شرکت و مضاربت عصرِ حاضر میں

مشارکہ اور مضاربہ کی بنیاد پر اسلامی بینکنگ کے طریقۂ کار، مشترک سرمایہ کی
کمپنیوں میں سرمایہ کاری اور اُن سے متعلق عصرِ حاضر کے جدید مسائل کی تحقیق

مولانا محمد عمران اشرف عثمانی (پی ایچ ڈی)

مکتبہ معارف القرآن کراچی
(Quranic Studies Publishers)

شرکت و مضاربت عصرِ حاضر میں

مشارکہ اور مضاربہ کی بنیاد پر اسلامی بینکنگ کے طریقۂ کار، مشترک سرمایہ کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری اور اُن سے متعلق عصرِ حاضر کے جدید مسائل کی تحقیق

از
ڈاکٹر مولانا محمد عِمران اشرف عثمانی

پیش لفظ
جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴
(Quranic Studies Publishers)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

جسٹس مُفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ

الحمدللہ رب العالمین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم،

وعلی آلہ وأصحابہ أجمعین۔ امابعد

میرے بیٹے عزیزم مولوی محمد عمران اشرف عثمانی سلمہٗ نے جب پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے کسی مناسب موضوع کی تلاش شروع کی تو میں نے ہی انھیں "شرکت و مضاربت اور اس کی عصری تطبیقات" کے موضوع پر کام کرنے کا مشورہ دیا۔ میرا منشأیہ تھا کہ اُن کا مقالہ تحقیق برائے تحقیق کے بجائے کسی اہم دینی اور علمی خدمت کی انجام دہی کے لیے لکھا جائے، اور ان مسائل پر تحقیقی کام ہو جن کی ضرورت امتِ مسلمہ اپنی جیتی جاگتی زندگی میں محسوس کر رہی ہے۔

اگر مقالے کا موضوع صرف "شرکت و مضاربت کے احکام" ہوتا تو مقالہ نگار کو کوئی قابلِ ذکر دشواری پیش نہ آتی، کیونکہ شرکت و مضاربت کے احکام تمام فقہی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ درج ہیں، اور انھیں مناسب ترتیب کے ساتھ بیان کر دینا کسی خاص تحقیقی کاوش کا متقاضی نہیں۔ لیکن اس مقالے کے موضوع میں یہ بات شامل تھی کہ عصرِ حاضر کے تجارتی ڈھانچے میں شرکت و مضاربت کے ان احکام پر عمل کا کیا طریقہ ہوگا؟ یہ سوال اس لیے دقت طلب ہے کہ ہمارے دور کی تجارتی زندگی میں ایسی بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں جن کا پہلے زمانے میں کوئی تصور نہیں تھا، لہٰذا ان پیچیدہ معاملات میں شرکت و مضاربت کے روایتی تصور سے رہنمائی حاصل کرنا بڑی دقتِ نظر چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ پورے عالم اسلام میں "شرکت و مضاربت" کو سودی سرمایہ

کاری کے متبادل کے طور پر اختیار کرنے کی آوازیں اُٹھ رہی ہیں، اور اسے سودی بنکاری کا مثالی متبادل قرار دیا جارہا ہے، چنانچہ اس بات کی ضرورت ہے کہ بنکاری کے نظام میں شرکت و مضاربت کے عمل دخل سے پیدا ہونے والے عملی مسائل کا شریعت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے۔

یہ مسائل تھے جنھوں نے اس موضوع کو ایک پی ایچ ڈی کے طالب علم ہی نہیں، ایک تجربہ کار مصنف کے لیے بھی مشکل بنادیا تھا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس مقالے سے پہلے "شرکت و مضاربت" پر معاصرین کی جو تحریریں آئی ہیں، وہ یا تو ان مسائل سے خاموش ہیں، یا ان سے بہت سرسری انداز میں گذر گئی ہیں۔

لیکن الحمد للہ، ان مشکلات کے باوجود عزیزم سلمہٗ نے اس موضوع کا نہ صرف انتخاب کیا، بلکہ اس پر ثابت قدمی سے کام جاری رکھا، اور جن مسائل پر تحقیق و استنباط کی ضرورت تھی، ان کو اپنے وسائل کی حد تک کھنگال کر اُن کا قابلِ عمل حل پیش کیا۔ انھوں نے ایک طرف عصر حاضر کے تجارتی معاملات اور اُن کی ضرورتوں کو سمجھ کر اُن کا قابلِ عمل حل پیش کرنے کی کوشش کی، اور دوسری طرف شرعی احکام کے تقدّس کو پوری طرح برقرار رکھتے ہوئے اپنی تحقیق کو فقہِ اسلامی کے مسلّم اصولوں کے تابع رکھا، اور تبرّزم کے شوق میں ان اصولوں کو تختۂ مشق بنانے کی کوشش سے مکمل احتراز کیا، اور اس طرح ان پُرخطر مسائل سے بفضلہٖ تعالیٰ سلامتی کے ساتھ گذرے۔

اس مختصر پیش لفظ میں اُن موضوعات کا تذکرہ غیر ضروری ہے جن میں مؤلف نے دادِ تحقیق دی ہے، کتاب اہلِ علم کے سامنے ہے، اور وہ انشاء اللہ ان مباحث کی قدر فرمائیں گے۔ تحقیق کے بعض نتائج سے کسی صاحبِ علم کو اختلاف بھی ہو سکتا ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی اس کتاب نے شرکت و مضاربت کو ہماری جیتی جاگتی زندگی میں ایک جدید پیرھن کے ساتھ پیش کیا ہے جو اپنی ظاہری شکل و صورت اور اپنی ترتیب و تنظیم میں نیا ضرور ہے، مگر اُس میں ان کی وہ روایتی رُوح پوری طرح جلوہ گر ہے جو اسلامی سرمایہ کاری کو غیر اسلامی معیشت کے مفاسد و معائب سے محفوظ رکھتی اور اُسے سودی سرمایہ کاری کے مقابلے میں ایک محسوس امتیاز عطا کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ عزیزم سلمہٗ کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر اُسے قارئین کے لیے نافع اور مؤلف کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائیں، اور اُن کو مزید دینی خدمات کی زیادہ سے زیادہ توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

۲۱ ذیقعدہ ۱۴۲۱ھ

۱۵ فروری ۲۰۰۱ء

اظہارِ تشکّر

میں سب سے پہلے اپنے اللہ تبارک وتعالی کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے محض اپنے فضل وکرم سے احقر کو یہ مقالہ تحریر کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اور اس کے بعد میں اپنے والدِ محترم حضرت مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم کا تہہِ دل سے ممنون ہوں جنکی انتہائی قیمتی ہدایات اور مشوروں سے احقر اس مقالہ کی تکمیل کر سکا، اور اس کے ساتھ ہی میں اپنے اساتذۂ کرام خصوصاً محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر فضل احمد صاحب اور محترم جناب پروفیسر ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب کا ممنون ہوں، جنکی اس مقالہ نگاری کے دوران نگرانی و معاونت احقر کے لئے بہت بڑا اعزاز اور سرمایۂ افتخار ہے۔

آخر میں دعاگو ہوں کہ اللہ تعالی اس مقالہ کو شرفِ قبول عطا فرمائے، اور اسے احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور قارئین کے لئے مفید بنائے (آمین)۔

وللہ الحمد أولاً و آخراً

محمد عمران اشرف عثمانی

فہرستِ مضامین (CONTENTS)

جلدِ دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

مقالہ کا تعارف اور اہمیت (Research Plan)

عصر حاضر کی سرمایہ کاری میں مشارکہ کا کردار

مشارکہ کی اصطلاح جدید اسلامی معاشیات پر لکھی جانے والی جدید تحریروں میں بکثرت استعمال ہو رہی ہے۔ لیکن چونکہ موجودہ وسیع پیمانے کی صنعت اور تجارت میں مشترک کاروبار مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے۔ جو روایتی فقہ کے مطابق کہیں شرکت، کہیں مضاربت، کہیں شرکت ملک، اور کہیں شرکت اعمال کی مختلف اصطلاحات کے ذیل میں آتا ہے، اور مختلف مقامات پر مختلف اصطلاحات کا استعمال الجھن کا سبب بن سکتا تھا، اسلئے جدید مصنفین نے مشارکہ کا لفظ اسلئے استعمال کیا کہ وہ مشترک کاروبار کی ان تمام صورتوں پر محیط ہو سکے۔

مشارکہ کو جدید اسلامی معاشی مفکرین اور علماء سودی نظام کے بدل کے طور پر پیش کرتے رہے ہیں۔ اور عوام کی بچتوں کو وسیع پیمانہ کی تجارت اور صنعت میں استعمال کرنے کے لئے ایک موثر ذریعہ بھی قرار دیتے رہے ہیں، اور اس موضوع پر مختلف زبانوں میں مضامین اور مقالات منظر عام پر آئے ہیں، لیکن یہ بحث ابھی تک تشنہ ء تکمیل ہے کہ مشارکہ کو موجودہ دور کے بزنس میں کس طرح استعمال کیا جائے گا؟ اسکے عملی مسائل کیا ہوں گے؟ اور ان عملی مسائل کو مشارکہ کے بنیادی اسلامی اصولوں کے دائرہ میں رہتے ہوئے کس طرح حل کیا جائیگا؟ اسکی فقہی توجیہات کیا ہونگی؟ اور معیشت کے مختلف شعبوں میں مشارکہ کے اطلاق کا مفصل طریقہ کس طرح وضع کیا جائے گا؟

مثلاً شرکت کا روایتی تصور یہ ہے کہ جب کوئی شرکت قائم ہو، تو اس کے شرکاء کاروبار کے شروع سے آخر تک

اپنا یہ رشتہ برقرار رکھیں، اور اگر شرکت ختم ہو تو کاروبار کے تمام اثاثے نقد کی صورت میں تبدیل کر کے باہم تقسیم کئے جائیں، لیکن موجودہ دور میں یہ تصور پوری طرح قابل عمل نہیں ہے، کیونکہ موجودہ دور کی صنعت و تجارت اُس وقت ملک اور قوم کے لئے نفع بخش ہو سکتی ہے جب اسمیں تسلسل ہو، دوسری طرف عوام کی بچتوں کو صنعت و تجارت میں استعمال کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ شریک ہونے والوں کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ وہ جب چاہیں شرکت سے علیحدہ ہو کر اپنی رقمیں منافع کے ساتھ واپس لے سکیں گے، لہذا موجودہ دور میں مشارکہ کو موثر طور پر استعمال کرنے کیلئے ایسا طریقہ کار وضع کرنا لازمی ہے، جسمیں ایک طرف زمانہ کے ان دونوں تقاضوں کی پوری رعایت ہو، اور دوسری طرف شرکت کے بنیادی اصولوں کی خلاف ورزی لازم نہ آئے، اس کیلئے جو بھی حل تجویز کیا جائے گا، اسکی فقہی توجیہ بھی ضروری ہے۔

یہ صرف ایک مثال تھی، مشارکہ کے عملی اطلاق میں اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں، جن کے حل کیلئے ایک طرف فقہی بصیرت ضروری ہے اور دوسری طرف موجودہ دور کی کاروباری ضروریات کا ادراک ناگزیر ہے، لہذا پیش نظر مقالہ میں اسی موضوع پر تحقیقی کام کرنا مقصود ہے۔

اس موضوع پر ابتک کئے جانے والے کام کا جائزہ:

شرکت اور مضاربت کے موضوع پر متعدد مقالات اور کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ لیکن ان میں سے زیادہ تر شرکت کے روایتی تصور کی توجیہ اور تشریح پر مبنی ہیں، اور موجودہ دور میں اسکے عملی اطلاق پر کماحقہ تحقیقی کام نہیں کیا گیا ہے، البتہ ان میں سے بعض میں شرکت و مضاربت سے متعلق مسائل کافی تفصیل کے ساتھ ذکر کئے گئے ہیں، اور بعض مقامات پر جدید دور کے مسائل سے بھی جزوی طور پر بحث کی گئی ہے، لہذا ان میں سے اہم کتابیں ذکر کرنا احقر ضروری سمجھتا ہے، چنانچہ انہیں ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، شرکت و مضاربت کے شرعی اصول، اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔

2- Shah Rukh Rafi Khan, Profit and Loss Sharing,

1997, Oxford University Press.

3- Imran Ahsan Khan Niyazee, Islamic Law of Business organization Partnerships, The International Institue of Islamic Thought and Islamic Research Institute. 1997.

۴۔ احمد محی الدین احمد حسن ، عمل شرکات الاستثمار الاسلامیہ فی السوق العالمیہ، بنک البرکۃ الاسلامی للاستثمار، البحرین۔

۵۔ المرزوقی، ڈاکٹر صالح بن زابن، "شرکۃ المساہمۃ فی النظام السعودی"، جامعہ ام القری، ۱۴۰۶ھ۔

۶۔ الدبو، ابراہیم فاضل یوسف، عقد المضاربۃ، مطبعۃ الارشاد، بغداد، ۱۹۷۳ء۔

۷۔ الخیاط، عبدالعزیز عزت، الشرکات فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الوضعی، دار النہضۃ العربیۃ بیروت ۱۴۰۷ھ۔

۸۔ الدکتور السید علی السید، الحصۃ بالعمل بین الفقہ الاسلامی والقانون الوضعی ، ۱۹۷۳ء۔

۹۔ النبهانی، الشیخ تقی الدین ، الشرکات فی الفقہ الاسلامی۔

۱۰۔ ابو غدہ، الدکتور عبد الستار، المضاربۃ والقراض والتطبیقات المعاصرۃ، ابحاث موتمر المصرف الاسلامی الثانی، موسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۷ھ۔

۱۱۔ استاد علی الخفیف، الشرکات۔

۱۲۔ ڈاکٹر عبدالعظیم، عقد المضاربۃ بین الشریعۃ والقانون، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ، الازہر، ۱۴۰۳ھ۔

۱۳۔ استاذ سعید العالم، اللمحات فی احکام الشرکات، مخطوطہ ۱۹۹۴ء۔

۱۴۔ الشرکۃ ، قرص فقہ المعاملات ، شرکۃ صخر لبرامج الحاسب، (Fiqhul Muamlaat, C.D. Sakhr Software Co 1996).

مندرجہ بالا مقالات اور کتابوں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں روایتی شرکت کے احکام تو کافی بسط و تفصیل سے مذکور ہیں البتہ شرکت اور مضاربت کی جدید صورتیں، کمپنی اور بینک سے متعلق مسائل، اور مشارکہ سرٹیفکیٹس وغیرہ پر فقہی انداز سے سیر حاصل بحث مذکور نہیں ہے۔

ان کے علاوہ بعض کتابیں منظمۃ المؤتمر العالم الاسلامی (Organization of Islamic conference) کے ذیلی ادارہ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ (Islamic Fiqh Acadmy)، مجمع الفقہ الاسلامی انڈیا اور بعض غیر سودی مالیاتی اداروں اور اسلامی بینکوں کے ہیئۃ الرقابۃ الشرعیہ (Shariah Supervisory Boards) نے جدید تجارت اور بینکاری سے متعلق شائع کی ہیں، جن میں مشارکہ مضاربہ سمیت بہت سے معاملات، موجودہ دور کی تجارت و معیشت کے مسائل اور غیر سودی نظام بینکاری پر بھی کام کیا گیا ہے تاہم ان میں مشارکہ اور مضاربہ اور ان سے متعلقہ احکام اور مسائل مرتب اور یکجا مذکور نہیں ہیں۔ البتہ افادیت کے پیش نظر انمیں سے بعض اہم اور قابل ذکر کتابوں کے نام ذیل میں ذکر کیئے جاتے ہیں:

۱۔ مجلات مجمع الفقہ الاسلامی (۲۵ مجلدات)، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ۔

2- A compendium of Legal Opinions On The Operations Of Islamic Banks - Murabaha, Mudarabah, and Musharakah. Edited and translated by Yousuf Talal Delorenzo, Published by Institue of Islamic Banking and Insurance (IIBI), 1997, London, Uk.

۳۔ ابو غدہ، ڈاکٹر عبدالستار، وخوجہ، پروفیسر عزالدین، فتاوی الہیئۃ الشرعیۃ للبرکۃ وفتاوی ہیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ، شرکۃ التوفیق وشرکۃ الامین۔ ناشر، مجموعۃ دلہ البرکۃ، قطاع الاموال، شرکۃ البرکۃ للاستثمار والتنمیۃ۔

۴۔ الفتاوی الشرعیہ فی المسائل الاقتصادیہ، بیت التمویل الکویتی ۱۹۸۵ء۔

۵۔ ابو غدہ، ڈاکٹر عبدالستار، خوجہ، پروفیسر عزالدین، فتاوی ندوات البرکۃ

(۱۹۸۱۔ ۱۹۸۷)، مجموعۃ دلۃ البرکۃ، قطاع الاموال، شرکۃ البرکۃ للاستثمار و التنمیۃ۔

۶۔ فتاوی ہیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ، بینک فیصل الاسلامی السودانی۔

۷۔ مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ فی الاقتصاد، الصادرہ عن ندوات البرکۃ للاقتصاد الاسلامی (۱۹۸۱۔ ۱۹۹۰) دار الحرمین للطباعۃ، القاہرہ ۱۹۹۲ء۔

۸۔ ابو غدہ، ڈاکٹر عبد الستار، الاجوبۃ الشرعیۃ فی التطبیقات المصرفیۃ، دلۃ البرکۃ۔

خلاصہ یہ کہ شرکت اور مضاربت کے موضوع پر مقالات اور کتابیں لکھی جاچکی ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر شرکت کے روایتی تصور کی توجیہ اور تشریح پر مبنی ہیں، اور موجودہ دور میں اسکے عملی اطلاق پر مرتب طریقے سے کماحقہ کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا، لہذا پیش نظر مقالہ میں اسی موضوع پر تحقیقی کام کرنا مقصود ہے، عہد حاضر میں اس کام کی ضرورت اسلئے انتہائی شدید ہے، کہ موجودہ وقت میں بہت سے تجارتی اور مالیاتی ادارے مشارکہ کی بنیاد پر کام کرنا چاہتے ہیں، لیکن اسکی عملی تفصیلات کا کوئی واضح تصور ان کے ذہن میں صاف نہیں ہے، اس مقالہ میں انشاء اللہ اس خلا کو پر کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور اس موضوع پر عالم اسلام میں ابتک جو کام ہوا ہے، اس سے استفادہ کرتے ہوئے مشارکہ کا ایسا عملی خاکہ پیش کیا جائے گا، جو موجودہ دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو، اور سودی نظام کے بدل کے طور پر پیش کیا جاسکے۔

البتہ اس زیر نظر مقالہ کے مطالعہ سے پیشتر یہ بات مد نظر رہنی چاہیے کہ اس میں بہت سے مسائل ایسے ذکر کیے جائیں گے، جن کا صریح حکم کتاب اللہ سنت یا فقہ میں موجود نہیں ہے، اسلئے ان میں اجتماعی غور و تحقیق و استنباط کی بھی ضرورت ہوگی، لہذا ایسے مسائل میں جو فقہی بحث کی جائے گی وہ اس موضوع پر حرف آخر نہیں ہوگی، اسی طرح اس مقالہ میں عموماً ہر مسئلہ میں چاروں اماموں کے مذاہب ذکر کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اسی مسئلہ کو بنیاد بنایا جائے گا جسپر یا توسب کا یا اکثر کا اتفاق ہو، البتہ بعض اوقات جہاں یہ صورت ممکن نہ ہو، وہاں اختلاف مذاہب ذکر کرنے کے بعد کسی ایک مذہب کو ضرورت عامہ یا دلائل کی قوت کی بناء پر راجح قرار دیا جاسکتا ہے۔ ناچیز کو اپنی کم مائیگی اور کم علمی کا پورا اعتراف ہے اسوجہ سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہے کہ کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی رائے یا نتیجہ بحث حرف آخر نہیں ہوگی، کیونکہ ان میں اجتماعی تحقیق اور استنباط کی ضرورت ہے، چنانچہ ان مسائل کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان

کے بارے میں بحث و نظر کا دروازہ کھلے اور اہل علم اور فقہاء اس رائے پر بھی غور فرما کر حتمی رائے دے سکیں۔

اس مقالہ میں شرکت اور مضاربت کے تمام فقہی احکام کا احاطہ نہیں کیا جائے گا، بلکہ زیادہ تر ان امور سے بحث کی جائے گی جن کا جدید صنعت و تجارت، بینکوں کی تنظیم نو اور کمپنیوں سے گہرا تعلق ہے۔ اب ہم اس مقالہ کا خطہ (Synopsis) ذکر کرتے ہیں، تاکہ اس مقالہ کے بنیادی محتویات اور اجزاء سمجھنا آسان ہو جائیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خطہ (SYNOPSIS)

مقدمہ:

۱۔ موضوع کی اہمیت۔

۲۔ اس موضوع پر ابتک کیے جانے والے کام کا جائزہ۔

پہلا باب: عصر حاضر میں مشارکہ کی ضرورت۔

مشترک سرمائے سے کاروبار کی ضرورت۔

سرمایہ دارانہ نظام میں بچتوں کو استعمال کرنے کے مختلف طریقے:

۱۔ سودی قرضے۔

۲۔ سودی دستاویزات۔

۳۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں۔

ان طریقوں پر شرعی نقطۂ نگاہ سے تنقید۔

۱۔ سود کے بارے میں قرآن وسنت کے احکام، تجارتی سود اور صرفی سود، سود مفرد اور سود مرکب۔

۲۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں تمام بچتوں کو استعمال نہیں کر سکتیں؟

قصیر المیعاد اور طویل المیعاد سرمایہ کی ضرورت۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے مشارکہ کا کردار۔

دوسرا باب: شرکت کا روایتی تصور:

مشارکہ کا مطلب۔

مشارکہ اور شرکت میں فرق۔

قرآن وسنت میں شرکت کا ماخذ۔

قرآن کریم میں شرکت کا تذکرہ۔

شرکت کی مختلف صورتیں۔

احادیث میں شرکت کا تذکرہ۔

شرکت الملک، اختیاری شرکۃ الملک، غیر اختیاری شرکۃ الملک۔

شرکت العقد اور اسکی مختلف قسمیں۔

شرکت المفاوضۃ، شرکت العنان، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، مضاربت۔

شرکت کے بنیادی اصول۔

سرمایہ کی فراہمی۔

شرکاء کے حقوق اور اختیارات۔

منافع کی تقسیم کے بنیادی اصول، منافع کے تعین کا طریقہ۔

شرکت اور مضاربہ کا مجموعہ اور اسکے احکام۔

نقصان کی تقسیم کے بنیادی اصول۔

تیسرا باب: شرکت سے متعلق قابل تحقیق عصری مسائل:

کیا سرمایہ کا نقد ہونا ضروری ہے؟

کیا سرمایہ کا مخلوط ہونا ضروری ہے؟

کیا شرکت کسی میعاد کی پابند سکتی ہے؟

مشارکہ اور کاروبار کا تسلسل۔

کاروبار کو نقد بنائے بغیر منافع کی تقسیم۔

کاروبار کے کسی ایک حصہ میں مشارکہ۔

سروسز کے کاروبار میں مشارکہ۔

جوائنٹ اسٹاک کمپنی (Joint Stock Company) کی شرعی حیثیت۔

شخص قانونی (Juristic Person) کا تصور اور اس کی شرعی حیثیت۔

محدود ذمہ داری (Limited Liablity) کا تصور اور اس کی شرعی حیثیت۔

مشارکہ متناقصہ اور اسکا شرعی حکم۔

چوتھا باب: مالیاتی اداروں میں مشارکہ کا استعمال۔

تمویل (یعنی Financing) کے مختلف شعبوں میں مشارکہ کا استعمال۔

محدود مقصد کا مشارکہ۔

منصوبوں کی تمویل (Project Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

عامل سرمایہ کی تمویل (یعنی Working Capital Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

درآمد کی تمویل (Import Finacing) میں مشارکہ کا استعمال۔

برآمد کی تمویل(Export Financing)میں مشارکہ کا استعمال۔

مشارکہ کا رواں اکاؤنٹ(Musharkah Running Account)۔

روزانہ پیداوار کی بنیاد(Daily Product Basis) پر منافع کا حساب اور اسکی شرعی حیثیت۔

ھاؤس فائنانسنگ(House Finacing) میں مشارکہ کا استعمال۔

آٹو موبائل فائنانسنگ(Automobile Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

پانچواں باب مشارکہ کی مالی دستاویز۔ایک نیا تصور۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ کا اجراء۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ اور بانڈ کا فرق۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ اور شیئر سرٹیفکیٹ کا فرق۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ کا ثانوی بازار(Seconderay Market)اور اسکی خرید و فروخت کے اصول۔

کیا مشارکہ سرٹیفکیٹ بیئرر(Bearer) ہوسکتا ہے؟

کیا مشارکہ سرٹیفکیٹ اوپن اینڈ(Open End) ہوسکتا ہے؟

مشارکہ سرٹیفکیٹ کی قیمت کا تعین۔

حکومتی قرضوں میں مشارکہ سرٹیفکیٹ کا استعمال۔

کن کن سرکاری شعبوں میں مشارکہ سرٹیفکیٹ استعمال ہوسکتا ہے؟

چھٹا باب: مشارکہ کے عصری تجربے۔

پاکستان میں پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ (Participation Term certificate)۔

پاکستان میں ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ (Term Finance certificate)۔

حکومت اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ۔

ساتواں باب: مشارکہ کی معاشی حیثیت۔

مشارکہ کے معاشی مضمرات۔

مشارکہ اور سود کا فرق۔

پیدائش دولت پر مشارکہ سود کے اثرات کا تقابل۔

تقسیم دولت پر مشارکہ اور سود کے اثرات کا تقابل۔

اختتامیہ۔

مراجع۔

پہلا باب

عصر حاضر میں مشارکہ کی ضرورت

پہلا باب: عصر حاضر میں مشارکہ کی ضرورت

مشترک سرمائے سے کاروبار کی ضرورت

تجارت یا صنعت و حرفت کی ترقی کا دارومدار سرمائے پر ہے کیونکہ دنیا میں کوئی بھی کاروبار یا ذریعہ آمدنی ہو اس کے لئے سب سے اہم چیز سرمایہ ہے، اگر کوئی تاجر تجارت کرے یا مزدور مزدوری کرے تو ان کے پاس سرمایہ ہونا چاہیے تاکہ وہ اس سے سامان تجارت یا اوزار وغیرہ خریدیں، انتہائی پس ماندہ ممالک میں بھی کہیں یہ ممکن نہیں کہ آدمی بالکل نہتا اور خالی ہاتھ ہو اور اس کے پاس کام کرنے کا کوئی سامان بھی نہ ہو، سقہ کے پاس بھی مشک ہوتی ہے خاکروب بھی جھاڑو استعمال کرتا ہے، لہذا معلوم ہوا کہ کسی بھی کام یا تجارت یا صنعت کے لئے سامان کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ سامان بغیر سرمایہ کے حاصل نہیں ہو سکتا، لہذا سرمایہ ایک بہت بڑا عامل پیدائش (Factor of production) ہے، اس کے بغیر مزید دولت پیدا ہونی مشکل ہے، لہذا اگر کوئی شخص تجارت کرنا چاہتا ہے تو پہلے اسے سرمایہ کا انتظام کرنا ہوگا، اور سرمایہ کے انتظام کا ایک اہم راستہ بچت یا پس انداز کرنا ہے، اور بچت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص جتنا کمائے اس سے کم خرچ کرے، اور باقی جو بچے اسکو جمع کرے، یہی وہ طریقہ ہے جس سے ملک میں دولت بڑھتی ہے، اور عموماً دولت بڑھانے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے، اگر لوگ جس قدر پیدا کریں اسی قدر خرچ کر دیں تو بچتیں اور اندوختہ سرمایہ حاصل ہونے کا کوئی راستہ نہیں، اور جب سرمایہ نہیں ہوگا تو کاروبار کس طرح کیا جائے گا، لیکن ایک تنہا آدمی اپنی جمع شدہ رقم سے کوئی بڑا کاروبار نہیں کر سکتا، کوئی بڑا کاروبار کرنے یا کارخانہ لگانے کے لئے عظیم سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس کا راستہ یہ ہے کہ بہت سے افراد اپنی جمع کردہ رقوم کو اکٹھی کر کے اس سے کاروبار کریں۔

بعض لوگ بے شک اس قدر دولت مند ہوتے ہیں کہ چاہیں تو تنہا اپنے ذاتی سرمائے سے کارخانے یا ملیں قائم کر لیں، چنانچہ بہت سے ممالک میں بعض ملیں اور چھوٹے کارخانے اس طرح قائم بھی کئے گئے ہیں، لیکن بڑے بڑے

کارخانے مثلاً ٹیکسٹائل ملیں، اسٹیل ملیں، آئل ریفائنریوں وغیرہ کے لئے اربوں بلکہ کھربوں روپے کی ضرورت ہوتی ہے، جب تک سرمایہ فراہم کرنے کے لئے بہت سے لوگ شریک نہ ہوں وہ کوئی بڑا کارخانہ قائم نہیں کرسکتے، لہذا مشترک سرمائے سے کاروبار کی ضرورت ہوتی ہے، تاکہ کارخانے قائم کئے جائیں چنانچہ سرمائے کو جمع کرنے کے لئے مشترک سرمائے کی کمپنیاں قائم کی جاتی ہیں، یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہونے کے بعد سترہویں صدی کے آغاز میں بڑے بڑے کارخانے وغیرہ قائم کرنے کے لئے جب عظیم سرمایہ کی ضرورت پڑی، جس کو کوئی شخص اکیلا یا چند افراد مل کر فراہم نہیں کرسکتے تھے، تو اس وقت عام لوگوں کی منتشر بچتیں یکجا کرکے ان سے اجتماعی فائدہ اٹھانے کے لئے کمپنی کا نظام رائج ہوا، اس نظام کے ذریعہ سے بہت سی چھوٹی چھوٹی رقمیں کثیر مقدار میں جمع ہوکر کارخانہ داروں کو بڑے بڑے سرمائے سے کاروبار چلانے کا موقعہ فراہم کرتی ہیں، اور چھوٹی جمع پونجی رکھنے والوں کو بھی آمدنی حاصل ہوجاتی ہے، جو بالآخر پورے ملک اور قوم کے سرمائے میں اضافہ اور خوشحالی کا باعث بن جاتی ہے۔

لہذا ملک اور قوم کے لئے بالعموم اور افراد کے لئے بالخصوص ضروری ہے کہ اپنی رقموں کو پس انداز کرکے کسی مشترک کاروبار میں لگائیں تاکہ اپنا اور ملک و قوم کا فائدہ ہو۔

البتہ یہاں پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ضرورت سے زائد مال جمع کرنے کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ آیا بچت کرنا شریعت میں ممنوع تو نہیں ہے؟ اور اگر ممنوع نہیں تو کتنی بچت کی جاسکتی ہے؟ اور کیا شرائط ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بقدر ضرورت جائز طریقے سے مال جمع کرنا ضروری امور میں سے ایک ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,طلب کسب الحلال فريضة بعد الفرائض،،[۱]

حلال کمائی تلاش کرنا فرائض کے بعد ایک فرض ہے۔

البتہ ضرورت سے زائد مال بچا کر رکھنے یا جمع کرنے کا حکم یہ ہے کہ اگر نیت اچھی اور مقصد ٹھیک ہو تو جائز ہے،

(۱) ملاحظہ فرمائیں: بخاری ومسلم، کنز العمال ۴: ۹۲۰۳، طبرانی کبیر عن ابن مسعود، ومسند الفردوس الدیلمی۔

مثلاً اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد مال جمع کرنا یا بچت کرنا چاہتا ہے اور مقصود اس سے اپنی اور اپنے اہل وعیال کی کفالت کرنا، انہیں اپنی زندگی یا مرنے کے بعد کسی کا محتاج ودست نگر ہونے اور زمانے کے حوادث اور مصائب سے بچانا، رشتہ داروں، اعزہ اقرباء کے لئے کشادہ دلی اور سخاوت، زکاۃ وصدقات کے ذریعہ فقراء ومساکین کی اعانت، خدا تعالی کے راستے، اور خیراتی کاموں میں خرچ کرنا ہو تو مذکورہ مقاصد کے لئے مال جمع کرنا اور انہیں صحیح جگہ پر استعمال کر کے ضائع ہونے سے بچانا نہ صرف جائز ہے بلکہ ثواب کا کام ہے۔

چنانچہ اللہ تعالی نے مال کو ضائع ہونے سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے اسے کسی ناسمجھ آدمی کے ہاتھ میں دینے سے منع فرمایا، اور مال کو انسان کے لئے قوام (بقاء کا ذریعہ) قرار دیا:

﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾ (۱)
اور مت پکڑاؤ بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے تمہارے گذارہ کا سبب۔

اور آگے فرمایا:

﴿وَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ﴾ (۲)
پھر اگر ان میں ہوشیاری دیکھو تو انکا مال ان کے حوالہ کردو۔

حضور ﷺ نے اہل وعیال کے واسطے مال کی حفاظت اور بچت کا حکم دیا، اور اسے ضائع کرنے سے منع فرمایا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا:

إنك أن تذرَ ورثتك أغنياء خير من أن تذرَهم عالة يتكففون الناس (۳)

(۱) سورة النساء آیت:۵۔

(۲) سورة النساء آیت:٦۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: بخاری، (أبو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری)، الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح ۱۳۲-۸۹ ، دار الکتاب بیروت دار الکتب العلمیہ ۷، ۱٤۱۰ھ، رقم الحدیث: (٤٠٥٧)۔

اگر تم اپنے ورثاء کو مالدار چھوڑ دو یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ دوسروں کے محتاج بن کر ان کے دست نگر ہوں۔

حضور ﷺ نے نیک آدمی کے لئے مالدار ہونے کو پسند فرمایا چنانچہ حدیث میں ہے:

,,نعم المال الصالح للرجل الصالح،،[1]

اچھا مال نیک شخص کے لئے اچھا ہے۔

حضرت انسؓ کے لئے حضور ﷺ نے دعا فرمائی:

,,اللھم أكثر ماله وولده وبارك له فيه،،[2]

اے اللہ اسکے مال، اولاد کو زیادہ کر اور اسمیں برکت دے۔

حدیث بالا سے معلوم ہوا کہ اگر مال اپنی ذات میں کوئی بری چیز ہوتی تو اس کے اضافہ کے لئے آپ ﷺ دعا گو نہ ہوتے، ایک مرتبہ حضرت کعبؓ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میں اپنے گناہوں سے توبہ کرنے اور مغفرت کے لئے صدقہ نکالنا چاہتا ہوں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(گذشتہ سے پیوستہ)

ومسلم (أبو الحسين مسلم بن الحجاج القشيرى) مع الترقيم والتحقيق لفواد عبد الباقى ۸۰۷، دار الكتاب بيروت، رقم الحديث: (۳۰۷٦)۔

ابن ماجه، حديث: (۲٦۹۹)۔ موطأ امام مالك، حديث: (۱۲۵۸)۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں: احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)، مسند الشاميين رقم الحديث: (۱۷۰۹٦ـ ۱۷۱۳٤)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: بخاری، (أبو عبد اللہ محمد بن اسماعيل) الصحيح البخارى المسمى بالجامع الصحيح، الدعوات حديث: (۵۸۵۹ـ۵۸٦۸ـ۵۹۰۱ـ۵۹۰۲)۔

مسلم (أبو الحسين مسلم بن الحجاج القشيرى) فضائل صحابه، حديث: (٤۵۲۹، ٤۵۳۰)۔

,,أمسك عليك بعض مالك فهو خير لك،،[1]

اپنے بعض مال کو روک کر رکھو یہ تمہارے لئے بہتر ہے۔

مذکورہ بالا حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صدقہ خیرات کرنے میں بھی اعتدال سے کام لینا چاہیے، کہ کچھ اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے بھی بچا کر رکھے، اور کچھ رشتہ داروں اور مساکین وغیرہ پر بھی خرچ کرے۔ اس قسم کا مضمون قرآن پاک کی مختلف آیات میں بھی آیا ہے، چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً إِلَى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَحْسُوْرًا﴾[2]

اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لو (کہ انتہائی بخل سے بالکل ہاتھ خرچ کرنے ہی سے روک لو) اور نہ بالکل ہی کھول دو، (کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کرکے اسراف کیا جائے) ورنہ الزام خوردہ اور تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے۔[3]

(گذشتہ سے پیوستہ)

ترمذی، (أبو عیسیٰ محمد بن عیسی بن سورة الترمذی ۱۱۹۸-۱۲۵۲) جامع السنن، دار الفکر بیروت، کتاب المناقب/حدیث:(۳۷٦٤)۔

احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)، مسند مکثرین/ حدیث(۱۲۵٤۳)۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں: بخاری، (أبو عبد اللّٰہ محمد بن اسماعیل) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح، الزکاة ,,باب لا صدقة إلا عن ظهر غنى،، الوصایا، حدیث: (۲۵۵۲)۔ والهبة /حدیث: (۲٤۳۲)۔

احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)، مسند مکثرین/ حدیث(۱۳۸۲۱)۔

(۲) سورۂ بنی اسرائیل، آیت:۲۹۔

(۳) خلاصۂ تفسیر معارف القرآن(۵/ ٤٦٠)۔

اور ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾[1]

قرابتدار، مسکین، اور مسافر کو اس کا حق دے اور فضول خرچی مت کر۔

اسی طرح حضور ﷺ نے مال کے بے جا ضائع کرنے اور لٹانے سے منع فرمایا:

,,امسكوا عليكم أموالكم ولا تفسدوها،،[2]

اپنے مالوں کو روک کر رکھو اور انہیں ضائع مت کرو۔

دوسری جگہ یہ ارشاد فرمایا:

,,امسكوا عليكم أموالكم ولا تقسموها،،[3]

اپنے مال کو روک کر رکھو اور اسے تقسیم نہ کرو۔

علامہ قرطبیؒ اپنی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ بعض کم علم لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ضرورت سے زائد مال جمع کرنا توکل کے منافی اور گناہ کا سبب ہے، بلکہ جائز طریقے سے نیک نیتی کے ساتھ ضرورت سے زائد مال جمع کرنا بھی نہ صرف جائز ہے، بلکہ ثواب کا کام ہے، البتہ اگر مال جمع کرنے اور بچت کرنے کا مقصد ٹھیک نہ ہو مثلاً کوئی شخص نمائش، نام و نمود، حب جاہ اور حب مال کی وجہ سے مال جمع کرنا چاہتا ہو یا غلط جگہوں پر خرچ کرنا چاہتا ہو تو غلط اور گناہ کا سبب ہوگا، ان مقاصد سے مال جمع کرنے والوں کے بارے میں ہی حضور ﷺ نے فرمایا:

---

(۱) سورۂ بنی اسرائیل، آیت: ۲٦۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: مسلم (أبو الحسين مسلم بن الحجاج القشيرى) الهبات/ حديث: (۳۰٦۸)۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)، باقی مسند المکثرین، حدیث: (۲۴٦۰۴)۔

,,الأكثرون هم الأقلون إلا من قال هكذا و هكذا و هكذا،،[۱]

زیادہ مال رکھنے والے قیامت کے روز خسارہ میں ہونگے، مگر جنہوں نے اسطرح اور اسطرح (صدقہ، خیرات میں خرچ) کیا۔

غلط مقصد سے یا بری نیت سے مال جمع کرنے والوں کے لئے ہی مال کو فتنہ قرار دیا گیا، لیکن جو نیک لوگ نیک نیتی سے مال جمع کریں گے، تو ان کے لئے زیادہ مالدار ہونا نقصان اور فتنہ کا سبب بھی نہ ہو گا۔

اسی وجہ سے بہت سے جلیل القدر انبیاء کرام، صحابہ کرام تابعین اور علماء و فقہاء کرام نے حسن نیت کے ساتھ پاکیزہ طریقوں سے نہ صرف مال جمع فرمایا بلکہ اپنے ورثاء کے لئے وافر مقدار میں مال ترکہ میں چھوڑا، ان میں سے چند ایک مثالیں ذیل میں مذکور ہیں۔

۱۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالی نے عظیم دولت سے نوازا۔

۲۔ حضرت ایوب علیہ السلام پر اللہ تعالی کی طرف سے سونے کی تتلیاں برسائی گئیں، حضرت ایوب علیہ السلام انہیں زیادہ سے زیادہ اپنے کپڑے میں جمع کرنے لگے تو اللہ تعالی نے ان سے پوچھا کہ کیا تمہارا ابھی تک پیٹ نہیں بھرا؟ تو انہوں نے جواب دیا اے پروردگار میں آپ کے فضل سے کیسے مستغنی اور بے نیاز ہو سکتا ہوں[۲]۔

۳۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تمام انبیاء کرام نے بکریاں چرائی ہیں، صحابہ کرامؓ نے

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعیل البخاری)، الصحیح البخاری، المسمی بالجامع الصحیح، الاستئذان، رقم الحدیث: (۵۷۹۷)۔

مسلم (أبو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری) الإیمان، رقم الحدیث: (۱۳۷۔۱۳۸۔۱۶۵۴)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: القرطبی، ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری ۶۷۱ھ، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر القرطبی) مصر، مطبعۃ دار الکتب ۱۳۶۸ھ آیۃ الدین (۱۳: ۴۲)۔

حضور ﷺ سے دریافت کیا یا رسول اللہ! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ حضور ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ ہاں! میں اہل مکہ کی بکریاں قیراطوں کے عوض چرایا کرتا تھا[۱]۔

۴۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جو عشرۂ مبشرہ اور غزوۂ بدر کے شرکاء میں سے مشہور صحابی ہیں، جب ان کا انتقال ہوا تو انہوں نے کثیر مال وراثت میں چھوڑا، بعض لوگوں نے چہ میگوئی کی کہ ہمیں عبدالرحمٰن کے بارے میں انکے ترکہ کی وجہ سے فکر ہے، حضرت کعبؓ نے یہ سنا تو فرمایا: سبحان اللہ (تمہیں کیوں فکر ہے کیونکہ) انہوں نے پاکیزہ طریقے سے کمایا، پاکیزہ طریقے سے خرچ کیا، اور پاکیزہ مال چھوڑا[۲]۔

۵۔ حضرت طلحہؓ نے تین سو اونٹوں کے بوجھ کے برابر مال ترکہ میں چھوڑا۔

۶۔ حضرت زبیر بن عوامؓ نے ڈھائی لاکھ مالیت کا سامان ترکہ میں چھوڑا۔

۷۔ حضرت ابن مسعودؓ نے نوّے ہزار ترکہ میں چھوڑا[۳]۔

۸۔ حضرت سعید بن میتبؓ نے چار سو دینار ترکہ میں چھوڑے، موجودہ زمانہ میں جنکی مالیت لاکھوں روپے کے برابر ہے، آپ فرمایا کرتے تھے:

,,لا خير فيمن لا يطلب المال يقضي به دينه ويصون عرضه فإن مات تركه ميراثا لما بعده،،

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاری)، الصحيح البخاری، المسمى بالجامع الصحيح، كنز العمال (حديث: ۹۲۴۳): ,,ما بعث الله نبياً إلا رعى الغنم قالوا: وأنت يا رسول الله؟ قال: وأنا كنت ارعاها لأهل مكة بالقراريط،،

(۲) ملاحظہ فرمائیں: القرطبی، ابو عبدالله محمد بن احمد الانصاری ۶۷۱ھ، الجامع لاحكام القرآن (تفسير القرطبی)، مصر، مطبعة دار الكتب ۱۳۶۸ھ آية الدين، (۳: ۴۲۰)۔

(۳) حوالہ بالا۔

ایسے شخص میں کوئی خیر نہیں جو ایسی روزی تلاش نہ کرے کہ اس سے اپنا قرض چکائے، عزت بچائے، اور اپنے ورثاء کیلئے اپنی موت کے بعد ترکہ میں مال چھوڑے[1]۔

۹۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے بھی دوسو دینار وراثت میں چھوڑے اور آپ فرمایا کرتے تھے:

,,المال فی هذاالزمان سلاح،،[2]

مال اس زمانہ میں اسلحہ ہے۔

خلاصہ یہ کہ مذکورہ بالا تمام مثالوں، واقعات اور دلائل سے یہ واضح ہوتا ہے کہ صحیح نیت سے مال کی حفاظت کرنا، یا بچت کرنا نہ صرف جائز ہے بلکہ باعثِ اجر وثواب ہے۔

یہ بات پیچھے ذکر کی جاچکی ہے کہ سرمایہ حاصل کرنے کا ایک اہم راستہ بچت کرنا ہے، اور شریعت میں اچھی نیت سے روپیہ بچانا کوئی معیوب بات نہیں بلکہ باعث اجر وثواب ہے، یعنی جتنی کمائی ہو اس میں سے اپنے اوپر، اپنے اہل وعیال اور والدین پر اور زکاۃ صدقات میں اعتدال کے ساتھ خرچ کرکے جو رقم باقی بچے اسے اچھی نیت سے جمع کیا جائے، پھر اس جمع کردہ رقم کو کسب تجارت یا صنعت میں لگایا جائے، تاکہ اس کے ذریعے سے جو کمائی ہو اس سے نہ صرف خود اپنے آپ کو فائدہ پہونچے بلکہ پوری قوم اور ملک اس سے مستفید ہو سکے، کیونکہ ملک اور قوم کی ترقی کا راز اپنی بچتوں کو تجارت وصنعت میں لگانے میں ہے، چنانچہ شریعت بھی اپنی بچتوں کو جائز طریقوں سے اور صحیح نیت سے تجارت وصنعت میں استعمال کرنے پر زور دیتی ہے، لہذا انہیں تجارت وصنعت میں لگانا چاہیے تاکہ ملک میں تجارت وصنعت سے دلچسپی

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: القرطبی ، ابو عبداللہ محمد بن احمد الانصاری ۶۷۱ھ، الجامع لاحکام القرآن (تفسیر القرطبی)،مصر، مطبعة دار الکتب ۱۳۶۸ھ آیۃالدین،(۳: ۴۲۰)۔

(۲) حوالہ بالا۔

بڑھے، کیونکہ جو قوم یا ملت جس قدر ان سے دلچسپی لیتی ہے وہ اسی قدر اپنی اقتصادی ترقی اور فلاح و بہبود کی زیادہ کفیل بنتی ہے، اور جس قوم یا جس ملک کے باشندے ان سے دلچسپی نہیں لیتے وہ اقتصادی نظام میں ہمیشہ دوسروں کے دست نگر بنے رہتے ہیں، اور اسی راستے سے دوسری اقوام ان کی تہذیب و تمدن، معیشت و سیاست بلکہ مذہب پر بھی قابض ہو جاتی ہیں، اور انہیں غلام بنا کر مطلق العنان حکمرانی کرتی ہیں۔

اسلام نے اسی لئے بار بار تجارت کی ترغیب دی ہے اور اس کے فضائل و برکات اور دینی فوائد بتائے ہیں۔

قرآن کریم میں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾(۱)
جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال تجارت ورزق) کو تلاش اور حاصل کرو۔

یہاں فضل سے مراد رزق حلال کی طلب ہے، اور آیت کا سبب نزول ترغیب تجارت پر مبنی ہے۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿لاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾(۲)
اپنے اموال کو آپس میں باطل کی راہ سے نہ کھاؤ بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کے راستہ سے نفع حاصل کرو۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

---

(۱) سورة الجمعة آیت ۶۲۔

(۲) سورة النساء آیت ۲۹۔

﴿یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَنفِقُوْا مِنْ طَیِّبَاتِ مَا کَسَبْتُمْ﴾[۱]

اے ایمان والو! تم خرچ کرو ان پاک چیزوں میں سے جو تم نے کمائی ہیں۔

مشہور تابعی مفسر مجاہد آیت کے جملہ ,,ما کسبتم،، کی تفسیر میں کسب سے مراد تجارت لیتے ہیں[۲]۔

ان آیات کے علاوہ اور بہت سی آیات میں تجارت وصنعت اور کسب حلال کے فوائد اور فضائل آئے ہیں جن میں سے خصوصاً درج ذیل آیات کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

سورۃ البقرۃ آیت: ۱۹۸، ۲۷۵، ۲۸۲، سورۃ النساء آیت: ۳۲، سورۃ بنی اسرائیل آیت: ۱۲، ۶۶، سورۃ القصص آیت ۷۳، سورۃ الروم آیت ۲۳ و ۴۶۔

چونکہ وسائل معیشت میں ایک بہت اہم وسیلہ تجارت ہے، اس لئے اس کے ذرائع کی توسیع بھی اقتصادی نظام کا ایک عظیم جزو ہے، چنانچہ فقہائے امت فرماتے ہیں:

,,فالبیع والشراء من أکبر الوسائل الباعثة علی العمل فی هذه الحیاة الدنیا وأجل أسباب الحضارة والعمران،،[۳]

تجارت نہ صرف اقتصادی نظام کا ایک جزو ہے بلکہ انفرادی طور پر بھی یہ ایک باعزت اور باوقار پیشہ ہے، اس پیشہ کی فضیلت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم ﷺ خود نبوت سے پہلے بارہ سال تک تجارت کرتے رہے، علاوہ ازیں آپ ﷺ نے تجارت کی ترغیب بھی دی:

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۲۶۷۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: بیهقی، احمد بن حسین البیهقی ۴۵۸ھ، السنن الکبری، دارالخلفا الکتہ الاسلامی، ملتان، نشر السنۃ، کویت۔ کتاب البیوع/ جلد:۵۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: جزائری، عبد الرحمن الجزائری، کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعه، لاهور، محکمه اوقاف ۱۹۷۱ء، (۲/۲)

,,علیکم بالتجارة فإن فیها تسعة أعشار الرزق،،[۱]

تجارت کی طرف توجہ کرو، کیونکہ رزق کا نو بٹا دس حصہ تجارت میں ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت ساری احادیث سے تجارت کی فضیلت پتہ چلتی ہے، اکثر بڑے بڑے صحابہ کرامؓ کا بھی یہی مشغلہ رہا ہے، اور صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین، علماء و فقہاء نے بھی یہ پیشہ اپنایا اور مسلمانوں نے اس میدان میں خوب ترقی کی، اور اس میں نیک نامی پیدا کی۔

تجارت کا پیشہ اگر اسلامی حدود کے اندر رہ کر اختیار کیا جائے تو دنیا میں فراوانی رزق کے علاوہ اخروی زندگی میں درجات کی بلندی اور ثواب کے حصول کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,التاجر الصدوق الأمین مع النبیین والصدیقین والشهداء،،[۲]

سچے امانت دار تاجر کا حشر قیامت کے روز انبیاء کرام صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔

کنز العمال کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص تجارت کرتا ہے اس کے یہاں خیر و برکت اور خوشحالی پیدا ہوتی ہے[۳]۔

(۱) کنز العمال: ۹۳۴۲، سنن سعید بن منصور عن نعیم بن عبد الرحمن۔

(۲) ترمذی، أبو عیسیٰ محمد بن عیسی بن سورة الترمذی (۱۱۹۸-۱۲۵۲) جامع السنن، دار الفکر بیروت، البیوع /رقم الحدیث: (۱۱۳۰)۔

الدارمی، (عبد اللّٰه بن عبد الرحمن ۲۵۵ھ)، سنن الدارمی، المدینة المنورة، رقم :(۲۴۲۷)۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: کنز العمال(علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الهندی البرهانفوری) ,,کنز العمال فی سنن الأقوال والإفعال،، ۵۸۷ھ مؤسسة الرسالة، الفصل الثالث/ فی أنواع الکسب وآدابه۔
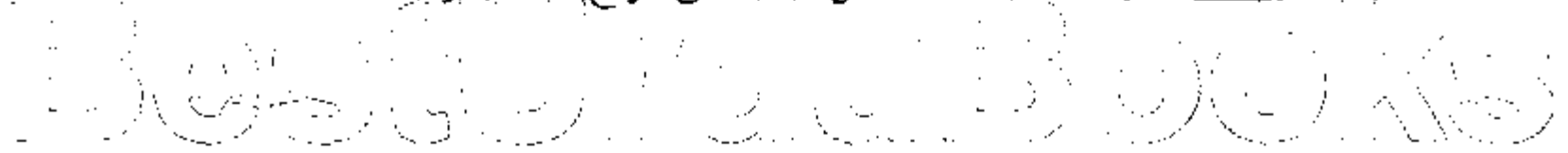
کسب حلال کی اتنی زیادہ فضیلت وارد ہوئی ہے کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,من قتل دون ماله فهو شهيد،،(۱)

جو شخص مال کے پیچھے (کسب حلال کی خاطر) قتل کر دیا گیا وہ شہید ہے۔

ان تمام حوالوں سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ حلال رزق کی تلاش کی کس قدر فضیلت ہے، البتہ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ اگر کوئی شخص خدانخواستہ رزق کمانے میں ان طریقوں کو اختیار کرے جسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے تو ایسی تجارت ثواب کے بجائے وبال بن جاتی ہے، ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,التجار يحشرون يوم القيامة فجارا إلا من اتقى وبر وصدق،،(۲)

تاجر لوگ قیامت کے دن گناہ گاروں کی حیثیت سے اٹھائے جائیں گے، مگر جس نے تقویٰ (پرہیزگاری) نیکی اور سچائی اختیار کی۔

ان تمام حوالہ جات سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اسلام کا منشا یہ ہے کہ مال اور سرمایہ کو فالتو پڑا رکھنے کے بجائے

(۱) بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعيل البخاری)، الصحيح البخاری، المسمى بالجامع الصحيح، المظالم والغصب/ رقم الحديث: (۲۳۰۰)۔

صحيح مسلم (أبو الحسين مسلم بن الحجاج القشيری)، الإيمان/رقم الحديث: (۲۰۲)۔

ترمذی، (أبو عيسىٰ محمد بن عيسى بن سورة الترمذی ۱۱۹۸-۱۲۵۲)جامع السنن، دار الفكر بيروت الديات/رقم الحديث:(۱۳۳۹)۔

(۲) ترمذی، (أبو عيسىٰ محمد بن عيسى بن سورة الترمذی ۱۱۹۸-۱۲۵۲)جامع السنن، دار الفكر بيروت البيوع /رقم الحديث: (۱۱۳۱)۔

ابن ماجه (عبد الله محمد بن يزيد القزوينی ابن ماجه) سنن ابن ماجه مع التحقيق الترقيم لمحمد فواد عبد الباقی ۸۹۷ء مكتبه اسلاميه كوئٹه التجارات/ رقم الحديث:(۱۲۳۷)۔

اس سے جائز طریقوں سے تجارت کی جائے، جو نہ صرف اپنے لئے دنیاوی لحاظ سے نفع بخش ہے بلکہ اخروی لحاظ سے بھی مفید اور باعث اجر ہے، کیونکہ اگر اسے فالتو پڑا رہنے دیا جائے اور اسے تجارت میں استعمال نہ کیا جائے، تو وہ رقم ضروریات اور حقوق وواجبات کی ادائیگی کرتے کرتے ہی ختم ہو جائے گی، جیسا کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

ألا من ولی یتیما له مال فلیتجر فیه ولا یترك حتی تأكله الصدقه[1]۔

سنو! جو شخص ایسے یتیم کا ولی بنے جس کے پاس کوئی مال ہو، تو اس ولی کو چاہیے کہ اس میں تجارت کرے اور اسے یوں ہی فالتو نہ چھوڑے کہ اسے صدقہ کھا جائے۔

اسی وجہ سے روز مرہ ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اور شرعی حقوق وواجبات کی ادائیگی کے بعد بچ رہنے والی آمدنی یا دولت کو یونہی بیکار پڑا نہیں رہنے دینا چاہیے، بلکہ اسے تجارت وصنعت میں استعمال کرنا چاہیے، کیونکہ دولت یا فائدہ بہم پہنچانے والے دوسرے پیداواری وسائل کو غیر مستعمل شکل میں پڑے رہنے دینا یا انہیں ذخیرہ اندوزی کے مقصد سے رکھ چھوڑنا اور انہیں مزید پیدائش دولت کے لئے استعمال نہ کرنا نہ صرف اقتصادی اور معاشی لحاظ سے ناپسندیدہ بات ہے بلکہ اسلام نے بھی اسکی ممانعت فرمائی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام میں بچتوں کو استعمال کرنے کے مختلف طریقے

بچت کرنا جس طرح ملک کی ترقی کا باعث بنتا ہے، خود اپنی ذات اور اپنے مستقبل کی خوشحالی کا سبب بن جاتا ہے، وہ لوگ جو اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اپنی آمدنیوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور پس انداز اور جمع کرتے چلے جاتے ہیں، تاکہ مستقبل کے غیر متوقع حالات کا سامنا کرنے میں مدد مل سکے، لہذا انکی افراد اپنی بچتوں کی بدولت اپنی آمدنی کو بڑھانے، مستقبل کی ناگہانی اور غیر متوقع ضروریات کو پورا کرنے، پائیدار اشیائے

(۱) جامع الترمذی (أبو عیسیٰ محمد بن عیسی بن سورة الترمذی) حدیث:(۵۸۰)، من موسوعة الحدیث، الزکاة، رقم الحدیث: (۵۸۰)۔

صرف خریدنے، بڑھاپے اور بیماری کے تقاضوں کو پورا کرنے اور اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے مقاصد کی تکمیل چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ لوگ عموماً اپنی روز مرہ کی ضروریات پوری کرنے کے بعد بچ جانے والی آمدنی کو مختلف طریقوں سے مختلف جگہوں پر لگا دیتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام میں اپنی بچتوں کے استعمال کرنے کے مختلف طریقے ہیں، جنہیں ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ سودی قرضے:

بعض لوگ اپنے پیسے کسی بینک یا پوسٹ آفس کے سیونگ اکاؤنٹ میں جمع کرا دیتے ہیں یا بعض اوقات وہ لوگ اپنی بچتوں کو کسی حاجتمند یا تاجر کو قرض دیدیتے ہیں، اور پھر قرض کے بدلہ ایک معین شرح سے سود لیتے ہیں۔

۲۔ سودی دستاویزات:

بعض لوگ اپنی بچتوں کو اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ ان کے ذریعے سیونگ سرٹیفکیٹ، تمسکات، بانڈز وغیرہ خرید لیتے ہیں۔

۳۔ مشترک سرمائے کی کمپنیاں:

بعض افراد اپنی بچتوں کو مشترک سرمائے کی کمپنیوں (Joint stock companies) کے حصص (Shares) خرید کر استعمال میں لاتے ہیں، اور وہ کمپنیاں مختلف کاروبار کرتی ہیں، جن کے کل نفع کو حصہ داروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، بعض حضرات کسی انشورنس کمپنی کی انشورنس پالیسی خرید کر بچت کا مقصد پورا کرتے ہیں۔ نجی افراد کی طرح کاروباری فرمیں بھی بچت کرتی ہیں، یہ بچتیں قابل تقسیم منافع جات (Divedends) سے عمل میں لائی جاتی ہیں۔

ان طریقوں پر شرعی نقطہ نظر سے تنقید:

مندرجہ بالا تین طریقوں میں سے تیسرا طریقہ مشترک سرمائے کی کمپنیوں کے ذریعے بچت کرنے کا طریقہ ہے، بچت کا یہ طریقہ اختیار کرنا بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے، جس کی مکمل تفصیل (ان شاء اللہ) تیسرے باب میں جائنٹ اسٹاک (Joint stock company) کمپنی کے شرعی حکم کے ذیل میں ذکر کی جائے گی۔

البتہ بقیہ دو طریقے سودی قرضے اور سودی دستاویزات کے ہیں۔ سودی قرضے سے ہماری مراد بینک ڈیپازٹس (بینک کی امانتیں یا کھاتے) ہیں، اور سودی دستاویزات سے مراد سودی سرٹیفکیٹس، تمسکات یعنی بانڈز، ڈبینچرز وغیرہ ہیں، یہ دونوں طریقے سودی کاروبار اور سودی قرضوں پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہیں، اور سود کے بارے میں قرآن وحدیث کی شدید وعیدوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی مسلمان کو انہیں اختیار کرنے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے، اس کے بجائے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کوئی ایسا شرعی متبادل طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو سود اور سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں سے پاک ہو، زیر نظر مقالے میں اس کے لئے مشارکہ کا طریقہ تجویز کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان دونوں طریقوں کے ناجائز ہونے کی تفصیلی وجہ ذکر کرنے کے ساتھ مشارکہ کی بنیاد پر ان کا شرعی متبادل نظام بیان کریں، یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سود کا مفہوم اور اسکی حرمت سے متعلق شرعی احکام ذکر کئے جائیں، تاکہ ان کی روشنی میں سودی ڈیپازٹس اور سودی سرٹیفکیٹس کے ناجائز ہونے کی وجہ اور پھر ان کا شرعی متبادل نظام سمجھنا آسان ہو جائے، چنانچہ اس مقصد سے اب آگے سود سے متعلق شریعت کے احکام ذکر کئے جائیں گے۔

سود کے بارے میں قرآن وسنت کے احکام

سرمایہ کاری کی ایک صورت جو غیر اسلامی معاشروں میں عرصہ دراز سے پائی جاتی ہے وہ سودی کاروبار ہے، کاروبار کی اس صورت میں ایک سرمایہ کار اپنا سرمایہ بطور قرض مہیا کرتا ہے، اور دوسرا اپنی محنت۔ کاروبار میں نفع ہو یا نقصان سرمایہ کار کا اس سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا، اسے دونوں صورتوں میں ایک مخصوص معینہ شرح کے مطابق اپنے سرمائے پر سود حاصل ہو جاتا ہے، اسلام نے اس قسم کے کاروبار کو حرام اور ممنوع قرار دیا ہے، زیر نظر مقالہ میں افادیت کے پیش نظر سود کے بارے میں قرآن وسنت کے احکام ذکر کئے جائیں گے، جن کے تحت مندرجہ ذیل امور زیر بحث آئیں گے:

۱۔ اسلام کا اقتصادی فلسفہ اور سود

۲۔ ربا اور سود کا مفہوم

۳۔ ربا کی تعریف، سود اور ربا میں فرق

۴۔ ربا کی قسمیں، ربا النسیئہ، ربا الفضل

۵۔ تجارتی سود، صرفی سود

۶۔ سود مفرد، سود مرکب

۷۔ سود کی ممانعت قرآن وحدیث کی روشنی میں

۸۔ سود کی ممانعت کے عقلی دلائل

۹۔ ربا اور انٹرسٹ کے درمیان فرق اور مشارکہ، مضاربہ کے بنیاد پر انٹرسٹ کا متبادل نظام۔

اسلام کا اقتصادی فلسفہ اور سود:

دور حاضر کے سرمایہ داری نظام میں سود کے عنصر کو بے حد اہمیت حاصل ہے، لیکن اسلام کے اقتصادی فلسفہ میں سود کیلئے کوئی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ اسلام کے اقتصادی فلسفہ کی رو سے سود وہ لعنت ہے جو دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے اور اس کے لازمی نتیجہ میں اجارہ داریاں قائم کرنے، معاشرے میں خود غرضی لالچ اور ظلم وستم کی راہیں کھولنے کی حوصلہ افزائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے، کاروباری اور تجارتی دنیا میں ہر قسم کی زیادتی اور بددیانتی کو خوب پھلنے پھولنے کا موقعہ ملتا ہے، اسلام چونکہ عالمگیر اخوت، اجتماعی فلاح و بہبود اور سماجی عدل وانصاف جیسی اعلیٰ ترین اخلاقی قدروں کو فروغ دینے کا خواہاں ہے، اس لئے اس نے سود کو حرام قرار دیتے ہوئے ہر قسم کے سودی لین دین کی سختی سے ممانعت کی ہے۔

ابتدائے عالم انسانی سے ہمیشہ دو نظریئے کار فرما رہے ہیں، ایک عادلانہ نظام کا نظریہ اور دوسرا سرمایہ دارانہ نظام کا نظریہ، پہلے نظریہ کا مطالبہ ہے کہ انسانوں میں ایک ایسا اجتماعی نظام قائم ہو جس میں نہ بڑے بڑے سرمایہ دار ہوں اور نہ مفلس و محتاج طبقے، بلکہ ایک طرح کی درمیانی حالت ہو، جسمیں معیشت کے درجات کا فطری تفاوت اگرچہ موجود ہو لیکن حقِ معیشت کی مساوات ضرور قائم رہے وہ اس کا طالب نہیں ہے کہ سب کی معیشت کے سامان ایک ہی طرح کے

ہوں، لیکن اسکا ضرور خواہشمند ہے کہ سب کو حسب ضرورت ملے اور ترقی و سعی کے راہیں سب پر یکساں طور پر کھلی ہوں۔

حق اور خدا کے فرستادہ سچے مذاہب اسی نظریہ کے داعی رہے ہیں اور اسلام نے اسی نظریہ کو کامل اور مکمل نقشہ کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

دوسرے نظریہ کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کے کارخانے میں قدرت کے ہاتھوں نے معاشی نقطہ نظر سے انسانی مخلوق کو دو حصوں پر تقسیم کیا ہے، کچھ خدائی اور آقائی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور کچھ بندگی اور محکومی کیلئے، اسی طرح قدرت کا یہ منشا ہے کہ بعض انسانی گروہ دولت وثروت کے مستقل اجارہ دار ہوں، جائز اور ناجائز طریقوں سے دولت فراہم کریں اور خدا کی عطا کردہ نعمتیں صرف اپنے ہی لئے مخصوص کرلیں، اور بعض طبقے مفلسی، محتاجی اور غربت کی وجہ سے ہمیشہ مجبور ومقہور رہیں، اور تفاوتِ درجات کے اس ہولناک فرق کو اعتدال پر لانے کا کسی کو بھی حق نہ ہو، یہ نظریہ طاغوتیوں اور شیاطین وکفار کا ہے اور ان کے اس نظریہ کی عملی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ سود ہے، جو مہذب اور غیر مہذب شکلوں میں بڑے بڑے گروہوں اور جماعتوں کا خون چوس کر ایک چھوٹی جماعت کو قارون کا خزانہ بخشتا ہے، اور خدا کی مخلوق میں سے ایک کو دوسرے کا محکوم بناتا ہے۔

بہر حال سود ہمیشہ سے سرمایہ داری کا بہت بڑا پشت پناہ رہا ہے، اسکی مندرجہ بالا خرابیوں کے پیش نظر اسلام نے اسکی ممانعت کی ہے، اور اس کے احکام بیان فرمائے ہیں، ان کو سمجھنے سے قبل سود کا مفہوم اور اسکی تعریف سمجھنا ضروری ہے۔

ربوا:

ربوا کا تلفظ ربا کیا جاتا ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں "زیادتی" اور فارسی اور اردو میں اس کا اصطلاحی ترجمہ "سود" کیا جاتا ہے، اور انگریزی زبان میں اس کا اصطلاحی ترجمہ انٹرسٹ(Intrest) یا(Usury) کیا گیا ہے، اسے ربوا اور ربا دونوں طرح لکھا جا سکتا ہے[1]، قرآن میں بھی یہ دونوں رسم الخط استعمال ہوئے ہیں، الربوا (البقرۃ: ۲۷۵) اور ربا

(۱) الرازی، (امام رازی محمد بن عمر ٦٠٦ھ)تفسیر مفاتیح الغیب (۲: ۳۵۱) حسینیہ مصر، بحوالہ اردو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب، ربوا:(۱۷۰)۔

(الروم:۳۹)۔

اسلامی کتب میں لفظ ربا کا استعمال پانچ قسم کے معاملات پر کیا گیا ہے، ایک سودی قرض کے لین دین پر، چنانچہ دیکھئے سورہ البقرۃ آیت:۲۷۵، دوسرے ربا الفضل پر جسکی تشریح آگے آئیگی، تیسرے بعض مرتبہ خرید و فروخت کے ناجائز معاملے پر بھی "ربا" کا اطلاق کردیا جاتا ہے[1]، اور بعض مفسرین نے سورہ نساء کی آیت ۱۶۱: ﴿وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ﴾ کو بھی اسی معنی پر محمول کیا ہے[2]، چوتھے یہ لفظ نیوتہ یعنی جوابی تحفہ کے لالچ میں کسی کو تحفہ دینے میں بھی استعمال ہوا ہے، اکثر مفسرین کے نزدیک ﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ﴾ (الروم:۳۹) میں یہی معنی مراد لئے گئے ہیں[3]، اور پانچویں کبھی ہر ناجائز اور حرام کام کے لئے بھی "ربا" کا لفظ مستعار لے لیا گیا ہے، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ,,إن أربى الربا استطالة الرجل فی عرض أخيه،، یعنی سب سے بڑا ربا یہ ہے کہ ایک شخص اپنے بھائی کی آبرو پر دست درازی کرے[4]۔

مندرجہ بالا معنوں میں سے آخری تین معنی میں اس لفظ کا استعمال مجازی بھی ہے، اور شاذ و نادر بھی، خالص علمی اور فقہی اصطلاح کے طور پر پہلے دو معنی ہی مراد لئے جاتے ہیں، چنانچہ اس مقالے میں "ربوا" سے یہی دو مفہوم مراد ہوں گے، اور ان دونوں قسموں (یعنی ربا النسیئہ اور ربا الفضل) سے الگ الگ عنوانات کے تحت بحث کی جائیگی۔

سود کا مفہوم:

قرآن کریم میں سود کیلئے ربوا کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے لغوی معنی اضافہ، زیادتی اور نمو کے ہیں، سود اردو زبان کا لفظ ہے، جسکا مفہوم یہ ہے کہ ایک مخصوص رقم جو ایک مقروض اپنے قرض خواہ کو اس سے حاصل کئے گئے قرضہ

---

(۱) العسقلانی، (احمد بن علی ۸۵۲ھ)فتح الباری مصر،المطبعة البهيه المصريه ۱۳۴۸ھ، (۴: ۵۰)۔

(۲) القرطبی، الجامع لأحکام القرآن مصر ۱۹۳۶ء، (۳: ۳۴۸)۔

(۳) ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ)، جامع البیان مصر، بیروت دار الفکر ۱۴۰۵ھ (۲۱: ۲۷)۔

(۴) علی المتقی، (علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الهندی البرهانفوری) کنز العمال دائرة المعارف دکن ۱۳۱۲ھ، (۲: ۲۱۴،حدیث:۴۰۱۳۲)۔

کے عوض میں ایک مخصوص مدت کے بعد ادا کرے۔

سود اور ربا میں فرق:

قرآن کریم میں جس چیز کو ربا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اسکا ترجمہ اردو زبان کی تنگ دامنی کی وجہ سے عموماً لفظ سود سے کیا جاتا ہے، اور جسکی وجہ سے عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ربا اور سود عربی اور اردو زبان میں ایک ہی چیز کے دو نام ہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے، بلکہ ربا ایک عام اور وسیع مفہوم رکھتا ہے، مروجہ سود بھی اسی کی ایک قسم یا فرد کی حیثیت میں ہے، مروجہ سود متعین مقدار روپیہ، متعین مدت کیلئے ادھار دے کر متعین شرح کے ساتھ نفع یا زیادتی لینے کا نام ہے، اور بلاشبہ یہ بھی ربوا کی تعریف میں داخل ہے، مگر ربوا اسمیں منحصر نہیں ہے، بلکہ اس کا مفہوم اس سے بھی زیادہ وسیع ہے، چناچہ اسمیں ایسے بہت سے خرید و فروخت کے معاملات بھی شامل ہیں جسمیں ادھار کا کوئی لین دین نہیں ہے۔

زمانہ جاہلیت (یعنی اسلام سے پہلے کا زمانہ) میں بھی عموماً ربا صرف اسی کو کہتے اور سمجھتے تھے جس کو آج سود کہا جاتا ہے، یعنی ادھار پر متعین شرح سے زیادتی یا نفع لینا، رسول اللہ ﷺ نے ربا کے معنی کی وسعت بیان فرما کر ایسی بہت سی صورتوں کو بھی ربا میں شامل فرمادیا جن میں ادھار کا معاملہ نہیں ہے۔

ربا کی اصطلاحی تعریف:

ربوا کے معنی لغت کے اعتبار سے زیادتی، بڑھوتری اور بلندی کے آتے ہیں، اور اصطلاحِ شریعت میں ایسی زیادتی کو ربا کہتے ہیں جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے۔

ابن عربی احکام القرآن میں فرماتے ہیں:

"الربا فی اللغة الزیادة، والمراد فی الآیة کل زیادة لا یقابلها عوض"[1]

یعنی ربا لغت میں اضافہ کو کہتے ہیں، اور آیتِ قرآنی میں اس سے مراد ہر وہ اضافہ ہے جو بلا معاوضہ ہو۔

---

(۱) ابن العربی، (محمد بن عبد الله ۵۴۳ھ)، احکام القرآن، مکتبة السعاده مصر ۱۳۱۹ھ بحوالہ مسئلہ سود، مصنفہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

ربوا کی یہ اصطلاحی تعریف اپنی دونوں قسموں یعنی ربوا الفضل اور ربوا النسیئہ کو شامل ہے، کیونکہ ایسا اضافہ یا زیادتی جو بغیر کسی مالی معاوضہ کے حاصل کی جائے اس میں وہ اضافہ یا زیادتی بھی شامل ہے جو روپے کو ادھار دینے پر حاصل کیا جائے، کیونکہ مال کے معاوضہ میں تو راس المال (سرمایہ) پورا واپس مل جاتا ہے، اور جو اضافہ بنام سود یا انٹرسٹ لیا جاتا ہے وہ بے معاوضہ ہے اور یہی ربوا النسیئہ یا ربوا القرآن کہلاتا ہے، اور خرید و فروخت کی وہ صورتیں بھی اس اضافہ یا زیادتی میں شامل ہیں جن میں کوئی زیادتی بلا معاوضہ حاصل کی جائے جس کی تفصیل آگے ربا الفضل کے بیان میں انشاء اللہ آئے گی، مگر دور جاہلیت میں ربا کا لفظ صرف پہلی قسم کے لئے استعمال ہوتا تھا، دوسری قسم یعنی ربوا الفضل کو ربا نہیں کہا جاتا تھا، اور لوگ اسے ربا میں داخل نہیں سمجھتے تھے، لیکن حضور اکرم ﷺ نے اس دوسری قسم کو بھی ربوا میں شامل فرمایا تھا۔

خلاصہ یہ کہ ربوا سے مراد ایسا اضافہ یا زیادتی ہے جو بلا معاوضہ ہو، اس معنی کی تصریح خود قرآن کریم میں بھی کردی گئی ہے:

۱۔ ﴿وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (......) وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ﴾ (۱)

اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر رہ گیا ہے اس کو چھوڑ دو (......) اور اگر تم توبہ کرلو تو تمہیں اپنے رأس المال (یعنی اصل رقم) لینے کا حق ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ اصل رقم پر جو زیادتی بھی ہوگی وہ ربوا کہلائیگی، لیکن قرآن مجید نے مطلق ہر زیادتی کو حرام نہیں کیا۔ زیادتی تو تجارت میں بھی ہوتی ہے، قرآن جس زیادتی کو حرام قرار دیتا ہے وہ ایک خاص قسم کی زیادتی ہے، اس لئے وہ اس کو ربوا کے نام سے تعبیر کرتا ہے، دور جاہلیت میں اہل عرب ربوا کو بھی ایک قسم کی بیع سمجھتے تھے، جسطرح آج کل اسکو سمجھا جاتا ہے، اسلام نے آکر بتایا کہ راس المال میں جو زیادتی بیع سے ہوتی ہے وہ اس زیادتی سے مختلف ہے جو ربوا سے ہوا کرتی ہے، پہلی قسم کی زیادتی حلال ہے اور دوسری قسم کی زیادتی حرام۔

﴿ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾ (۲)

(۱) سورة البقرة آیت: (۲۷۸-۲۷۹)

(۲) سورة البقرة آیت: (۲۷۵)

سود خواروں کا یہ حشر اسلئے ہوگا کہ انہوں نے کہا کہ بیع بھی ربوا کے مانند ہے،
حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال اور ربوا کو حرام کیا۔

ربا کی اقسام

ربوا کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ ربوا کی پہلی قسم کو ربا النسیئہ یا ربا الجاہلیہ کہا جاتا ہے۔

۲۔ ربوا کی دوسری قسم کو ربا الفضل، ربا النقد یا ربا البیع کے ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے۔

چونکہ پہلی قسم حضور ﷺ کے ارشاد سے قبل خود الفاظِ قرآن ہی سے واضح تھی، اسلئے بعض فقہاء نے اسکو ربا القرآن کے نام سے بھی تعبیر کیا ہے، اور دوسری قسم چونکہ صرف الفاظ قرآن سے نہیں سمجھی گئی بلکہ رسول اللہ ﷺ کی سنت یا حدیث سے معلوم ہوئی اسلئے اس کو ,,ربا الحدیث،، بھی کہا گیا ہے، اب ذیل میں ان دونوں قسموں کے احکام قدرے تفصیل سے ذکر کئے جاتے ہیں:

ا۔ ربا النسیئہ:

ربا کی سب سے پہلی اور سب سے اہم قسم ,,ربا النسیئہ" (قرض کا سود) ہے اور چونکہ قرآن کریم کی آیات نے براہِ راست ربا کی اسی قسم کو ممنوع قرار دیا ہے، اسلئے اسے ,,ربا القرآن" بھی کہتے ہیں، اور زمانہ جاہلیت میں بھی اسی قسم کو ربا سمجھا جاتا تھا، اسلئے اسکا ایک نام ربا الجاہلیۃ بھی ہے، امام ابو بکر جصاص رازیؒ نے اسکی جامع ومانع قانونی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

,,هو القرض المشروط فيه الأجل وزيادة مال على المستقرض"
یعنی قرض کا وہ معاملہ جسمیں ایک مخصوص مدت ادائیگی اور قرضدار پر مال کی کوئی زیادتی معین کرلی گئی ہو[1]۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الجصاص، (احمد بن علی ۳۷۰ھ)، احکام القرآن مصر ۱۳۴۷ھ (۱:۵۵۷) مطبع لاہور سہیل اکیڈمی۔

ایک حدیث میں بھی ربا النسیہ کی قریب قریب یہی تعریف منقول ہے، حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

,,کل قرض جرّ منفعةً فهو ربوا" [1]
یعنی ہر ایسا قرض جو نفع لیکر آئے وہ ربا ہے۔

علامہ عبدالرؤف مناویؒ اس حدیث کو سند کے اعتبار سے ضعیف کہتے ہیں [2]، مگر چونکہ یہ متعدد اسناد سے مروی ہے اسلئے علامہ عزیزی نے اسے "حسن لغیرہ" قرار دیا ہے [3]۔

مشہور صحابی حضرت فضالہ بن عبیدؓ سے بھی ربا کی یہی تعریف منقول ہے:

,,کل قرض جر منفعةً فهو وجهٌ من وجوه الربا" [4]
یعنی ہر ایسا قرض جو نفع کھینچے وہ ربا کی صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔

لغت عرب کے مشہور عالم ابو اسحاق الزجاج بھی ربا کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ:

کل قرض یؤخذ به أكثر منه [5]۔
یعنی قرض جس میں اس سے زیادہ لیا جائے۔

ربا النسیہ کی حرمت ان مسائل میں سے ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی معروف شریعتوں میں مسلّم رہے ہیں، عہد

---

(۱) السیوطی:(عبد الرحمن بن ابی بکر ۹۱۱ھ) الجامع الصغیر مصر، مکتبة مصطفی البابی الحلبی ۱۳۵۸ھ، (۱:۹٤) حدیث (٦٣٣٦)۔ بحوالہ مسئلہ سود، مصنفہ حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

(۲) المناوی، فیض القدیر، مصر ۱۳۵٦ھ،(۵:۲۸)۔ بحوالہ بالا

(۳) العزیزی، السراج المنیر، مصر ۱۳۲۵ھ (۳:۸٦)۔ بحوالہ بالا

(٤) بیهقی، احمد بن حسین البیهقی ٤۵۸ھ، السنن الكبرى، ملتان، نشر السنة۔ (۵:۳۵۰)۔ بحوالہ بالا

(۵) تاج العروس (محب الدین أبو الفیض السید محمد مرتضی الحسینی الواسطی الزبیدی ۵۰۷ھ) الخیریه مصر ماده ربوا۔ بحوالہ بالا

قدیم کے کئی صحیفوں میں ربا کو حرام قرار دیا گیا ہے، (ملاحظہ ہو خروج ۲۲: ۲۵ واحبار، ۲۵: ۳۵، ۳۶، واستثناء ۲۳: ۲۰، وزبور، ۱۵: ۵ وامثال ۲۸: ۸، ونحمیاہ ۵: ۷ وحزقی ایل ۱۸: ۸، ۱۳، ۱۷، ۲۲: ۱۲) قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پر ربا کی حرمت بیان کی ہے، اسے اللہ کے ساتھ جنگ کے مترادف قرار دیا ہے اور بیسیوں احادیث میں سود کا لین دین کرنے والے، اس معاملے کو لکھنے والے اور اس پر گواہ بننے والے کے بارے سخت وعیدیں بیان کی گئی ہیں، ان آیات اور احادیث کا بیان آگے ,,سود کی ممانعت قرآن وحدیث کی روشنی میں" کے عنوان کے ذیل میں کیا جائیگا۔

ربا النسیہ کی جو تعریف اوپر بیان کی گئی ہے اسکی رو سے قرض کے بدلے میں ہر اضافہ یا زائد رقم جو معاہدہ طے کر کے لی اور دی جائے سود میں داخل ہے، خواہ اسکی شرح کم ہو یا زیادہ، اوپر جو حدیث علامہ سیوطی کے حوالے سے بیان کی گئی ہے اسمیں ,,معاہدہ طے کرنے" کی صریح قید نہیں ہے، لیکن دوسری احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کئی واقعات میں قرض لے کر ادائیگی کے وقت کچھ زیادہ عطا فرمایا[1]۔ لیکن چونکہ یہ اضافہ معاہدے میں طے شدہ نہ تھا، اس لئے اسے ,,ربا" نہیں کہا جاسکتا[2]، اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ,,کل قرض جرّ منفعۃً،، والی حدیث میں ,,جرّ" کا لفظ معاہدہ قرض میں طے کر کے زائد رقم کا لین دین کرنے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے لایا گیا ہے، اس بناء پر امام ابو بکر جصاصؒ نے تعریف میں ,,المشروط" کا لفظ بڑھا دیا ہے۔

۲۔ ربا الفضل:

ربا کی دوسری اہم قسم ,,ربا الفضل" ہے، اور چونکہ ربا کی اس قسم کی حرمت سنت سے ثابت ہے اسلئے اسے ربا الفضل یا ربا الحدیث بھی کہتے ہیں، ربا الفضل دراصل اس اضافے کو کہا جاتا ہے جو کچھ مخصوص اجناس کے ہم جنس تبادلے پر لی جائے، لیکن وہ مخصوص اجناس کیا ہیں؟ اسکی مکمل قانونی تعریف ہر فقیہ کے یہاں جدا ہے۔

اس اختلاف کا اصل سبب یہ ہے کہ جس حدیث کے ذریعے حضور اکرم ﷺ نے ربا الفضل کو حرام قرار دیا اس

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: مسلم، (أبو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری) صحیح مسلم (۲: ۳۰) اصح المطابع دھلی۔

(۲) النووی، (الحافظ أبو زکریامحی الدین بن شرف النووی) شرح صحیح مسلم، دھلی (۲: ۳۰)۔

کے الفاظ یہ ہیں:

,,الذهب بالذهب مثلاً بمثلٍ، والفضة بالفضة مثلاً بمثلٍ، والتمر بالتمر مثلاً بمثلٍ، والبر بالبر مثلاً بمثلٍ، والملح بالملح مثلاً بمثلٍ، والشعير بالشعير مثلاً بمثلٍ فمن زاد أو أزداد فقد أربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يداً بيدٍ، وبيعو الشعير بالتمر كيف شئتم يداً بيدٍ"[1]۔

یعنی سونے کو سونے کے بدلے میں برابر سرابر بیچو، چاندی کو چاندی کے بدلے برابر سرابر بیچو، کھجور کو کھجور کے عوض برابر سرابر فروخت کرو، گندم کو گندم کے بدلے برابر سرابر بیچو، نمک کو نمک کے بدلے برابر سرابر بیچو، جو کو جو کے بدلے برابر سرابر بیچو، لیکن جو شخص اضافے کا لین دین کرے وہ ربا کا معاملہ کرے گا، البتہ سونے کو چاندی کے بدلے جس طرح چاہے فروخت کرو، بشرطیکہ دست در دست ہو، اور جو کو کھجور کے بدلے جس طرح چاہو فروخت کرو بشرطیکہ دست در دست ہو۔

اس حدیث میں صرف چھ چیزوں کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کا ہم جنس تبادلہ دست بدست اور برابر سرابر ہونا چاہیے، اور کمی اضافہ، یا ادھار خرید و فروخت دونوں ربا ہیں، ان چھ چیزوں کو فقہ میں ,,اموال ربویہ'' کہا جاتا ہے، حدیث میں یہ تفصیل نہیں کہ یہ حکم صرف انہیں چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا کچھ اور اجناس بھی اسی حکم میں داخل ہیں، چنانچہ طاؤس اور قتادہؒ سے منقول ہے کہ وہ ,,ربا الفضل'' کو صرف انہی چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص سمجھتے تھے، باقی فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ کچھ اور اجناس بھی اس حکم میں داخل ہیں، لیکن پھر اس میں اختلاف ہے کہ کون کون سی اجناس اس حکم کے تحت آئیں گی؟ ایسے فقہاء نے یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ان چھ چیزوں میں کونسی چیز مشترک ہے کہ جسے حکم کا دار و مدار یا علت قرار دیا جائے؟

---

(۱) علی المتقی (علاء الدين علی المتقی بن حسام الدين الهندی البرهانفوری)، كنز العمال عدد(٤٦٦٩) بحواله الترمذی۔

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا کہ وہ مشترک چیز ,,کیل ''اور ,,وزن'' ہے، یعنی یہ چیزیں برتن سے ناپ کر یا تول کر فروخت کی جاتی ہیں، لہذا ہر وہ چیز جو کیلی یا وزنی ہو اس کے ہم جنس تبادلے میں کمی بیشی یا ادھار ربوا ہو گا۔

امام شافعیؒ نے قدر مشترک ,,طعم و ثمنیت'' کو سمجھا، یعنی یہ چیزیں یا خوردنی ہیں یا ان میں زر بننے کی فطری صلاحیت پائی جاتی ہے، لہذا ہر اس چیز کا یہی حکم ہو گا جو کھانے کے لائق ہو یا زر (Money) بن سکے۔

امام مالکؒ نے ,,غذائیت اور قابل ذخیرہ اندوزی'' ہونے کو قدر مشترک سمجھا، لہذا یہ کہا کہ جو چیز بھی ,,غذا'' کے کام آتی ہو یا اسے ,,ذخیرہ'' کر کے رکھا جا سکے، وہ اموال ربویہ میں داخل ہو گی۔

امام احمدؒ سے اس معاملے میں تین اقوال مروی ہیں:

(الف)، ایک قول امام ابو حنیفہؒ کے موافق ہے۔

(ب)، دوسرا قول امام شافعیؒ کے مطابق ہے۔

(ج)، تیسرا قول یہ ہے کہ سونے چاندی کے علاوہ دوسری چیزوں میں سے صرف وہ اشیاء اموال ربویہ میں شامل ہوں گی جن میں ,,طعم'' (خوردنی ہونا) اور ,,کیل'' (برتن سے ناپ کر بیچا جانا) یا ,,وزن'' (تول کر بیچا جانا) کی صفت بیک وقت پائی جاتی ہو[1]۔

ربا الفضل کی حرمت در حقیقت ایک انسدادی نوعیت کا حکم ہے، اہل عرب میں چونکہ اشیاء کے ہم جنس تبادلے کا دستور تھا اور اس میں کمی بیشی رائج تھی، اور خطرہ تھا کہ یہ چیز ربا النسیہ کے ارتکاب کا پیش خیمہ بنے گی، اسلئے آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرمایا، چنانچہ بعض روایات میں حرمت ,,ربا الفضل'' کے بیان کے ساتھ آپ ﷺ کے یہ الفاظ بھی منقول ہیں: ,,إنی أخاف علیکم الربا[2]'' یعنی مجھے تم پر ربا کا خوف ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ربا الفضل کی حرمت

---

(۱) دیکھئے: ابن قدامہ، (موفق الدین ۶۳۴ھ وشمس الدین ابن قدامہ المقدسی ۶۸۲ھ)، المغنی مع الشرح الکبیر، مصر، (۴:۴)۔

(۲) دیکھئے: علی المتقی (علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الهندی البرهانفوری)، کنز العمال، دکن، ۱۳۱۲ھ (۲:۲۳۱)۔

در حقیقت ربا النسیہ ہی کے مکمل سدِّباب کے پیش نظر کی گئی تھی[1]۔

لیکن بعض صحابہ کرامؓ کو ربا الفضل والی حدیث نہیں پہونچی تھی اسلیئے وہ اسے حرام نہیں سمجھتے تھے، ان میں حضرت عبد اللہ بن عباسؓ زیادہ مشہور ہیں، ان کا استدلال حضرت اسامہ بن زیدؓ کی اس روایت سے تھا کہ: لا ربا إلا فی النسیئه[2]، (یعنی ربا صرف ادھار میں ہوتا ہے) لیکن مستدرک حاکم میں ہے کہ جب حضرت ابو سعید خدریؓ نے انہیں ربا الفضل والی حدیث سنائی تو انہوں نے توبہ واستغفار کر کے اپنے مسلک سے رجوع کر لیا[3]۔

رہی ,,لا ربا إلا فی النسیئة،، والی حدیث تو اس کے بارے میں اکثر فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ یہ برابر سرابر بیع صرف کے بارے میں ہے، یعنی سونے کو سونے یا چاندی کو چاندی کے مقابلے میں برابر سرابر بیچا جارہا ہو تو اس کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ معاملہ صرف اس وقت ربا میں داخل ہوگا جب اس میں ادھار شامل ہو، اور بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ یہاں ربا سے مراد وہ ربا ہے جس پر قرآن پاک نے شدید وعید ذکر کی ہے[4]، گویا ان حضرات کے نزدیک ربا النسیہ کی حرمت شدید تر ہے، اور قرآن کریم کی سخت وعیدیں اسی پر عائد ہوتی ہیں ربا الفضل پر نہیں۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں ابن القیم، (محمد بن ابی بکر الجوزیه ۷۵۱ھ إعلام الموقعین)، دمشق (۲:۱۰۰)۔

(۲) دیکھئے: بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعیل) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح، دهلی ۱۳۵۷ھ (۱:۲۹۱)۔

(۳) دیکھئے: العسقلانی، (احمد بن علی ۸۵۲ھ) فتح الباری مصر، المطبعة البهیه المصریه ۱۳٤۸ھ، (٤:۳۰۳)۔

(٤) حواله بالا۔

ربا الفضل کے متعلق منتخب احادیث

پیچھے یہ بات گذر چکی ہے کہ ربوا الفضل اس زیادتی کو کہتے ہیں جو ایک ہی جنس کی دو چیزوں کے دست بدست لین دین میں ہو، رسول اللہ ﷺ نے اس کو حرام قرار دیا، کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے، اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے، جسکا ثمرہ سود خواری ہے، چنانچہ حضور ﷺ نے خود ہی اس مصلحت کو اس حدیث میں بیان فرمایا ہے جسے حضرت ابو سعید خدریؓ نے ان الفاظ سے نقل کیا ہے:

,,لا تبيعوا الدرهم بدرهمين فإني أخاف عليكم الرما" (والرما هو الربا)(۱)
یعنی ایک درہم کو دو درہموں کے عوض نہ فروخت کرو، کیونکہ مجھے خوف ہے کہ کہیں تم سود خواری میں نہ مبتلا ہو جاؤ۔

ربا کی اس قسم کے بارے میں احکام بیان کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعيروالتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ يدا بيد فمن زاد واستزاد فقد أربى،الآخذ والمعطى فيه سواء،،(۲)
سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے اور گندم گندم کے بدلے، اور نمک نمک کے بدلے میں، اگر لیا اور دیا جائے تو ان کا لین دین برابر برابر دست بدست ہونا چاہیے، اس میں کمی بیشی (یا ادھار) ربوا کے حکم میں ہے، جس کے گناہ میں لینے والا اور دینے والا برابر ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: على المتقى (علاء الدين على المتقى بن حسام الدين الهندى البرهانفورى) كنز العمال، دكن ١٣١٢ه (٢٣١:٢)۔

(۲) مسلم، (أبو الحسين مسلم بن الحجاج القشيرى) صحيح مسلم، رقم الحديث:(٢٩٧١)، المساقاة۔

ربا الفضل کے بارے میں ایک اور حدیث جو بخاری کے سوا تمام صحاح میں آئی ہے، اسمیں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعيروالتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ سواءً بسواءٍ يدًا بيدٍ، فإذا اختلفت هذه الأجناس فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد"[1]

سونے کا مبادلہ سونے سے، چاندی کا مبادلہ چاندی سے، گیہوں کا مبادلہ گیہوں سے، جو کا مبادلہ جو سے، کھجور کا مبادلہ کھجور سے، نمک کا مبادلہ نمک سے، اس طرح ہونا چاہیے کہ برابر برابر اور دست بدست ہو، البتہ اگر یہ جنسیں مختلف ہوں تو جس طرح چاہو فروخت کرو، بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

اور ابوداؤد کی روایت میں ہے:

,,ولابأس ببيع الذهب بالفضة اكثرهما يدا بيدٍ،وأما نسيئة فلا، ولا بأس ببيع البر بالشعير والشعير اكثرهما يدا بيد وأما النسيئه فلا"

اور کوئی حرج نہیں اگر سونے کو چاندی کے عوض بیچا جائے اور چاندی زیادہ ہو، بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو، رہا قرض تو وہ جائز نہیں ہے، اور کوئی حرج نہیں اگر گیہوں کا مبادلہ جو سے ہو اور جو زیادہ ہوں، بشرطیکہ مبادلہ دست بدست ہو جائے، رہا قرض تو وہ جائز نہیں ہے[2]۔

ان احادیث سے جو تمام کتب حدیث میں مختلف عنوانات سے منقول ہیں ایک نئی قسم کا ربا کے حکم میں داخل ہونا

---

(۱) بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعيل) الصحيح البخاری المسمى بالجامع الصحيح، رقم الحديث: (۲۹۷۰)، المساقاة۔

(۲) ابو داؤد، (سليمان بن الأشعث بن اسحاق السجستانی) سنن أبي داؤد، رقم الحديث: (۲۹۰۷)، البيوع۔

معلوم ہوا کہ چھ چیزیں جن کا ذکر اس حدیث میں کیا گیا ہے، اگر ان چیزوں کا باہمی تبادلہ اور بیع کی جائے تو اس میں کمی بیشی کرنا بھی ربوا ہے، اور ادھار کرنا بھی ربا ہے، خواہ اس ادھار میں مقدار کی کوئی زیادتی نہ ہو بلکہ برابر لیا دیا جائے، چونکہ ربا کا مشہور مفہوم قرض دیکر اسپر نفع لینا تھا (جسے ربا کی قسم اول میں ذکر کیا گیا) وہ سب صحابہ کرامؓ نے پہلے ہی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، مگر ربا کی یہ قسم جو حدیث میں بیان کی گئی حضور ﷺ کے بیان سے پہلے کسی کو معلوم نہ تھی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ جیسے امام اور فقیہ صحابی کو بھی شروع میں جب تک حضرت ابو سعید خدریؓ کی اس روایت کا علم نہ تھا جو اوپر نقل کی گئی ہے، تو ربا کی اس قسم کے حرام ہونے کے قائل نہ تھے، (کما رواہ مسلم) پھر جب حضرت ابو سعیدؓ نے یہ روایت حضرت ابن عباسؓ کو سنائی تو انہوں نے اپنے سابقہ فتوے سے رجوع کیا اور اپنی غلطی پر استغفار فرمایا[۱]۔

,,عن ابی سعیدؓ قال، جاء بلال الی النبی ﷺ بتمر برنی، فقال له النبی ﷺ: من أين هذا؟ قال: كان عندنا تمر رديئ فبعت منه صاعين بصاع، فقال: اوّه، عين الربا، عين الربا لا نفعل ولكن إذا أردت أن تشترى فبع التمر ببيع آخر ثم اشتر به''[۲]

ابو سعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ حضرت بلالؓ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں برنی کھجوریں لے کر آئے (جو کھجور کی ایک بہترین قسم ہوتی تھی)، آپ ﷺ نے پوچھا یہ کہاں سے لائے؟ انہوں نے عرض کیا ہمارے پاس گھٹیا

---

(۱) دیکھئے: الشوکانی، (محمد بن علی ۱۲۵۵ھ)، نیل الاوطار، مصر، مکتبۃ مصطفی الباب الحلبی ۱۳۴۷ھ۔
بروایت حاکم، بحوالہ مسئلہ سود ۱۸۔
العسقلانی، (احمد بن علی ۸۵۲ھ)، فتح الباری مصر، المطبعۃ البھیہ المصریہ ۱۳۴۸ھ، فتح الباری، مصر ۱۳۴۸ھ (۳:۴)۔

(۲) بخاری، (أبو عبد اللّٰہ محمد بن اسماعیل) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح رقم الحدیث: (۲۱۴۵)، الوکالۃ۔
مسلم، (أبو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری) صحیح مسلم، رقم الحدیث (۲۹۸۵)، المساقاۃ۔

قسم کی کھجور تھی، میں نے وہ دو صاع دے کر یہ ایک صاع خریدی، فرمایا: ہائیں! قطعی سود، قطعی سود، ایسا ہر گز یہ کیا کرو، جب تمہیں اچھی کھجوریں خریدنی ہوں تو اپنی کھجوریں درہم یا کسی اور چیز کے عوض بیچ دو، پھر اس قیمت سے اچھی کھجوریں خریدلو۔

,,عن أبی سعید وأبی هريرة أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا علی خیبر فجاء ه بتمر جنیب فقال: أ کلُّ تمر خیبر هکذا؟ قال: لا واللّٰه یارسول اللّٰه، إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعین، والصاعین بالثلاثة، فقال: لا تفعل، بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنیبًا۔ وقال فی المیزان مثل ذلك،،[1]

حضرت ابو سعید خدریؓ اور ابو ھریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کا تحصیل دار مقرر کر کے بھیجا، وہ وہاں سے (مالگزاری میں) عمدہ قسم کی کھجوریں لے کر آیا، آنحضرت ﷺ نے پوچھا: کیا خیبر کی ساری کھجوریں ایسی ہی ہوتی ہیں؟ اس نے کہا نہیں یارسول اللہ، ہم جو ملی جلی کھجوریں وصول کرتے ہیں انہیں کبھی دو صاع کے بدلے ایک صاع کے حساب سے اور کبھی تین صاع کے بدلے دو صاع کے حساب سے ان اچھی کھجوروں سے بدل لیا کرتے ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا نہ کرو، پہلے ان مخلوط کھجوروں کو درہموں کے عوض فروخت کرو، پھر اچھی قسم کی کھجوریں درہموں کے عوض خرید لو، یہی بات آپ ﷺ نے وزن کے حساب سے مبادلہ کرنے کی صورت میں بھی ارشاد فرمائی۔

(۱) بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعیل) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح رقم الحدیث: (۲۱۳۸)۔

مسلم، (أبو الحسین مسلم بن الحجاج القشیری) صحیح مسلم، رقم الحدیث:(۲۹۸٤)۔

مذکورہ بالا دونوں احادیث میں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایک ہی جنس کی چیزوں کے باہمی تبادلہ کے وقت کمی بیشی جائز نہیں ہے، چاہے ان میں سے ایک چیز اعلی اور دوسری ادنی نوعیت کی ہو، اور اسمیں اعلی اور گھٹیا ہونے کا کوئی اعتبار نہیں، خواہ دونوں کی قیمتوں میں تفاوت ہو ان کو تبادلہ کے وقت وزن میں برابر سرابر ہونا چاہئے۔

ان دو احادیث سے ایک بات اور یہ بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر سود کے خاتمہ کیلئے کوئی جائز حیلہ تجویز کیا جائے، جس سے معاملہ سود کے بجائے ایک جائز معاملہ بن جائے، تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ شارع اور فقیہ کا یہ بھی کام ہے کہ ایسے مواقع پر ان کیلئے حل تجویز کرے۔

ربا الفضل کے احکام

مذکورہ بالا احادیث کے الفاظ اور معانی پر اور اس بارے میں بقیہ احادیث اور فقہ حنفی کی کتابوں میں ذکر کردہ مسائل پر غور کرنے سے ربا الفضل کے حسب ذیل اصول اور احکام حاصل ہوتے ہیں:

۱:۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک ہی جنس کی دو چیزوں کو بدلنے کی ضرورت اسی وقت پیش آتی ہے جب کہ اتحاد جنس کے باوجود انکی صفات اور نوعیت میں فرق ہو، مثلاً چاول اور گیہوں کی ایک قسم اور دوسری قسم، اعلی سونا اور گھٹیا سونا، عمدہ چاندی اور ادنی درجہ کی چاندی، معدنی نمک اور سمندری نمک وغیرہ، ان مختلف اقسام کی ہم جنس چیزوں کو باہم فروخت کرنا (جسے آجکل بارٹر کہا جاتا ہے) اگرچہ بازار کی قیمت ملحوظ رکھ کر ہی ہو کمی بیشی کے ساتھ جائز نہیں ہے، کیونکہ ان میں کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ کرنے سے اس ذہنیت کے پرورش پانے کا اندیشہ ہے جو بالآخر سود خواری اور ناجائز نفع اندوزی تک جا پہونچتی ہے، اسلئے شریعت نے قاعدہ مقرر کر دیا کہ ہم جنس اشیاء کے مبادلہ کے وقت لازماً حسب ذیل دو شکلوں میں سے ہی کوئی شکل اختیار کرنی ہوگی، ایک یہ کہ ان کے درمیان قدر و قیمت کا جو تھوڑا سا فرق ہو اسے نظر انداز کر کے برابر سرابر مبادلہ کر لیا جائے، دوسرے یہ کہ چیز کا چیز سے براہ راست مبادلہ کرنے کے بجائے ایک شخص اپنی چیز روپے کے عوض بازاری قیمت سے فروخت کر دے، اور دوسرے شخص سے اسکی چیز روپے کے عوض بازار کے نرخ پر خرید لے۔

۲:۔ ہم جنس اشیاء کے درمیان مبادلہ کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ ایک شخص کے پاس ایک چیز خام شکل میں ہو، اور دوسرے کے پاس اسی جنس سے بنی ہوئی کوئی شئے ہو، اور دونوں آپس میں ان کا مبادلہ کرنا چاہیں، اس صورت میں دیکھا جائیگا کہ آیا صنعت نے اس شئے کی ماہیت بالکل ہی تبدیل کر دی ہے یا اس کے اندر صنعت کے تصرف کے باوجود ابتدائی خام صورت کی بہ نسبت کوئی بڑا فرق واقع نہیں ہوا ہے، پہلی صورت میں تو کمی بیشی کے ساتھ مبادلہ ہو سکتا ہے لیکن دوسری صورت میں شریعت کا منشا یہ ہے کہ یا تو سرے سے مبادلہ ہی نہ ہو یا اگر ہو تو برابری کے ساتھ ہو تا کہ زیادہ

ستانی کے مرض کو غذا نہ مل سکے، مثال کے طور پر ایک تو وہ عظیم الشان تغیرات ہیں جو روئی سے کپڑا اور لوہے سے انجن بننے کی صورت میں رونما ہوتے ہیں، اور دوسرے وہ خفیف تغیرات ہیں جو سونے سے ایک چوڑی یا ایک کنگن بنائے جانے کی صورت میں ہوتے ہیں، ان میں سے پہلی صورت میں تو کوئی مضائقہ نہیں، اگر ہم زیادہ مقدار میں روئی دے کر کم مقدار میں کپڑا اور بہت سے وزن کا خام لوہا دے کر تھوڑے سے وزن کا ایک انجن خرید لیں، لیکن دوسری صورت میں یا تو سونے کے کنگن کا مبادلہ ہم وزن سونے ہی سے کرنا ہوگا، یا پھر سونے کو بازار میں فروخت کر کے اسکی قیمت کے کنگن خریدنے پڑیں گے۔

۳:۔ جب مختلف اجناس کی چیزوں کا باہم مبادلہ کیا جائے تو اسمیں کمی بیشی تو جائز ہے، البتہ ادھار جائز نہیں ہے، مثلاً اگر ایک کلو گندم کو دو کلو کھجوروں کے ساتھ فروخت کریں، یا ایک تولہ سونے کا چار تولہ چاندی سے تبادلہ کریں، تو یہ صورت جائز ہے، مگر شرط یہ ہے کہ معاملہ دست بدست ہو، اس شرط کی وجہ یہ ہے کہ دست بدست جو لین دین ہوگا وہ تو لامحالہ بازار کے نرخوں ہی پر ہوگا، مثلاً جو شخص چاندی دے کر سونا لے گا وہ نقد سودے کی صورت میں سونے کے بالمقابل اتنی ہی چاندی دے گا، جتنی اسے بازار کے بھاؤ کے لحاظ سے دینی چاہیے، لیکن قرض کی صورت میں کمی بیشی کا معاملہ اس اندیشہ سے خالی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر سود کا غبار شامل ہو جائے۔

مثال کے طور پر جو شخص آج ۸۰ تولہ چاندی دے کر یہ طے کرتا ہے کہ ایک مہینہ بعد وہ ۸۰ تولہ چاندی کے بجائے ۲ تولہ سونا لے گا، اس کے پاس در حقیقت یہ معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ایک مہینہ بعد چالیس تولہ چاندی ایک تولے سونے کے برابر ہوگی، لہٰذا اس نے چاندی اور سونے کے درمیان مبادلے کی اس نسبت کا جو پیشگی تعین کر لیا ہے یہ بہر حال ایک طرح کی سود خوارانہ اور قمار بازارانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے، اور قرض لینے والے نے بھی جب اسے قبول کیا تو اس نے بھی گویا جوا کھیلا کہ شاید ایک مہینہ بعد سونے اور چاندی کی باہمی نسبت ۴۰/۱ کے بجائے ۳۵/۱ ہو، اسی بناء پر شارع نے یہ قانون مقرر کیا ہے کہ مختلف اجناس کا مبادلہ کمی بیشی کے ساتھ کرنا ہو تو وہ صرف نقد ہی ہو سکتا ہے۔

البتہ معاملہ کرتے وقت خرید و فروخت کی عمومی شرائط ذہن میں رکھنی ضروری ہیں چنانچہ تبادلہ کرتے وقت دونوں اشیاء کا متعین ہونا نقد ہونے کے علاوہ بھی ضروری ہے، البتہ تعیین کا طریقہ یہ ہے کہ سونے اور چاندی کو جب

باہم خریدا اور بیچا جائے تو اسی مجلسِ عقد میں دونوں پر قبضہ کرلیا جائے، کیونکہ یہ دونوں ثمن حقیقی (پیدائشی ثمن) ہیں، اور یہ اسوقت تک متعین نہیں ہوتے جب تک ان پر قبضہ نہ کرلیا جائے، لہذا سونے اور چاندی کو باہم فروخت کرنے پر اسی مجلسِ عقد میں قبضہ ضروری ہے، لیکن سونے اور چاندی کے علاوہ چیزوں کو جب باہم خریدا اور بیچا جائے تو دونوں طرف کی چیزوں پر اسی مجلسِ عقد میں قبضہ کرنا ضروری تو نہیں ہے، البتہ اسے کسی بھی دوسرے طریقہ سے متعین کیا جاسکتا ہے، تاہم اس صورت میں معاملہ نقد ہی رہیگا ادھار نہیں ہوگا۔

مثال کے طور پر زید نے بکر کو ایک کلو گندم دو کلو نمک کے بدلہ نقد فروخت کیا، اور زید اور بکر نے اپنی اپنی چیزوں کی طرف اشارہ کرکے متعین کردیا لیکن ان دونوں نے یا ان میں سے کسی ایک نے دوسرے کو اپنی چیز حوالہ نہیں کی، اور اس سے یہ کہا کہ میں تھوڑی دیر بعد دیدوں گا، تو یہ معاملہ جائز ہوگا، کیونکہ اسمیں دونوں شرائط پائی گئی ہیں، یعنی معاملہ نقد بھی ہے اور متعین بھی، البتہ اگر زید نے بکر کو ایک تولہ سونا چالیس تولے چاندی کے بدلہ فروخت کیا تو یہ ضروری ہے کہ زید اور بکر اپنی اپنی خریدی ہوئی چیزوں پر اسی مجلس میں قبضہ کرلیں، کیونکہ اگر دونوں اسی مجلس میں دونوں عوض پر قبضہ نہیں کرینگے تو دونوں عوض متعین نہیں ہوں گے اسلئے کہ سونے اور چاندی ان اشیاء میں سے ہیں جو بغیر قبضہ کے متعین نہیں ہوتے، اور بغیر متعین کئے عقد صحیح نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ کہ احناف کا مذہب یہ ہے کہ جن چیزوں میں وزن اور پیمانہ سے حساب کیا جاتا ہے، اگر انہیں ہم جنس طریقے سے فروخت کیا جائے تو کمی بیشی بھی ناجائز اور ادھار بھی ناجائز ہے، اور اگر ایک جنس کی چیز دوسری جنس سے فروخت کی جائے تو کمی بیشی جائز ہے البتہ ادھار ناجائز۔

ربا الفضل کی تشریح کے بارے میں حضرت عمرؓ کا ارشاد:

ربا الفضل ہی وہ قسم تھی جسکی تفصیلات کے تعین میں حضرت فاروق اعظمؓ کو اشکال پیش آیا، کیونکہ حدیث میں صرف چھ چیزوں کا نام لیکر ان میں کمی بیشی اور ادھار کو ربا کے حکم میں قرار دیا گیا، مگر الفاظ حدیث میں اسکی صراحت نہیں ہے کہ یہ حکم صرف انہیں چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا کسی ضابطہ کے تحت اور چیزیں بھی اسمیں داخل ہیں، اور چونکہ آیاتِ ربا حضور اکرم ﷺ کی آخرِ عمر میں نازل ہوئیں، اس کے متعلق حدیثِ مذکور کی مزید تشریح کو آپ ﷺ سے دریافت کرنے کا کسی کو موقعہ نہ مل سکا، اسلئے حضرت فاروق اعظمؓ نے اس پر اظہار افسوس فرمایا کہ کاش ہم نے آپ

ﷺ سے اسکی پوری تشریح حاصل کر لی ہوتی، اس کے ساتھ چند اور بھی مسائل جن میں ابہام باقی رہا، اور حضور ﷺ سے ان کی تشریح معلوم کرنے کا اتفاق نہ ہوا[1]، ان پر بھی اسی سلسلہ میں افسوس کا اظہار فرمایا، حضرت فاروق اعظمؓ کے الفاظ یہ ہیں:

,,ثلاث وددت أن رسول الله ﷺ عهد إلينا فيهن عهدًا، الجَدُّ والكلالة وأبواب من أبواب الربا،،[2]

,, تین مسائل ایسے ہیں کہ مجھے یہ تمنارہ گئی کہ کاش رسول اللہ ﷺ ان میں ہم سے مزید تشریحات بیان فرمادیتے، دو مسئلے تو میراث کے ہیں، (یعنی دادا اور کلالہ کی میراث) اور تیسرا مسئلہ ربا کے بعض ابواب واقسام کی تشریح۔

حضرت فاروق اعظمؓ کے اس ارشاد میں ابواب ربا سے یہی تشریحات مراد ہیں کہ یہ حکم ان چھ چیزوں کے ساتھ مخصوص ہے یا یہ چیزیں بطور مثال بیان فرمائی ہیں، اور دوسری کچھ اشیاء بھی اسی حکم میں داخل ہیں، اور اگر دوسری اجناس بھی داخل ہیں تو ان کا ضابطہ کیا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ بعد میں آنے والے أئمہ مجتہدین امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے اپنے اپنے اجتہاد سے ان چیزوں کا ایک ضابطہ بتایا، اور دوسری اشیاء کو بھی اسی ضابطہ کے تحت اس حکم میں داخل قرار دیا، جسکی تفصیل تو کتب فقہ میں مذکور ہے جسکا خلاصہ پیچھے صفحات میں گذر چکا ہے۔

---

(۱) دیکھئے: قال عمر بن الخطابؓ: ,,إن آية الربا من آخر ما نزل من القرآن وأن النبي ﷺ قبض قبل أن يبينه لنا، فدعوا الربا والريبة،، بحوالہ سود (مودودی، ابوالاعلیٰ بن سید احمد حسن مودودی ۱۳۹۹ھ)، لاہور، مکتبہ جماعت اسلامی، اشاعت یازدہم۔

(۲) دیکھئے: ابن كثير، (عماد الدين ابن كثير ۱۳۵٦ھ) التفسير لابن كثير، مصر (۱: ۳۳۱)۔

تجارتی اور صرفی سود

سترہویں صدی عیسوی میں نظام بینکاری وجود میں آنے کے بعد سود کی دو نئی اصطلاحات بھی ابھریں ان دو اصطلاحات کی تعریف یہ کی گئی ہے:

۱:۔ تجارتی سود(Commercial Intrest): کسی نفع آور پیداواری(Productive)مقاصد کیلئے حاصل کردہ قرضہ پر جو سود لیا جائے وہ تجارتی سود کہلاتا ہے۔

۲:۔ مہاجنی یا صرفی سود(Usuary): قرض اگر ذاتی ضرورت اور صرفی مقاصد کے لے لیا گیا ہو تو اسپر اضافہ مہاجنی یا صرفی سود کہلاتا ہے۔

دونوں اصطلاحات کا پس منظر:

بینکاری کا موجودہ نظام جس نے سود کو اخلاقی اور قانونی سندِ جواز فراہم کی، عصر حاضر کے سرمایہ دارانہ نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہے، جب مسلم ممالک سیاسی طور سے مغرب کے زیر نگیں اور معاشی میدان میں انکے دست نگر ہو گئے تو انیسویں صدی کے بعض مغرب زدہ مسلمانوں نے ایک طرف تو مغرب کی ان روز افزوں ترقیات کو دیکھا جو صنعت اور تجارت کے میدان میں انہیں حاصل ہو رہی تھیں اور دوسری طرف ان کی نگاہ اپنی ہم مذہب قوم کی معاشی پستی اور اقتصادی زبوں حالی پر بھی پڑی، ساتھ ہی انہیں اس بات کا بھی احساس ہوا کہ صنعت و تجارت کے میدان میں بینک ایسے ناگزیر ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی اہمیت صرف قومی ہی نہیں بین الاقوامی ہے اس چیز نے انہیں یہ کہنے پر آمادہ کیا کہ حرام صرف مہاجنی یا صرفی سود ہے نہ کہ تجارتی سود(Intrest)، کیونکہ تجارتی سود کو حرام سمجھنے سے اس صنعت و تجارت

کی راہ میں نا قابلِ عبور دشواریاں حائل ہو جائیں گی، مگر یہ پریشان کن مسئلہ کہ قرآن وسنت نے ربا اور ربا پر مبنی سارے معاملات کو بالتصریح حرام کیا ہے، اسطرح حل کیا گیا کہ ربا کے لفظ کا ترجمہ "یوژری" کر دیا گیا، اور اسے انٹرسٹ کے لفظ کے مغربی تصور سے مختلف بتایا گیا، اسطرح یہ سمجھا گیا کہ قرآن کا ربا جو حرام قرار دیا گیا تھا وہ یوژری تھا، انٹرسٹ کی حرمت سے اسے کوئی سروکار نہ تھا۔

ہندوستان میں اس طرز فکر کی ابتداء سر سید احمد خان مرحوم سے ہوئی[(۱)]، اور انکی پیروی ان کے مکتب خیال کے لوگوں نے کی، مثلاً نذیر احمد[(۲)]، سید طفیل احمد منگلوری[(۳)]، اور اقبال سہیل[(۴)] وغیرہ، بعض مصری علماء مثلاً شیخ محمد عبدہ[(۵)]، توفیق آفندی[(۶)]، شیخ اسماعیل خلیل[(۷)] اور ترکی کے تجدد پسند حضرات نے بھی اس طرح کے خیالات ظاہر کیئے[(۸)]۔

تجارتی سود کو جائز قرار دینے والے حضرات فقہی زاویہ نگاہ سے جو دلائل پیش کرتے ہیں انکے دو گروہ ہو گئے ہیں:

بعض تو وہ ہیں جو اپنے استدلال کی بنیاد اس بات پر رکھتے ہیں کہ تجارتی سود عہدِ رسالت میں رائج تھا یا نہیں؟ ان کا

---

(۱) دیکھئے: سر سید احمد خان، (سید احمد بن میر تقی ۱۸۹۸ء)، سلسلہ تصانیف۔ احمدیہ، تفسیر القرآن، (۳:۲۹۸ تا ۳۱۳) تفسیر آیت ربا، سورۂ بقرۃ آیت: (۲۷۶) بحوالہ تجارتی سود مصنفہ فضل الرحمٰن، علیگڑھ یونیورسٹی۔

(۲) دیکھئے: ڈپٹی نذیر احمد، الحقوق والفرائض (۲:۴۱۸ تا ۴۴۴) بحوالہ تجارتی سود مصنفہ فضل الرحمٰن، علیگڑھ یونیورسٹی۔

(۳) دیکھئے: منگلوری، مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل، بحوالہ تجارتی سود۔

(۴) دیکھئے: اقبال سہیل، حقیقۃ الربا بحوالہ تجارتی سود۔

(۵) دیکھئے: رشید رضا، تفسیر المنار (۳:۱۱۶) بحوالہ بالا۔

(۶) دیکھئے: منگلوری، مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل (۲۱ تا ۲۲) بحوالہ بالا۔

(۷) بحوالہ بالا۔

(۸) دیکھئے: مضامین سود (۸۹) شائع کردہ منگلوری، بحوالہ تجارتی سود فضل الرحمٰن علیگڑھ یونیورسٹی۔

کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم میں حرام سود کے لئے "الربا" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس سے مراد سود کی وہ مخصوص شکل ہے جو آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں یا آپ ﷺ سے پہلے عہد جاہلیت میں رائج تھی، ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے بلا واسطہ مخاطب اہلِ عرب ہیں، ان کے سامنے جب "الربا" کا ذکر کیا جائے گا تو مراد وہی ربوا ہو گا جو انکی نگاہ میں جانا پہچانا اور معروف ہو، جب ہم اس زمانے میں سود کی مروجہ صورتوں میں جستجو کرتے ہیں تو ہمیں کہیں تجارتی سود کی شکل نہیں دکھائی دیتی، تجارتی سود اہل یورپ کی ایجاد ہے اور صنعتی انقلاب کے بعد جب صنعت و تجارت کو فروغ نصیب ہوا ہے اس وقت تجارتی سود (Commercial Intrest) کا لین دین شروع ہوا ہے، لہذا جن آیات سے سود کی حرمت معلوم ہوتی ہے ان سے تجارتی سود کے حرام ہونے پر استدلال صحیح نہیں۔

ہم پہلے اسی گروہ کے اس استدلال کا جائزہ لیتے ہیں:

ہماری نگاہ میں ان حضرات کا یہ استدلال بہت سطحی ہے، اسلئے کہ ان حضرات نے اپنی اس دلیل کی اس عمارت کو دو ہی ستونوں پر کھڑا کیا ہے، ایک تو یہ کہ "الربا" سے مراد "ربا" کی وہی شکل و صورت ہے جو زمانۂ رسالت میں رائج تھی، اور دوسرے یہ کہ تجارتی سود اس زمانے میں رائج نہ تھا، لیکن اگر دلائل کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ یہ بالکل بے وزن ہیں۔

اول تو یہ بات ہی بے وزن ہے کہ "الربا" کی جو شکل عہد جاہلیت میں رائج نہ ہو وہ حرام نہیں ہے، اسلئے کہ اسلام کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دیتا ہے تو اسکی ایک حقیقت سامنے ہوتی ہے، اسی پر احکام کا دار مدار ہوتا ہے، شکل وصورت کے بدلنے سے احکام میں کوئی فرق نہیں آتا، قرآن نے شراب کو حرام قرار دیا ہے، زمانۂ نبوت میں وہ جس شکل و صورت کے ساتھ معروف تھی اور اس کے بنانے کے جو طریقے رائج تھے وہ سب بدل گئے، مگر چونکہ حقیقت نہیں بدلی اسلئے حکم بھی نہیں بدلا، وہ بدستور حرام رہی، قرآن کریم نے خنزیر کا گوشت حرام قرار دیا، چاہے جدید دور میں اسے کتنی ہی اعلٰی غذا دیکر فارموں میں پالا جائے، وہ پھر بھی حرام ہی رہیگا، الفحشاء (بدکاری) کی صورتیں اس زمانے میں کچھ اور تھیں آج کچھ اور ہیں، ان میں زمین آسمان کا تفاوت ہے، مگر بدکاری بدکاری ہی ہے، اور قرآن کے وہی احکام اسپر نافذ ہیں، سود اور قمار کا بھی یہی حال ہے، اس زمانے میں اسکی جو شکل و صورت رائج تھی آج اس سے بہت مختلف صورتیں رائج ہیں، مگر جس

طرح شراب خنزیر اور بدکاری حرام ہے اسی طرح سود وقمار بھی حرام ہے۔

پھر اس دلیل کا دوسرا مقدمہ بھی درست نہیں کہ تجارتی سود عہد جاہلیت میں رائج نہ تھا، یہ کہنا دراصل تاریخ اور ناواقفیت پر مبنی ہے، جاہلیت عرب اور پھر اسلامی دور کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات بالکل آشکار ہو جاتی ہے کہ اس زمانے میں سود کا لین دین صرف احتیاجی اور صرفی قرضوں پر نہیں تھا، بلکہ تجارتی اغراض اور نفع بخش مقاصد کے لئے بھی قرض لئے اور دیئے جاتے تھے، چنانچہ ذیل میں اس قسم کی چند مثالیں ذکر کی جاتی ہیں:۔

۱۔ ,, كانت بنو عمرو بن عامر يأخذون الربا من بني المغيرة، وكانت بنو المغيرة يربون لهم في الجاهلية، فجاء الإسلام ولهم عليهم مال كثير"[۱]

جاہلیت کے زمانے میں بنو عمرو بن عامر، بنو مغیرہ سے سود لیتے تھے اور بنو مغیرہ انہیں سود دیتے تھے، چنانچہ جب اسلام آیا تو ان پر ایک بھاری مال واجب تھا۔

اس روایت میں عرب کے دو قبیلوں کے درمیان سودی لین دین کا ذکر کیا گیا ہے، یہ بات ذہن میں رکھئے کہ ان قبیلوں کی حیثیت تجارتی کمپنیوں جیسی تھی، ایک قبیلے کے افراد اپنا مال ایک جگہ جمع کر کے اجتماعی انداز میں اس سے تجارت کیا کرتے تھے، پھر یہ قبیلے اچھے خاصے مالدار بھی تھے اب آپ خود ہی فیصلہ کر لیجئے کہ کیا دو مالدار قبیلوں کے درمیان سود کا مسلسل کاروبار کسی ہنگامی ضرورت کے لئے ہو سکتا ہے؟ یقیناً یہ لین دین تجارتی بنیادوں پر تھا۔

اس کے علاوہ ہم طائف کی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں جو قبیلہ ثقیف کا مسکن تھا، طائف مکے سے پچھتر میل کے فاصلے پر جنوب مشرق میں واقع ہے، اسکی زمین نہایت زرخیز اور سرسبز وشاداب تھی[۲]، اس کے ارد گرد وادیوں سے باہر بھیجی جانے والی تجارتی اشیاء کافی مقدار میں حاصل ہوتی تھیں، جنہیں حجاز جیسے بے آب وگیاہ علاقہ میں کہیں بھی فروخت کیا جا سکتا تھا، طائف سے برآمد کیجانے والی چیزوں میں کشمش، منقی، شراب، گیہوں اور لکڑی ہوتی تھی، طائف کی مخصوص

(۱) دیکھئے: عبد الرحمن بن ابی بکر ۹۱۱ھ، الدر المنثور بحوالہ ابن جریر، عن ابن جریج (۱: ۳۶۶)۔

(۲) دیکھئے: انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ج: ۴)، طائف بحوالہ تجارتی سود (ص: ۹)۔

صنعت چمڑے کی تیاری اور رنگائی تھی[1]، مغربی عرب میں طائف مکّے کے بعد دوسرے درجہ کا شہر سمجھا جاتا تھا، قرآن مجید نے طائف کا ذکر مکہ کے ساتھ ,,القریتین" کے فقرے سے کیا ہے، جس سے اس بات کا اشارہ بھی ملتا ہے کہ ان دونوں شہروں کے روابط ایک مخصوص اہمیت کے حامل تھے[2]، آبادی کا ایک حصہ کثیر تعداد پر مشتمل یہودیوں کا بھی تھا جو یمن اور یثرب سے نکال دیے جانے کے بعد طائف میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں مستقل مقیم ہو گئے تھے[3]، طائف کے باشندوں کا جو زیادہ تر ثقیف کے قبیلے سے تھے سب سے بڑا کاروبار ربا (سودی لین دین) تھا[4]، اور سودی لین دین کے اس طرح معاشی زندگی کی گہرائیوں میں پیوست ہو جانے کی وجہ سے حضور اکرم ﷺ نے طائف سے صلح کرتے وقت ایک شرط صراحتہً یہ رکھی تھی کہ سودی لین دین بالکلیہ موقوف کردیا جائے گا[5]، ساتھ ہی ساتھ جو سود دوسروں کا ان پر یا ان کا دوسروں پر چڑھ چکا ہے اسے بالکل ترک کردیا جائے گا[6]۔

طائف کا سودی کاروبار کرنے والے صرف اپنے شہر کے لوگوں سے ہی سود کا لین دین نہ رکھتے تھے بلکہ مکّے والوں کو بھی جو بنیادی طور پر تاجر تھے سود پر روپیہ فراہم کرتے تھے، یہ سود روپیہ اور سامان دونوں صورتوں میں وصول کیا جاتا تھا، بنو مغیرہ جو مکّے کے قریشیوں کی ایک شاخ تھے، ان کے مستقل گاہک تھے، سود کی وصولیابی کا طریقہ یہ بھی تھا کہ عدم ادائیگی کی صورت میں اصل مع سود کو دوگنا کردیا جاتا تھا، اور یہ صورت روپیہ اور سامان دونوں کیلئے اختیار کی جاتی تھی[7]۔

---

(۱) دیکھئے: انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (ج:۴)۔ طائف کا نام بلد الدباغہ بھی تھا، الہمدانی، (۱۲۰) بحوالہ تجارتی سود: (۹)۔

(۲) سورۂ زخرف آیت: (۳۱)، ﴿لَوْ لاَ نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ﴾۔

(۳) دیکھئے: البلاذری: (احمد بن یحیی ۲۷۹ھ)، فتوح البلدان، قاهره ۱۹۳۲ء، (۶۷)۔

(۴) حوالہ بالا۔ ابو حیان الاندلسی، البحر المحیط (۲:۳۳۵)، سودی کاروبار میں عربوں سے زیادہ ثقیف تھے۔

(۵) دیکھئے: البلاذری، (احمد بن یحیی ۲۷۹ھ)، فتوح البلدان (۲۷) و اشترط أن لا یربوا۔

(۶) دیکھئے: السیوطی، (الإمام جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر ۹۱۱ھ): الدر المنثور (۱:۳۳۶)۔

ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ، جامع البیان) للطبری (۶۶:۳) کانت ثقیف قد صالحت النبی ﷺ على أن مالهم من ربا على الناس و ما كان للناس عليهم فهو موضوع۔

(۷) دیکھئے: ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ) جامع البیان، (۴:۵۵)۔

مکہ کے باشندوں کے ساتھ طائف والوں کے معاشی تعلقات اور سودی کاروبار کی اہمیت اور زیر بحث مسئلہ پر ان کے اثرات کا حقیقی اندازہ اسی وقت صحیح طور پر لگایا جاسکتا ہے، جب مکہ کے باشندوں کی تجارتی سرگرمیوں اور جدوجہد کو بھی سامنے رکھا جائے، مکہ کی زمین نا قابل زراعت تھی[۱]، وہاں نہ جنگلات تھے اور نہ معدنیات، چنانچہ خام اشیاء کی بڑی کمی تھی، صنعت بھی صرف دباغت کی پائی جاتی تھی[۲]، ان وجوہات کی بناء پر اہل مکہ کو تجارت اور کاروبار پر گذارا کرنا پڑتا تھا[۳]، چنانچہ مکہ عرب کا سب سے بڑا اور اہم ترین شہر ہو گیا۔

قریش دو تجارتی سفر کیا کرتے تھے، جن کی ابتداء ہاشم نے کی تھی[۴]، ایک یمن کی طرف جاڑے میں اور دوسرا شام کی طرف گرمی میں[۵]، قریش کے لئے یہ سفر نہایت سودمند ثابت ہوئے، خاص کر اس وجہ سے کہ کعبہ کے محافظوں کی حیثیت سے قریش کو بنظر احترام دیکھا جاتا تھا، انہیں مخصوص رعایتیں دی جاتی تھیں، اور ان کا تحفظ کیا جاتا تھا، جو اس وقت کے عرب میں نقل و حرکت کیلئے نہایت ضروری تھا[۶]۔ اس طرح تجارتی کاروبار ان کا واحد ذریعہ معاش اور گذر اوقات کا ذریعہ بن گیا، تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کے مواقع قریب آجاتے تو اہل مکہ کی دلچسپی، ذوق و شوق اور مصروفیت کی انتہا نہ ہوتی، عورتیں تک تجارت میں حصہ لیتی تھیں، اور اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتی تھیں، وہ قافلہ جو ابو سفیان کی قیادت میں تھا اور جس پر حملہ کرنے کا ارادہ مسلمانوں نے کیا تھا اور جو آخر کار جنگ بدر کا باعث بنا، مکہ کا کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جس کا کچھ نہ کچھ روپیہ اسمیں نہ لگا ہو[۷]، اہل مکہ کی زندگی میں اس طرح سرمایہ کی اہمیت میں روز افزوں

(۱) قرآن مجید، ﴿وَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ﴾۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ) تاریخ طبری، مطبعۃ الاستقامہ القاھرہ (۱۲۰۲) بحوالہ تجارتی سود، ص: ۱۱۔

(۳) Intro duction to the Quran P:7 بحوالہ تجارتی سود: ۱۱۔

(۴) ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ) تاریخ طبری، مطبعۃ الاستقامہ القاھرہ (۱۰۸۹) بحوالہ تجارتی سود، ص: ۱۱۔

(۵) قرآن مجید سورۂ القریش ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ)، جامع البیان (۱۷۱:۳۰) تفسیر سورۂ قریش۔

(۶) قرآن مجید سورۂ قریش، ﴿وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ﴾، سورۂ عنکبوت، ﴿وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾، سورۂ بقرہ، ﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْناً﴾۔

(۷) الزرقانی، شرح المواھب اللدنیۃ (۴۱۱:۱)۔ ابن سعد، الطبقات الکبیر جلد اول بدر۔

اضافہ ہوتا چلا گیا اور وہ انکی زندگی کا ایک ناگزیر عنصر بن گیا، یہاں تک کہ انکی تمام تر توجہ اس کے حصول، بہم رسانی اور گردش پر لگ گئی، چنانچہ یہ بات ظاہر ہے کہ مکے جیسی تجارتی جگہ نے رفتہ رفتہ ایک قسم کے بینکنگ شہر اور کلیئرنگ ہاؤس کی خصوصیات اپنے اندر پیدا کرلی ہوں گی، اور اس طرح کے مبادلات، کاروبار اور تنظیم سے متعلق ادارے اور رواج بھی آہستہ آہستہ وجود میں آگئے ہونگے[۱]، اس طرح کے حالات کے تحت یہ فطری سی بات تھی کہ اہل مکہ میں سود کے لین دین کا ایک عام رواج ہو گیا تھا[۲]، جب قرآن مجید نے ربا کو حرام اور قبیح قرار دیا تو قریش نے اس پر اعتراض اس دلیل کے ذریعے کیا کہ سودی لین دین بھی ایک قسم کی تجارت ہی ہے، جس میں سرمایہ کا معاوضہ بدل لیا جاتا ہے، اور سرمائے کو کرایہ پر چلایا جاتا ہے، وہ کہتے تھے کہ انہیں ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا کہ سرمائے پر بڑھوتری یا تو نفع کی صورت میں شروع ہی میں لے لی جائے جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے یا کچھ عرصہ بعد لی جائے، یعنی جب رقم واجب الاداء ہو جائے، تو اس کے انتظار کے عوض میں سود کی شکل میں اصل رقم کے علاوہ کچھ اور بھی وصول کرلی جائے[۳]، قریش نے اس سودی کاروبار کو بہت اونچے معیار تک ترقی دی تھی، وہ صرف اپنے قبیلے والوں کو ہی نہیں حجاز کے دوسرے شہروں کے باشندوں کو بھی سودی قرضے دیتے تھے، سود کی حرمت سے قبل حضرت عباس بن عبد المطلب اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہما نے باہم مشترکہ سرمائے سے ایک کمپنی سی قائم کر رکھی تھی، جس کا خاص کاروبار سود پر روپیہ چلانا تھا، ان حضرات کا کاروبار مکے تک محدود نہ تھا، طائف کے باشندوں کو وہ مستقل قرضے دیا کرتے تھے، خاص کر بنو عمرو بن

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: لامنس کا مقالہ "مکہ"، .Shorter Encyclopadia of Islam بحوالہ تجارتی سود: ۱۵۔

(۲) لامنس کا مقالہ "مکہ"، .Shorter Encyclopadia of Islam بحوالہ تجارتی سود: ۱۵۔

(۳) سورۂ بقرۃ آیت: ﴿قَالُوٓا إِنَّمَا البَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾، ان کا کہنا تھا کہ سود تو بس بالکل تجارت کی مانند ہے، مزید دیکھئے...... روح المعانی (۳:۴۳)، وارادو نظمهما فی سلك واحد لا فضائها إلى الربح إلا أنهم جعلوا الربا أصلا فی الحل وشبهو البیع به ردما للمبالغة (انکا مطلب یہ تھا کہ ربح اور ربا دونوں ایک ہی سلسلہ کی چیز ہیں، بلکہ انہوں نے ربا کو حلت میں اصل قرار دیا اور تجارت کو اس سے مشابہت دی، جس سے مقصد مشابہت باہمی میں مبالغہ کا اظہار تھا)۔

ابو حیان الاندلسی، البحر المحیط (۲:۳۳۵) و کان أهل الجاهلیة إذا حل دینه علی غریمه طالبه فیقول: زدنی فی الأجل وأزیدك فی المال، فیفعلان ذلك، ویقولون سواء علینا الزیاده فی اول البیع بالربح، وعند المحل لأجل التاخیر۔

عمیر کو جو قبیلہ بنو عوف کی ایک شاخ تھے[1]، حضرت عثمانؓ بھی ان مالدار تاجروں میں سے تھے جو زبردست پیمانہ پر سودی کاروبار کرتے تھے[2]، بدر کے تجارتی کارواں کے منتظمین خصوصاً وہ لکھ پتی تھے جنہوں نے کارواں میں ہزاروں دینار تجارت میں لگانے کے علاوہ اپنا سرمایہ مختلف سودی کاروبار میں پھیلا رکھا تھا[3]۔

اس کے علاوہ حضرت زبیر بن عوام کا جو طرز عمل اس سلسلے میں روایات سے ثابت ہوتا ہے وہ بڑی حد تک اس طریقہ سے مشابہ ہے جو آج بینکنگ کے نظام میں رائج ہے، کیونکہ حضرت زبیرؓ اپنی امانت ودیانت کے اعتبار سے مشہور تھے، اس لئے بڑے بڑے لوگ ان کے پاس اپنی امانتیں جمع کرایا کرتے تھے، اور اپنی مختلف ضروریات کی بناء پر وہ اپنی پوری یا تھوڑی رقمیں واپس بھی لیتے رہتے تھے، حضرت زبیر کے بارے میں صحیح بخاری میں یہ تصریح موجود ہے کہ یہ لوگوں کی رقموں کو بطور امانت رکھنا منظور نہیں کرتے تھے، بلکہ کہدیا کرتے تھے کہ: ,,لا ولکن هو سلف" یعنی یہ امانت نہیں قرض ہے[4]، اور علامہ حافظ ابن حجرؒ نے اس بات کا مقصد یہ بیان کیا کہ:

> انہیں خطرہ تھا کہ کہیں مال ضائع نہ ہو جائے اور یہ سمجھا جائے کہ انہوں نے اسکی حفاظت میں کوتاہی کی ہوگی، اس لئے انہوں نے یہ مناسب سمجھا کہ اُسے (قرض بنا کر) بہر صورت واجب الاداء قرار دے لیں، تاکہ مال والے کو بھروسہ زیادہ رہے، اور ان کی ساکھ بھی قائم رہے، ابن بطالؒ نے یہ بھی فرمایا کہ: وہ ایسا اس لئے

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ) جامع البیان، (٤:٥٥)۔
والسیوطی، (الإمام جلال الدین عبد الرحمن بن ابی بکر ۹۱۱ھ): الدر المنثور (۱:۳۳٦)۔

(۲) ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ،) تاریخ طبری (ص ۱۷۵۳)۔

(۳) Shorter Encyclopadia of Islam. بحوالہ تجارتی سود: (۱۷)۔

(۴) بخاری، (أبو عبد اللّٰه محمد بن اسماعیل) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح کتاب الجهاد، باب برکة الغازی فی ماله۔

وابن سعد، (محمد بن سعد ۲۳۰ھ)، طبقات (۳:۱۰۹) دار بیروت، بیروت ۱۳۷۷ھ، فی ضمن طبقات البدریین من المهاجرین۔

بھی کرتے تھے تاکہ اس مال سے تجارت کرنا اور فائدہ کمانا ان کے لئے جائز ہو جائے[1]۔

اس طریقے سے حضرت زبیرؓ کے پاس لاکھوں کی تعداد میں رقمیں جمع ہو جاتیں، حضرت زبیرؓ کے صاحب زادے عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے ذمہ واجب الاداء قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ نکلے[2]، حضرت زبیرؓ جیسے متمول صحابی پر یہ بائیس لاکھ روپے کا قرضہ ظاہر ہے کہ کسی صرفی اور وقتی ضرورت کیلئے نہیں تھا بلکہ یہ امانتوں کا سرمایہ تھا، اور یہ تمام سرمایہ کاروبار ہی میں مشغول تھا، کیونکہ حضرت زبیرؓ نے وفات سے قبل اپنے صاحب زادے حضرت عبداللہ کو یہ وصیت فرمائی تھی کہ ہماری املاک کو فروخت کر کے یہ رقم ادا کی جائے[3]۔

علامہ طبریؒ نے ۲۳ھ کے واقعات میں ایک واقعہ یہ نقل کیا ہے کہ ہند بنت عتبہ حضرت عمرؓ کے پاس آئی اور بیت المال سے چار ہزار قرض مانگے تاکہ ان سے تجارت کرے، اور انکی ضامن ہو، حضرت عمرؓ نے دیدئے چنانچہ وہ بلادِ کلب میں گئی اور مال خرید کر فروخت کیا[4]، اسمیں خاص تجارت کیلئے تجارت کے نام سے روپیہ قرض لینے اور دینے کا ذکر ہے، کیا اس کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرونِ اولیٰ میں تجارت کے لئے قرض لینے دینے کا رواج نہ تھا، ہاں یہ صحیح ہے کہ اس قرض پر سود لینے دینے کا رواج احکام قرآنی نازل ہونے کے بعد نہ رہا تھا، جیسا کہ اس واقعہ میں چار ہزار قرض بلا سود دینا مذکور ہے۔

ایک بہت واضح دلیل:

درِّ منثور ہی میں علامہ سیوطیؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے:

---

(۱) ابن حجر، احمد بن علی الشافعی ۸۵۲ھ، فتح الباری، بیروت دار المعرفہ، (۱۷۵:۶)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: ابن سعد، (محمد بن سعد ۲۳۰ھ)، طبقات (۱۰۹:۳) دار بیروت، بیروت ۱۳۷۷ھ۔

(۳) حوالہ بالا۔

(۴) دیکھئے: ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ،)تاریخ طبری (۸۷:۳)۔

,,من لم يترك المخابرة فليؤذن بحربٍ من الله ورسوله" [۱]

جو شخص مخابرہ نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول سے اعلان جنگ سن لے۔

اس روایت میں رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ کو سود کی طرح ناجائز قرار دیا، اور جس طرح سود خور کے خلاف خدا اور رسول نے اعلان جنگ کیا ہے، اسی طرح مخابرہ کرنے والے کے خلاف بھی کیا، استدلال کی وضاحت سے قبل مخابرہ کا مطلب سمجھنا ضروری ہے، مخابرہ دراصل بٹائی کی ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ زمیندار کسی کاشتکار کو اپنی زمین اس معاہدے پر دے کہ کاشتکار اس کو ایک معین پیداوار دیا کرے، فرض کیجئے کہ زید کی ایک زمین ہو اور وہ اسے عمر کو اس معاہدے پر کاشت کے لئے دے کہ وہ غلہ کی ایک معین مقدار مثلاً پانچ من ہر فصل پر زید کو دے گا، خواہ اس کی پیداوار کم ہو یا زیادہ یا بالکل نہ ہو، یا مثال کے طور پر یہ طے کریں کہ جو پیداوار پانی کی نالیوں کے قریبی حصہ پر ہوگی وہ زید لے گا باقی عمر (کاشتکار) لے گا، یہ معاملہ مخابرہ کہلاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس معاملے کو ربا کی ایک شکل قرار دے کر حرام فرمایا ہے، اب آپ ہی غور فرمائیں کہ یہ معاملہ ربا کی کون سی صورت سے متعلق ہے؟ صرفی اور احتیاجی سود سے یا تجارتی سود سے! ظاہر ہے کہ یہ صورت تجارتی سود سے مشابہ ہے کیونکہ جسطرح تجارتی سود میں مقروض قرض کی رقم تجارت یا نفع آور کام میں لگاتا ہے اسی طرح مخابرہ میں بھی، کہ کاشتکار زمین کو نفع آور کام میں لگا رہا ہے، صرفی اور احتیاجی سود میں ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ اسمیں وہ قرض لے کر اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کر دیتا ہے۔

پھر جو علتِ تحریم مخابرہ کو ناجائز قرار دیتی ہے وہ یہ ہے کہ ممکن ہے کاشت کے بعد کل پیداوار پانچ من ہی ہو، اور بیچارے کاشتکار کو کچھ بھی نہ ملے، یہی علت تجارتی سود میں بھی پائی جاتی ہے، کہ ممکن ہے جو رقم قرض لے کر تجارت میں لگائی گئی ہے، اس سے صرف اتنا ہی نفع ہو جتنا کہ اُسے سود میں دیدینا ہے، یا اتنا بھی نہ ہو، اور یہ علت صرفی اور احتیاجی سود میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ مقروض قرض کی رقم کسی تجارت میں نہیں لگاتا، اس کے حرام ہونے کی علت کچھ اور ہے۔

---

(۱) ابو داودسجستانی، (سليمان بن الأشعث بن اسحاق) سنن أبي داودرقم الحديث (۲۹۵۷)، البيوع۔

وحاكم، (محمد بن عبد الله الحاكم ۴۰۵ھ)، مستدرك، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۴۱۱ھ۔

خلاصہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے مخابرہ کو ربا میں داخل فرمایا اور مخابرہ صرفی سود کے مشابہ نہیں ہو سکتا، وہ تجارتی سود کے مشابہ ہے، اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ عہد رسالت میں نفع بخش کاموں میں لگانے کے لئے سودی لین دین کا رواج تھا، اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سود حرام ہے۔

دوسرا گروہ:

تجارتی سود کو جائز کہنے والوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو اپنے استدلال کی بنیاد سود کے عہد جاہلیت میں رائج ہونے یا نہ ہونے پر نہیں رکھتا، بلکہ وہ اس کے جواز پر کچھ اور ایجابی دلائل پیش کرتا ہے، اس گروہ نے کئی دلائل پیش کئے ہیں، ذیل میں ان میں سے چند ایک ذکر کئے جاتے ہیں۔

پہلی دلیل اور استدلال کا جواب:

اس گروہ کا یہ کہنا ہے کہ سود کے حرام ہونے کی علت یہ ہے کہ اسمیں قرض لینے والے کا نقصان ہوتا ہے، اس بیچارے کو محض اپنی تنگدستی کے جرم میں ایک چیز کی قیمت اس کی اصل قیمت سے زائد دینی پڑتی ہے، اور دوسری طرف قرض دینے والا اپنے فاضل سرمایہ سے بغیر کسی محنت کے مزید مال وصول کرتا ہے جو سراسر ظلم ہے، لیکن یہ علت تجارتی سود میں نہیں پائی جاتی، بلکہ اسمیں قرضدار اور قرض خواہ دونوں کا فائدہ ہے، قرضدار قرض کی رقم کو تجارت میں لگا کر نفع حاصل کر لیتا ہے، اور قرض خواہ قرض کی رقم پر سود لے کر، اس لئے اسمیں کسی کے ساتھ ناانصافی اور ظلم نہیں ہوتا۔

یہ دلیل آج کل لوگوں کو بہت اپیل کرتی ہے اور بظاہر بڑی خوشنما ہے لیکن تھوڑے سے غور و فکر سے یہ بات واضح ہو جائیگی کہ یہ دلیل بھی حقیقت میں بے وزن ہے کیونکہ اس کا سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ تجارتی سود میں کسی کا نقصان نہیں، کیونکہ حرمت سود کی حکمت صرف وہ نہیں جو تجارتی سود کے حامی حضرات نے پیش کی ہے، اس کے بہت سے اسباب ہیں، ان حکمتوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کسی فریق کا نقصان اس میں ضرور ہوتا ہے اور نقصان والا معاملہ ناجائز ہوتا ہے، مگر تھوڑے سے تغیر کے ساتھ۔ ان حضرات نے تو بات یہیں تک ختم کر دی کہ اگر ایک فریق کا نقصان اور دوسرے کا فائدہ ہو تو معاملہ ناجائز ہوتا ہے، اور دونوں کا فائدہ ہو تو جائز، حالانکہ بات صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ اگر دونوں کا فائدہ ہو سکتا ہو مگر ایک کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا غیر یقینی اور مشتبہ ہو تب بھی معاملہ ناجائز ہوتا ہے، جیسا کہ

پیچھے مخابرہ کے بیان میں ذکر کیا گیا۔

دوسری دلیل اور اس کا جواب:

اس گروہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم نے ارشاد فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾[1]۔

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نہ کھاؤ، الا یہ کہ وہ تجارت ہو اور آپس کی رضامندی سے ہو۔

مندرجہ بالا آیت میں قرآن حکیم نے اکل بالباطل سے منع فرمایا ہے، لہذا تجارت کے جن طریقوں میں اکل بالباطل موجود ہو وہ حرام ہیں، اور ظاہر ہے کہ جہاں اکل باطل ہوگا وہاں ایک فریق کی عدم رضا ضرور ہوگی، اکل باطل میں کھانے والا تو راضی ہوتا ہے، لیکن جس سے کھایا جاتا ہے وہ کبھی راضی نہیں ہوتا، وہ اسے صرف اپنی مجبوری سے برداشت کرتا ہے، اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی ایسی تجارت ہو جس میں دونوں فریقوں کی رضامندی اور خوشدلی ہو تو وہ یقیناً اکل بالباطل نہ ہوگا۔ اس توجیہ کی رو سے کمرشل انٹرسٹ (تجارتی سود) کو دیکھئے کہ اس میں قرض لینے والا مجبور اور مظلوم نہیں ہوتا، اور اسی طرح وہ دائن کے نفع سے ناخوش بھی نہیں ہوتا، لہذا جو ربوا حرام ہے وہ وہی ہے جس میں ایک فریق کا خود غرضانہ نفع اور دوسرے کا نقصان ہے، کمرشل انٹرسٹ پر جو تجارت کی جاتی ہے، اس میں دونوں کی باہمی رضامندی اور خوش دلی ہوتی ہے۔

لیکن حقیقت میں اس گروہ کا یہ استدلال بھی سطحی نوعیت کا ہے، کیونکہ یہ بات ظاہر ہے کہ فریقین کی رضامندی کو حرام چیز کے حلال ہونے کیلئے سبب قرار نہیں دیا جاسکتا، کیا فریقین رضامند ہوں تو زنا کو جائز کہا جاسکتا ہے؟ جو تجارت میں ایسی بہت سی انواع ہیں کہ جنمیں دونوں فریق راضی اور خوش ہوتے ہیں مگر وہ ناجائز ہیں، حدیث کی کتابوں میں "ابواب البیوع الباطلة" میں دیکھئے کہ محاقلہ، تلقی الجلب، بیع کی ان تمام صورتوں میں فریقین کی رضامندی اور خوش دلی

(۱): سورة النساء (آیت: ۲۹)

ہوتی ہے، مگر ہر ایک کو رسول اللہ ﷺ نے حرام قرار دیا ہے۔

صرف سود اور قمار میں بھی فی الجملہ فریقین معاملے پر راضی ہوتے ہیں، اسکے باوجود اسے حرام قرار دیا گیا، لہذا صرف اس بنا پر کوئی سودی معاملہ جائز قرار نہیں پاسکتا کہ اس پر دونوں فریقین راضی ہیں، بلکہ دونوں کی رضامندی کے ساتھ وہ ایسا معاملہ ہونا چاہئے جسے شریعت نے حرام قرار نہ دیا ہو، اسی کو قرآن کریم نے ﴿إلاَّ أنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً﴾ سے تعبیر فرمایا ہے۔

”سودِ مفرد اور سودِ مرکب“

دورِ جاہلیت میں رائج ربا جسے ربا النسیئہ یا ربا الجاہلیۃ کہا جاتا ہے اسکی دو قسمیں ہیں، ایک سودِ مفرد، دوسری سودِ مرکب، ذیل میں دونوں قسموں کی تعریف اور اس کے احکام ذکر کئے جاتے ہیں:

سودِ مفرد:

سودِ مفرد یہ ہے کہ اگر ایک متعین مدت کیلئے ایک متعین مقدار سود پر کوئی رقم قرض دی جائے، قرض خواہ نے اگر متعین مدت پر اصل رقم بمعہ سود واپس کر دی تو مقررہ سود لے کر معاملہ ختم ہو گیا، اور اگر اس متعین مدت تک واپس نہ کر سکا تو کچھ عرصہ کیلئے مزید مہلت دیدی گئی، اور آئندہ کی مدت کیلئے بھی سابقہ شرح سے سود وصول کیا جائے[1]۔

سودِ مرکب:

سودِ مرکب یہ ہے کہ ایک شخص کو ایک متعین مدت کیلئے روپیہ قرض دیا جائے، قرض خواہ نے اگر متعین مدت تک سرمایہ بمعہ سود ادا نہ کیا تو اس سرمایہ کے سود کو بھی اصل سرمایہ (رأس المال) قرار دیکر مجموعہ کو مقروض مال شمار کر لیا جاتا اور پھر اس مجموعے پر ایک مزید مدت کیلئے مہلت دیدی جاتی، اور سود میں اضافہ کر دیا جاتا۔ اسطرح سود پر بھی سود کمایا جاتا ہے، اور سود خور شخص اپنی اصل رقم پر سود کے ذریعہ چند در چند اضافہ کر دیتا، سود کی یہ شکل بھی جاہلیت کے زمانے میں مروّج تھی[2]۔

قرآن کریم اور احادیث کی رو سے سود کی دونوں قسمیں ربا الجاہلیہ میں داخل اور حرام ہیں، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

---

(۱) **ملاحظہ فرمائیں:** ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ)، (۶۲:۳)۔

(۲) **دیکھئے:** ابن جریر، (محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ) ۶۲:۳، وتفسیر کبیر للعلامہ الامام الرازی (۲۰۱:۲۱)۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لاَ تَأْكُلُوْا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾۔ (۱)

یعنی اے ایمان والو! سود مت کھاؤ کئی حصے زائد (چند در چند) اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم کامیاب ہو۔

اس آیت کے نزول کا یہی خاص سبب ہے کہ جاہلیت عرب میں سود خوری کا عام طور پر یہ طریقہ تھا کہ ایک خاص اور متعین مدت کیلئے ادھار سود پر دیا جاتا تھا، اور جب وہ میعاد آجاتی اور قرضدار اسکی ادائیگی پر قادر نہ ہوتا تو اس کو مزید مہلت اس شرط پر دی جاتی تھی کہ سود کی مقدار بڑھادی جائے، اس طرح دوسری میعاد پر بھی ادائیگی نہ ہوتی تو سود کی مقدار اور بڑھادی جاتی تھی، یہ واقعہ عام کتبِ تفسیر میں بالخصوص لباب النقول میں بروایت مجاھد مذکور ہے (۲)۔

جاہلیتِ عرب کی اس ملت کش رسم کو مٹانے کیلئے یہ آیت نازل ہوئی، اس لئے اسمیں اضعافاً مضاعفۃ یعنی کئی حصے زائد فرما کر ان کے مروجہ طریقے کی مذمت اور ملت کشی اور خود غرضی پر متنبہ فرما کر اس کو ممنوع قرار دیا۔

بعض حضرات اس آیت سے استدلال کر کے یہ فرماتے ہیں کہ سود اگر اضعافاً مضافۃ (سود مرکب) نہ ہو تو حرام نہیں ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے، کیونکہ سورۂ بقرہ و سورۂ نساء میں مطلقاً ربا کی حرمت صاف صاف مذکور ہے، ان آیات میں اسکی کوئی قید نہیں کہ اگر سود چند در چند یا مرکب طریقے سے نہ کھایا جائے تو وہ جائز ہے، بلکہ مطلقاً سود کو حرام قرار دیا گیا ہے، خواہ وہ اضعاف مضاعف (چند در چند) یا مرکب ہو یا نہ ہو، اس آیت میں اضعافا مضاعفہ کا لفظ ان کے شرمناک طریقے پر نکیر کرنے کیلئے لایا گیا ہے، اسکی مثال ایسی ہے جسے قرآن کریم میں جابجا فرمایا ہے: ﴿وَلاَ تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلاً﴾ یہ میری آیتوں کے بدلے میں تھوڑی سی قیمت مت لو، اسمیں تھوڑی سی قیمت اس لئے فرمایا کہ آیات الٰہیہ کے بدلہ اگر ہفت اقلیم کی سلطنت بھی لے لے، تو وہ بھی تھوڑی ہی قیمت ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں کہ قرآن کی آیت کے بدلہ میں تھوڑی قیمت لینا حرام ہے، اور زیادہ لینا جائز، اس طرح اس آیت میں اضعافا مضاعفۃ کا لفظ ان کے شرمناک طریقے پر نکیر کرنے کیلئے لایا گیا ہے، حرمت کی شرط یا قید نہیں۔

(۱) سورة البقرة آيت:۲۸۱۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: لباب النقول۔ بحوالہ مسئلہ سود، مصنفہ: حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

لہذا مندرجہ بالا آیت سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ قرآن کریم نے صرف اس سود کو حرام قرار دیا ہے جو چند در چند ہو کر اصل رقم سے بڑھ جائے، اور اگر سود کی مقدار اس سے کم ہو تو وہ جائز ہے، حالانکہ دراصل اس آیت میں سود کی بنیادی کیفیت اور ایک خاص صورت کا بیان ہے جو زمانۂ جاہلیت میں بکثرت رائج تھی، لہذا چند در چند کا لفظ حرمتِ سود کی قانونی شرط نہیں ہے (بلکہ زائد رقم کا تصور دلانے کے لئے ہے) یہ بات کہ مذکورہ آیت میں چند در چند کا لفظ قانونی شرط نہیں ہے، مندرجہ ذیل دلائل سے ثابت ہے:

۱۔ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ﴾[1]

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ربا کی جو کچھ مقدار رہ گئی ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم مومن ہو۔

۲۔ ﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾[2]

اور اگر تم توبہ کرو تو تمہاری (قرض کی) اصل رقم تمہارا حق ہے، نہ تم کسی پر ظلم کرو، اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔

مندرجہ بالا دونوں آیتوں میں سود کی تمام رقم چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا ہے، نیز تنبیہ کی گئی ہے کہ ربا کو چھوڑنے کا مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کو صرف قرض کی اصل رقم واپس ملے، اس سے زائد کچھ نہیں، دوسری آیت میں ﴿لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ﴾ کے ذریعہ اس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اصل رقم پر ہر اضافہ خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو، قرآن کی نظر میں ظلم ہے، چنانچہ حضرت قتادہ بن دعامہ الدوسیؒ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

,,ما كان لهم من دينٍ فجعل لهم أن يأخذوا رؤس أموالهم ولا يزدادوا عليه شيئًا''[3]

(۱) سورة البقرة آيت: (۲۷۸)۔

(۲) سورة البقرة، آيت: (۲۷۹)۔

(۳) ابن جرير، (محمد بن جرير الطبرى ۳۱۰ھ) جامع البيان، مصر (۶۷:۳)۔

جس شخص کا کچھ قرض دوسرے پر ہو اس کے لئے قرآن نے اصل رقم لینے کی اجازت دی ہے، لیکن اس پر ذرا سا بھی اضافہ کرنے کی اجازت نہیں دی۔

آنحضرت ﷺ کے ایک ارشاد سے بھی آیت کا یہی مفہوم سمجھ میں آتا ہے:

,,ألا أن كل ربا كان في الجاهلية موضوع عنكم كله، لكم رؤس أموالكم لا تظلِمون ولا تُظلمون، وأول ربا موضوع ربا العباس بن عبد المطلب كله''(1)

سنو! کہ ہر وہ ربا جو ایام جاہلیت میں واجب تھا تم سے پورے کا پورا ختم کر دیا گیا، تمہارے لئے صرف قرض کی اصل رقم ہے، نہ تم ظلم کرو، نہ تم پر ظلم کیا جائے، اور سب سے پہلے جو ربا مکمل طور پر ختم کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبد المطلب کا ربا ہے پورے کا پورا۔

۳۔ صحابہ کرامؓ کے متواتر عمل سے ثابت ہے کہ وہ سود کی ہر مقدار کو حرام سمجھتے تھے، اور قرض پر معاہدے میں طے کر کے لیا جانے والا ہر اضافہ ان کے نزدیک ربا تھا، چند مثالیں درج ذیل ہیں:

الف: امام بخاریؒ نے کتاب الاستقراض ,,باب إذا أقرضه إلى أجل مسمًّى'' میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا یہ قول تعلیقاً نقل کیا ہے:

,,قال ابن عمرؓ: القرض إلى أجل لا بأس به وإن أعطى أفضل من دراهمه ما لم يشترط''(2)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے فرمایا معین مدت تک قرض دینے میں کوئی حرج نہیں، خواہ قرضدار اس کے دراہم سے بہتر دراہم ادا کرے، بشرطیکہ (یہ بہتر

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن کثیر، (عماد الدين ابن كثير) التفسير لابن كثير، مصر ١٣٥٦ه (١:٣٣١)۔

(۲) بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعيل) الصحيح البخاری المسمى بالجامع الصحيح، اصح المطابع، دهلی ١٣٥٧ه (١:٣٢٣)۔

دراہم ادا کرنا) معاہدۂ قرض میں شرط نہ کیا گیا ہو۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اگر معاہدے میں یہ طے کردیا جائے کہ قرض کے دراہم سے بہتر دراہم ادا کردیئے جائیں گے تو وہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے نزدیک ربا میں داخل ہو کر حرام ہوگا۔

ب: ابو بردہؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے مجھے نصیحت کی کہ تم ایک ایسی سرزمین میں آباد ہو جہاں ربا بہت عام ہے، لہذا اگر کسی شخص پر تمہارا قرض واجب ہو اور وہ تمہیں بھوسے، جو یا چارے کا کچھ بوجھ ہدیۃً دینا چاہے تو تم اسے قبول نہ کرو، کیونکہ وہ ربا ہے[1]۔

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا یہ حکم یا تو تقویٰ اور احتیاط پر مبنی ہے یا پھر اس قسم کے تحفے کا عام رواج اتنا ہوگا کہ اس معاہدے کا جزو سمجھا جانے لگا ہوگا، اس لئے فقہی قاعدہ ,,المعروف کالمشروط" کے مطابق انہوں نے اس تحفے کو بھی ,,ربا" قرار دیا، بہر حال اس سے اتنا ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک قرض پر لیا جانے والا ہر اضافہ ,,ربا" تھا۔

ج: ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے کہا کہ میں نے ایک شخص سے پانچ سو درہم اس شرط پر قرض لئے ہیں کہ اسے اپنا گھوڑا سواری کے لئے دوں گا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ جتنی سواری وہ کرے گا وہ سود ہوگی[2]۔

د: ایک شخص کے کسی پر بیس درہم واجب تھے، مقروض اس کے پاس بار بار مختلف تحفے لاتا رہا، قرض خواہ ہمیشہ ان تحفوں کو بیچ دیتا، یہاں تک کہ تحفوں کی قیمت تیرہ درہم تک پہونچ گئی، قرض خواہ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مسئلہ پوچھا تو انہوں نے کہا کہ: اب تم اس سے سات درہم سے زائد نہ لینا[3]۔

سنن بیہقی میں حضرت عمر اور حضرت انسؓ کے بھی اسی قسم کے واقعات ذکر کئے گئے ہیں، اس قسم کی روایات سے

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الصحیح للبخاری، مناقب عبد اللّٰہ بن سلام، دھلی ۱۳۵۷ھ (۱:۵۳۸)۔

(۲) دیکھئے: البیھقی، احمد بن حسین البیھقی ۴۵۸ھ والسنن الکبری، دائرۃ المعارف، دکن ۱۳۵۲ھ (۵:۳۵۱)۔

(۳) حوالہ بالا۔

یہ واضح ہو جاتا ہے کہ قرض پر ہر قسم کا اضافہ جو معاہدے میں طے کر لیا گیا ہو عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں ,,ربا النسیئہ" شمار کیا جاتا تھا، بلکہ اہلِ تقویٰ کے نزدیک طے نہ کی ہوئی رقم یا تحفہ وصول کرنا بھی مذموم سمجھا جاتا تھا، اور وہ شبہات سے بچنے کے لئے اس سے بھی پرہیز کرتے اور کراتے تھے۔

لہٰذا مندرجہ بالا دلائل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ غلط ہے کہ قرآن کریم نے صرف اس سود کو حرام قرار دیا ہے جو چند در چند ہو کر اصل رقم سے بڑھ جائے، اور اگر سود کی مقدار اس سے کم ہو تو وہ جائز ہے، اور مزید یہ کہ اگر سود کے مروجہ طریقوں پر غور کیا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جب سود خواری کی عادت بڑھ جائے تو پھر سود تنہا نہیں رہتا، بلکہ لازماً اضعاف مضاعف (چند در چند) ہو جاتا ہے کیونکہ جو رقم سود سے حاصل ہو کر سود خور کے مال میں شامل ہوئی، اب سود کی اس زائد رقم کو بھی سود پر چلایا جائیگا، تو سود مضاعف ہو جائے گا، اس طرح ہر سود اضعاف و مضاعف بن کر رہے گا، علاوہ ازیں جب سودی کاروبار میں اصل قرض بدستور باقی ہے اور میعاد کا سود لیا جا رہا ہے تو ایک زمانے کے بعد ہر سود اصل رأس المال (سرمایہ) کا اضعاف و مضاعف ہو جائے گا۔

سود کی ممانعت قرآن اور حدیث کی روشنی میں

ربا کے متعلق نصوص قرآنی:

ربا کا لفظ اپنی مختلف صورتوں میں قرآن حکیم میں تقریباً بیس جگہ استعمال ہوا ہے [1]، سورۂ بقرۃ کی آیات: ۲۷۵، ۲۷۶ اور ۲۷۸ تا ۲۸۱ سر فہرست ہیں، ان کا ترجمہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

﴿ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَايَقُوْمُوْنَ إِلاَّ كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَ أَمْرُهُ إِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾ [2]

جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کا حال اس شخص کا سا ہوتا ہے جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو، اور اس حالت میں ان کے مبتلا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ تجارت بھی تو آخر سود ہی جیسی چیز ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام، لہٰذا جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے یہ نصیحت پہونچے اور آئندہ کیلئے وہ سود خوری سے باز آجائے تو جو کچھ پہلے کھا چکا سو کھا چکا،

(۱) ملاحظہ ہو: سورة البقرة: ۲٦٥، ۲۷٥،۲۷٦،۲۷۸،۲۷۹،۲۸۰۔ سورة آل عمران: ۱۳۰۔ سورة النساء: ۱٦۱، سورة الرعد:۱۷، سورة النحل:۹۲، سورة بنی اسرائیل:۲٤، سورة الحج:٥، سورة الشعراء:۱۸، سورة الروم:۳۹، سورة حم السجدہ:۳۹، سورة الحاقة:۱۰۔

(۲) سورة البقرة آیت:۲۷٥۔

اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے، اور جو اس کے بعد بھی اس حرکت کا اعادہ کرے گا وہ جہنمی ہے، جہاں وہ ہمیشہ رہے گا۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾[1]

اللہ سود کو مٹاتا ہے اور خیرات کو بڑھاتا ہے، اور (یاد رکھو) تمام ایسے لوگوں کو جو نصیحت الٰہی کے ناسپاس اور نافرمان ہیں اسکی پسندیدگی حاصل نہیں ہو سکتی۔

﴿يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ اَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾[2]

مسلمانو! اگر فی الحقیقت تم خدا پر ایمان رکھتے ہو تو اس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ رہ گیا اسے چھوڑ دو، اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے لئے تیار ہو جاؤ (کیونکہ ممانعت کے صاف صاف حکم کے بعد) اس کی خلاف ورزی کرنا اللہ اور اس کے رسول کے برخلاف جنگ آزما ہو جانا ہے، اور اس (باغیانہ روش سے) توبہ کرتے ہو تو پھر تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ اپنی اصل رقم لے لو، اور سود چھوڑ دو، نہ تو تم کسی پر ظلم کرو، نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا۔

﴿وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾[3]

اور اگر ایسا ہو کہ ایک مقروض تنگ دست ہے (اور فوراً قرض ادا نہیں کر سکتا)

(۱) سورة البقرة آيت:۲۷٦۔

(۲) سورة البقرة آيت:۲۷۸،۲۷۹۔

(۳) سورة البقرة آيت:۲۷۸،۲۷۹۔

تو چاہیے کہ اسے فراخی حاصل ہونے تک مہلت دی جائے، اور اگر تم سمجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے بہتری کی بات تو یہ ہے کہ (ایسے تنگ دست بھائی کو) اسکا قرض بطور خیرات بخش دو۔

﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لاَ يُظْلَمُونَ﴾[1]

اور دیکھو اس دن کی پرسش سے ڈرو جبکہ تم سب اللہ کے حضور لوٹائے جاؤ گے، پھر ایسا ہوگا کہ ہر جان اپنے عمل سے جو کچھ کمایا ہے اس کا بدلہ پورا پورا اسے مل جائیگا، یہ نہ ہوگا کہ کسی کی بھی حق تلفی ہو۔

اس کے بعد سورۂ آل عمران کی آیت نمبر ۱۳۰ میں فرمایا گیا ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا الرِّبٰوا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ﴾[2]

مسلمانو! سود کی کمائی سے اپنا پیٹ نہ بھرو، جو قرض کی اصل رقم میں مل کر دوگنی چوگنی ہو جاتی ہے اللہ سے ڈرو (اور اسکی نافرمانی سے بچو) تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاؤ۔

سورۃ الروم میں ربا کا ذکر اس طرح آیا ہے:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِّبًا لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلاَ يَرْبُوا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكٰوةٍ تُرِيدُونَ وَجْهَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُونَ﴾[3]

(۱) سورۃ البقرۃ آیت: ۲۸۰۔

(۲) سورۃ البقرۃ آیت: ۲۸۱۔

(۳) سورۃ الروم آیت: ۳۹۔

جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے اموال میں شامل ہو کر بڑھ جائے، اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا، اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے ارادے سے دیتے ہو، اسی کے دینے والے دراصل اپنا مال بڑھاتے۔

سورۃ النساء میں ارشادِ خداوندی ہے:

﴿فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا﴾[1]

الغرض یہودیوں کے اس ظلم کی وجہ سے ہم نے (کئی ایک) اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں جو (پہلے) حلال تھیں، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے، نیز انکی یہ بات کہ سود لینے لگے حالانکہ اس سے روک دیے گئے تھے، اور یہ بات کہ ناجائز طریقے پر لوگوں کا مال کھانے لگو (حالانکہ انھیں ہر انسان کے ساتھ دیانتدار ہونے کا حکم دیا گیا تھا) اور یاد رکھو انہیں جو لگ (اس طرح احکام حق) کے منکر ہو گئے ہم نے ان کے لئے (پاداش عمل میں) درد ناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

(۱) سورة النساء آيت: ۱٦۰، ۱٦۱۔

ربا کی حرمت پر معروف احادیث

نصوص قرآنی کے ساتھ ساتھ رسول اکرم ﷺ کی بہت سی احادیث موجود ہیں جن میں سودی کاروبار پر وعید اور ربا کی حرمت وممانعت کاذکر ہے، ان روایتوں کو امام مالکؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، ابوداؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، احمد بن حنبلؒ، دار قطنی اور دیگر محدثین کرام نے اپنے مجموعہ ہائے احادیث میں مختلف اسناد سے نقل کیا ہے، یہاں ان میں سے چند ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ ,,عن ابن مسعودؓ قال: لعن رسول اللہ ﷺ آکل الربا وموکلہ"[1]

وفی روایہ لمسلم وغیرہ: لعن ,,رسول اللہ ' آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدیہ وقال: ھم سواء"

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے اور سود کھلانے والے پر لعنت فرمائی ہے (یعنی سود لینے والے اور سود دینے والے پر) اسکو مسلم نسائی، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، اور ابن حبان نے روایت کیا ہے اور اسے صحیح قرار دیاہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود دینے والے، سودی تحریر یا حساب لکھنے والے

(۱) بخاری/کتاب الطلاق، حدیث:(۵۵۰۵)، مسلم/مساقاۃ، حدیث:(۲۹۹۴-۲۹۹۵)۔ النسائی/کتاب الطلاق وکتاب الزینہ، حدیث:(۳۳۶۳-۵۰۱۴-۵۰۱۵-۵۰۱۶)۔
ابو داؤد / کتاب البیوع، حدیث: (۲۸۹۵)الترمذی وصححہ/کتاب البیوع،حدیث: (۱۱۲۷)۔ ابن ماجہ/کتاب التجارات، حدیث: (۲۲٦۸)۔
احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر،مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)۔/ مسند العشرۃ المبشرین بالجنۃ، حدیث: (٦۰۱-٦۲٤-٦۳٤-٦۸۳-۸۰۳)۔ دارمی/ کتاب البیوع، حدیث:(۲٤۲۳)۔

اور سود کی شہادت دینے والوں پر لعنت فرمائی اور فرمایا کہ وہ سب لوگ (گناہ میں) برابر ہیں۔

۲۔ عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ عن النبی ﷺ قال: ,,الربا بضع وسبعون بابًا والشرك مثل ذلك" [۱]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سود کے مفاسد ستر سے زائد ہیں اور شرک اس کے برابر ہے۔

۳۔ عن عبد اللّٰہ بن مسعودؓ عن النبی ﷺ قال: ,,الربا ثلاث وسبعون بابًا ایسرها مثل آن ینکح الرجل أمه" رواه الحاكم [۲]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سود کے تہتر قسم کے وبال ہیں ان میں سب سے ادنٰی قسم ایسی ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے بدکاری کرے۔

٤۔ عن عبد اللّٰہ بن سلامؓ عن رسول اللّٰہ ﷺ قال: ,,الدرهم یصیبه الرجل من الربا أعظم عند اللّٰہ من ثلاثةٍ وثلاثین زنیةٍ یزنبها فی الإسلام" رواه الطبرانی [۳]

حضرت عبداللہ بن سلامؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایک

---

(۱) رواه البزّار ورواته رواة الصحیح وهو عند ابن ماجه بإسناد صحیح باختصار : ,,والشرك مثل ذلك"۔

(۲) الحاکم، (محمد بن عبد اللّٰہ الحاکم ۴۰۵ھ)، مستدرك، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱٤۱۱ھ۔ وقال صحیح علی شرط البخاری ومسلم۔

والبیهقی، (احمد بن حسین البیهقی ۴۵۸ھ)السنن الکبری، دائرة المعارف، دکن ۱۳۵۲ھ (۵:۲۵۱)۔

(۳) الطبرانی :(سلیمان بن احمد ۳۶۰ھ)، الکبیرمن طریق عطاء والخراسانی عن عبد اللّٰہ ولم یسمع منه، ورواه ابن ابی الدنیا، والبغوی وغیرهما موقوفاً علی عبد اللّٰہ وهو الصحیح ولفظ الموقوف فی أحد طرقه۔

درہم کوئی سود سے حاصل کرے اللہ تعالیٰ کے نزدیک مسلمان ہونے کے باوجود تینتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ شدید جرم ہے، اور حضرت عبد اللہ بن حنظلہؓ کی روایت میں ہے کہ ایک درہم کھانا چھتیس زنا سے زیادہ شدید ہے، بشرطیکہ اسے معلوم ہو کہ یہ درہم سود کا ہے (۱)۔

۵۔ عن عبد اللہ بن مسعودؓ عن النبی ﷺ قال: ,,ما أحد أكثر من الربا إلا كان عاقبة أمره إلى قلة"۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص نے سود کے ذریعہ سے زیادہ مال کمایا، انجام کار اسمیں کمی ہوگی (۲)۔

۶۔ عن سمرة بن جندبؓ قال قال النبی ﷺ: ,,رأيت الليلة رجلين أتيانی فأخرجانی إلى أرض مقدسة فانطلقنا حتى أتينا على نهر من دم فيه رجل قائم، وعلى وسط النهر رجل بين يديه حجارة فأقبل الرجل الذی فی النهر فإذا أراد أن يخرج رمى الرجل بحجر فی فيه فرده حيث كان، فجعل كلما جاء ليخرج رمى فی فيه بحجر فيرجع كما كان فقلت: ما هذا الذی رأيته فی النهر قال: آكل الربا" رواه البخاری (۳)

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے آج رات خواب میں دیکھا کہ دو آدمی میرے پاس آئے، اور مجھ کو ایک مقدس سرزمین کی طرف لے چلے، یہاں تک کہ ہم ایک خون کی نہر پر پہونچے، اس کے

(۱) احمد و الطبرانی :(سلیمان بن احمد سن۳۶۰ھ)، فی الکبیر ورجال احمد رجال الصحیح۔

(۲) رواه ابن ماجه والحاکم وقال: صحیح الأسناد۔

(۳) بخاری، (أبو عبد اللہ محمد بن اسماعیل) صحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح) فی البیوع مختصراً وفی الصلاة مطولاً۔

درمیان ایک شخص کھڑا تھا، اور نہر کے کنارے پر ایک شخص ہے، اس کے سامنے بہت سے پتھر پڑے ہیں، نہر کے اندر والا شخص نہر کے کنارے کی طرف آتا ہے، جس وقت نکلنا چاہتا ہے کنارے والا شخص اس کے منہ پر ایک پتھر اتنے زور سے مارتا ہے کہ وہ گھوم کر واپس اپنی جگہ جا پہونچتا ہے، پھر جب کبھی نکلنا چاہتا ہے، اسی طرح اس کے منہ پر پتھر مار مار کر اس کو اپنی پہلی جگہ لوٹا دیتا ہے، آنحضرت ﷺ نے پوچھا کہ وہ کون شخص تھا جسکو میں نے نہر میں دیکھا؟ فرمایا سود خوار، اس کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے۔

۷۔ عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال: ,,اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا يا رسول الله! وما هن؟ قال: الشرك بالله والسحر وقتل النفس التي حرم الله إلا بالحق وأكل الربا، وأكل مال اليتيم والتولي يوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات" رواه البخاري ومسلم وأبوداؤد والنسائي[۱]

حضرت ابو ھریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ سات ایسی چیزوں سے بچو جو ہلاک کرنے والی ہیں، صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ سات چیزیں کون سی ہیں؟ حضرت نے فرمایا: اللہ تعالی کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، جادو کرنا، ایسی جان کو ناحق مار ڈالنا جسکا مانا اللہ تعالی نے حرام فرمادیا، سود کھانا، اور یتیم کا مال کھانا، اور جنگ کے روز پیٹھ دکھا کر بھاگنا، اور بھولی بھالی پاک دامن مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔

۸۔ عن ابن عباسؓ قال: "نهى رسول الله ﷺ أن تشترى الثمرة حتى تطعم وقال: إذا ظهر الزنا والربا في قرية فقد أحلوا بأنفسهم عذاب الله"، رواه

(۱) بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعیل) صحيح البخاري المسمى بالجامع الصحيح) في البيوع مختصراً وفي الصلاة مطولاً۔

الحاکم وقال صحیح الأسناد[۱]

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھائے جانے کے قابل ہونے سے پہلے پھلوں کی خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے، اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ کسی بستی میں سود اور زنا پھیل جائے تو گویا بستی والوں نے اللہ کے عذاب کو اپنے اوپر اتار لیا۔

۹۔ عن عمرو بن العاصؓ قال: سمعت رسول اللّٰہ ﷺ یقول: "ما من قوم یظهر فیهم الربا إلا أخذوا بالسنة وما من قوم یظهر فیه الرشا إلا أخذوا بالرعب"، رواه أحمد[۲]

حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول پاک ﷺ کو یہ فرماتے ہوے سنا کہ جس قوم میں سود پھیل جائے وہ یقیناً قحط سالی میں مبتلا ہو جاتی ہے، اور جس قوم میں رشوت پھیل جائے وہ مرعوبیت میں گرفتار ہو جاتی ہے۔

۱۰۔ عن أبی هریرةؓ قال رسول اللّٰہ ﷺ: "رأیت لیلةً أسری بی لما انتهینا إلی السماء السابعة فنظرت فوقی فإذا أنا برعدٍ وبرق وصواعق قال: فأتیت علی قومٍ بطونهم کالبیوت فیها الحیات من خارج بطونهم، قلت: یا جبریل! من هؤلاء؟ قال: هؤلاء أکلة الربا"، رواه أحمد فی حدیث طویل[۳]

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا معراج کی رات جب

---

(۱) الحاکم، (محمد بن عبد اللّٰہ الحاکم ۴۰۵ھ) مستدرک، بیروت، دار الکتب العلمیه ۱۴۱۱ھ۔ وقال صحیح الاسناد۔

(۲) احمد بن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)، باسناد فیه نظر۔حدیث: (۱۷۱۵۵)۔

(۳) ایضاً فی حدیث طویل وابن ماجه مختصراً۔

ساتویں آسمان پر پہونچکر میں نے اوپر نظر اٹھائی تو میں نے چمک، کڑک اور گرج دیکھی، پھر میرا گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جن کے پیٹ مکانوں کی طرح (بڑے بڑے) تھے، ان میں سانپ بھرے ہوئے تھے، جو باہر سے نظر آرہے تھے، میں نے جبرئیل سے دریافت کیا یہ کون لوگ ہیں؟ جبرئیل نے جواب دیا کہ یہ سود خوار ہیں۔

۱۱۔ عن ابن مسعودؓ عن النبی ﷺ قال: ''بین یدی الساعة یظهر الربا والزنا والخمر،، رواه الطبرانی[1]

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا قیامت کے قریب سود، زنا، اور شراب کی کثرت ہو جائے گی۔

۱۲۔ ،،عن القاسم بن عبد الواحد الوراق قال: رأیت عبد اللّٰه بن أبی أوفیؓ فی السوق فی الصیارفة فقال: یامعشر الصیارفة أ بشروا، قالوا: بشرك اللّٰه بالجنة بم تبشرنا یا محمد؟ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: ''ابشروا بالنار،، رواه الطبرانی[2]

حضرت قاسم بن عبد الواحد وراق فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن اوفیؓ کو صرافوں کے بازار میں دیکھا، آپ نے فرمایا اے صرافو! خوش خبری سنو، صرافوں نے کہا کہ اے اُبو محمد! اللہ آپ کو جنت سے سرفراز فرمائے، آپ ہمیں کس چیز کی خوش خبری دے رہے ہیں؟ حضرت عبد اللہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں دوزخ کی خوشخبری ہو (تم دوزخ کے لئے تیار ہو جاؤ کیونکہ سونے چاندی کی خرید و فروخت میں ادھار جائز نہیں، اور صرافہ والے

(۱) الطبرانی، سلیمان بن احمد ۳۶۰ھ رواته رواة الصحیح۔

(۲) الطبرانی، سلیمان بن احمد ۳۶۰ھ، باسناد لا بأس به۔

عموماً حساب کھاتہ پر ادھار کے معاملات کرتے رہتے ہیں وہ سود ہے)۔

۱۳۔ عن أبی ہریرۃؓ قال: قال رسول اللہ ﷺ "لیأتین علی الناس زمان لا یبقی منھم أحد إلا أکل الربا فمن لم یأکلہ أصابہ من غبارہ"رواہ أبو داؤد وابن ماجہ[1]

حضرت ابو ہریرۃؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ایک زمانہ آئے گا کہ کوئی شخص سود خواری سے بچ بھی گیا تو اس کا غبار ضرور پہونچکر رہے گا۔

یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ حدیث کی پیشین گوئی کے مطابق سود کا رواج اتنا بڑھا کہ بڑے سے بڑا متقی آدمی بھی سود کے شائبہ یا کسی نہ کسی درجہ میں استعمال سے نہیں بچ سکتا، مگر جو سود اس درجہ میں عام ہو وہ تجارتی سود ہے مہاجنی اور عرفی سود نہیں، اس سے یہ ثابت ہوا کہ تجارتی سود بھی حرام ہے۔

۱٤۔ عن أبی أمامۃؓ عنْ النبی ﷺ قال:" یبیت قوم من ھذہ الأمۃ علی طعم وشرب ،ولھو ولعب فیصبحوا قد مسخوا قردۃ وخنازیر ولیصیبنھم خسف وقذف حتی یصبح الناس، فیقولون: خسف اللیلۃ بینی فلان وخسف اللیلۃ بدار فلان ولترسلن علیھم حجارۃ من السماء کما أرسلت علی قوم لوط علی قبائل فیھا،وعلی دور لترسلن علیھم الریح العقیم التی أھلکت عادا علی قبائل فیھا وعلی دور بشربھم الخمر ولبسھم الحریر واتخاذھم القینات وأکلھم الربا وقطیعۃ الرحم نسیھا جعفر" رواہ أحمد[2]

حضرت ابو امامہؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا اس امت کی ایک

---

(۱) ابو داودسجستانی، (سلیمان بن الأشعث بن اسحاق) سنن أبی داود وابن ماجہ کلاھما من روایۃ الحسن عن أبی ہریرۃؓ، واختلف فی سماعہ والجمھور علی انہٗ لم یسمع منہٗ۔

(۲) احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر،مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)، بیھقی، احمد بن حسین البیھقی ۴۵۸ھ،السنن الکبری، ملتان، نشر السنۃ، واللفظ لہٗ۔

جماعت کھانے پینے اور لہو ولعب (کھیل کود) کی حالت میں رات گذارے گی تو وہ ایسی حالت میں صبح کرے گی کہ بندر اور سور کی صورت میں مسخ ہو گئی ہو، اور ایسی امت کے بعض افراد کو خسف (زمین میں دھنس جانے) اور قذف (آسمان سے پتھر برسنے) کا ضرور پہونچے گا، یہانتک کہ جب لوگ صبح کو اٹھیں گے تو آپس میں یوں کہیں گے کہ آج رات فلاں خاندان زمین میں دھنس گیا، اور فلاں کا گھر بار زمین میں دھنس گیا، اور انپر آسمان سے پتھر برسائے جائیں گے، جسطرح قوم لوط پر برسائے گئے تھے، اس کے قبائل پر اور گھروں پر اور ان پر نہایت تیز و تند آندھی بھیجی جائیگی۔ جس نے قوم عاد کو تباہ کر دیا تھا، اس کے قبائل پر اور گھروں پر یہ دھنسانے اور پتھر برسانے کے عذاب ان کے شراب پینے اور ریشم پہننے اور سود کھانے اور قطع رحمی کرنے کی وجہ سے ہو گا۔

۱۵۔ عن عمر بن الخطابؓ "أن آخر ما نزلت آية الربا وأن رسول الله ﷺ قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربا والريبة،،[۱]

حضرت عمر بن خطابؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ پر جو آخری آیت نازل ہوئی وہ سود کے متعلق ہے، اور حضور ﷺ نے اسکی پوری تشریح بیان نہیں فرمائی تھی کہ آپ کا وصال ہو گیا، لہذا سود بھی چھوڑ دو، اور ان چیزوں کو بھی چھوڑ دو جسمیں سود کا شبہ ہو۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن ماجہ ، (عبد اللّٰہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجہ) سنن ابن ماجہ، والدارمی۔

سود کی حلت میں نہ کوئی مصلحت ہے نہ ضرورت

موجودہ دور کے بعض جدت پسند یہ کہتے ہیں کہ اس زمانے میں بعض مصالح اور ضروریات کے پیش نظر بینک کے سود یا تجارتی سود کو جائز قرار دینا چاہیے۔

یہ بات بھی صحیح نہیں۔ اسلئے کہ شرعی حکم کا مدار مصالح، حکمتوں یا ضروریات پر نہیں ہوتا بلکہ علت پر ہوتا ہے، اور ربا کی تعریف یا علت ,,الفضل الخالي عن العوض،، بیان کی گئی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ایسی زیادتی یا اضافہ جو عوض سے خالی ہو وہ ربا ہے، خواہ وہ ربا الفضل ہو یا ربا النسیئہ، تجارتی ربا ہو یا صرفی، مفرد ربا ہو یا مرکب، مہاجنی سود ہو یا بنک کا انٹرسٹ، جہاں بھی یہ علت پائی جائے گی ربا کا حکم پایا جائے گا، اور جب یہ علت نہیں پائی جائے گی تو حکم بھی نہیں پایا جائے گا، کیونکہ حکم کا مدار علت پر ہے مصلحت حکمت یا ضرورت پر نہیں ہے۔

حکم کا مدار مصلحت یا حکمت پر اسلئے نہیں ہوتا کہ انسان کی فہم اور عقلوں میں تفاوت ہوتا ہے، کسی چیز کو ایک زمانہ میں کچھ لوگ اچھا سمجھتے ہیں تو دوسرے لوگ اسی زمانہ میں یا دوسرے زمانہ میں اسے برا خیال کرتے ہیں، بعض چیزوں کو انسان اچھا سمجھتا ہے، درحقیقت وہ بہتر نہیں ہوتی، اسی طرح بعض چیزوں کو انسان برا سمجھتا ہے حالانکہ حقیقۃً اسی میں اس کے لئے بہتری ہوتی ہے، انسان کی فہم مکمل طور پر تمام مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر ہے، اسی وجہ سے کسی چیز یا حکم کے اچھا یا برا ہونے اور مصالح کے لئے وحی الٰہی اور حکم خداوندی کی ضرورت ہوتی ہے، پھر جو حکم وحی میں نازل ہو خواہ وہ ہماری فہم سے بالا ہو اسی میں انسان کی مصلحت ہوتی ہے۔

چنانچہ اگر شریعت کے احکام کو تمام انسانی مصلحتوں کے تابع بنادیا جائے تو حلال و حرام میں تمیز کرنا مشکل ہو جائے، بلکہ فتنہ فساد برپا ہو جائے، شراب اور جوے میں بھی بعض لوگوں کیلئے فائدہ اور مصلحت ہے، جسکا قرآن میں بھی ذکر ہے:

﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ [1]
لوگ آپ سے شراب اور قمار (جوے) کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ
فرمادیجئے کہ ان دونوں کے استعمال میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں
کے بعضے فائدے بھی ہیں۔

لیکن اس مصلحت کو معتبر نہیں مانا گیا کیونکہ یہ از روے نص گناہ اور حرام چیز ہے۔

البتہ اگر کوئی مصلحت نصِ شرعی کے مخالف بھی نہ ہو اور مقاصدِ اسلامیہ کے معارض نہ ہو تو اسے اختیار بھی کیا جا سکتا ہے۔

اگر تمام مصلحتوں پر غور کیا جائے تو کل تین قسم کی مصلحتیں بنتی ہیں جن میں سے بعض شریعت میں معتبر مانی گئی ہیں اور بعض غیر معتبر، ان تینوں اقسام کا خلاصہ ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

ا۔ مصلحت کی ایک قسم وہ ہے جو نصِ شرعی کے موافق ہے، یہ مصلحت معتبر ہے، اگرچہ دلیل شرعی یہ مصلحت نہیں بلکہ نص ہے، اگر یہ مصلحت ہماری سمجھ میں نہ آئے تب بھی نص پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسلئے اس مصلحت کو سمجھنا ضروری بھی نہیں ہے، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اس کا علم عطا ہی نہ کیا گیا ہو اسلئے کہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾، یعنی تمہیں تھوڑا علم عطا کیا گیا ہے۔

۲۔ مصلحت کی دوسری قسم وہ ہے کہ اگر نص کسی چیز کی حرمت بیان کرے اور اسکی مصلحت اور حکمت ہماری ناقص عقل میں سمجھ نہ آئے تو ہمیں مصلحت کی وجہ سے اس چیز کو حلال کرنے کا اختیار نہیں ہے، مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ کوئی ملک معاشی طور پر مقروض اور غریب ہے، اور اسکے اقتصادی ماہرین اور معاونین یہ مشورہ دے رہے ہیں کہ ملک میں انگور کی پیداوار کافی ہوتی ہے لہذا اس سے شراب بنا کر باہر برآمد کی جائے، یا سرمایہ کے حصول کے لئے ملک میں نائٹ کلب شراب خانے یا جوئے خانے کھولے جائیں، تاکہ ملکی معیشت بہتر ہو، تو ظاہر ہے کہ شرعاً اس پر عمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے، ایسی صورت میں مصلحت کو مدار بنا کر ان کاموں کو جائز نہیں کہا جائے گا، بلکہ بہر صورت احکام

(۱) سورة البقرة ۲۱۹۔

شریعت کی اتباع کا حکم دیا جائے گا، اور یہ مصلحت کا تقاضا بے کار اور فضول ہو کر رہ جائے گا۔

۳۔ مصلحت کی تیسری قسم وہ ہے جسکی نہ تو کوئی نص شرعی مخالف ہے اور نہ ہی اسکی تائید میں کوئی نصِ شرعی موجود ہے، البتہ یہ مصلحت مقاصدِ شرعیہ کے موافق ضرور ہے، تو اس مصلحت کا اعتبار کر لیا جائے گا، اسکی مثال یہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے دورِ خلافت میں قرآن پاک کو ایک مصحف میں جمع کرنے کا مسئلہ پیدا ہوا، اور اس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ یہ کام ہم کیسے کر لیں جسے حضور ﷺ نے سر انجام نہیں دیا، تو جواب دیا گیا کہ اسمیں خیر اور مصلحت ہے اور پھر قرآن پاک کو ایک مصحف میں جمع کر دیا گیا، اس مسئلہ کے بارے میں چونکہ نص شرعی نہ تو موافق ملی نہ ہی مخالف ملی، اور یہ کام مقاصد شرعیہ کے موافق تھا، لہذا اس مصلحت کو معتبر مان کر اختیار کر لیا گیا[1]۔

مذکورہ بالا تینوں قسموں کے لحاظ سے اگر ربا کے مسئلہ پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسری قسم کی مصلحت میں داخل ہے، جسکا اعتبار نہیں کیا گیا ہے کیونکہ بہت ساری قرآن وحدیث کی نصوص ربا کی مطلقا حرمت ثابت کر رہی ہیں، لہذا ربا کی کسی قسم کو کسی مصلحت کے پیش نظر جائز نہیں کہا جا سکتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ربا کی کسی بھی قسم کے حلال ہونے میں کوئی مصلحت اور فائدہ نہیں ہے، بلکہ حرمت میں ہی مصلحت اور خیر ہے اور یہ بات خود اللہ جل شانہ قرآن پاک میں فرماتے ہیں:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾[2]

یعنی اللہ تعالی ربا کو مٹاتے (یا کم) کرتے ہیں اور صدقات کو بڑھاتے ہیں۔

اور حضور ﷺ نے بھی فرمایا:

"الربا وإن كثر فإن عاقبته إلى قل،،[3]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: السالوس، ڈاکٹر علی احمد ،معاملاتنا المعاصرة فی البیوع والبنوك والنقود، محاضرات وندوات:۸، طبع فی دار الحرمین، الدوحہ قطر ۱۹۸۳ء۔

(۲) سورۂ بقرۃ آیت:۲۷۶۔

(۳) دیکھئے: احمدبن حنبل، مسنا، قرص الحاسوب صخر،مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)۔مسند مکثرین من الصحابہ، (۳۸۲۲)۔

یعنی ربا اگرچہ زیادہ ہو لیکن کمی کی طرف جائے گا۔

لہذا از روے قرآن وحدیث ربا کی کسی بھی شکل میں عوام الناس کیلئے انفرادی یا اجتماعی خیر ہو ہی نہیں سکتی، اسلئے اسے مصلحت کے موافق کیسے کہا جاسکتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ اسے مصلحت کے تحت جائز قرار نہیں دیا جاسکتا تو ضرورت اور حاجت کے تحت جائز ہونا چاہیے؟۔

اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے پہلے اس ضرورت یا مجبوری کا مفہوم معلوم ہونا چاہیے جو شریعت میں کسی حرام کام کو جائز قرار دینے کے لئے معتبر ہے۔

شریعت میں کونسی ضرورت معتبر ہے؟

کسی حرام کام کے ارتکاب کے لئے شریعت میں صرف وہ ضرورت معتبر مانی گئی ہے کہ اگر اسکا ارتکاب نہ کیا جائے تو (بھوک، ننگے پن، یا بیماری کی وجہ سے) اپنی جان یا کسی عضو کے تلف اور ہلاک ہونے کا خوف ہو، اور اس حرام چیز کے علاوہ کوئی حلال چیز اپنی بھوک مٹانے، علاج کرانے یا پہنے کے لئے نہ ہو تو یہ اضطرار یا مجبوری کی حالت کہلاتی ہے، ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اس چیز کو برا سمجھتے ہوئے اور دین کی اطاعت پر برقرار رہتے ہوے وہ چیز بقدر ضرورت استعمال کرلے تو شریعت اس سے درگذر کرتی ہے[1]۔

مذکورہ بالا اصول قرآن پاک کی ان آیات سے مستنبط ہے:

١۔ ﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ

(۱) ملاحظہ فرمائیں: شیخ الاسلام علامہ ظفر أحمد عثمانی، أحكام القرآن (١٢:١)۔ الجصاص، احمد بن علی ١٣٧٠ء، احكام القرآن مصر ١٣٤٧ه (٥٥٧:١) مطبع لاہور سہیل اکیڈمی (١٢٢:١)۔ وشرح حموی، احمد بن محمد ١٠٩٨ه، الأشباه والنظائر غمز عيون البصائر، لبنان، دار الكتب العلميه، بيروت ١٤٠٥ه۔ السيوطى، (الإمام جلال الدين عبد الرحمن بن ابى بكر ٩١١ه) الأشباه والنظائر، (٧٧)، ونظرية الضرورة الشرعية۔

اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[۱]

اللہ تعالیٰ نے تو تم پر صرف حرام کیا ہے مردار (جانور) کو اور خون کو جو بہتا ہو، اور خنزیر کے گوشت کو، اور ایسے گوشت کو جو غیر اللہ کے لئے نامزد کیا گیا ہو، پھر بھی جو شخص بھوک سے بہت ہی بے تاب ہو جائے (بشرطیکہ) نہ تو کھانے میں طالبِ لذت ہو اور نہ (قدرِ حاجت سے) تجاوز کرنے والا ہو تو اس شخص پر کچھ گناہ نہیں ہوتا، واقعی اللہ تعالیٰ بڑے غفور رحیم ہیں[۲]۔

۲۔ ﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِيْ مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[۳]

پس جو شخص شدت کی بھوک میں بے تاب ہو جاوے بشرطیکہ کسی گناہ کی طرف اسکا میلان نہ ہو تو یقیناً اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے رحمت والے ہیں[۴]۔

فقہاء کرام نے ان آیات سے دو قاعدے مستنبط فرمائے ہیں:

ا۔ الضرورات تبيح المحظورات۔

یعنی ضرورت (شدیدہ) حرام چیزوں کو مباح بنا دیتی ہے

ب۔ الضرورة تتقدر بقدر الضرورة۔

یعنی ضرورت پر بقدر ضرورت عمل کیا جائیگا[۵]۔

بعض فقہائے کرامؒ نے فاقہ کش، محتاج اور مسکین کو جو سود پر قرض لینے کے جواز کا حکم لگایا ہے اسکی وجہ بھی یہی

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت ۱۷۳۔

(۲) ترجمہ قرآن مجید، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ (ص:۳۹، پارہ سیقول، آیت:۱۷۳) مطبوعہ ادارۃ القرآن کراچی۔

(۳) سورۃ المائدۃ، آیت:۳۔

(۴) ترجمہ قرآن مجید، حضرت تھانویؒ ۱۲۱ پارہ ۶ آیت ۳۔

(۵) ملاحظہ فرمائیں: مجلة الاحکام العدلية، جماعة من العلماء، نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب کراچی۔ (۲۲،۲۱)۔

اصول ہے[١]۔

مشہور عرب عالم ڈاکٹر یوسف القرضاوی فرماتے ہیں:

''وإذا كانت هناك ضرورة ملحة اقتضت معطى الفائدة أن يلجأ إلى هذا الأمر، فإن الإثم في هذه الحالة يكون على آخذ الربا (الفائدة) وحده،،[٢]
اگر کوئی شدید ضرورت سود دینے والے کو سود کی ادائیگی پر مجبور کردے تو اس صورت میں گناہ صرف سود لینے والے کو ہوگا۔

آگے علامہ ڈاکٹر قرضاوی صاحب فرماتے ہیں کہ یہ ضرورت بھی وہ ہے جس میں انسان کو اپنی جان کا خوف ہو مثلاً شدید بھوک میں کھانا نہ ہو، سردی سے بچانے کیلئے لباس نہ ہو، ضروری علاج کیلئے پیسہ نہ ہو، اور پھر یہ رخصت بھی صرف بقدر حاجت ہے، اس سے زیادہ رخصت نہیں ہے۔

ضرورت شدیدہ کی جو تفصیل یہاں ذکر کی گئی ہے اسکی روشنی میں بلا تأمل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ربا کے کاروبار میں اس قسم کی ضرورت نہیں پائی جاتی کہ اگر سودی کاروبار نہ کیا جائے تو جان کی ہلاکت کا خوف ہو، اور یہ بات بھی پیچھے آچکی ہے کہ سود کے سلسلے میں اگر اضطرار پایا جائے تو زیادہ سے زیادہ سود دینے والا تو شرعاً مجبور سمجھا جاسکتا ہے، سود لینے والا کبھی بھی مجبور نہیں سمجھا جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ ربا الفضل یا تجارتی سود کو کسی ضرورت یا مصلحت کی خاطر جائز قرار نہیں دیا جاسکتا، قرآن کریم نے ربا الفضل اور ربا النسیئہ وغیرہ کی تفریق کے بغیر مطلقاً یہ ارشاد فرمایا کہ: ﴿أَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾ یعنی اللہ تعالی نے بیع کو حلال قرار دیا اور ربا کو حرام قرار دیا، اسمیں جلی و خفی، مفرد و مرکب، قلیل و کثیر یا حرام لعینہ اور حرام لغیرہ کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا گیا، بلکہ ہر قسم کے ربا کو حرام قرار دیا ہے۔

(١) ملاحظہ فرمائیں: ابن نجيم: البحر الرائق عن القنية (١٢٦:٦) باب الربا۔

(٢) القرضاوی، دكتور يوسف، الحلال والحرام في الاسلام۔(٢٢٧)۔

سود کی حرمت پر عقلی دلائل

گذشتہ اوراق میں ربا کی حرمت پر قرآن اور حدیث کے دلائل ذکر کئے گئے ہیں ان دلائل کے مطالعہ کے بعد کسی بھی مسلمان کے لئے یہ گنجائش نہیں کہ وہ سودی لین دین کو جائز کہے، اور اس کے جواز کے لئے طرح طرح کی عقلی توجیہات اور تاویلیں پیش کرے کیونکہ مسلمان کا کام شرعی احکام کی اتباع ہے، چاہے اسکی تعمیل میں بظاہر دنیاوی منفعت نظر نہ آئے لیکن پھر بھی مسلمان کا یہ دینی فریضہ ہے کہ قرآن اور حدیث کے احکام کے آگے سر تسلیم خم کرے، کیونکہ درحقیقت اس تعمیل میں ہی دنیا اور آخرت کی فلاح پوشیدہ ہے۔

البتہ اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ قرآن اور حدیث کے احکام کی تعمیل میں دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی فلاح اور بہتری ہے، چنانچہ حرمتِ سود کے حکم کی تعمیل میں بھی انسان کا دینی اور دنیاوی فائدہ ہے، مثلاً یہ کہ سودی کاروبار میں بہت سے اخلاقی، روحانی، تمدنی، معاشی اور اجتماعی نقصانات ہیں، ذیل میں ان میں سے چند نقصانات بطورِ خاص ذکر کئے جاتے ہیں:

سود کے اخلاقی اور روحانی نقصانات:

سب سے پہلے اخلاق اور روحانیت کے لحاظ سے غور کیجئے کیونکہ اخلاق اور روح ہی انسان کا اصل جوہر ہے، جو اسے دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے اگر کوئی شے اس جوہر کو ختم کرے تو وہ ہر حالت میں قابلِ ترک ہے چاہے دوسرے پہلو سے اسمیں کتنے ہی فوائد ہوں۔

سودی کاروبار جو ذہنیت جنم دیتا ہے اس سے اسلام کی اخلاقی اقدار پامال ہو کر خود غرضی، بے رحمی، سنگدلی، زرپرستی اور کنجوسی پروان چڑھتی ہے، کیونکہ قرض دینے والے ساہوکار کو بس اپنے سود کی تو پرواہ ہوتی ہے، اس سے آگے اسے کوئی سروکار نہیں کہ مقروض کو فائدہ ہوا یا نقصان؟ نفع حاصل ہوا تو کتنا؟ اور کتنی مشقتوں اور تکلیفیں برداشت

کرنے کے بعد؟ان تمام باتوں کی طرف غور کئے بغیر وہ اپنے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے اسکی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ مقروض کا نفع دیر سے حاصل ہو تاکہ اس کے سود کی تعداد اور شرح بڑھتی رہے، اور جتنا جتنا آدمی اس کاروبار میں آگے بڑھتا ہے اسکی یہ خود غرضی بڑھتی چلی جاتی ہے، اس کے برعکس زکوۃ، صدقات کی ابتدائی نیت سے لے کر اسکے عملی ظہور تک پورا ذہنی عمل فیاضی، ایثار، ہمدردی، فراخدلی، اعلی ظرفی اور خیر اندیشی جیسی صفات کے زیر اثر واقع ہے، اور اس طریقہ کار پر عمل پیرا ہونے سے یہی صفات انسان کے اندر نشوونما پاتی ہیں، اب اس موازنہ سے یہ بات بالکل بدیہی طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ اخلاقی لحاظ سے کونسی چیز بہتر ہے؟سود یا زکوۃ کا نظام۔

تمدنی اور اقتصادی نقصانات:

اب تمدنی حیثیت سے غور فرمایئے، تھوڑی سی غور وفکر سے یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آسکتی ہے کہ جس معاشرے میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں، کوئی اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک کی محتاجی دوسرے شخص کے واسطے نفع اندوزی کا موقعہ بن جائے اور مال دار طبقوں کا مفاد نادار طبقوں کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسا معاشرہ کبھی مستحکم نہیں ہو سکتا، اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی ہی کی طرف مائل رہیں گے، اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورت حال کے لئے مددگار بن جائیں تو ایسے معاشرے کے اجزاء کا باہم متصادم ہونا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس کے برعکس جس معاشرے کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو اور اس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کریں، اور ہر شخص دوسرے کی ضرورت کے موقعہ پر فراخدلی اور اخلاص کے ساتھ ہاتھ بڑھائے تو ایسے معاشرے میں آپس کی خیر خواہی، محبت و خلوص پروان چڑھے گا، اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر دست و بازو بنیں گے، اور اس باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار بہت زیادہ تیز ہو گی۔

اس کے بعد اقتصادی اور معاشی نقطہ نگاہ سے غور فرمائیں تو یہ پتہ چلے گا کہ سود خواہ صرفی ہو یا تجارتی، دونوں صورتوں میں معاشی لحاظ سے نقصان دہ ہے، ذیل میں دونوں قسم کے سود کے نقصانات کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

صرفی یا مہاجنی سود:

دنیا میں ایک عظیم سود خواری اس کاروبار کے ذریعہ ہوتی ہے جسے مہاجنی کاروبار (Money Lending Business) کہا جاتا ہے، اسمیں غریب اور متوسط طبقہ کے لوگ مثلاً کسان، چھوٹے چھوٹے کاروباری افراد کم تنخواہوں والے ملازم اپنے برے اوقات میں ایسے مہاجنوں سے قرض لیتے ہیں جو اپنی بستیوں کے قریب ہی ان کو گدھ کی طرح شکار کی تلاش میں منڈلاتے ہوے مل جاتے ہیں، اور انکو بھاری شرح سود پر قرضے فراہم کردیتے ہیں، اس کاروبار میں اتنی بھاری شرح سود رائج ہے کہ جو شخص ایک مرتبہ سودی قرضہ کے چکر میں پھنس گیا وہ پھر اس سے نکل نہ سکا، بلکہ یہ قرضہ وراثت میں ان کے پوتوں اور پڑپوتوں تک چلا گیا، اور اس میں بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر مقروض شخص کچھ مدت تک سود ادا کرنے کے قابل نہ ہوا تو چڑھے ہوئے سود کی رقم کو اصل میں شامل کر کے وہی مہاجن اپنا ہی قرض و سود وصول کرنے کے لئے اس شخص کو ایک اور بڑا قرضہ زیادہ شرح سود پر دیدیتا ہے، اور وہ غریب پہلے سے کہیں زیادہ زیر بار آجاتا ہے۔

یہ وہ بلائے عظیم ہے کہ جسمیں ہر ملک کے غریب اور متوسط الحال لوگوں کی بڑی اکثریت بری طرح پھنسی ہوئی ہے، اس کی وجہ سے قلیل المعاش ملازموں اور مزدوروں کی آمدنی کا بڑا حصہ مہاجن لے جاتا ہے، اور شب و روز کی انتھک محنت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہیں یا مزدوریاں حاصل ہوتی ہیں ان میں سے سود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں، یہ چیز نہ صرف ان کے اخلاق کو بگاڑتی ہے بلکہ انہیں جرائم کی طرف دھکیل دیتی ہے، اور انکی معیار زندگی اور معیار تعلیم پست سے پست تر ہوتی چلی جاتی ہے، اس لحاظ سے سودی کاروبار ظلم ہی نہیں بلکہ اسمیں اجتماعی معیشت کا بھی بڑا نقصان ہے یہ کیسی عجیب حماقت ہے کہ جو لوگ ایک قوم کے اصل عاملین پیدائش ہیں اور جن کی محنتوں ہی سے وہ ساری دولت پیدا ہوتی ہے جس پر قوم کی اجتماعی خوشحالی کا مدار ہے قوان پر ایسی جونکیں مسلط کئے رکھنی ہے جو ان کا خون چوس چوس کر نڈھال کردیتی ہے، اور اس طرح آخر کار قوم کی اکثر دولت ان مخصوص لوگوں کے پاس جمع ہو جاتی ہے، جبکہ ملک کے اکثر غریب اور متوسط عوام غریب سے غریب تر ہوتے چلے جاتے ہیں، یہ ہے سود کا ایک بڑا معاشی نقصان۔

تجارتی سود:

اب دیکھئے کہ جو قرض تجارت و صنعت اور دوسری کاروباری اغراض کے لئے لیا جاتا ہے اس پر سود کو جائز قرار دینے کے معاشی نقصانات کیا ہیں؟ معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ تجارت و صنعت زراعت اور تمام نفع آور (Productive) کاموں کی معاشی بہتری یہ تقاضا کرتی ہے کہ جتنے لوگ کسی کاروبار میں کسی بھی نوعیت میں شریک ہوں وہ سب کے سب اپنے مشترکہ کاروبار کے فروغ سے پوری پوری دلچسپی رکھتے ہوں اور انکی دلی خواہش یہ ہو کہ ہمارا کاروبار بڑھتا اور چڑھتا رہے، کاروبار کے نقصان کو وہ اپنا ہی نقصان تصور کریں، تاکہ ہر خطرہ کے موقع پر اس کے دفعیہ کے لئے اجتماعی جدوجہد کریں، اور کاروبار کے نفع کو اپنا ہی نفع سمجھیں تاکہ اس کے پروان چڑھانے میں انکی پوری طاقت خرچ ہو، اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو سودی کاروبار میں ان مفید جذبات کی کوئی رعایت نہیں ہے، بلکہ بعض اوقات معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے، کیونکہ سود خوار سرمایہ دار کو صرف اپنے نفع سے سروکار ہوتا ہے، اس بات کی اسے پرواہ نہیں ہوتی کہ جس شخص نے کاروباری قرضہ لیا ہے اس کے کاروبار میں نفع ہو رہا ہے یا نقصان؟ وہ تو مسلسل اپنے دیئے ہوئے قرضہ پر سود لینا چاہتا ہے، بلکہ بسا اوقات اسکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مقروض کو اپنے کاروبار میں نقصان ہو تاکہ یا تو وہ اس سے مزید شرحِ سود پر قرضہ لے یا پہلے کے لئے ہوئے قرضہ کی ادائیگی کا عرصہ طویل ہو جائے تاکہ اتنے عرصہ تک وہ مزید سود وصول کرتا رہے۔

اسی بناء پر اگر کاروبار کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو تو تاجر اپنی پوری محنت اس کے دور کرنے پر لگائے گا، جبکہ سودی سرمایہ دار اس وقت تک اسکی ذرا بھی پرواہ نہ کرے گا جب تک اسکا دیوالیہ نکلنے کا خطرہ نہ ہو جائے، اس غلط طریقہ کار نے سرمایہ اور محنت کے مابین ہمدردانہ رفاقت کے بجائے مکمل خود غرضی کا رشتہ قائم کر دیا ہے، جس کے نتیجہ میں بے شمار نقصانات جنم لیتے ہیں ان میں سے چند نمایاں ترین یہ ہیں:

ا۔ سرمایہ کا ایک بڑا حصہ سرمایہ دار اس انتظار میں کاروبار میں نہیں لگاتا کہ جب پیسہ کی مانگ بڑھے گی اور شرح سود میں اضافہ ہوگا تو سودی قرضہ پر دونگا، حالانکہ اس کے سامنے بہت سے ایسے جائز مصارف ہوتے ہیں جن میں وہ سرمایہ لگا سکتا تھا، اور اتنے عرصہ تک کسی کاروبار میں سرمایہ لگانے سے بے شمار لوگوں کو روزگار مل جاتا اور ملکی تجارت

وصنعت کی ترقی میں اضافہ ہوتا۔

۲۔ چونکہ ساہوکار کو زیادہ شرح سود کا لالچ ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے سرمایہ کو کاروبار کی واقعی ضرورت اور طبعی مانگ کے اعتبار سے نہیں لگاتا بلکہ وہ محض اپنی اغراض کو سامنے رکھ کر سرمایہ کو روکنے یا لگانے کا فیصلہ کرتا ہے، چنانچہ اگر سرمایہ دار کے سامنے دو صورتیں ہوں کہ یا تو وہ اپنا سرمایہ کسی فلم کمپنی میں لگائے یا بے گھر لوگوں کے لئے رہائشی مکانات تعمیر کروا کر انہیں کرایہ پر دے، اور اسے فلم کمپنی کی صورت میں منافع کی امید زیادہ ہو تو وہ یقیناً فلم کمپنی میں سرمایہ لگا دے گا، اور بے گھر افراد کی اسے ذرا بھی پرواہ نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت عام ملکی مفاد کے لئے کس قدر خطرناک ہے؟

اس طرح کے اور بہت سے نقصانات ہیں جو سودی کاروبار کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، اور تمدنی اور اقتصادی لحاظ سے پوری قوم انحطاط کا شکار ہوتی چلی جاتی ہے۔

مشارکہ، مضاربہ کی بنیاد پر انٹرسٹ کا متبادل نظام

عہد حاضر کے علماء میں یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ اسلامی نظامِ معیشت میں بینکنگ کا طریقِ کار کیا ہوگا؟ جب کہ آج کل بینکوں کا سارا نظام انٹرسٹ پر قائم ہے؟

اس سوال کے جواب میں ابتک بہت سی تحریریں سامنے آچکی ہیں، تفصیلی جزئیات سے قطع نظر اصولی طور پر غیر سودی بنکاری کی جتنی تجویزیں ابتک سامنے آئی ہیں ان میں یہ بات مشترک ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں بینکاری ربا کے بجائے مشارکہ کے اصولوں پر قائم ہوگی اسکی مختصر [۱] تشریح درج ذیل ہے:

ابتداء میں سرمایہ لگا کر جو لوگ بینک قائم کریں گے وہ حصہ دار (Sharers/ Share holders) کہلائیں گے، پھر عوام کی جو امانتیں بینک میں جمع ہوں گی ان میں سے عند الطلب قرضے (Current Account) کے علاوہ بقیہ تمام کھاتے مضاربت کھاتے میں تبدیل ہو جائیں گے۔

---

(۱): بینک کے بارے میں مکمل تفصیل چوتھے باب میں مالیاتی اداروں میں مشارکہ کے استعمال کے ذیل میں ذکر کی جائے گی (انشاء اللہ)۔

عند الطلب قرضوں میں تمام رقوم بینک کے پاس (فقہی نقطہ نظر سے) قرض ہونگی، کھاتہ دار ہر وقت بذریعہ چیک انکی واپسی کا مطالبہ کر سکے گا، اور ان پر کوئی منافع کھاتہ دار کو نہیں دیا جائے گا، موجودہ نظام بینکاری میں بھی اس مد پر کوئی خاص منافع نہیں دیا جاتا، البتہ مشارکہ کے کھاتہ دار ایک معین مدت کے لئے رقم رکھوائیں گے، پھر اس رقم سے بینک جو منافع حاصل کرے گا اس میں کھاتہ دار متناسب طور سے (Propertionately) شریک ہوں گے۔

عند الطلب قرضوں اور مشارکہ کھاتہ کے ذریعے حاصل ہونے والی رقوم میں سے ایک حصہ بینک مد محفوظ (Reserve) میں رکھ کر بقیہ سرمایہ کاروباری افراد کو مشارکہ یا مضاربہ کے اصول پر (بطور Financing) دے گا، کاروباری افراد اس سرمایے کو صنعت یا تجارت میں لگا کر جو نفع حاصل کریں گے اس کا ایک طے شدہ متناسب حصہ مثلاً پچیس فیصد یا تینتیس فیصد بینک کو اصل رقم کے ساتھ ادا کریں گے، اور بینک یہ منافع اپنے حصہ داروں اور کھاتہ داروں کے درمیان طے شدہ متناسب حصوں کی صورت میں تقسیم کریں گے، فرانس اور جرمنی میں بعض بینک شرکت کے اصول پر سرمایہ لگاتے رہے ہیں، اس اصول کو غیر سودی بینکاری میں اختیار کیا جاسکتا ہے۔

مشترک سرمایہ کی کمپنیاں تمام بچتوں کو کیوں استعمال نہیں کر سکتیں؟

سود سے متعلق شریعت کے احکام ذکر کرنے سے قبل سرمایہ دارانہ نظام میں بچتوں کے استعمال کے تین طریقے ذکر کیئے گئے تھے، جن میں ایک مشترک سرمایہ کی کمپنی (Joint stock company) تھا، مشترک سرمائے کی کمپنیوں میں بچتیں لگانے کو علماءِ کرام نے اگرچہ بعض شرائط کے ساتھ جائز قرار دیا ہے (جسکا تفصیلی حکم آگے تیسرے باب میں ذکر کیا جائے گا) لیکن مشترک سرمائے کی کمپنیاں تمام بچتوں کو استعمال نہیں کر سکتیں، بلکہ اس مقصد کے لئے بینکوں کی بھی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ حصص جلد نقد پذیر (Liquidate) نہیں ہو سکتے، جبکہ بہت سے لوگ بچتیں اس طرح نفع بخش کاموں میں لگانا چاہتے ہیں کہ وہ جب چاہیں، انہیں نقد میں تبدیل کر سکیں، اسی لئے وہ اپنا ایسا فاضل روپیہ حصص میں لگانے کے بجائے بینکوں میں رکھواتے ہیں، تاکہ انہیں ایک طرف کچھ نفع (بشکل سود) ملتا رہے، اور دوسری طرف وہ جب چاہیں بینک سے رقم نکلوا کر اپنی ضروریات پوری کر سکیں، اس لئے اگر بینک کا موجودہ نظام نہ ہو تو لوگ اپنے جس سرمائے کو فوری طور پر نقد پذیر رکھنا چاہتے ہوں وہ اسے حصص میں لگانے کے بجائے اپنے تجوریوں میں رکھیں گے، جس

کے نتیجے میں وہ روپیہ ست پڑا رہیگا، اور تجارت وصنعت اور ملکی ترقی میں استعمال نہ ہو سکے گا، اس لحاظ سے معاشرے کی بچتوں کو صنعت وتجارت اور ملکی ترقی میں استعمال کرنے کیلئے بینکوں کا وجود آج کے دور میں ناگزیر سمجھا جاتا ہے، چنانچہ بینکاری وہ اہم شعبہ ہے جسے سود سے پاک کر کے اسے مشارکہ کی بنیاد پر چلانا ایک اسلامی معاشرے کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس لئے اب ہم پہلے "مشارکہ" کا اسلامی تصور تفصیل کے ساتھ ذکر کریں گے اس کے بعد (انشاء اللہ) اس پر مفصل بحث کی جائیگی کہ مشارکہ کی بنیاد پر بینک اور مالیاتی ادارے کس طرح چلائے جائیں[۱]۔

(۱): اس سلسلے میں ملاحظہ فرمایئے: چوتھا باب، مالیاتی اداروں میں مشارکہ کا استعمال۔

دوسرا باب

شرکت کا روایتی تصور

دوسرا باب: شرکت کا روایتی تصور

شرکت کے لغوی معنی

شَرِكَ (س) شرکاً، وشِرکاً وشِرْکۃً ،شَرِکۃً: شریک ہونا،أشرکہٗ فی امرہٖ: کسی کو اپنے کام میں شریک کرنا۔ أشرك باللّٰہ، اللہ کے لئے شریک ٹھہرانا،صفت: مشركٌ۔

شَارَكَ يُشَارِكُ از مفاعلۃ،وتَشَارَكَ يَتَشَارَكُ از باب تفاعل: باہم شریک ہونا،اَلْمُشَارَكَۃُ ،اَلتَّشَارُكُ (مصدر) ایک دوسرے کا حصہ دار بننا،اشترك الأمر: کسی امر کا مشتبہ ہونا، اشترك القوم فی کذا: باہم شریک ہونا۔

الشریك: شریک، ساجھی، حصہ دار، ج: شرکاء، وأشراك، مؤنث شریکۃ ج: شرائك۔

المشترك (اسم مفعول از بابِ افتعال، وہ چیز جس میں دو یا کئی کی شرکت ہو۔

الشرکۃ: مصدر شَرِكَ يَشْرَكُ شِرْكًا، وَشِرْكَۃً (باب سمع) اصل میں شَرِكَۃ یعنی شین کے زبر اور راء کے زیر کے ساتھ تھا، پھر مصدر میں تخفیف ہو کر شین کے زبر اور راء کے سکون کے ساتھ (شِرْکۃ) ہو گیا۔[1]

شرکت اور مشارکہ میں لغوی فرق:

شرکت باب سمع سے ثلاثی مجرد کا مصدر ہے، جبکہ مشارکہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، جس کی وجہ سے خصوصیات

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: العلامۃ الفیومی، الحجۃ فی التفسیر فی الفاظ المهذب و المصباح المنیر مادۃ شرك۔

الزیلعی، (فخر الدین عثمان بن علی) تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق،(۱۰۸۷) مکتبۃ امدادیہ ملتان، (۱۱۲:۳)۔

ابواب کے تحت شرکت کے معنی مطلقاً شریک ہونے کے ہیں، جبکہ مشارکہ کے معنی باہم شریک ہونے کے اور ایک دوسرے کے حصہ دار بننے کے ہیں۔

شرکت کی لغوی تعریف

تعریفِ اول:

اختلاط النصيبين فصاعدا بحيث لا يتميز ثم اطلق اسم الشركة على العقد وإن لم يوجد اختلاط النصيبين۔[1]

یعنی دو یا زیادہ حصوں کا اس طرح مخلوط ہو جانا کہ ان میں تمیز نہ ہو، پھر اس کا اطلاق ایک عقد پر ہونے لگا، اگرچہ اس میں دو حصے مخلوط نہ پائے جائیں۔

تعریف دوم:

عقد بين اثنين فأكثر للقيام بعمل مشترك۔[2]

دو افراد یا زیادہ کے درمیان ایک مشترک کام کرنے کا معاملہ۔

شرکت کی اصطلاحی تعریف

شریعت اور فقہِ اسلامی میں شرکت کی تعریفیں مندرجہ ذیل کی گئی ہیں:

ا۔ فقہ حنفی میں:

إنها اختصاص اثنين فأكثر بمحل واحد۔[3]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: أبو حبيب السعدى، القاموس الفقهى (عربى) لغة واصطلاحا، من علماء القرن الخامس عشر مطبعة المدنى القاهره /مادة الشركة۔

(۲) حوالہ بالا۔

(۳) الدرالمنتقى شرح الملتقى (١: ٧١٤)، والتعليق الميسر على ملتقى الابحر (٢: ٣٨٨)، والفتاوى التاترخانية (٥: ٦٢)۔

دو یا زیادہ افراد کا کسی ایک محلِ عقد سے مخصوص ہو جانا۔

یہی تعریف فقہاء مالکیہ میں ابن عرفہ نے بھی کی ہے۔

یہ تعریف اپنے اندر عمومیت رکھتی ہے، یعنی اس طرح اس میں شرکت کی تمام صورتیں داخل ہو جاتی ہیں کہ شرکت املاک کی دونوں قسمیں یعنی اختیاری اور جبری، اور خواہ وہ عین ہو یا دین ہو، اور شرکت عقد خواہ وہ عمل، مال یا جاہ میں شرکت ہو، سب اس تعریف میں شامل ہیں۔

۲۔ فقہ شافعی میں:

بأنها ثبوت الحق لاثنين فأكثر على جهة الشيوع۔[۱]

حق کا دو یا زیادہ افراد کے لئے بطریقہ شیوع ثابت ہونا۔

یہ تعریف بھی شرکت کی جملہ اقسام کو شامل ہے، چنانچہ شرکت ملک دو یا زیادہ افراد کے لئے بطریقہ مشاع ثابت ہوتی ہے، اور ایسے ہی شرکت عقد بھی، اگرچہ اس میں شرکت عقد کیذریعہ ہوتی ہے لیکن دو یا زیادہ افراد کے لئے بطور شیوع شرکت کا ثبوت ہوتا ہے۔

۳۔ فقہ حنبلی میں:

علامہ ابن قدامہؒ نے شرکت کی ایک عمومیت والی تعریف فرمائی ہے:

هي الاجتماع في استحقاق او تصرف[۲]

یعنی استحقاق اور تصرف میں جمع ہونا

الاجتماع فی استحقاق کہنے سے شرکت ملک کی تمام اقسام کو یہ تعریف جامع ہو گئی، خواہ وہ استحقاق وراثت، وصیت، ہبہ، مال غنیمت، یا خریداری وغیرہ کے ذریعہ ہو، اور تصرف کی قید سے تمام شرکتِ عقد کی اقسام داخل ہو گئیں، خواہ وہ

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المطيعي، (محمد نجيب) تكملة المجموع شرح المهذب، (۱۳:۵۰۵) مطبعة الامام بمصر۔

(۲) ابن قدامة المقدسي(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد) ،المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ(۵:۳)۔

شرکت فی الاموال ہو یا شرکت بدنی یا شرکت وجوہ ہو۔

۴۔ فقہ مالکی میں:

ابن عرفہ نے ایک مزید عام تعریف کی:

تقرر متمول بين مالكين فأكثر ملكا فقط

دو مالکوں یا زیادہ کے درمیان کسی شئے متقوم کی ملکیت کا مقرر ہو جانا۔[1]

چنانچہ ان میں سے ہر ایک بطور مالک تصرف کا مستحق ہو، لہذا انسب کا دو افراد کے درمیان ثبوت یا دو افراد کی ولایت کسی مملوک پر شرکت نہ کہلائیگی، اس لئے کہ یہ مال متقوم کے درمیان تقرر نہیں ہے، یا اسی طرح دو وصی یا دو وکیلوں کے پاس کوئی مال کچھ عرصہ کے لئے ہے اور اس میں وہ تصرف بھی کر سکتے ہیں، لیکن چونکہ وہ اس مال کے مالک نہیں ہیں، لہذا یہ شرکت نہ کہلائیگی۔

۵۔ جدید معاشیات میں شرکت کا مفہوم:

Two, three or more people combine, contribute capital, and agree to share profits and bear losses in agreed propertions.[2]

دو، تین یا زیادہ لوگ مل کر سرمایہ لگائیں اور منافع میں شرکت پر راضی ہوں اور اپنے لگائے ہوئے سرمائے کے تناسب سے نقصان برداشت کریں۔

مذکورہ بالا تعریف سے یہ معلوم ہوا کہ جدید معاشیات میں شرکت کی تعریف اس قدر عام نہیں ہے، جس قدر

(۱) محمد بن ابراهيم موسى، شركات الأشخاص بين الشريعة والقانون، جامعة الامام محمد بن سعود الاسلاميه رياض، ۱۴۰۱ھ۔ (۲۴)۔

2. K.K Dewit, Modern Economic Theory P.106 Chapter:14.

ماقبل کی تعریفات عام ہیں، کیونکہ جدید معاشیات کی تعریف کی رو سے شرکت سے مراد صرف شرکت عقد ہوگی، اور کہا جاتا ہے کہ معاشیات کی یہ تعریف دراصل فرانسیسی قانونی سے لی گئی ہے۔ جس میں شرکت کا مفہوم عام نہیں ہے۔ (۱)

شرکت لغوی اور اصطلاحی کے درمیان تعلق:

اگر مذکورہ بالا تعریفات پر غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لغوی لحاظ سے اصطلاحی شرکت کے درمیان ربط اور نسبت ہے، کیونکہ لغوی لحاظ سے اگر شرکت پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ شرکت دو یا زیادہ افراد کے مطلقا مشترک اور مخلوط ہونے کو کہتے ہیں خواہ وہ خود سے مخلوط ہوں، یا باہم اختلاط کیا جائے، یا کسی عقد کے سبب مخلوط ہوئے ہوں، اسی طرح شریعت کی اصطلاح میں جو شرکت کی تعریف کی گئی ہے وہ بھی یہ ہے کہ دو یا زیادہ کا ایک جگہ پر مختص ہو جانا، یا اس جیسی اور اصطلاحی تعریفات کی گئی ہیں، جن کے اندر بھی عموم ہے، یعنی کہ دو یا زیادہ افراد کی شرکت مطلقا ہو، خواہ خود سے مخلوط ہوں یا اختلاط کیا جائے، یا عقد کے ذریعہ اختلاط ہو۔ (۲)

پھر اگر اس شرکت کا مزید تجزیہ کیا جائے تو شرکت کی اوّلاً دو صورتیں ہیں، کہ یا تو شرکت باہم شرکاء کی رغبت اور اختیار سے وقوع پذیر ہوگی یا بغیر کسی اختیار کے خود سے اشتراک پایا جائے مثلاً وراثت، وصیت یا ہبہ وغیرہ کے ذریعہ۔ پھر اگر باہم اختیار سے شراکت قائم کی گئی ہے تو یا تو وہ اموال کے مابین اشتراک ہوگا، یا افرادی قوت میں اشتراک ہوگا، یا اپنی ذاتی وجاہت اور تدبیر میں اشتراک ہوگا۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: محمد بن ابراهيم موسى، شركات الأشخاص بين الشريعة و القانون، جامعة الامام محمد بن سعود الاسلاميه رياض، ١٤٠١ھ۔ (٢٥)۔

(۲) حواله بالا، و الشامى ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ايچ ايم سعيد كمپنى (٢٩٨:٤) مطبعة الحلبى مصر ١٣٨٦ھ۔

قرآن کریم میں شرکت کا تذکرہ اور ثبوت

شرکت کا ثبوت کتاب اللہ، سنتِ رسول اللہ ﷺ، اجماع اور قیاس سب سے ثابت ہے جسے ہم ذیل میں بالترتیب ذکر کرتے ہیں۔

پہلی آیت:

اللہ تبارک وتعالیٰ اصحاب کہف کے نوجوانوں کے بیان کو قرآن پاک کی سورۂ کہف میں بیان فرماتے ہیں:

﴿فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا﴾[1]

ترجمہ: اب اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ (جو کہنے والے کے پاس ہوگا کیونکہ یہ لوگ کچھ خرچ کرنے کے لئے رقم بھی لے کر چلے تھے، غرضیکہ کسی کو یہ روپیہ) دیکر شہر کی طرف بھیجو، پھر (وہ وہاں پہونچ کر) تحقیق کرے کہ کونسا کھانا حلال ہے۔[2]

اس آیت کی عبارۃ النص اگرچہ شرکت پر دلالت نہیں کرتی البتہ اشارۃ النص سے شرکت کا ثبوت ہوتا ہے، کیونکہ اس واقعہ میں سب اصحاب کہف نے ایک آدمی کو منتخب کر کے سب کی رقم اس کے حوالہ کی کہ وہ کھانا خرید کر سب کے لئے لائے، اور وہ سب مل کر کھائیں، چنانچہ امام جصاصؒ نے ذکر فرمایا ہے:

يدل على خلط دراهم الجماعة والشرى بها، والأكل من الطعام الذى

---

(۱) سورة الكهف آيت: ۱۹ ۔

(۲) المفتی محمد شفیع مفتی اعظم پاکستان معارف القرآن ، ادارۃالمعارف کراچی،خلاصۂ تفسیر (۵۵۸:۵)۔

بينهم بالشركة، وإن كان بعضهم يأكل أكثر مما يأكل غيره، وهذا هو الذي يسميه الناس المناهدة ويفعلونه في الأسفار۔

یعنی یہ آیت جماعت کے دراہم کے مخلوط ہونے اور ان سے خریداری اور مشترکہ طور پر کھانا کھانے پر دلالت کرتی ہے اگرچہ بعض لوگ اپنے ساتھیوں سے زیادہ کھاتے ہیں، اس کو لوگ مناہدہ بھی کہتے ہیں، اور یہ عام طور پر سفر میں ہوتا ہے۔[(١)]

اور امام جصاصؒ احکام القرآن میں مزید اس بات کی تائید میں دلیل بیان فرماتے ہیں:

لأنهم قالوا: ﴿فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ﴾، فأضاف الورق إلى الجماعة، ونحوه قوله تعالى: ﴿وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ﴾ فأباح لهم بذلك خلط اليتيم بطعامهم، وأن تكون يده مع أيديهم مع جواز أن يكون بعضهم أكثر أكلا من غيره۔[(٢)]

اس لئے کہ انہوں نے کہا کہ تم اپنے میں سے کسی کو اپنا یہ روپیہ دیکر شہر کی طرف بھیجو، یہاں پر روپے کی اضافت جماعت کی طرف کی گئی (اس سے معلوم ہوا کہ مال مشترکہ طور پر سب کا تھا) اور اسی طرح باری تعالی کا ارشاد ہے (جسکا ترجمہ یہ ہے) لوگ آپ سے یتیم بچوں کے خرچ علیحدہ یا شامل رکھنے کے بارے میں حکم پوچھتے ہیں آپ فرمادیں کہ انکی مصلحت کی رعایت رکھنا زیادہ بہتر ہے، اور تم ان کے ساتھ خرچ شامل رکھو تو (کوئی حرج نہیں کیونکہ) وہ تمہارے (دینی) بھائی

(١) محمد بن ابراهيم موسى، شركات الأشخاص بين الشريعة والقانون، جامعة الامام محمد بن سعود الاسلاميه رياض، ١٤٠١ھ۔(٥٧)۔

(٢) الجصاص، احمد بن علی ٣٧٠ھ، احکام القرآن مصر ١٣٤٧ھ ٥٥٧/١ مطبع لا ہور سہیل اکیڈمی، (٢١٣:٣)۔

ہیں،[۱] اس آیت میں بھی یتیم کے طعام کو اپنے طعام کے ساتھ مخلوط کرنے کا جواز بتلایا گیا ہے، اگرچہ اس کا ہاتھ یتیموں کے ہاتھوں سے مخلوط ہوگا، اور باوجودیکہ ان میں سے کوئی ایک زیادہ کھا سکتا ہے دوسرے کے مقابلہ میں۔

اسی مذکورہ بالا قرآنی آیت کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ اپنی شہرہ آفاق تفسیر "معارف القرآن" میں ذکر فرماتے ہیں:

"اس واقعہ میں اصحاب کہف نے اپنے میں سے ایک آدمی کو شہر بھیجنے کے لئے منتخب کیا، اور رقم اس کے حوالہ کی کہ وہ کھانا خرید کر لائے، قرطبیؒ نے بحوالہ ابن خویز منداد فرمایا کہ اس سے چند فقہی مسائل حاصل ہوئے، اول یہ کہ مال میں شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ رقم سب کی مشترک تھی...... تیسرے یہ کہ چند رفیق اگر کھانے میں شرکت رکھیں یہ جائز ہے اگرچہ کھانے کی مقداریں عادتاً مختلف ہوتی ہیں کوئی کم کھاتا ہے، کوئی زیادہ۔[۲]

دوسری آیت:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَجُلاً فِيْهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُوْنَ وَرَجُلاً سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لاَ يَعْلَمُوْنَ﴾[۳]

اللہ تعالیٰ نے (موحد اور مشرک کے بارے میں) ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک شخص ہے (غلام) جس میں کئی ساجھی ہیں، جن میں باہم ضداضدی (بھی) ہے،

(۱) مفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن ۹۰۲-۹۵۴، ادارۃ المعارف کراچی، خلاصہ تفسیر ۹:۵۳۸، سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۰۔

(۲) حوالہ بالا (۵:۵٦۱)۔

(۳) الآیۃ ۱۹ من سورۃ الزمر۔

اور ایک اور کہ پورا ایک ہی شخص کا (غلام) ہے، تو کیا ان کی حالت یکساں ہو سکتی ہے، الحمد للہ (حق ثابت ہو گیا، لیکن پھر بھی یہ لوگ قبول نہیں کرتے، بلکہ قبول تو کیا) ان میں اکثر لوگ سمجھتے بھی نہیں۔[1]

یہ آیت بھی شرکت فی العبد (غلام کی مشترک ملکیت) پر دلالت کرتی ہے، اور اس آیت سے اسکا جواز بھی معلوم ہوتا ہے، کیونکہ باری تعالی نے اس مثال میں شرکت فی العبد کا ذکر فرمایا ہے، اگر چہ شرکاء کے مابین ضد اور اختلاف ہے، لیکن یہ بات ایک مسلمہ کے طور پر ذکر کی گئی ہے کہ غلام کی ملکیت میں وہ دونوں شریک ہیں۔

تیسری آیت:

اور اس آیت سے بھی شرکت کا ثبوت ہوتا ہے:

﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ﴾[2]

اور اکثر شرکاء (کی عادت ہے کہ) ایک دوسرے پر (یوں ہی) زیادتی کیا کرتے ہیں، مگر ہاں جو لوگ ایمان رکھتے ہیں، اور نیک کام کرتے ہیں اور ایسے لوگ بہت ہی کم ہیں۔[3]

تفسیر معارف القرآن میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ تعالی ذکر فرماتے ہیں:

وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْخُلَطَاءِ الخ (یعنی اور بہت سے شرکاء ایک دوسرے پر زیادتی کیا کرتے ہیں) اس سے اس بات پر تنبیہ کر دی ہے کہ جب دو انسانوں میں شرکت کا کوئی معاملہ ہو تو اس میں اکثر ایک دوسرے کی حق تلفیاں ہو جاتی ہیں، بعض

---

(۱) المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن، ادارۃ المعارف، خلاصۂ تفسیر ٥٥٤۔

(۲) الآیۃ ٢٤ سورۃ: ص رقم السورۃ ٣٨۔

(۳) المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، خلاصۂ تفسیر ٧:٤٩٩۔

اوقات ایک آدمی ایک کام کو معمولی سمجھکر کرگذرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ گناہ کا سبب بن جاتا ہے، اس لئے اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔[۱]

گویا مذکورہ بالا آیت بھی شرکت پر دلالت کرتی ہے، اور خلطاء کا لفظ شرکاء کےمعنی میں ہے، اس سے بھی یہی سمجھ میں آتا ہے کہ جب لوگوں میں شرکت ہو تو اس میں ایک دوسرے کی حق تلفیاں ہو جاتی ہیں، لہذا شرکت کے معاملہ میں احتیاط چاہیے، اور اس دوران کوئی ایسا کام نہ ہونا چاہیے جو باہمی غلط فہمی اور رنجش کا سبب بنے۔ اس مفہوم سے شرکت کے جواز کا پتہ چلتا ہے، اسی وجہ سے علماء کرام نے اس آیت سے شرکت فی العین (مال میں شرکت) اور شرکت فی العقد (عقدِ شرکت) کے جواز پر استدلال کرتے ہیں۔[۲]

چوتھی آیت:

﴿فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ﴾

اور اگر یہ لوگ اس سے (یعنی ایک سے) زیادہ ہوں (مثلاً دو ہوں یا اور زیادہ) تو وہ سب تہائی میں (برابر کے) شریک ہونگے، اور ان میں مذکر و مؤنث کا برابر حصہ ہے، اور بقیہ میراث دوسرے ورثاء کو اور اگر کوئی نہ ہو تو پھر انہی کو دی جائے گی۔[۳]

مذکورہ بالا آیت کلالہ کے بارے میں ہے، اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرد یا عورت وفات پا جائے، اور اس کے نہ باپ ہوں نہ دادا اور نہ ہی اولاد ہو، اور اس نے ایک بھائی یا بہن ماں شریک چھوڑے ہوں تو ان میں سے اگر بھائی ہے تو اسکو چھٹا حصہ ملے گا، اور نہیں ہے تو بہن کو چھٹا حصہ ملے گا، اور اگر ایک سے زیادہ ہوں، مثلاً ایک بھائی ایک بہن ہو یا دو بھائی، یا دو بہنیں ہوں تو یہ سب مرنے والے کے کل مال کے تہائی حصہ میں شریک ہوں گے، اور اس میں مذکر کو

---

(۱) المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن، ادارۃالمعارف کراچی، خلاصۂ تفسیر (۷:۵۰۵)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الشرکات فی الشریعة الاسلامیة والقانون الوضعی ۵۹۔

(۳) المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن، ادارۃالمعارف کراچی، سورة النساء آیت ۱۲۔

مؤنث سے دوہرا نہیں ملے گا۔ (۱)

خلاصہ یہ کہ اس آیت سے بھی شرکت الملک (ملکیت میں اشتراک) اور شرکت فی الوراثت (وراثت میں شرکت) کا پتہ چلتا ہے، اور اس کا حکم معلوم ہوتا ہے۔

پانچویں آیت:

﴿أَشْدُدْ بِهِ أَزْرِيْ وَأَشْرِكْهُ فِيْ أَمْرِيْ﴾ (۲)
(یعنی ہارون جو میرے بھائی ہیں) ان کے ذریعہ سے میری قوت کو مستحکم کر دیجئے، اور ان کو میرے (اس تبلیغ کے) کام میں شریک کر دیجئے (یعنی ان کو بھی نبی بنا کر مامور بالتبلیغ کیجئے کہ ہم دونوں تبلیغ کریں، اور میرے قلب کو قوت پہونچے)۔ (۳)

مذکورہ بالا آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے ساتھ نبوت ورسالت میں شریک کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کی، تاکہ تبلیغ کے کام میں سہولت ہو جائے، اس آیت سے شرکت کے لغوی معنی کا ثبوت ہوتا ہے، یعنی شرکت دو افراد کے درمیان کسی بھی کام میں خواہ مالی ہو یا غیر مالی۔

چھٹی آیت:

﴿وَاعْلَمُوْا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ إِنْ كُنْتُمْ آمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَا أَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (۴)

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، بتفسیر یسیر ۳۲۸:۲۔

(۲) سورۃ طٰہٰ آیت ۳۱ و ۳۲۔

(۳) المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان معارف القرآن، ادارۃ المعارف کراچی، خلاصۂ تفسیر ۷۶۱:۶۔

(۴) سورۃ الانفال آیت: ٤١۔

اور اس بات کو جان لو کہ جو شئے (کفار سے) بطور غنیمت کے تم کو حاصل ہو، تو اس کا حکم یہ ہے کہ (اس کے کل پانچ حصے کئے جائیں جن میں سے چار حصے تو مقاتلین کا حق ہے اور ایک حصہ یعنی) اس کا پانچواں حصہ (پھر پانچ حصوں پر تقسیم ہوگا جن میں سے ایک تو) اللہ کا اور اس کے رسول کا ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ کو ملے گا، جن کو دینا بمنزلہ اس کے کہ اللہ تعالی کے حضور میں پیش کر دیا) اور (ایک حصہ) آپ کے قرابتداروں کا ہے، اور (ایک حصہ) یتیموں کا ہے، اور (ایک حصہ) غریبوں کا ہے، اور (ایک حصہ) مسافروں کا ہے، اگر تم اللہ پر یقین رکھتے ہو، اور اس چیز پر جس کو ہم نے اپنے بندہ (محمد ﷺ) پر فیصلہ کے دن (یعنی) جس دن کہ (بدر میں) دونوں جماعتیں (مومنین اور کفار کی) باہم مقابل ہوئی تھیں، نازل فرمایا تھا، اور اللہ (ہی) ہر شے پر پوری قدرت رکھنے والے ہیں۔[۱]

مذکورہ بالا آیت کا حاصل یہ ہوا کہ مال غنیمت کے پانچ حصہ کر کے اولاً چار حصے مقاتلین کو دیے جائیں گے، اور پانچویں حصہ میں بھی پانچ حصہ دار و شرکاء) ہوں گے یعنی اللہ تبارک وتعالی اور حضور ﷺ، ذوی القربی، یتامی، مساکین، ابن السبیل۔

اور اس آیت میں "غَنِمتُمْ" کا لفظ استعمال کیا گیا، جس کے لغوی معنی یہ ہیں:

ما تناله الجماعة بسعي أفرادها مجتمعين،

جو شئے کسی جماعت کے افراد مشترکہ اور مجموعی کوشش سے حاصل کریں[۲]۔

اور مذکورہ تعریف شرکت پر بھی صادق آتی ہے، کیونکہ اسمیں بھی کسی جماعت کے افراد مشترک طور پر کوشش کر کے مال یا کوئی شئے حاصل کرتے ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المفتی محمد شفیعؒ مفتی اعظم پاکستان، معارف القرآن ۲-۹۰۴، ۹۰۵، ادارة المعارف، ۴:۲۳۶۔

(۲) دیکھئے: الدبو، ابراهيم فاضل، عقد المضاربه، ص: ۱۳۔

احادیث مبارکہ سے شرکت کا ثبوت

سنت رسول اللہ ﷺ میں قول اور تقریر دونوں سے شرکت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

سب سے پہلے احادیثِ قولی ذکر کی جائیں گی، پھر تقریری احادیث کا بیان ہوگا:

۱۔ حضور پاک ﷺ سے ایک حدیث قدسی منقول ہے کہ:

عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: يقول الله تعالى: أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما[۱]

حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا شریک ہوں جب تک ان میں سے کوئی ایک خیانت نہ کرے۔

اور دار قطنی کی روایت میں یہ ہے کہ:

فإذا خان أحدهما صاحبه رفعها عنهما۔

پس جب ان دونوں میں سے ایک اپنے ساتھی سے خیانت کرے تو اس کو ان دونوں سے اٹھا دیتے ہیں، (یعنی خیانت کی وجہ سے برکت ختم ہو جاتی ہے)۔

اور اس حدیث سے شرکت کا نہ صرف جواز معلوم ہوتا ہے بلکہ اسکی ترغیب معلوم ہوتی ہے کہ جب تک شرکاء کے مابین خیانت نہ ہو، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ رہتے ہیں، اور اپنی برکت و حفاظت نازل فرماتے ہیں۔[۲]

(۱) دیکھئے: رواه ابوداود، ج:٥، رقم الحديث: ٢٩٣٦، ٣٢٤٣، وصححه الحاكم فی مستدركه، ورواه الدارقطنی، الشركات (١:٦٠)

(۲) دیکھئے: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)، المغنی، مكتبة الرياض السعودية ١٤٠٣ھ۔ ٥:١٠٥۔

۲۔ أخرج ابو یعلی والبیهقی عن النعمان بن بشیرؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من خان شریکا فیما أئتمنه علیه واسترعاه له فإنه بریئ منه۔

جس شخص نے اپنے شریک کی اس مال میں خیانت کی جس میں اسکو امانت اور حفاظت سپرد کی گئی تھی، تو حضور ﷺ اس شخص سے بری ہیں۔

اس روایت سے بھی شرکت کا ثبوت ہوتا ہے، بلکہ اس میں شرکت میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

۳۔ عن النبی ﷺ : ید الله مع الشریکین ما لم یتخاونا، فإذا تخاونا محقت تجارتهما فرفعت البرکة منها۔[1]

حضور ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالی کا ہاتھ شریکین (دو شریکوں) کے ساتھ رہتا ہے جب تک خیانت نہ کریں، پس اگر وہ خیانت کریں گے تو ان کی تجارت مٹادی جائیگی، اور اس میں برکت ختم ہو جائیگی۔

اس روایت سے بھی شرکت کے ثبوت کے علاوہ اسکی فضیلت واہمیت اور تاکید ثابت ہوتی ہے، اور خیانت کرنے پر وعید کا ثبوت ہوتا ہے۔

٤۔ عن علیؓ: أن رجلین کانا شریکین علی عهد رسول الله ﷺ، فکان أحدهما مواظبا علی السوق والتجارة، وکان الآخر مواظبا علی المسجد والصلاة خلف رسول الله ﷺ، فلما کان عند قسمة الربح قال المواظب علی السوق فضلنی، فإنی کنت مواظبا علی التجارة، وأنت کنت مواظبا علی المسجد، فجاء إلی رسول الله ﷺ فذکر ذلك، فقال النبی ﷺ:

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابو داودسجستانی، (سلیمان بن الأشعث بن اسحاق) سنن أبی داود، و الحاکم، (محمد بن عبد الله الحاکم ٤٠٥ھ)، مستدرك، بیروت، دار الکتب العلمیه ١٤١١ھ، بیهقی، احمد بن حسین البیهقی ٤٥٨ھ، السنن الکبری، ، ملتان، نشر السنة۔

للذی کان یواظب علی السوق إنما کنت ترزق بمواظبة صاحبك علی المسجد۔[1]

حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ دو آدمی حضور ﷺ کے زمانہ میں شریک تھے ان میں سے ایک بازار اور تجارت میں پابندی کرتا تھا، اور دوسرا مسجد اور نماز حضور ﷺ کے پیچھے پڑھنے کی پابندی کرتا تھا، پس جب نفع کے تقسیم کا وقت آیا تو وہ شریک جو تجارت میں پابندی کرتا تھا کہنے لگا کہ مجھ کو زیادہ دو، کیونکہ میں نے تجارت میں زیادہ محنت کی اور تم نے نماز پڑھنے میں زیادہ وقت لگایا، پس دونوں آنحضرت ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے قصہ بیان کیا، تو حضور ﷺ نے اس شریک سے جو تجارت میں پابندی کرتا تھا فرمایا کہ تم کو بھی اس شخص کی وجہ سے رزق دیا جاتا ہے جو مسجد میں پابندی کے ساتھ نماز ادا کرتا ہے۔

۵۔ علامہ شوکانیؒ نے ابو منہال کی ایک روایت ذکر کی ہے کہ :

إن زید بن أرقم والبراء بن عازب رضی اللّٰہ عنہما کانا شریکین فاشتریا فضّة بنقد ونسیئة، فبلغ النبی ﷺ فأمرھما أن ما کان بنقد فأجیزوہ، وما کان بنسیئة فردوہ۔[2]

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الصنعانی، محمد بن اسماعیل۱۱۸۲ھ، الروض النضیر شرح مجموع الفقه الکبیر (۳۶۲:۳) مکتبة المؤید بالطائف۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں:بخاری، (أبو عبد اللّٰہ محمد بن اسماعیل البخاری) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح، ولفظ ا لبخاری: ما کان یدا بید فخلوہ، وما کان نسیئة فردوہ، الشوکانی، محمد بن علی الشوکانی ۱۲۵۵ھ،نیل الأوطار، مصر، مصطفی البابی الحلبی ۱۳٤۷ھ۔(۲۹۸:۵)۔

القشیری ،(أبو الحسین) مسلم بن الحجاج ،صحیح مسلم مع الترقیم والتحقیق لفواد عبد الباقی ۸۰۷ھ دار الکتاب بیروت، (۲٤۵:۵/ الشعب)، احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر،مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)(حدیث: ۱۸۵۲، حدیث مرفوع متصل)۔

حضرت زید ابن ارقم اور حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ وہ دونوں شریک تھے، پس انہوں نے چاندی نقد اور ادھار طریقہ پر خریدی، یہ بات آنحضرت ﷺ کے علم میں آئی تو آپ ﷺ نے فرمایا جو چاندی نقد طریقہ سے لی ہے وہ تو جائز ہے البتہ ادھار والی واپس لوٹادو۔

مذکورہ بالا حدیث سے تین امور مستنبط ہوتے ہیں:

۱: عقد شرکت کے جواز کا ثبوت۔

۲: دراھم اور دنانیر میں شرکت کے جواز کا ثبوت۔

۳: سونے اور چاندی کی بیع و شراء نقد ہونی چاہئے ادھار (نسیئۃ) جائز نہیں۔

٦۔ قال علیه الصلاۃ والسلام: ,,تفاوضوا فإنه أعظم للبرکة،،۔ (١)

وفی روایة أخری: ,,فاوضوا فإنه أعظم للبرکة،،۔ (٢)

حضور پاک ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ شرکت مفاوضہ کرو، کیونکہ یہ بہت عظیم برکت والی شرکت ہے۔

اس روایت سے بھی شرکت کا عمومی طور پر، اور شرکت مفاوضہ کا خاص طور پر جواز کا ثبوت ہوتا ہے، بلکہ اسکی ترغیب اور فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغینانی، (برهان الدین ابو الحسن) علی بن عبد الجلیل أبو بکر الرشدانی، الهدایة ،مکتبه امدادیه ملتان، (٢:٨٨٥)۔

وفی الدرایة فی تخریج أحادیث الهدایة: فاوضوا فإنه أعظم للبرکة لم أجده، وری ابن ماجه من حدیث صهیب رفعه، ثلاثٌ فیهن البرکة البیع إلی أجل والمفاوضة، واخلاط البر بالشعیر للبیت لا للبیع إلخ۔

قال العینی: هذا غریب لیس له أصل انظر البنایة: (٦:٨١)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ٥٨٧ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ١٤١٧ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، ٧:٥٨۔

۷۔ قال النبی ﷺ: الربح علی ما شرطا والوضیعة علی قدر المالین۔[1]

حضور پاک ﷺ نے اس روایت میں شرکت میں منافع اور نقصان کا اصول اس طرح بیان فرمایا کہ: منافع جو متعاقدین (شریکین) شرط لگائیں (اور باہم طے کریں) اس پر ہوگا اور نقصان دونوں کے مال کے حساب سے ہوگا۔

روایت بالا سے بھی شرکت کا نہ صرف ثبوت ہوتا ہے بلکہ اس کے منافع اور نقصان کی تقسیم کا اصول بھی واضح ہوتا ہے، کہ نفع اس حساب سے ہوگا جو دونوں باہم مل کر طے کریں اور نقصان دونوں کے مال کے حساب سے تقسیم ہوگا۔

۸۔ حضور اقدس ﷺ کے فعل مبارک سے بھی شرکت کا ثبوت ہوتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے بذات خود حضرت سائب ابن ابی سائبؓ کے ساتھ اول اسلام میں اور ایک روایت کے مطابق دور جاہلیت میں شرکت کا عقد فرمایا، چنانچہ علامہ شوکانیؒ نے روایت اس طرح ذکر فرمائی ہے:

إن السائب بن أبی السائبؓ قال للنبی ﷺ: كنت شريكا فی الجاهلية، فكنت خير شريك لا تدارينی ولا تمارينی[2]

وفی رواية: انه كان شريك النبی ﷺ فی اول الاسلام فی التجارة فلما كان يوم الفتح قال: مرحبا باخی وشريكی لا تداری ولا تماری[3]

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغینانی، (برهان الدین ابو الحسن) علی بن عبد الجلیل أبو بکر الرشدانی، الهداية، مکتبہ امدادیہ ملتان (۵۹۲:۲)۔

مصنف عبد الرزاق، عن علی فی المضاربة والشريكين، الوضيعة على المال والربح على ما اصطلحوا عليه، (كنز العمال، ۱۵: ۴۰۴۸۲، ۱۷۶)، ومصنف ابن ابی شيبة (۶:۴، حديث: ۱۰/ البيوع)

(۲) دیکھئے: الشوکانی، محمد بن علی الشوکانی ۱۲۵۵ھ، نیل الأوطار، مصر، مصطفى البابی الحلبی ۱۳۴۷ھ۔ ۲۹۷:۵ ابو داود سجستانی، (سلیمان بن الأشعث بن اسحاق) سنن أبی داود والنسائی والحاکم، (محمد بن عبد الله الحاکم ۴۰۵ھ)، مستدرك، بيروت، دار الكتب العلميه ۱۴۱۱ھ۔ وصححه۔

(۳) دیکھئے: البیهقی، احمد بن حسین البیهقی ۴۵۸ھ فی سننه فی کتاب الشركة ۷۸:۱، مطبعة مجلس دائرة المعارف العثمانية بالهند ۱۳۵۲ھ۔

وقال ابن عبد البر: کان شریك النبیﷺ فی اول الاسلام فی التجارة فلما کان یوم الفتح قال: مرحبا باخی وشریکی کان لا یماری ولا یداری۔[۱]

یعنی حضرت سائب بن ابی السائبؓ نے حضور ﷺ سے کہا: میں آپ کا شریک تھا دور جاہلیت میں، پس آپ بہترین شریک تھے، آپ ﷺ نہ بہت زیادہ نرمی کرتے تھے اور نہ جھگڑا کرتے تھے[۲]، اور ایک روایت میں یہ ہے کہ حضرت سائبؓ حضور ﷺ کے ابتدائے اسلام میں تجارت میں شریک تھے پس فتح مکہ کے دن انہوں نے حضور ﷺ سے کہا: خوش آمدید میرے بھائی اور میرے شریک کو، جو نہ تو بہت نرمی کرتے تھے اور نہ جھگڑا کرتے تھے، اور ابن عبد البرؒ فرماتے ہیں کہ وہ حضور ﷺ کے ساتھ ابتدائے اسلام میں شریک تھے، فتح مکہ کے روز انہوں نے حضور ﷺ کو خوش آمدید کیا اور کہا مرحبا میرے بھائی اور میرے شریک، کہ وہ نہ تو بہت نرمی کرتے تھے اور نہ جھگڑا کرتے تھے۔

۹۔ عن حکیم بن حزام صاحب رسول اللہ ﷺ أنه کان یشترط علی الرجل إذا أعطاہ مالا مقارضة، یضرب له به أن لا تجعل مالی فی کبد رطبة ولا تحمله فی بحر ولا تنزل به بطن مسیل فإن فعلت شیئا من ذلك فقد ضمنت مالی۔[۳]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: سبل السلام شرح بلوغ المرام لمحمد بن اسماعیل الصنعانی ۳:۶٤، دار إحیاءالتراث العربی بیروت ۱۳۰۹ھ، وذکر الصنانی أن الحاکم قد صححه۔

(۲) یہ ترجمہ لا تماتنی اور ولا تجاوزنی کے لحاظ سے کیا گیا ہے یہ ترجمہ شرکات الأشخاص بین الشریعۃ والقانون: محمد بن ابراہیم، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ، میں موجود ہے، ورنہ دوسرا ترجمہ جو مصباح اللغات کے لحاظ سے لا تداری کا کیا گیا ہے وہ یہ کہ آپ دھوکا نہیں دیتے تھے اور جھگڑا نہیں کرتے تھے۔

(۳) دیکھئے: دارقطنی،علی بن عمر ۳۸۵ھ، سنن الدارقطنی، دھلی، مطبع الفاروقی۔ والبیہقی، احمد بن حسین البیهقی ٤٥۸، وقوّی الحافظ ابن حجر اسنادہ۔

مزید دیکھئے: الشوکانی، محمد بن علی الشوکانی ۱۲۵۵ھ،نیل الأوطار، مصر، مصطفی البابی الحلبی ۱۳٤۷ھ۔ ۵: ۳۰، شرکات الأشخاص٤٦۔

حضرت حکیم بن حزامؓ جو حضور ﷺ کے ایک صحابی ہیں ان سے مروی ہے کہ وہ جب کسی کو مقارضہ (قرض) پر مال دیتے تو یہ شرط لگاتے کہ تم میرے مال کو کسی تر (گیلی) چیز کے اندر نہ رکھنا اور اسے سمندر پر نہ لادنا، اور تم اس کے ساتھ کسی پانی بہنے والی جگہ کے اندر نہ اترنا۔

سنت تقریریہ سے شرکت کا ثبوت

سنت تقریریہ سے بھی شرکت کا ثبوت حاصل ہوتا ہے، اور محدثین کی اصطلاح میں تقریر اس سنت کو کہا جاتا ہے کہ کوئی عمل آنحضرت ﷺ کے سامنے کسی مسلمان نے کیا ہو، اور آپ ﷺ نے اس پر سکوت فرمایا اور نکیر نہیں فرمائی، چنانچہ ایسا شرکت کے معاملہ میں بھی ہوا کہ بہت سے صحابہ کرام شرکت کا عقد کیا کرتے تھے، اور حضور ﷺ نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔

اسلام سے پہلے بھی شرکت کا عقد رائج اور معروف تھا، چنانچہ اہل مکہ جو تجارت میں مشہور تھے اور خاص طور پر قریش کے قافلے گرمیوں اور سردیوں میں بھی سفر کر کے شام اور دوسرے مقامات پر بغرض تجارت جایا کرتے تھے جیسا کہ قرآن حکیم میں اسکا ذکر بھی کیا گیا:

﴿لِإِيلَافِ قُرَيْشٍ إِيلَافِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَاءِ وَالصَّيْفِ﴾

حضرت ابو سفیان کا قافلہ اسلام لانے سے قبل مالِ تجارت لے کر شام جاتا تھا، اس میں اہل مکہ اور قریش کا مالِ تجارت بھی شامل ہوتا تھا، یقیناً یہ لوگ اس تجارت میں شرکت و مضاربت کرتے ہونگے [۱]۔

اور یقیناً وہ لوگ اس تجارت میں مشارکہ اور مضاربہ بھی کرتے ہوں گے، کیونکہ بہت سے صاحب ثروت اور

(۱) ملاحظہ فرمائیں: تاریخ طبری، واقعة البدر الكبرى، (۲:۱۳۵)

مالدار لوگوں کے پاس اگرچہ مال تو ہوتا ہے لیکن وہ کسی وجہ سے خود سفر پر تجارت کے لئے نہیں جاتے، بلکہ وہ اپنا مال یا رقم کسی دوسرے کے سپرد کر کے اس سے یہ معاملہ کر لیتے ہیں کہ مال میرا ہوگا، اور کام تمہارا، لہذا جو منافع حاصل ہوگا، وہ ہم دونوں میں اتنے تناسب سے تقسیم ہوگا، یہی مضاربہ کی شکل ہے، اگر اسی رقم میں عامل اپنا سرمایہ بھی شامل کرے تو یہ مشارکہ بھی بن جائیگا اس طرح کا معاملہ خود حضور ﷺ نے بھی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ فرمایا کہ ان کا مال حضور ﷺ بطور مضاربت شام لے جاتے، اور وہاں جا کر فروخت کر دیتے اور بعد میں منافع تقسیم فرما لیتے۔

اسی طرح حضرت حکیم بن حزامؓ اور حضرت عباسؓ بھی اپنے مال میں مضاربت کرتے تھی، اور کچھ معین شرطیں لگالیا کرتے تھے، اور حضور ﷺ نے اس کو دیکھ کر کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ (۱)

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الخطاب، المواهب شرح مختصر خليل، دارصادر، بيروت، (۵:۲۲)، قوله: ذكر صاحب المقدمات واللخمى وشراح المدونة أيات وأحاديث تدل على أن الأصل فى الشركة أيات المواريث وقوله: ضرب الله مثلاً رجلا فيه شركاء الآية، وقوله: إذا حضر القسمة الآية، وحديث: أيما دار قسمت فى الجاهلية، وحديث الشفعة فى كل ما يقسم، وقال ابن عبد السلام الأصل فيها قوله تعالى: ﴿فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ﴾ الآية، والحديث المتقدم وحديث السفينة وهو قوله ﷺ: مثل للقائم على حدود الله والمداهن فيها كمثل قوم استهموا سفينة فى البحر، فأصاب بعضهم أعلاها، وبعضهم أسفلها، فكان الذين فى أسفلها يصعدون فيستقون الماء، فيضيقون على الذين فى أعلاها فقال الذين فى أعلاها: لا ندعكم تصعدون فتؤذوننا، فقال الذين فى أسفلها فإننا نبقها من أسفلها، فنستقى، فإن أخذوا على أيديهم فمنعوهم نجوا جميعا، وإن تركوا هم غرقوا جميعا۔ قال الترمذى حديث حسن صحيح۔

وقد استشهد بعضهم بقوله تعالى: ﴿وَأَشْرِكْهُ فِيْ أَمْرِيْ﴾ وقد استبعدت الاستشهاد بها لبعدها فى الاستدلال ما عدا آيتى الشركة فى العبد وفتية الكهف، وحديث القسمة والشفعة ليسانصا فى الشركة، كما أن حديث السفينة ضربه الرسول ﷺ مثلاً فى تضامن الجماعة، وأية الميراث نص فى شركة الملك الجبرية لإثبات الشركة فى الثلث للأخوة، وقد وردت فى بيان الصبة الورثة فاستبعدت الاستشهاد بها۔ (الشركات فى الشريعة الاسلامية لاستاذ عبد العزيز خياط ۱:۶۳)۔

درج ذیل حدیث سے مضاربت جو کہ شرکت کی ایک صورت ہے کا سنت تقریریہ سے ثبوت ملتا ہے۔

عن زيد بن اسلم عن ابيه قال: خرج عبد الله و عبيد الله ابنا عمر ابن الخطاب فى الجيش الى العراق فلما قفلا مرا على ابى موسى الاشعرىؓ وهو امير البصرة فرحب بهما وسهل ثم قال: لو اقدر لكما على امرأ نفعكما به لفعلت ثم قال بلى: هنا مال من مال الله اريد ان ابعث به الى امير المؤمنين فاسلفكماه فتبتاعان به متاعا من متاع العراق، ثم تبيعانه بالمدينة فتؤديان راس المال إلى أمير المومنين ويكون لكما الربح فقالا: وددنا ففعل وكتب الى عمر بن الخطاب ان يأخذ منهما

(گذشتہ سے پیوستہ)

المال فلما قدما باعا وربحا فلما دفعا ذلك الى عمر قال: اكل الجيش اسلفه مثل ما اسلفكما؟ قالا: لا فقال عمر بن الخطاب: ابنا امير المومنين فاسلفكما ادیا المال وادیا ربحه فأما عبد الله فسكت ، وأما عبيد الله فقال ما ينبغي لك يا امير المومنين لو نقص المال او هلك لضمناه فقال عمر: اديا ه، فسكت عبد الله وراجعه عبيد الله، فقال رجل من جلساء عمر يا امير المومنين لو جعلته قراضا فقال عمر: قد جعلته قراضا، فاخذ عمر راس المال ونصف ربحه واخذ عبد الله و عبيد الله ابنا عمر بن الخطاب نصف الربح اخرجه مالك فى الموطا والشافعى والدارقطنى ىقال الحافظ اسناده صحيح۔ (الشوكاني، محمد بن على ١٢٥٥ھ، نيل الاوطار، مصر، مكتبة مصطفى الباب الحلبى ١٣٤٧ھ۔ ٣٠٦:٥ المطبعةا لمصريه)۔

اجماعِ امت

قرآن وسنت کے مذکورہ بالا دلائل کی بنیاد پر پوری امت کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ شرکت ایک جائز معاملہ ہے۔

چنانچہ بہت سے فقہاء کرام نے ذکر فرمایا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ سے لے کر آج تک شرکت کا عقد ہوتا چلا آیا ہے، لیکن کسی ایک فقیہ یا عالم نے کبھی اس پر نکیر نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شرکت کی مشروعیت اجماع سے بھی ثابت ہے:

ابن قدامہؒ نے المغنی میں ذکر فرمایا ہے:

,,أجمع المسلمون على جواز الشركة في الجملة،،[1]

تمام مسلمانوں نے شرکت کے جواز پر فی الجملہ اجماع کیا ہے۔

علامہ بابرتیؒ نے العنایہ علی الہدایۃ میں ذکر فرمایا:

,,وتعاملها الناس من لدن رسول الله ﷺ الى يومنا هذا من غير نكير،،[2]

شرکت پر حضور ﷺ سے لیکر ہمارے زمانہ تک بلا کسی نکیر کے تعامل چلا آرہا ہے۔

علامہ ابن ہمامؒ فتح القدیر میں ذکر فرماتے ہیں:

(۱) المغنی علی مختصر الخرقی لموفق الدین بن قدامہ (۳:۵)، کتاب الشركة۔

(۲) البابرتی، اکمل الدین محمد بن محمود، ۷۸٦ھ، شرح العنایہ علی الهدایہ، کلکته، بابو منشی رام، ۱۲٤۷ھ، (۳:۵)۔

,,ولا شك أن مشروعيتها أظهر ثبوتا إذ التوارث والتعامل بها من لدن رسول الله ﷺ وهلم جرا متصل لا يحتاج فيه الى اثبات حديث بعينه،،[۱]

شرکت کی مشروعیت کسی بھی شک وشبہ سے بالاتر ہے کیونکہ اس پر حضور ﷺ کے زمانہ سے لیکر آج تک عمل چلا آرہا ہے، لہذا اس کے ثبوت کے لئے کسی متعین حدیث کی ضرورت نہیں۔

فقہ مالکی میں علامہ دوانی ؒ اپنی کتاب ,,الفواکہ الدوانی علی رسالۃ ابی محمد عبداللہ القیروانی المالکی،، میں ذکر فرماتے ہیں:

,,وانعقد الاجماع على جوازها،،[۲]

شرکت کے جواز پر اجماع منعقد ہو چکا ہے۔

سعدی ابو جیب نے موسوعۃ الاجماع میں ذکر کیا ہے:

,,أجمع المسلمون على ان الشركة جائزة في الجملة،،[۳]

تمام مسلمانوں نے شرکت کے جواز پر فی الجملہ اجماع کیا ہے۔

علامہ ابن حزم ؒ نے مراتب الاجماع میں ذکر کیا ہے:

,,اتفقوا أن الشركة إذا أخرج كل واحد من الشريكين او الشركاء دراهم متماثلة في الصفة والوزن وخلطوا كل ذلك خلطا لا يتميز به ما أخرج كل

(۱) ابن الهمام، فتح القدير،(٧٦٧) المكتبة الرشيدية كوئٹه(٣:٥)۔

(۲) غنيم، احمد المالكي الأزهري، الفواكه الدواني على رسالةابى محمد عبدالله القيرواني المالكي (١٧١:٢) شركات الأشخاص بين الشريعة والقانون:محمد بن ابراهيم، جامعة الامام محمد بن سعود الاسلاميه ١٤٠١ه،(ص:٤٢)۔

(۳) موسسة الاجماع في الفقه الاسلامي لسعدى أبي حبيب طبع في دار العربية بيروت۔

واحد منهم او منهما فإنها شركة صحيحة فيما خلطوه من ذلك على السواء بينهم،،[1]

فقہاء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر دو شریک یا زیادہ مل کر ایک ہی جیسی صفت اور وزن کے دراہم نکال کر ملادیں، اور انہیں آپس میں اس طرح خلط کردیں کہ ان میں تمیز نہ ہو سکے تو یہ شرکت اس مخلوط دراہم میں برابری کے ساتھ صحیح ہے۔

مذکورہ بالا عبارت سے کم از کم شرکت کی مشروعیت پر اجماع ثابت ہوتا ہے، اسی طرح اسی قسم کی عبارت علامہ ابن منذرؒ نے الاجماع میں ذکر کی ہے:

،،وأجمعوا على ان الشركة الصحيحة ان يخرج كل واحد من الشريكين مالا مثل مال صاحبه دنانير او دراهم، ثم يخلطا ذلك حتى يصير مالا واحدًا لا يتميز على ان يبيعا ويشتريا ما رأيا من التجارات على ان ما كان فيه من فضل فلهما وما كان من نقص فعليهما، فإذا فعلا ذلك صحت الشركة،،[2]

اور اس بات پر اجماع ہے کہ شرکت صحیحہ یہ ہے کہ دو شریک مل کر ہم مثل دراہم یا دنانیر نکالیں، پھر اسے مخلوط کر کے ایک ایسا مال بنادیں کہ اب اس میں تمیز باقی نہ رہے، اور اس سے بیع وشراء اور تجارت کریں اور باہم یہ طے کرلیں کہ جو نفع ہوگا وہ دونوں کو ملے گا، اور جو نقصان ہوگا وہ بھی دونوں پر ہوگا، چنانچہ اگر وہ ایسا معاملہ کریں تو یہ جائز صورت ہے۔

---

(۱) مراتب الاجماع لابن حزم مطبوعه دار الباز مكة المكرمة(ص: ۹۱) ، الشركة۔

(۲) نيسابوری ، ابن منذر، الاجماع (۱۲۲) كتاب الشركة طبع فی دار طيبة، الرياض۔

ثبوت شرکت کی عقلی دلیل

اللہ تعالیٰ نے تمام ادیان کے مقابلہ میں دین اسلام کو یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ اس میں انسان کی فطری ضروریات کو مد نظر رکھا گیا ہے، اور کوئی ایسا کام انسان کے ذمے لازم نہیں کیا گیا جو اس کی قدرت اور وسعت سے باہر ہو، چنانچہ انہی انسانی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شریعت مطہرہ نے شرکت کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اگر شرکت کو جائز نہ کیا جاتا اور اس سے لوگوں کو منع کر دیا جاتا تو بنی نوع انسان کی تجارت کا ایک عظیم باب بند ہو جاتا، اور انسان کو نفع کے بجائے نقصان اور مشقت کا احتمال تھا، شریعت چونکہ دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی بھلائی کی ضامن ہے اس لئے اس نے انسان پر بے جا بندشیں لگا کر دین میں مشکلات پیدا نہیں کیں، البتہ اگر کوئی کام پوری انسانیت کے لئے باعث ضرر و نقصان ہوا تو اس پر پابندی لگا کر اسے حرام قرار دیدیا۔

قرآن کریم نے اسی بات کو ذکر فرمایا کہ:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ [1]

اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [2]

اللہ تعالیٰ تمہارے لئے آسانی چاہتے ہیں اور مشکل نہیں چاہتے۔

اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(۱) سورة الحج آیت:(۷۸) (ترجمہ:تفسیر بیان القرآن،۷:۸٤)۔

(۲) سورة طٰہٰ آیت:۱۷۵ ۔

یسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا۔[۱]

لوگوں کے لئے آسانی کرو، مشکلات نہ کرو، خوش خبری سناؤ، نفرت نہ دلاؤ۔

اور یہ کہ اسلام نے تجارت کو اللہ تعالی کا فضل قرار دیا اور اس فضل اور رزق کو تلاش کرنے اور اسمیں سعی کرنے کا جابجا حکم بھی دیا چنانچہ فرمایا گیا:

﴿وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾[۲]

اللہ کا فضل تلاش کرو۔

دوسری جگہ فرمایا:

﴿لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾[۳]

تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کرو۔

بقولِ مفسرین وعلماءِ محققین یہاں ,,فضل،، سے مراد تجارت ہے، لہذا تجارت کی تمام جائز شکلیں اختیار کرنا باعث ثواب اور خدا تعالی کے حکم کی اطاعت ہوگی، چنانچہ شرکت جو تجارت کا ایک عظیم ذریعہ ہے، وہ بھی فضل خداوندی کی تلاش میں معاون ہونے کی وجہ سے باعثِ فضیلت ہوگا، اور اس میں چونکہ دو یا زیادہ افراد مل کر باہمی تعاون سے کاروبار کرتے ہیں، لہذا اس میں اتحاد، اجتماع، اشتراک، اور باہمی اتفاق کی فضیلت بھی حاصل ہوگی، اور ان قرآنی آیات واحادیثِ نبویہ کی وجہ سے جن میں تعاون اور اجتماع کی فضیلت آئی ہے یہ کاروبار شرکت باعث اجر وثواب ہوگا، جیسے قرآنِ حکیم میں ارشاد ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾[۴]

---

(۱) متفق علیہ۔

(۲) سورة الجمعة آیت: ۱۰۔

(۳) سورة النحل آیت: ۱٤۔

(۴) سورة المائدة آیت: ۲۔

تم نیکی اور تقوی میں تعاون کرو، اور گناہ اور دشمنی میں تعاون نہ کرو۔

مزید بر آں چونکہ احادیث میں فرمایا:

ید اللّٰہ علی الجماعۃ[1]

اللہ کی مدد جماعت پر ہوتی ہے۔

اور دوسری جگہ فرمایا:

,,المومن للمومن کالبنیان یشد بعضہ بعضا،،[2]

ایک مومن دوسرے مومن کے لئے ایسا ہے جیسے عمارت کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اشتراک عمل نہ صرف موجب ثواب ہے، بلکہ ایک دوسرے کی تقویت اور برکت کا باعث ہے، کیونکہ شرکت کی ضرورت تجارت میں اس لئے بھی زیادہ ہے کہ بعض اوقات انسان کے پاس مال واسباب تو وافر مقدار میں مہیا ہوتا ہے، البتہ وہ اس صلاحیت اور مہارت سے محروم ہوتا ہے، جو کاروبار کے لئے درکار ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے کے حوالہ کر دیتا ہے، اور اس سے شرکت یا مضاربت کا معاملہ طے کر لیتا ہے، خاص طور پر آج کل کے دور میں جو کہ صنعتی دور ہے، ملیں، کارخانے اور بڑی بڑی صنعتیں لگانے کی حاجت ہوتی ہے، جس کے لئے اتنی خطیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے کہ عام طور پر ایک یا دو افراد مہیا نہیں کر سکتے، لہذا کچھ افراد کے لئے مشترکہ طور پر فنڈ اکٹھا کر کے کاروبار کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر وہ کاروبار نہیں چل سکتا، لہذا اس دور میں تو شرکت کے بغیر تجارتی ضروریات پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الترمذی، (أبو عیسیٰ محمد بن عیسی بن سورۃ الترمذی ۱۱۹۸-۱۲۵۲) جامع السنن، دار الفکر بیروت، الفتن (۹:۱۰)، وقال: حدیث حسن غریب۔

(۲) دیکھئے: البخاری، (أبو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری) الصحیح البخاری المسمی بالجامع الصحیح، (۱٤:۸) ,,باب تعاون المؤمنین بعضھم بعضاً،، مطبعۃ مصطفی الحلبی مصر۔

مزید برآں اللہ تعالی نے ہر انسان کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے کوئی کسی ہنر میں طاق اور ماہر ہوتا ہے، تو دوسرا کسی اور فن میں مہارت رکھتاہے، چنانچہ اگر کچھ افراد مل کر کام کریں تو یہ ممکن ہے کہ ایک شخص انتظامات (Management) میں ماہر ہو، اور دوسرا تجارت میں، اور تیسرا تعلقات اور ساکھ میں فوقیت رکھتا ہو، اس طرح مشترک طور پر کام کرنے سے تین افراد کی قوتیں مجتمع ہوں گی تو اس کے فوائد بھی زیادہ ہونگے اور برکت بھی۔

شرکت کی مختلف صورتیں اور انکا ارتقاء

بنی نوع انسانی کی ضروریات زندگی اور خواہشات طبعیہ میں اضافہ کے ساتھ لوگوں کے باہمی تعلقات اور معاملات میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا، چنانچہ بیع وشراء اور تجارت میں اضافہ کی خاطر انسان نے نت نئے راستے نکالے، اور معاملات کی مختلف صورتیں رائج کیں، انہی صورتوں میں سے ایک عقد شرکت بھی ہے، جسکی مزید نئی شکلیں اور متنوع اقسام زمانہ کی گردش کے ساتھ ساتھ منظر عام پر آتی رہیں، اور انہیں انسانوں نے قبول کر کے اختیار کیا، انہی انسانوں میں سے اہل عرب کو بھی شرکت کی ان اقسام کا علم حاصل ہوا، اور انہوں نے اس کے مطابق تعامل اور باہمی لین دین کا عقد کرنا شروع کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ نے جب دینِ اسلام کی آفاقی تعلیمات کی تبلیغ کی اور شرعی احکام کو نافذ فرمایا تو ان تعلیمات اور احکامات کا ایک جزو اعظم "معاملات" بھی تھے لہذا انہوں نے ان معاملات میں سے جو تمام بنی نوع انسانی کیلئے ضروری اور مناسب تھے ان کو باقی رکھا، البتہ ان میں سے وہ جو نفع عامہ کے منافی تھے، اور اس سے انسان کا دین ودنیا کا ضرر تھا ان کو ممنوع قرار دیدیا۔

جب صحابہ کرام اور تابعین کے دور میں اسلام جزیرۂ عرب سے دنیا کے دور دراز خطوں میں پھیلا تو مختلف شہروں اور علاقوں کے معاملات بشمول عقد شرکت کی ایسی نت نئی اور مختلف صورتیں سامنے آئیں، جو اس سے پہلے موجود نہ تھیں، لہذا فقہاء اسلام نے اسلام کے زریں اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اجتہاد کیا اور انتہائی عرق ریزی کے بعد ان میں سے بعض صورتوں کو جائز اور بعض صورتوں کو ناجائز قرار دیا اور مزید یہ کہ ادلہ اربعہ کی روشنی میں ایسے اصول مستنبط

فرمادیئے کہ بعد میں آنیوالوں کوانکی روشنی میں جزوی مسائل کا علم ہو جائے۔

عصر حاضر میں دنیا اقتصادیات، معاشیات، صنعت، تجارت اور حرفت کے عروج پر پہونچ چکی ہے، مواصلات اور ذرائع نقل وحمل نے بھی دنیا کو قریب تر کر دیا ہے، چنانچہ اب شرکت اور تجارت کا مفہوم اور دائرہ کار اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ اسکی جدید سے جدید صورتیں روز مرہ سامنے آتی جارہی ہیں، اور ان کے بارے میں کتابیں اور مقالے تحریر کیے جارہے ہیں، جامعات اور تعلیمی اداروں میں انکی تعلیم اور تفہیم پر زور دیا جارہا ہے، اور جدید معاشیات میں بالخصوص اور عصری قوانین میں بھی شرکت کے انواع واقسام کی تحدید اوران کے احکامات کو بطور خاص ذکر کیا جارہا ہے، تاکہ ان کے فوائد اور نقصانات کا جائزہ لے کر اہل دنیا اپنے لئے معاشی مسائل حل کر سکیں، جس کے نتیجہ میں دنیا سے غربت وافلاس کا خاتمہ ہو، اور ایک خوشحالی معاشرہ تشکیل پائے، اس مقصد سے بھی فقہ اسلامی کی روشنی میں شرکت کی ان اقسام کا جائزہ لے کر انکے احکامات جاننے کی ضرورت ہے، چنانچہ ذیل میں اسی طرح شرکت کی انواع کی تعریفات اور صورتِ مسئلہ کی وضاحت کی جائیگی، آگے تفصیل کے ساتھ احکامات کا بیان ہوگا، (انشاءاللہ)۔

اگر شرکت کی مختلف صورتوں کا جائزہ لیا جائے تو ابتدائی طور پر دو بنیادی شکلیں یہ ہیں:

۱: روایتی شرکت یا فقہ اسلامی میں شرکت کی صورتیں واقسام۔

۲: جدید معاشیات اور عصری قوانین میں شرکت کا تصور۔

مذکورہ بالا ترتیب کے مطابق اولاً روایتی شرکت یا فقہ اسلامی کی بیان کردہ شرکت کی صورتیں اور اقسام ذکر کی جائیں گی، اس کے بعد جدید معاشیات اور قوانین عصریہ میں شرکت کے تصور کی وضاحت اور اس کے ساتھ مذکورہ بالا دونوں صورتوں کے درمیان باہم ربط اور تعلق کی وضاحت کی جائیگی۔

شرکت کی اقسام اور

شرکت، مضاربہ اور مشارکہ میں فرق

زیرِ نظر مقالہ میں چونکہ شرکت، مضاربہ اور مشارکہ کی تفصیلات کا بیان ہوگا، اس لئے ان کے احکام اور مسائل سے قبل ان تینوں کی تعریفات اور ان کے درمیان فرق اچھی طرح سمجھنا ضروری ہے۔

شرکت کی دو تعریفیں کی گئی ہیں، جن میں سے ایک عام اور دوسری خاص ہے، پہلی تعریف چونکہ عام ہے اس لئے اس میں مضاربت اور مشارکہ بھی داخل ہیں، اور دوسری تعریف کے خاص ہونے کی وجہ سے اس میں مشارکہ اور مضاربہ شامل نہیں ہیں۔

شرکت کی تعریف اول بمعنی عام:

ایک سے زائد افراد کا کسی چیز کی ملکیت میں یا کسی کاروبار میں یا نفع میں حصہ دار ہونا۔ (اس تعریف کی رو سے اصطلاحی شرکت کی تمام اقسام مضاربت اور مشارکہ شرکت بمعنی عام میں داخل ہو جائیں گی۔

شرکت کی تعریف ثانی بمعنی خاص:

ایک سے زائد افراد کا کسی چیز کی ملکیت میں یا مشترک سرمائے کے کاروبار میں حصہ دار ہونا۔ (اس تعریف میں صرف شرکت اصطلاحی اور مشارکہ شامل ہونگے)۔

مذکورہ ذیل نقشہ سے شرکت کی تمام اقسام اور ان کا خاکہ واضح ہو جائیگا:
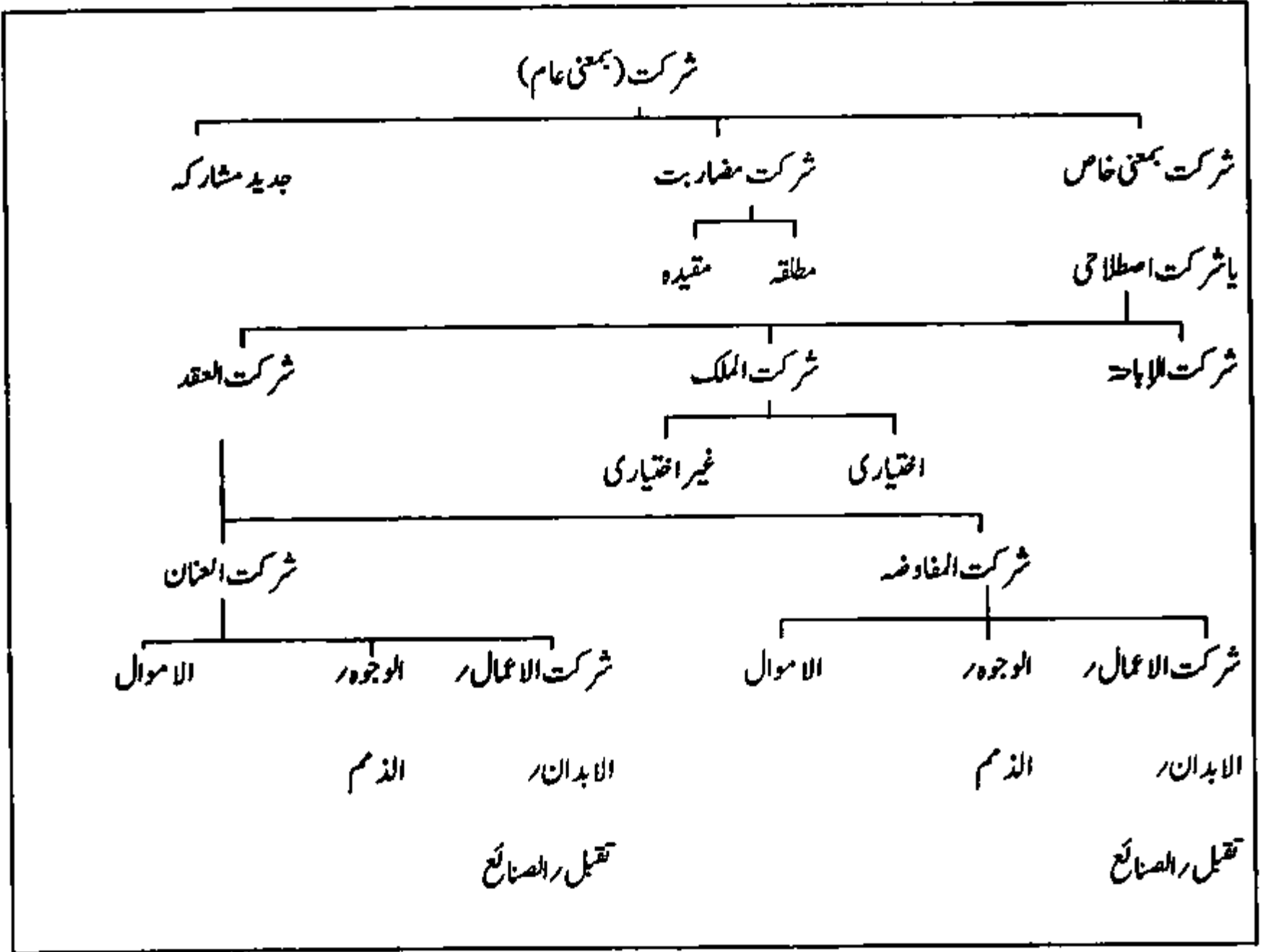
مندرجہ بالا نقشہ کی تفصیل یہ ہے کہ شرکت بمعنی عام کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت اصطلاحی بمعنی خاص۔

۲۔ مضاربت۔

۳۔ مشارکہ جدیدہ۔

شرکت اصطلاحی بمعنی خاص کی تعریف پیچھے ذکر کی جاچکی ہے البتہ مضاربت اور مشارکہ کی تعریفیں ذیل میں مذکور ہیں۔

مضاربت:

دوافراد کا اس طرح شرکت کرنا کہ ایک کی طرف سے مال ہو اور دوسرے کی طرف سے عمل، اور نفع میں دونوں شریک ہوں، صاحب مال کو رب المال اور سرمایہ کار (Invester) کہتے ہیں، جبکہ عمل کرنے والے کو عامل (Active) اور مضارب کہا جاتا ہے، اور جو مال لگایا جائے اسے راس المال (Capital) یا سرمایہ کہتے ہیں، مضاربت کی مزید دو قسمیں ہیں ۱۔ مضاربت مطلقہ، ۲۔ مضاربت مقیدہ، مضاربت اور اسکی اقسام کی مزید تفصیل آگے علیحدہ سے ذکر کی جائے گی، (انشاءاللہ)۔

جدید مشارکہ:

فقہ کی قدیم اور روایتی کتابوں میں لفظ مشارکہ کو شرکت کی کسی خاص قسم یا کسی مخصوص معاملہ کے لئے استعمال نہیں کیا گیا، بلکہ ان میں مشارکہ اور شرکت ایک ہی معنی میں استعمال ہوتا رہا، چنانچہ فقہ کی ان کتب میں مشارکہ کا وہ مفہوم نہیں ملے گا جسے یہاں ذکر کرنا مقصود ہے، اسی طرح عصر حاضر میں شرکت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی جاچکی ہیں، چونکہ وہ بھی درحقیقت فقہ کی قدیم کتابوں سے ماخوذ ہیں اس لئے ان میں بھی مشارکہ کا تصور شرکت کی کسی نئی قسم کے طور پر ملنا مشکل ہے، البتہ جدید معاشی محققین مشارکہ کی اصطلاح شرکت کی ایک نئی قسم کے طور پر استعمال کررہے ہیں، جس کے ذریعہ فائنانسنگ اور انویسٹمنٹ کے ایسے طریقے متعارف کرانا مقصود ہیں جو سود کے بدل کے طور پر بھی پیش کئے جاسکیں، اور ان کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ نفع بھی کمایا جاسکے، اسکی مختصرا وضاحت درج ذیل ہے:

یہ درحقیقت شرکت اور مضاربت کا ایک مجموعہ ہے اسکا حاصل یہ ہے کہ مضاربہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص پیسہ لگاتا ہے جسے رب المال کہتے ہیں، اور دوسرا شخص اس کے ذریعہ تجارت کرکے پیسہ کماتا ہے، جسے مضارب کہا جاتا ہے، عام طور پر مضارب اپنے پاس سے پیسے نہیں لگاتا بلکہ رب المال سے سرمایہ لیکر کاروبار کرتا ہے، لیکن اگر مضارب بھی اپنا کچھ سرمایہ اسی کاروبار میں لگانا چاہے تو اس صورت میں اس مضاربت کے ساتھ شرکت بھی جمع ہو جائیگی، مثلاً اگر زید (رب المال) نے عمر (مضارب) کو ایک لاکھ روپے بطور مضاربہ دیئے، اس میں عمر (مضارب) نے اپنے پاس سے پچاس ہزار روپے اور شامل کرلئے، یہ شرکت اب مشارکہ بن جائیگی، جس میں مضاربہ بھی پایا جائے گا،

جدید مشارکہ کی مزید تفصیل آگے علیحدہ سے ذکر کی جائے گی۔

شرکت اصطلاحی (بمعنی خاص) کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت الاباحہ ۲۔ شرکت الملک ۳۔ شرکت العقد

۱۔ شرکت الاباحہ کی تعریف:

شرکت الاباحہ یہ ہے کہ عام لوگوں کا کسی ایسی مباح چیز کی حق ملکیت میں شرکت جس چیز کا کوئی ایک شخص مالک نہ ہو، اس شرکت کو عام ملکی قوانین میں ملک عام یا منافع عام کی اشیاء کہا جاتا ہے۔

شرکت الاباحہ کا ثبوت قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات سے ہوتا ہے:

۱۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الأَرْضِ جَمِيْعًا﴾[۱]
یعنی وہ ذات پاک ایسی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدہ کے لئے جو کچھ بھی زمین میں موجود ہے سب کا سب[۲]۔

۲۔ ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الأَرْضِ جَمِيْعًا مِنْهُ﴾[۳]
اور تمہارے لئے اس نے ان تمام چیزوں کو مسخر کر دیا ہے جو آسمان اور زمین میں ہیں۔

۳۔ ﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ﴾[۴]
تمہارے لئے دریا کا شکار پکڑنا اور اس کا کھانا حلال کیا گیا ہے تمہارے انتفاع کے واسطے اور مسافروں کے واسطے[۵]۔

---

(۱) سورۃ البقرۃ آیت:(۲۹)۔

(۲) بیان القرآن ص:۸۔

(۳) سورۃ الجاثیۃ آیت:(۱۳)۔

(۴) سورۃ المائدہ آیت:(۹۶)۔

(۵) بیان القرآن ص:۱۸۶۔

اور درج ذیل حدیث سے بھی شرکت الإباحۃ کا ثبوت ملتا ہے۔

,,الناس شرکاء فی ثلاثۃ: الماء والکلأ والنار،،۔

لوگ تین چیزوں میں شریک ہیں: ۱۔ پانی ۲۔ گھاس ۳۔ آگ۔

شرکت الاباحہ ایسی عام اشیاء کو شامل ہوتی ہے جس کی حق ملکیت میں عام لوگ شریک ہوتے ہیں، اور شارع علیہ السلام نے اس کے استعمال کی ہر ایک کو اجازت دی ہوتی ہے، یہ چیزیں درج ذیل ہیں:

۱۔ پانی، اس میں سمندروں، دریاؤں اور نہروں کا پانی شامل ہے۔

۲۔ گھاس، اس سے مراد غیر مملوکہ زمین میں اُگنے والی گھاس اور خودرو جھاڑ اور درخت ہیں۔

۳۔ آگ، اس سے مراد آگ جلانے کی غیر مملوکہ لکڑی، تاکہ اسے جلا کر روشنی اور کھانے پکانے میں استعمال کرسکیں۔

۴۔: معدنیات، کبھی ختم نہ ہونے والی اور زمین سے نکلنے والی معدنیات۔[1]

۵۔: عام منافع کی اشیاء، مثلاً شارع عام، سڑک، مسجد، رباط، میدان اور باغات وغیرہ۔

شرکتِ اصطلاحی کی بقیہ دو اقسام ہیں شرکت الملک اور شرکت العقد، شرکت الملک کی دو قسمیں ہیں، ایک شرکت الملک اختیاری، اور دوسری شرکت الملک غیر اختیاری۔

اسی طرح شرکت العقد کی بھی دو قسمیں ہیں: ۱۔ شرکت المفاوضہ، ۲۔ شرکت العنان۔ پھر شرکت المفاوضہ اور شرکت العنان میں سے ہر ایک کی تین تین قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت الأعمال جسے شرکت الابدان یا تقبل یا صنائع بھی کہا جاتا ہے۔

۲۔ شرکت الوجوہ جسے مالکیہ کے نزدیک شرکت الذمم کہا جاتا ہے۔

---

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے فقہ المعاملات، C.D. Edition بحث شرکۃ الاباحۃ۔

۳۔ شرکت الأموال۔

اب سب سے پہلے شرکت الملک کی تعریف اور اقسام واحکام ذکر کئے جائیں گے، اس کے بعد شرکت العقد کی تعریف، اقسام اور احکام بالترتیب بیان کئے جائیں گے۔

شرکت الملک اور اسکی اقسام

شرکت الملک کی تعریف:

شرکت ملک کی تعریف عربی کتب میں یوں ذکر کی گئی ہے:

,,شركة الملك أن يكون الشيء مشتركا بين اثنين أو أكثر بسبب من أسباب التملك كالشراء والهبة والوصية والإرث أو خلط الأموال أو اختلاطها بصورة لا تقبل التمييز والتفريق،،۔[1]

شرکت ملک یہ ہے کہ کوئی شے دو افراد کے یا زیادہ کے درمیان ملکیت حاصل کرنے کے اسباب مثلاً خریداری، ہبہ، وصیت، وراثت کے ذریعے اموال کا بایں طور مخلوط کرنا یا ہونا کہ ان میں امتیاز باقی نہ رہے، ان میں سے کسی سبب کے ذریعہ مشترک ہو۔

مذکورہ بالا تعریف کا خلاصہ یہ ہوا کہ شرکت ملک یہ ہے کہ دو یا زیادہ افراد کسی چیز کو مشترکہ طور پر خریدنے یا تحفہ میں ملنے، یا میراث کی وجہ سے مالک ہو جائیں۔

یہی بات قدرے تفصیل سے مجلۃ الأحکام العدلیۃ میں بھی مذکور ہے جس کی عبارت یہ ہے:

شرکت الملك: هی کون الشيء مشترکا بین أکثر من واحد، أی

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الوجیز للغزالی (۱:۱٤٦)۔

مخصوصا بهم، بسبب من أسباب التملك كالاشتراء والاتهاب، وقبول الوصية والتوارث، أو بخلط واختلاط الأموال، يعنى بخلط الأموال بعضها ببعض بصورة لا تكون قابلة للتمييز والتفريق، أو باختلاط الأموال بتلك الصورة بعضها ببعض، مثلاً لو اشترى اثنان مالا، أو وهبها أحد، أو أوصى به وقبلا، أو ورثا اثنان مالا، فيكون ذلك المال مشتركا بينهما، ويكونا ذوى نصب فى ذلك المال، ومتشاركين فيه، ويكون كل منهما شريك الأخر فيه، كذلك إذا خلط اثنان ذخيرتهما بعضها ببعض، أو اختلطت ذخيرتهما ببعضها بانخراق عدولهما، فيصير هذه الذخيرة المخلوطة أو المختلطة مالا مشتركا بين اثنين۔[1]

ملکیت حاصل ہونے کے اسباب میں سے کسی سبب سے کسی شے کا دو یا زیادہ افراد کے درمیان مشترک ہونا، اور اسباب ملکیت یہ ہیں: خریداری، ہبہ، قبول وصیت، وراثت، اموال کا اس طرح مخلوط ہونا کہ امتیاز باقی نہ رہے، مثلاً جب دو افراد ملکر کوئی چیز خریدیں، یا ان دونوں کو ہدیہ میں کوئی چیز ملے، یا ان دونوں کو کسی

---

(۱) مجلة الاحكام العدلية، جماعة من العلماء، نور محمد كار خانه تجارتِ كتب كراچی۔ (۲:۱۰٦۰)،
والحصكفى ، محمدعلاء الدين ، الدر المختار شرح تنوير البصار مع الشامى ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ايچ ايم سعيد كمپنى (٤:۲۹۹)۔
وفتح القدير (٥:٣٧٧)۔
والبحر الرائق (١٦٦)۔
والكاسانى،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ٥٨٧ه ، بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربى ١٤١٧ه،ايچ ايم سعيد كمپنى:(٦:٥٦)، (ولم يوجد تعريف شركة الملك فى غير الكتب الحنفية مع أن أقسامهامذكورة فيها)۔

مال کی وصیت کی گئی اور انہوں نے اسے قبول کر لیا، یا دو افراد کسی مال کے وارث بن گئے اس طرح یہ مال ان کا مشترک ہو گیا، اور وہ دونوں اس میں اس طرح حصہ دار بن گئے کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کے حصہ میں شریک ہے، اسی طرح اگر دو افراد نے اپنا اکٹھا کردہ ذخیرہ ملا کر اسے خلط ملط کر دیا کہ اب اس میں تمیز نہ ہو سکے، تو یہ ذخیرہ بھی مال مشترک بن جائیگا۔

شرکت ملک کی اقسام

احناف کے نزدیک شرکت ملک کی دو قسمیں ہیں: ا۔ شرکت الاختیار۔ ۲۔ شرکت الجبر۔

شرکت اختیاری:

أن يجتمع الشريكان أو أكثر في ملك شيء بالاختيار۔

دو شریک یا زیادہ کسی ملکیت میں اختیار سے شریک ہوئے ہوں۔

تشریح: مذکورہ بالا تعریف کی تشریح یہ ہے کہ دو یا زیادہ افراد اگر کسی شئے کی ملکیت میں بایں طور شریک ہوں کہ وہ ملکیت خود ان دو افراد کے اپنے اختیار سے، یا تو خود انکے اپنے کسی فعل کے نتیجہ میں حاصل ہوئی ہو، یا ان کے علاوہ کسی اور کے کسی فعل کے نتیجہ میں حاصل ہو۔

پہلی صورت کی مثال یہ ہے کہ دو افراد نے اپنا مال اپنے اختیار سے مخلوط کر دیا یا دو افراد نے مشترکہ طور پر کوئی شے خرید لی۔

دوسری صورت کی یہ مثال ہے کے دو شرکاء کو کسی آدمی نے کوئی چیز ہبہ کر دی، اور اسے ان دونوں نے قبول کر لیا، یا دو افراد کو کوئی صدقہ اکٹھا دیدیا گیا اور انہوں نے اسے قبول بھی کر لیا، یا دو افراد نے دشمن کے مال پر استیلاء کے ذریعہ قبضہ کر لیا، یا کسی آدمی نے دو افراد کو مال کی وصیت کر دی، اور انہوں نے وہ مال قبول کر لیا۔

مذکورہ بالا تمام صورتیں شرکت الملک اختیاری کی ہیں۔[1]

شرکت غیر اختیاری یا شرکت الجبر:

,,وهي التي تحصل بغير فعل الشركاء بأن يختلط المال بغير اختيار المالكين خلطا لا يمكن التمييز بينهما حقيقة، بأن كان الجنس واحدا كاختلاط قمح بقمح أو يمكن التمييز بصعوبة كأن يختلط الحنطة بالشعير، أو يختلط المالان عن طريق الإرث،،۔

یہ وہ شرکت ہے جو شرکاء کے کسی بھی فعل کے بغیر وجود میں آئی ہو، بایں طور کہ مال مالکوں کے اختیار کے بغیر خود سے ایسا مخلوط ہو جائے کہ اسکی تمیز ممکن نہ رہے، گویا کہ وہ جنس واحد بن جائے، مثلاً گندم کو گندم کے ساتھ مخلوط کردیا جائے، یا تمیز کرنا بہت زیادہ مشقت اور مشکل کے ساتھ ممکن ہو مثلاً گندم کو جو کے ساتھ مخلوط کردیا جائے، یا دو مال وراثت کی وجہ سے مخلوط ہوں۔

تشریح: مذکورہ بالا تعریف کا خلاصہ یہ ہوا کہ شرکت غیر اختیاری وہ ہے جس میں دو مال اسطرح مخلوط شکل میں حاصل ہوں کہ ان میں تمیز کرنا کہ کونسا کس کا ہے ناممکن ہو یا بہت مشکل ہو۔

بعض فقہاء کرام نے مذکورہ صورت میں یہ فرمایا کہ اس میں ملکیت جبراً یا قہراً (مجبوری میں) حاصل ہوئی ہے، کہ

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الحصكفي، محمدعلاء الدين، الدر المختار شرح تنوير البصار ،و الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ايچ ايم سعيد كمپنى(٤: ٣٠٠)۔

البحر الرائق (٥: ١٦٦)۔

وفتح القدير (٥: ٣٧٧)۔

الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ٥٨٧ه ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربي ١٤١٧ه،ايچ ايم سعيد كمپنى:(٦: ٥٦)۔

شرکاء کو حصول ملکیت میں کسی قسم کا کوئی اختیار نہیں ہے، لہذا انہوں نے تعریف اس طرح بھی فرمائی ہے:

اجتماع شخصين فأكثر في ملك عين قهراً۔[۱]

دو یا زیادہ افراد کا کسی متعین شے میں زبردستی مالک بن جانا۔

مذکورہ بالا شرکت ملک کی تقسیم شرکاء کے فعل یا اختیار کے ہونے نہ ہونے کے اعتبار سے تھی، البتہ مال مشترک کے اعتبار سے بھی دو قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت العین، ۲۔ شرکت الدین۔

شرکت العین:

وهي الاشتراك في المال المعين الموجود كاشتراك اثنين شائعا في دار أو في غيرها من الأعيان۔

کسی معین اور موجود مال میں شرکت ہو، مثلاً کسی گھر (یا زمین، جانور، یا گاڑی) میں یا ان کے علاوہ کسی شے میں دو افراد غیر منقسم حصہ داری کی بنیاد پر ہو) شریک ہوں۔

شرکت الدین:

وهي الاشتراك فيما في الذمة من المال كأن يبيع اثنان أو أكثر ثوبا لآخر بثمن مؤجل، فيكون الثمن دينا مشتركا للبائعين۔

اس مال میں اشتراک جو کسی کے ذمہ میں (دین یا due) ہو، مثلاً دو یا زیادہ افراد ملکر ایک کپڑا کسی معین مدت پر قیمت کی ادائیگی (ثمن موجل پر) فروخت کریں،

(۱) مراجع سابقہ، الاتاسی، شرح مجلة الأحكام: محمد خالد، مكتبه اسلاميه، كوئثه ۱۴۰۳ھ (۶۴:۱)۔

والشيخ نظام الدين رئيس جماعة من علماء الهند من القرن الحادي عشر الفتاوى الهنديه المعروف بالفتاوى العالمگیریه من علماء الهند من القرن الحادي عشر مكتبه ماجديه كوئثه (۲: ۳۰۱)۔

تو وہ قیمت جو ذمہ میں ہے دونوں فروخت کرنے والوں کے درمیان مشترک
ہو گی۔

خلاصہ یہ کہ کوئی بھی، واجب الاداء چیز جو معین مدت میں حاصل ہونے والی ہو اس میں باہم اشتراک شرکت الدین کہلاتا ہے، مثال کے طور پر زید نے عمر کو قرضہ دیا اس کے بعد قرضہ وصول کرنے سے قبل زید مر گیا، تو اب عمر جب قرضہ کی ادائیگی زید کے ورثاء کو کریگا تو اس مال میں تمام ورثاء شریک ہونگے، یا اسی طرح اگر ایک شخص نے ایسا مال تباہ کر دیا جو کئی افراد میں مشترک تھا، تو تباہ کرنے والے کے ذمہ جو مال واجب الاداء ہو گا وہ تمام شرکاء میں مشترک ہو گا، یا اسی طرح اگر ایسے مال کو جو دو افراد میں مشترک تھا کسی آدمی کو قرض دیدیا، تو مقروض کے ذمہ جو مال ادائیگی کرنا لازم ہو گا وہ دونوں قرضخواہوں میں مشترک ہو گا، اس کے علاوہ اور بہت سی صورتیں شرکت الدین کی ممکن ہیں۔

فقہاء مالکیہ کے نزدیک شرکت الملک کی تین قسمیں ہیں: [1]

۱۔ شرکت الارث:

ورثاء کا کسی ایسی شے کی ملکیت میں جمع ہونا جو کسی شخص کے ترکہ (وراثت) کی ہو۔

۲۔ شرکت الغنیمت:

کسی لشکر کا مال غنیمت کی ملکیت میں مجتمع ہونا۔

۳۔ شرکت المبتاعین:

دو یا زیادہ افراد کا کسی گھر یا کسی اور شے کو خریدنے میں مشترک ہونا۔

شوافع کے نزدیک شرکت کی چھ قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت المنافع والأعیان:

منافع (Usufruck) اور اعیان (Corpus) میں شرکت، مثلاً دو یا زیادہ افراد کسی زمین یا جانور کے وراثت،

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: جزائری، عبد الرحمن، کتاب الفقہ علی المذاهب الاربعه، لاهور، محکمه اوقاف ۱۹۷۱ء، (۶۳:۳)۔

خریداری یا ہبہ کے ذریعہ ملکیت حاصل کریں، اور وہ مال ان کے درمیان مشاع (نا قابل امتیاز و تقسیم) ہو۔

۲۔ شرکت المنافع دون الأعیان:

منافع (Usufruck) میں شرکت ہو لیکن اعیان (Corpus) میں شرکت نہ ہو، مثلاً کوئی ایک گروپ ملکر ایک گاڑی کرایہ پر لے لے، اس صورت میں تمام کرایہ دار اس سے نفع اٹھانے میں شریک ہوں گے، البتہ گاڑی کے مالک نہیں بنیں گے، یا مثلاً کوئی شے کسی جماعت کے لئے وقف کر دی، تو وہ شے ملکیت میں اللہ تعالیٰ کے ہو گی، لیکن منافع میں اس جماعت کے تمام افراد شریک ہوں گے۔

۳۔ شرکت الأعیان دون المنافع:

أعیان میں شرکت نہ کہ منافع میں، مثلاً کوئی آدمی کسی دوسرے آدمی کو یہ وصیت کرے کہ تم میری اس زمین اور گھر سے انتفاع حاصل کرتے رہنا، پھر وصیت کرنے والا مر جائے، اور اس کے ورثاء مال وراثت حاصل کر لیں تو اس گھر اور زمین کی ملکیت تو ورثاء کی ہو گی لیکن انتفاع کا حق اس شخص کا ہو گا جسے وصیت کی گئی تھی۔

۴۔ الشرکۃ فی المنافع المباحۃ:

جائز منافع میں شرکت مثلاً بستی سے ملحق چراہ گاہ میں سب جانور چرانے کا مشترک حق رکھتے ہیں۔

۵۔ الشرکۃ فی حقوق الأموال:

اموال کے حقوق میں شرکت، مثلاً کوئی ورثا کی جماعت اپنے مورث کے حق شفعہ، عیب دار مال کو لوٹانے (رد بالعیب) خیار شرط یار ہن (گروی) کے حقوق وغیرہ کی وراثت بن جائے، اور اس میں سب شریک ہوں۔

۶۔ الشرکۃ فی حقوق الأبدان:

بدن کے حقوق میں شرکت ہو مثلاً کوئی جماعت کسی سے قصاص لینے کے حق، یا حدِ قذف جاری کرنے والے کے

حق کی وارث بن جائے۔[۱]

حنابلہ نے بھی شرکت الملک کی تین قسمیں کی ہیں:

۱۔ شرکۃ العین والمنفعۃ:

عین اور منفعت میں شرکت، مثلاً کوئی جماعت کسی گھر وغیرہ کی وراثت، وصیت، یا ہبہ وغیرہ سے مالک بن جائیں، تو وہ لوگ اس گھر کے عین اور نفع دونوں میں شریک ہوں گے۔

۲۔ شرکۃ فی العین دون المنفعۃ:

عین میں شرکت ہو لیکن منافع میں نہ ہو، مثال کے طور پر اگر کوئی جماعت کسی کھیتی کی وراثت، وصیت، یا ہبہ کے ذریعہ مالک بن جائے، لیکن بالترتیب مورث، یا موصی یا واہب اس کھیتی کے منافع کسی دوسرے شخص کو دئے جانے کی وصیت کر جائے، تو اس صورت میں زمین کے مالک تو ورثا کی جماعت ہوگی لیکن منافع دوسرے کو ملے گا۔

۳۔ شرکۃ فی المنفعۃ دون العین:

منافع میں شرکت ہو نہ کہ عین میں، مثلاً کوئی شخص کچھ لوگوں کو مکان کی منفعت دینے کی وصیت کر جائے، اس صورت میں لوگ منافع مکان میں تو شریک ہوں گے، البتہ عین مکان میں شریک نہ ہوں گے۔[۲]

غور کرنے سے واضح ہو سکتا ہے کہ مذاہبِ اربعہ میں یہ مختلف تقسیمیں کسی حقیقی اختلاف پر مبنی نہیں ہیں، بلکہ مختلف فقہاء نے شرکت الملک کی مختلف صورتیں سامنے رکھ کر اپنے اپنے انداز میں مختلف قسمیں بیان فرمائی ہیں، حقیقت سب کے نزدیک مسلّم ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الدردیر، احمد بن محمد الدردیری (۱۲۰۱ھ)، الشرح الصغیر علی اقرب المسالك (۳:۴۵۵)، مصر، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی ۱۳۷۴ھ (۳:۳۵۶)۔

(۲) دیکھئے: نجیب، محمد نجیب المطیعی، تکملہ المجموع شرح المہذب، مطبعۃ الإمام، مصر۔ (۱۳:۵۰۶،۵۰۷)۔

شرکت الملک کے احکام

فقہاء کرام نے شرکت الملک کے احکام تفصیل سے ذکر فرمائے ہیں، ان تمام جزئیات اور فروع کو یہاں ذکر کرنا ممکن نہیں ہے، البتہ اس کے اساسی اور بنیادی احکام مرتب انداز میں ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں:

۱:۔ ملکیتی حقوق بقدر حصہ:

شرکت الملک میں مشترک مال کے ملکیتی حقوق اور پیداوار کی تقسیم حصہ داروں کے مال اور حصص کے تناسب سے ہوگی، لہذا کسی شریک کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دوسرے شریک کی رضامندی کے بغیر اپنے حصہ کے تناسب سے زیادہ منافع حاصل کرے، مثال کے طور پر اگر کوئی جانور دو افراد کے درمیان مشترک ہے، ایک شریک کا حصہ اسمیں 60% ہے، جبکہ دوسرے شریک کا 40% ہے، اس صورت میں اس جانور کی پیداوار مثلاً دودھ میں بھی اسی تناسب سے دونوں شرکاء کو حصہ ملیگا، ان میں سے کوئی بھی اپنے حصہ کی مقدار سے زیادہ دودھ کا مطالبہ نہیں کر سکتا، چنانچہ اس طرح کا مطالبہ کرنا اور عقد شرکت میں اس قسم کی شرط لگانا کہ وہ اپنے حصہ کے تناسب سے زیادہ حاصل کرے گا درست نہیں ہے، چنانچہ اگر بالفرض اس شرط کے تحت کوئی چیز زیادہ دیدی جائے تو اسے واپس کر دینا چاہیے۔[1]

۲:۔ مشترک ملکیت سے فائدہ اٹھانے کے طریقے:

اگر کسی چیز میں کئی افراد مشترک طور پر مالک ہوں، اور وہ اس مشترک چیز سے مستفید ہونا چاہیں تو اس کی کئی

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الشیخ نظام الدین رئیس جماعة من علماء الهند ۱۱ ھ «الفتاوی الهندیه المعروف بالفتاوی العالمگیریه، مکتبه ماجدیه کوئٹه، ورکنها اجتماع النصیبین وحکمها وفرع الزیادة علی الشرکة بقدر الملک (۲:۱:۳۰۱۔ الشرکة)۔

مزید دیکھئے: و مجلة الأحکام العدلیة مع شرح مجلة الأحکام، مکتبه اسلامیه، کوئٹه ۱۴۰۳ھ، الأموال المشترکة شرکة الملک تقسم حاصلاتها بین أصحابها علی قدر حصصهم، فإذا شرط أحد الشریکین فی الحیوان المشترک شیئا زائدا علی حصته من لبن ذلک الحیوان أو نتاجه فلا یصح (ماده ۱۰۷۳)۔

صورتیں ہیں۔

شرکت کو بر قرار رکھتے ہوئے تمام شرکاء کے فائدہ اٹھانے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔

ا۔ مہایأۃ:

پہلی صورت کو فقہاء کرام ,,مہایاۃ،، سے تعبیر کرتے ہیں، مہایأۃ کے معنی یہ ہیں کہ دونوں شریک اپنی اپنی مشترک ملکیت بر قرار رکھتے ہوئے آپس میں فائدہ اٹھانے کا کوئی طریقہ باہم رضامندی سے طے کرلیں، مہایأۃ کی بھی دو صورتیں ہوتی ہیں:

ایک صورت یہ ہے کہ دونوں فائدہ اٹھانے کے لئے باریاں مقرر کرلیں، مثلاً ایک گاڑی مشترک ہو، اور شرکاء یہ طے کرلیں کہ ایک مہینہ اسے ایک شریک رکھے گا، دوسرے مہینہ دوسرا شریک۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مشترک چیز کے ایک حصہ سے ایک شریک فائدہ اٹھائیگا، اور دوسرے حصہ سے دوسرا شریک فائدہ اٹھائے گا، مثلاً اگر گھر دو افراد میں مشترک ہو تو آپس میں یہ طے کر سکتے ہیں کہ فلاں حصہ میں ایک شریک رہے گا، اور فلاں حصہ میں دوسرا شریک رہیگا، پہلی صورت کو فقہاء مہایأۃ بالزمان کہتے ہیں اور دوسری صورت کو مہایأۃ بالمکان۔[1]

مہایأۃ کی دونوں صورتوں میں شرکت ملک بر قرار رہتی ہے، یعنی مشترک چیز اپنے اپنے حصہ کے تناسب سے

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الحصکفی ، محمدعلاء الدین ، الدر المختار شرح تنویر البصار ،(ولو تهايا فی سكنى دار واحدة يسكن هذا بعضا وذا بعضا وهذا شهرا وذا شهرا (إلى قوله) صح، و الشامی ،محمد امین الشهير بابن عابدين، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی تحت قوله: ولو تهايا: الهيئة به و المهايأة بابدال الهمزة ألفا لغة وهي في لسان الشرع قسمة المنافع وإنها جائزة في الأعيان المشتركة التي يملك الانتفاع بها على بقاء عينها، وتمامه في شرح الهداية (قوله: يسكن هذا بعضا إلخ) أشار إلى أن التهايو قد يكون في الزمان وقد يكون من حيث المكان، والأول متعين في العبد الواحد ونحوه كالبيت الصغير، (٦:٢٦٩، القسمة)۔

دونوں کی مشترک ملکیت میں ہوتی ہے، صرف فائدہ اٹھانے کے لئے وہ ایک عارضی طریقہ تجویز کر لیتے ہیں۔

۲۔ مشترک انتفاع:

شرکت کو باقی رکھتے ہوئے مشترک چیز سے فائدہ اٹھانے کا دوسرا طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نہ باریاں مقرر کی جائیں، اور نہ حصے مقرر کئے جائیں، بلکہ دونوں شریک باہمی رضامندی سے مشترک چیز سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق فائدہ اٹھاتے رہیں، البتہ انکو چاہیے کہ وہ اس مال مشترک میں کوئی ایسا کام یا تصرف نہ کریں جس سے دوسرے شریک کو ضرر اور نقصان پہونچے، مثلاً اگر دوسرے شریک نے پہلے شریک کو مشترکہ جانور پر کسی کو سواری کرانے کی اجازت دیدی، تو اگر دوسرے شریک نے اس پر کوئی ایسی شے سوار کرائی یا لاددی جس سے وہ جانور مر گیا، یا اسکی قیمت کم ہو گئی تو وہ ضامن ہوگا، کیونکہ جب مطلقاً اجازت دی گئی تو اسکا مطلب یہ سمجھا جائیگا کہ وہ اس پر کوئی ایسی شے لادے گا جو قابل تحمل اور متعارف ہو، مگر اس نے ناقابل برداشت بوجھ لادا جس سے وہ ہلاک ہو گیا، لہذا یہ سمجھا جائیگا کہ گویا کہ اس پر بلا اجازت لادا گیا، لہذا وہ ضامن ہوگا۔[1]

اسی مسئلہ کے تحت یہ مثال بھی ذکر کی جا سکتی ہے کہ اگر دو افراد نے ملکر ایک گاڑی خریدی، اور انہوں نے یہ طے کیا کہ اسے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق استعمال کرتے رہیں گے، پھر ان میں سے کسی ایک شریک نے اس گاڑی سے ایسا کام لے لیا جو اسکی پاور اور طاقت سے باہر تھا، تو صحیح نہ ہوگا، لہذا اس صورت میں اگر اس میں کوئی عیب یا نقص پیدا ہوا تو وہ ضامن ہوگا۔

علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں:

،،وإن الشريك أمين في المال فيقبل قوله بيمينه في مقدار الربح والخسران والضياع كلا أو بعضا ولو من غير تجارة، ويضمن بالتعدي أو بالتقصير فقط، كما هو المقرر في سائر الأمانات،،۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الاتاسي، شرح مجلة الأحكام:محمد خالد، مكتبه اسلاميه، كوئٹہ ۱۴۰۳ھ (۴:۱۳، ۵، ۴، ۱۰۷۱، ۱۰۷۵)۔

یعنی شریک اس مال میں امانتدار ہے، چنانچہ اسکا قول منافع اور نقصان اور ضائع ہونے میں خواہ پورا ہو یا تھوڑا، قسم کے ساتھ معتبر ہوگا، اگر اس کی کوتاہی پائی گئی تو وہ ضامن بھی ہوگا جیسا تمام امانتوں کا حکم بھی یہی ہے۔[1]

یہ دونوں صورتیں وہ تھیں جہاں شرکت برقرار رکھتے ہوئے شرکاء کے فائدہ اٹھانے کا طریقہ اختیار کیا گیا تھا، لیکن مشترک چیز سے فائدہ اٹھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ممکن ہے کہ شرکت ختم کردی جائے، اس کے بھی دو راستے ہیں:

۱۔ شریک کو حصہ فروخت کرنا:

اگر ایک سے زیادہ افراد کسی شے میں شریک ہیں تو ایک شریک اپنا حصہ کسی دوسرے شریک کو فروخت کر سکتا ہے، یا دوسرے شرکاء سے ان کے حصص خرید کر سب حصوں کا کوئی ایک شخص مالک بن سکتا ہے، بشرطیکہ اس بیع و شراء پر جبر نہ کیا جائے، مثلاً اگر زید اور عمر ایک زمین کے برابر مالک تھے، تو اگر زید اپنی رضامندی سے اپنا آدھا حصہ عمر کو فروخت کردے تو عمر اب پوری زمین کا مالک بن جائے گا، یا زید عمر کی رضامندی سے اسکا آدھا حصہ خرید لے تو زید اب پوری زمین کا مالک ہو جائے گا، یہ بھی اس زمین سے فائدہ اٹھانے کی ایک شکل ہے، البتہ اس صورت میں جب دونوں شرکاء میں سے کوئی ایک اپنا حصہ دوسرے کو فروخت کردے گا، تو اب شرکت ختم ہو جائے گی، اب دوسرا شخص تنِ تنہا اس کا مالک بن جائے گا۔

۲۔ تقسیم:

شرکت ختم کرنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ مشترک چیز کو شرکاء کے درمیان اس طرح تقسیم کردیا جائے کہ ہر شخص کی ملکیت دوسرے کی ملکیت سے ممتاز ہو جائے، یہ صورت اسی وقت ممکن ہے، جب مشترک چیز قابل تقسیم ہو،

---

(۱) الحصكفي، محمدعلاء الدين، الدر المختار شرح تنوير البصار مع الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ٤:٣١٩، و في السرخسي ،محمد بن أحمد بن أبي سهل شمس الأئمه الإمام الكبير أبو بكر، المبسوط للسرخسي (٢٥٦:١٩٤) إدارة القرآن كراچي(١١:١٨)، ومجمع الضمانات، وتبيين الحقائق للإمام الزيلعي (٣:١٠٨)۔

مثلاً ایک بڑا مکان ہے اور اسے دو مساوی حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، تو وہاں تقسیم عمل میں آسکتی ہے، جو باہمی رضامندی سے بھی ہوسکتی ہے، قرعہ اندازی سے بھی، اور عدالت کے واسطے سے بھی، اس طرح جب تقسیم عمل میں آجائے تو شرکت ختم ہوجاتی ہے، اور ہر شخص اپنے تقسیم شدہ حصہ کا بلاشرکت غیرے مالک بن جاتا ہے، قابل تقسیم اشیاء میں ہر شریک کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ تقسیم کا مطالبہ کرے۔

لیکن اگر مشترک چیز ایسی ہے کہ یا تو تقسیم ہو ہی نہیں سکتی یا تقسیم ہونے کے نتیجہ میں اسکی قدر و قیمت بہت کم رہ جاتی ہے، یا وہ قابل استعمال نہیں رہتی، تو تقسیم کے اس طریقہ پر عمل نہیں ہوسکتا، اس صورت میں یا تو ایک شریک باہمی رضامندی سے دوسرے شریک کا حصہ خرید کر شرکت ختم کرسکتا ہے، یا پھر شرکت کو باقی رکھتے ہوئے مہایاۃ پر عمل کرسکتا ہے، جس کی تفصیل اوپر دی گئی ہے۔[۱]

مشترک ملکیت کو منتقل کرنے کے احکام

شرکت ملک میں تمام مال سب شرکاء میں اس طرح مشترک ہوتا ہے کہ ہر شریک دوسرے شریک کے لئے اجنبی ہوتا ہے، چنانچہ ہر شریک اپنے حصہ کی ملکیت کو بیع، ہبہ، یا وصیت کے ذریعہ منتقل کرسکتا ہے[۲]، البتہ بیع (فروخت) کرنے کی صورت میں اگر مکان یا جائیداد فروخت کی جارہی ہے تو شرکاء کو اس میں شفعہ دائر کرنے کا پہلا حق حاصل ہوگا، اس صورت میں اگر شفعہ کے حق دار ایک سے زیادہ ہوئے تو اگرچہ ان کے حصص برابر (مساوی) نہ ہوں تب بھی شفعہ

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: مجلة الاحكام العدلية، جماعة من العلماء، نور محمد کار خانہ تجارتِ کتب کراچی۔ ، ليس لأحد الشريكين أن يجبر الآخر بقوله: اشتر حصتي أو بعني حصتك، غير أن المحل بينهما إن كان قابل القسمة، والشريك ليس بغائب يقسم، وإن كان غير قابل القسمة فلهما التهايؤ، مجلة الأحكام العدلية مع شرح مجلة الأحكام، مكتبه اسلاميه، كوئٹه ۱٤٠٣ھ (۱۰۷۲)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الحصكفي، محمد علاء الدين، الدر المختار شرح تنوير الأبصار (۷: ۳۰۰)، الشركة: و (كل) من شركاء الملك (أجنبي) في الامتناع عن تصرف مضر في مال صاحبه لعدم تضمنها الوكالة، فصح له بيع حصته ولو من غير شريكه بلا إذن۔

کے مطالبہ میں سب برابر سمجھے جائیں گے، چنانچہ شفعہ کے نتیجہ میں سب برابر (مساوی) زمین کی خریداری کے حق دار ہونگے۔[۱]

شرکت الملک کے کسی شریک کو دوسرے شریک کے حصہ میں کسی قسم کا عقد کرنے کا اختیار نہیں ہے، چنانچہ کوئی شریک دوسرے شریک کی اجازت کے بغیر اس کا حصہ فروخت، کرایہ یا عاریت پر نہیں دے سکتا، اگر اس نے بلا اجازت یہ کام کئے تو نقصان کا ضامن وہی ہوگا۔

یہ بات ذکر کی جاچکی ہے کہ ہر شریک اپنا حصہ کسی دوسرے کو فروخت کر سکتا ہے، البتہ کسی دوسرے کو تقسیم سے پہلے اپنا حصہ ہبہ کر سکتا ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ کا دارومدار ہبۃ المشاع کے جواز اور عدم جواز کے اختلاف پر مبنی ہے، احناف کے نزدیک یہ ناجائز ہے، جبکہ بقیہ ائمہ کے نزدیک جائز ہے، اب اسکی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

ہبۃ المشاع کا مسئلہ

جب تک کوئی مشترک ملکیت شرکاء کے درمیان تقسیم نہ ہوئی ہو اس وقت تک فقہ کی اصطلاح میں اس کو مشاع کہا جاتا ہے، یہ سوال فقہاء کرام کے درمیان زیرِ بحث آیا ہے کہ اگر کوئی شریک اپنا حصہ تقسیم کئے بغیر کسی تیسرے شخص کو ہبہ کرنا چاہے تو آیا وہ ایسا کر سکتا ہے یا نہیں؟، بالفاظ دیگر مشاع کا ہبہ ہو سکتا ہے یا نہیں؟

اس مسئلہ میں تفصیل یہ ہے کہ اگر مشترک چیز ناقابل تقسیم ہے تب تو اسکا ہبہ باتفاق جائز ہے، مثلاً ایک کار زید اور بکر کے درمیان مشترک ہے، ظاہر ہے کہ کار کو اس طرح تقسیم نہیں کیا جاسکتا کہ آدھی کار ایک کو دیدی جائے اور آدھی کار دوسرے کو، لہذا یہ ناقابل تقسیم ہے، اب اگر زید کار میں اپنا آدھا مشاع حصہ خالد کو ہبہ کرنا چاہے تو باتفاق وہ ایسا کر سکتا ہے، اور اگر ایسا کرلے تو اب وہ کار خالد اور بکر کے درمیان مشترک ہو جائیگی۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية، مكتبہ امداديہ ملتان، كتاب الشفعة (٣٨٩:٤): وإذا اجتمع الشفعاء فالشفعة بينهم على عدد رؤسهم، ولا يعتبر اختلاف الأملاك۔

لیکن اگر مشترک ملکیت ایسی ہے کہ اسے تقسیم کرنا ممکن ہو، مثلاً ایک وسیع قطعہ زمین اگر زید اور بکر کے درمیان مشترک ہو تو آیا زید اپنا مشاع (غیر منقسم) حصہ خالد کو ہبہ کر سکتا ہے؟ اس بارے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

ایمہ ثلاثہ یعنی حضرت امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اگر مشترک ملکیت تقسیم کے قابل ہو تو اس کا ہبہ کرنا بھی جائز ہے۔ (۱)

احناف اور اصحاب الرائے کا مذہب یہ ہے کہ اگر مشاع (مشترک) چیز تقسیم کی جاسکتی ہو تو اسے ہبہ کرنا اس وقت تک جائز نہیں جب تک اسے تقسیم نہ کرلیا جائے، مثلاً اگر کوئی بڑی زمین زید اور بکر کے درمیان مشترک ہو اور زید صرف اپنے غیر منقسم حصے کا ہبہ کرنا چاہے تو وہ جائز نہیں، ہاں البتہ اگر خالد کے قبضہ سے پہلے اسے تقسیم کردیا جائے تو ہبہ جائز ہو جائے گا۔ (۲)

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد) المغنی، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ۔ (٥:٦٥٥)، وتصح هبة المشاع وبه قال مالك، والشافعیؒ، قال الشافعی سواء فی ذلك أمكن قسمته أو لم يمكن۔ ومالك، مالك بن انس الأصبحی، رواته الإمام سحنون التنوخی،المدونة الكبرى، دار الكتب العلميه، بيروتؒ (٤:٣٩٦)، قلت: أرأيت لو أن رجلا تصدق على رجل بنصف دار له بينه وبين رجل، أو وهب له نصف داره غير مقسومة أتجوز هذه الهبة أم لا فی قول مالك؟قال: قال مالك: الهبة جائزة وإن لم تكن مقسومة، قلت: فكيف يقبض هذا هبته أو صدقته؟ قال: يحل محل الواهب ويحوز ويمنع من شركائه ويكون هذا قبضه، قلت: وكذلك هذا فيما لا يقسم فی العبد إذا وهب نصفه لرجل فهو جائز فی قول مالك؟ قال: نعم، قلت: ويكون قبضه مثل ما ذكرت فی الدار؟ قال: نعم، قلت: وهذا قول مالك؟ قال: نعم، إذا حاز ما وهب له دون صاحبه فقد قبض۔

مزید دیکھئے: النووی،(الحافظ أبو زكريا) محی الدين بن شرف، شرح المهذب المسمی بالمجموع المنهاج مع مغنی المحتاج(٢٠٦-٢٦١) مطبعة العاصمة القاهرة ۱۹۷٦م دار إحياء التراث بيروت(١٥:٣٧٣)، الهبة: وما جاز بيعه من الأعيان جاز هبته، لأنه عقد يقصد به ملك العين، فملك به ما يملك بالبيع وما جاز هبته جاز هبة جزء منه مشاع لما روى عمر بن سلمة الضمری أن رسول الله ﷺ خرج من المدينة حتى أتى الروحاء إلخ۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الحصكفی ، محمدعلاء الدين ، الدر المختار شرح تنوير البصار : (٤:٣٠٣):لا تجوز الهبة فيما يقسم إلامحوزة مقسومة، وهبة المشاع فيما لا يقسم جائزة۔

دیکھئے: القدوری، احمد بن محمد ٤٢٨ھ،متن الهدايه، المعروف بالكتاب، فی كتاب الهبة، ولا تجوز الهبة فيما يقسم إلا محوزة مقسومة وهبة المشاع فيما لا يقسم جائزة، ومن وهب شقصا مشاعا فالهبة فاسدة، فإن قسمه وسلمه جاز۔ (كتاب الهبة ١١٤)۔

البتہ اگر دو آدمیوں نے اپنی مشترک قابل تقسیم شے ایک آدمی کو ہبہ کر دی تو جائز ہے، (۱) کیونکہ دونوں نے اپنی پوری شئے موہوب لہ (جسے ہبہ کیا گیا) کے حوالہ کی ہے، اور اس آدمی (موہوب لہ) نے پورے پر قبضہ کیا ہے، تو اس میں شیوع (اشتراک) نہیں پایا گیا، اور ہبہ صحیح ہے، لہذا مذکورہ بالا مثال میں اگر زید اور بکر دونوں پوری زمین خالد کو ہبہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں، اس کے برعکس اگر ایک شخص اپنا گھر دو آدمیوں کو ہبہ کر دے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام زفرؒ کے نزدیک یہ صورت بھی مشاع کا ہبہ کہلائیگی، لہذا یہ ہبہ صحیح نہیں ہے، صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ) کے نزدیک یہ مشاع کا ہبہ نہیں ہے، لہذا یہ ہبہ صحیح ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ ہبہ کرنے والے (یعنی واہب) نے ہر ایک کو نصف نصف گھر ہبہ کیا ہے، اور ہر ایک کا نصف متعین نہیں ہے، کیونکہ اسے ابتک تقسیم نہیں کیا گیا، لہذا ہر نصف میں دونوں شریک ہیں اور مکان قابل تقسیم اشیاء میں شمار ہوتا ہے، لہذا قابل تقسیم شئے میں شیوع (اشتراک) پایا گیا، اس لئے ہبہ جائز نہیں ہوگا۔ اور صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ ملکیت منتقل کرنے والا ایک ہی شخص ہے، اور عقد بھی ایک ہی ہے، اور چونکہ عقد کے وقت مکان مشترک یا مشاع نہیں تھا، لہذا یہ ہبہ مشاع کا نہیں ہوا، اس لئے جائز ہے۔ (۲)

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: القدوری، احمد بن محمد ۴۲۸ھ، متن الھدایہ، المعروف بالکتاب، فی کتاب الھبة، وإذا وھب اثنان من واحد دارا جاز (الھبة ۱۱۴)۔

(۲) دیکھئے: ابن قاضی، بدر الدین، جامع الفصولین، اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ (۶۲:۲)، ومنھا أنه لو وھب الکل من اثنین فإن أجمل بأن قال: وھبته منکما لم یجز عند أبی حنیفةؒ وعندھما یجوز۔ وا بن قدامة المقدسی (أبو محمد عبد اللہ بن أحمد بن محمد)، المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱۴۰۳ھ (۶۵۵:۵)۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: القدوری، احمد بن محمد ۴۲۸ھ، متن الھدایہ، المعروف بالکتاب، فی کتاب الھبة،

دیکھئے: المرغینانی، (برھان الدین ابو الحسن) علی بن عبد الجلیل أبو بکر الرشدانی، الھدایة، مکتبہ امدادیہ ملتان، وإن وھبھا واحد من اثنین لا یجوز عند أبی حنیفةؒ وقالا: یصح لأن ھذہ ھبة الجملة منھما إذ التملیك واحد فلا یتحقق الشیوع، کما إذا رھن من رجلین دارا، وله: إن ھذہ ھبة النصف من کل واحد منھما، ولھذا لو کانت الھبة فیما لا یقسم فقبل أحدھما صح، ولأن الملك یثبت لکل واحد منھما فی النصف، فیکون التملیك کذلك، لأنه حکمه، وعلی ھذا الاعتبار یتحقق الشیوع، بخلاف الرھن لأن حکمه الحبس ویثبت لکل منھما کملا فلا شیوع، ولھذا لو قضی دین أحدھما لا یسترد شیئا من الرھن، (۴: ۲۸۴، الھبة)۔

ہبۃ المشاع کے مطلقاً جواز پر ائمہ ثلاثہ کے دلائل

ائمہ ثلاثہؒ مشاع چیز کے ہبہ کو خواہ وہ تقسیم کے قابل ہو یا قابل نہ ہو بعض روایات کی بناء پر جائز کہتے ہیں، وہ روایات درج ذیل ہیں:

۱۔ ,,عن قيس بن أبي حازمؓ قال: أتي رجل رسول الله ﷺ بكبة شعر من الغنيمة، فقال: يا رسول الله هبهالي، فإنا أهل بيت نعالج الشعر، فقال عليه الصلاة والسلام: نصيبي منها لك،،[۱]

حضرت قیس بن حازمؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس مویشیوں کے بالوں کا ایک گچھا لیکر آیا، اور کہا کہ یارسول اللہ یہ مجھے ہبہ کر دیجئے کیونکہ میں گھر بار رکھتا ہوں اور ہم ان بالوں سے علاج کرتے ہیں تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اس میں سے میرا حصہ تمہارے لئے ہے۔

ائمہ ثلاثہ اس روایت سے استدلال فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مال غنیمت کے مویشیوں کے بال ہبہ کر دئے حالانکہ وہ مشترک تھے، اس سے معلوم ہوا کہ مشاع (مشترک مال) کا ہبہ جائز ہے۔

۲۔ ,,عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: سمعت النبي ﷺ وقد جاء ه رجل ومعه كبة من شعر فقال: أخذت هذه من المغنم لأصلح بردعة لي، فقال النبي ﷺ: ما كان لي ولبني عبد المطلب فهو لك،،[۲]۔

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے

(۱) ابن أبي شيبة بحواله اعلاء السنن۔

(۲) سجستاني، ابوداود، سنن، ابن قدامة المقدسي (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ (٥: ٦٥٦)۔

حضور علیہ کے بارے میں سنا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس ایک آدمی آیا، اور اس کے پاس بالوں کا ایک گچھا تھا، اور اس نے کہا کہ یہ میں نے مال غنیمت میں سے لیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے پالان کے کمبل کو ٹھیک کرلوں، تو حضور علیہ نے ارشاد فرمایا: جو حصہ میرا اور عبدالمطلب کی اولاد کا ہے وہ تمہارا ہے۔

مذکورہ بالا روایت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حضور علیہ نے جو مال آپکے اور عبدالمطلب کی اولاد کے درمیان مشترک تھا اسکو ہبہ کردیا، اس سے بھی مشترک (مشاع مال) کو ہبہ کرنے کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۳۔ ,,وعن عمرو بن سلمة الضمريؓ قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ حتى أتينا الروحاء، فرأينا حمار وحش معقورا، فأردنا أخذه، فقال رسول الله ﷺ دعوه فإنه يوشك أن يجيء صاحبه، فجاء رجل من بهز، وهوالذى عقره، فقال: يا رسول الله شأنكم والحمار، فأمر رسول الله ﷺ أبا بكر أن يقسمه بين الناس،، (۱)۔

حضرت عمرو بن سلمہ الضمریؓ سے مروی ہے کہ ہم حضور علیہ کے ساتھ (سفر پر) نکلے یہاں تک کہ ہم روحاء کے مقام پر پہونچے، تو ہم نے ایک جنگلی گدھے کو زخمی حالت میں پایا، ہم نے اسے پکڑنے کا ارادہ کیا، تو حضور علیہ نے فرمایا: اس کو چھوڑدو، ہوسکتا ہے کہ اسکا کوئی مالک ہو اور وہ اسے لینے آجائے، پھر ایک آدمی بہز سے آیا اور کہنے لگا کہ یہ میں نے زخمی کیا تھا، اور اب یہ آپ کا ہے، تو حضور علیہ نے حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ اس کے گوشت کو سب لوگوں میں تقسیم کردو۔

اس روایت میں گدھے کے مالک نے وہ گدھا تمام مسلمانوں کو ہبہ کیا، اور آنحضرت علیہ نے اسکی بات کو منظور کرتے ہوئے حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ وہ اسے تمام مسلمانوں میں تقسیم کردیں، اس سے ائمہ ثلاثہ یہ استدلال کرتے ہیں

(۱) رواه الإمام أحمد والنسائي۔

کہ مشاع کا ہبہ جائز ہے۔[۱]

احناف کے دلائل:

ہبۃ المشاع کے سلسلے میں احناف کا موقف دراصل ایک اور اصولی مسئلے پر مبنی ہے، اور وہ یہ کہ اکثر علماء کے نزدیک ہبہ کی تکمیل اسکے بغیر نہیں ہو سکتی کہ جس شخص کو ہبہ کیا گیا ہے وہ متعلقہ چیز پر قبضہ کر لے، فرض کیجئے کہ زید نے اپنا مکان بکر کو ہبہ کیا یعنی یہ کہہ دیا کہ میں یہ مکان تمہاری ملکیت میں دیتا ہوں، بکر نے منظور بھی کر لیا، لیکن ابھی بکر نے مکان پر قبضہ نہیں کیا تھا کہ اتنے میں زید کا انتقال ہو گیا، تو یہ ہبہ نامکمل رہنے کی وجہ سے منسوخ سمجھا جائیگا، اور بکر اس پر ملکیت کا دعوی نہیں کر سکتا، بلکہ وہ زید کے ترکے میں شامل ہو کر تمام وارثوں میں تقسیم ہوگا، یہ مسلک اکثر فقہاء کا ہے، جن میں امام ابو حنیفہ، امام شافعی حضرت ابراہیم نخعی اور ثوری وغیرہ شامل ہیں، البتہ بعض ائمہ جن میں امام مالک اور ایک قول کے مطابق امام احمد بن حنبلؒ داخل ہیں یہ فرماتے ہیں کہ ہبہ کے صحیح ہونے کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے، یعنی اگر کوئی بھی چیز کسی آدمی کو ہبہ کی گئی، تو صرف ہبہ سے وہ اس شئے کا مالک بن جائیگا، اور ہبہ کردہ شئے میں اسکی ملکیت ثابت ہو جائیگی، خواہ وہ اس پر قبضہ کرے یا نہ کرے،[۲] چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں ان حضرات کا موقف یہ ہے کہ زید کے انتقال کے باوجود مکان بکر کی ملکیت ہوگا، اور ورثاء اس میں حقدار نہیں ہوں گے۔

امام ابو حنیفہؒ اکثر علماء کے قول کو اختیار کرتے ہوئے اس بات کے قائل ہیں کہ قبضہ کے بغیر ہبہ مکمل نہیں ہوتا، اس لئے وہ یہ فرماتے ہیں کہ جب تک مشترک چیز کے حصے الگ الگ نہ کر دئے جائیں کسی حصہ دار کے لئے اس پر بلا شرکت غیرے قبضہ کرنا ممکن نہیں ہے[۳]، اور جب قبضہ ممکن نہیں تو ہبہ بھی نہیں ہو سکتا۔

لہذا امام ابو حنیفہؒ ہبۃ المشاع کے مسئلے میں ان روایات سے استدلال کرتے ہیں جو ہبہ کی تکمیل کے لئے قبضہ کے

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد اللہ بن أحمد بن محمد)،المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱٤۰۳ھ(٦٥٣:٥)، الهبة۔ النووی،(الحافظ أبو زكريا) محی الدين بن شرف، و شرح المهذب المسمی بالمجموع المنهاج مع مغنی المحتاج(٢٠٦-٢٦١) مطبعة العاصمة القاهرة ١٩٧٦م دار إحياء التراث بيروت(٣٧٣:١٥)، الهبة۔

(۲) دیکھئے: ابن قدامة المقدسی (أبو محمد عبد اللہ بن أحمد بن محمد)،المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱٤۰۳ھ(٦٥٣:٥)، الهبة۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: الحصكفی، محمدعلاء الدين، الدر المختار شرح تنوير البصار (٣٠٣:٤)۔

ضروری ہونے پر دلالت کرتی ہیں، اور دو روایتیں ایسی ہیں جن میں خاص طور سے مشاع کے ہبہ میں تقسیم کے ضروری ہونے پر بھی رہنمائی ملتی ہے۔

۱۔ عن عائشة زوج النبی ﷺ أنها قالت: إن أبا بکر الصدیقؓ کان نحلها جاد عشرین وسقا من ماله بالغابة، فلما حضرته الوفاة قال: واللّٰه یا بنیة ما من الناس أحب إلی غنی بعدی منك ولا أعز علی فقر بعدی منك وإنی کنت نحلتك جاد عشرین وسقا فلو کنت جددتیه واحتزتیه کان ذلك لك، وإنما هو الیوم مال وارث، وإنما هما أخواك وأختاك، فاقسموه علی کتاب اللّٰه، قالت عائشة: فقلت یا أبت واللّٰه لو کان کذا وکذا لترکته، إنما هی أسما فمن الأخری؟ قال: ذو بطن ابنة خارجة اراها جاریة۔[1]

یعنی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مجھ کو اپنے باغ کی بیس وسق کھجوریں کاٹنے کی ہدایت کر کے ہدیہ میں دیں، جب انکی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے مجھ سے فرمایا: بیٹی اپنے (مرنے کے) بعد مجھے کسی کی خوشحالی اتنی محبوب نہیں جتنی تمہاری خوشحالی، اور اپنے بعد کسی کی تنگدستی مجھے اتنی شاق نہیں جتنی تمہاری تنگدستی، اور میں نے تمہیں بیس وسق کھجوریں ہدیہ کی تھیں، اگر تم ان کو توڑ کر اپنے قبضہ میں لے لیتیں تو وہ (آج) تمہاری ہوتیں، لیکن وہ آج ورثاء کا مال بن گئی ہیں، اور ورثاء تمہارے دو بھائی اور دو بہنیں ہیں، اب تم ان کو قرآن کریم (کے بیان کردہ حصوں) کے مطابق تقسیم کر لینا، حضرت عائشہؓ نے ارشاد فرمایا اباجان: اگر یہ بات ہے تو خدا کی قسم میں ان سے دست بردار ہوتی ہوں، (اور دو بہنوں میں سے ایک) تو اسماء ہیں اور دوسری کون ہیں؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا خارجہ کے پیٹ میں جو ہے اور میرا گمان ہے کہ وہ

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الموطأ للإمام مالکؒ (٦٤٥)، کتاب الأقضیة باب ما لا یجوز من النحل۔

لڑکی ہوگی۔

اس روایت سے احناف اس طرح استدلال کرتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے باغ کی کھجوریں درخت سے کاٹ کر الگ کئے بغیر حضرت عائشہؓ کو ہبہ کی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ باغ پر کل لگی ہوئی کھجوریں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان مشترک ہوگئی تھیں، کیونکہ ان میں سے بیس وسق حضرت عائشہؓ کی اور باقی حضرت صدیق اکبرؓ کی، لیکن جب حضرت عائشہؓ نے اپنی بیس وسق کھجوریں حضرت صدیق اکبرؓ کی صحت کی حالت میں کاٹ کر الگ نہیں کیں اور ان پر قبضہ نہیں کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ فرمایا کہ اب وہ ہبہ قابل عمل نہیں رہا، (کیونکہ بیماری کی حالت میں اپنے کسی وارث کو کوئی ہبہ نہیں کیا جاسکتا) اور سارا مال حضرت ابوبکرؓ کے سارے ورثاء میں مشترک ہوگیا ہے، احناف کہتے ہیں کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اس ارشاد کے یہ الفاظ خاص طور پر قابل توجہ ہیں: فلو كنت جددتيه واحتزتيه كان ذلك لك، یعنی اگر تم ان کو توڑ لیتیں اور اپنے خالص قبضے میں کر لیتیں تو وہ تمہاری ہو جاتیں، ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کے نزدیک اول تو قبضہ کے بغیر ہبہ مکمل نہیں ہوتا، دوسرے چونکہ وہ حضرت صدیق اکبرؓ کے ساتھ مشترک کھجوریں تھیں اس لئے ان کے الگ حصہ کئے بغیر ہبہ کی تکمیل نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ مشاع کا ہبہ نہیں ہوسکتا۔ (۱)

۲۔ احناف کا استدلال اس روایت سے بھی ہے:

> عن عمر بن الخطابؓ قال: ما بال أقوام يخلون أولادهم فإذا مات الابن قال الأب: مالي وفي يدي، وإذا مات الأب قال: قد كنت نحلت ابني كذا وكذا، لا نحل إلا لمن حازه وقبضه عن أبيه۔ (۲)
>
> حضرت عمر بن الخطابؓ سے مروی ہے کہ لوگوں کو کیا ہوا کہ وہ اپنی اولاد کو ہبہ

(۱) ملاحظہ فرمائیں: العثمانی، العلامة ظفر احمد، إعلاء السنن، ادارة القرآن، کراچی (۱۶:۷۹)۔

(۲) مزید دیکھئے: العثمانی، العلامة ظفر احمد، إعلاء السنن، ادارة القرآن، کراچی، الهبة (۱۶:۸) وقال: رواه عبد الرزاق عن عمر عن الزهرى عن عروة، أخبرنى المسور بن مخرمة وعبد الرحمن ابن عبد القارى أنهما سمعا عمر يقول فذكره المحلى (۹:۱۲۲)۔

کرتے ہیں، پھر جب بیٹا مر جاتا ہے تو باپ کہتا ہے کہ یہ میرا مال ہے اور میرے
قبضے میں ہے، (لہذا مرحوم بیٹے کے ورثاء کا اس میں حق نہیں) اور جب باپ
مر جاتا ہے تو کہتا ہے میں نے تو اپنے بیٹے کو یہ یہ ہبہ کر دیا تھا، (صحیح بات یہ ہے
کہ) ہبہ اسی کے لئے صحیح ہوتا ہے جو اسکو (تقسیم کر کے) الگ کر لے اور اپنے
باپ سے اسکا قبضہ لے لے۔

احناف مذکورہ بالا روایت کے اس جزء سے استدلال کرتے ہیں: لا نحل إلا لمن حازه وقبضه، یعنی ہبہ اسی کیلئے صحیح ہوتا ہے جو اسے (تقسیم کر کے اپنا حصہ) الگ کر لے، اور اپنے باپ سے اس کا قبضہ لے لے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہبہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوتا جب تک قبضہ مکمل نہ ہو، شیوع (مشترک) ہونے کے ساتھ قبضہ ایک جہت سے موہوب لہ (جسے ہبہ کیا گیا ہے) کا ہے، اور دوسری جہت سے اس کے شریک کا ہے، الا یہ کہ وہ اس شئے کو تقسیم کر کے اپنے قبضہ میں لے لے، کیونکہ قبضہ اپنے قبضۂ قدرت میں آنے کو کہتے ہیں اور تقسیم سے پہلے وہ اس کے قبضۂ قدرت میں آتا نہیں، لہذا اس کا ہبہ صحیح نہ ہوا، کیونکہ قبضہ سے پہلے پہلے تک واہب (ہبہ کرنے والا) کی ملکیت میں ہی رہتا ہے۔

ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات:

علماء حنفیہ نے ائمہ ثلاثہ کے دلائل کے جوابات اس طرح دیئے ہیں:

پہلی روایت حضرت قیس بن ابی حازمؒ کی تھی، جس میں مروی ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس مویشیوں کے بالوں کا گچھا لے کر آیا، اور کہنے لگا کہ یارسول اللہ یہ مجھے ہبہ کر دیں، کیونکہ میں گھربار رکھتا ہوں، اور ہم ان بالوں سے علاج کرتے ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس میں سے میرا حصہ تمہارے لئے ہے۔

اس روایت سے ائمہ ثلاثہ استدلال فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے مال غنیمت کے مویشیوں کے بال ہبہ کر دئے، حالانکہ وہ مشترک مال میں داخل تھے، اس سے معلوم ہوا کہ مشاع (مشترک مال) کا ہبہ جائز ہے۔

اس کا جواب علامہ ظفر احمد عثمانیؒ نے اپنی کتاب ,,اعلاء السنن،، میں اول تو یہ دیا ہے کہ یہ حدیث مرسل ہے، اور حدیث مرسل حجت نہیں ہوتی، لہذا اس سے استدلال درست نہیں، جبکہ اس کے مقابلہ میں دو روایتیں اور ہیں جن سے

یہ پتہ چلتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی عادت شریفہ یہ تھی کہ آپ غنیمت کے مال میں سے کسی کو اس وقت تک نہیں دیتے تھے جب تک وہ تقسیم نہ کر لیا جاتا۔

صاحب إعلاء السنن نے اسی حدیث کے دوسرے صحیح طرق أبوداؤد سے ذکر کیے ہیں جس میں یہ روایت ہے:

,,كان رسول الله ﷺ إذا أصاب غنيمة أمر بلالا فنادى في الناس فيجيئون بغنائمهم، فيخمسه ويقسمه، فجاء رجل بعد ذلك بزمام من شعر، فقال رسول الله ﷺ: هذا فيما كنا أصبناه من الغنيمة، فقال: أسمعت بلالا ينادي ثلاثا؟ قال نعم، قال: وما منعك أن تجيء به؟ فاعتذر إليه، فقال: كن أنت تجيء به يوم القيامة فلن أقبله عنك،،۔[(۱)]

حضرت عبد اللہ بن عمروؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام کو جب کوئی مال غنیمت ملتا تو حضرت بلالؓ کو حکم دیتے وہ لوگوں میں اعلان کرتے لوگ اپنی اپنی غنیمت کا مال لے کر آجاتے، (ان سب کو اکٹھا کر کے) حضرت بلال اس کا پانچواں حصہ (خمس) نکالکر تقسیم کر دیتے، (ایک مرتبہ تقسیم کے بعد) ایک آدمی بال کی لگام لے کر آیا، اور کہنے لگا، یارسول اللہ یہ اس مال غنیمت میں سے ہے جو ہم نے (جنگ میں) پایا تھا، تو حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا: کیا تم نے بلال کو سنا تھا کہ وہ تین بار اعلان کر رہے تھے، اس نے کہا ہاں، حضور علیہ السلام نے پوچھا: کہ پھر تم اس وقت کیوں نہیں آئے؟ تو وہ معذرت کرنے لگا، حضور علیہ السلام نے فرمایا: اب اس کو تم قیامت کے روز ہی لے کر آنا میں اسے ہرگز قبول نہ کروں گا۔

اسی طرح ایک دوسری روایت میں ہے:

كتب يزيد بن معاوية إلى أهل البصرة: سلام عليكم، أما بعد فإن رجلا

(۱) العثماني، العلامة ظفر احمد، إعلاء السنن، ادارة القرآن، کراچی (۳:۲۱)۔

سأل رسول الله ﷺ زماما من شعر من مغنم فقال رسول الله ﷺ: سألتني زماما من نار لم يكن لك أن تسألني ولم يكن لي أن أعطيه۔[1]

یزید بن معاویہ نے بصرہ والوں کو خط لکھا السلام علیکم امابعد! ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے مال غنیمت میں سے بال کی ایک لگام مانگی تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو نے مجھ سے آگ کی ایک لگام مانگی ہے، لہذا تمہیں مجھ سے مانگنی نہیں چاہیے، اور مجھے تمہیں دینا نہیں چاہیے۔

مذکورہ بالا روایات سے یہ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کی یہ عادت شریفہ تھی کہ آپ مال غنیمت میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی کسی کو اس وقت تک نہیں دیتے تھے جب تک مال تقسیم نہ کر لیا جائے، اس کے علاوہ بھی ایک روایت ہے جسمیں حضور ﷺ سے کسی نے مال غنیمت میں سے اونٹ باندھنے کی رسی مانگی، حضور ﷺ نے یہ کہہ کر منع فرمایا: أتركه حتى يقسم او نقسم، اسے چھوڑدو یہاں تک کہ اسے تقسیم کر لیا جائے یا یہ فرمایا کہ ہم تقسیم کر لیں۔[2]

ائمہ ثلاثہ حضرت قیس بن حازمؓ کی جس روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے بالوں کے گچھے کے بارے میں فرمایا: نصيبي منها لك، یعنی میرا حصہ تمہارے لئے ہے، اگر اس روایت کو بالفرض صحیح تسلیم بھی کر لیا جائے تو بھی اس سے ہبۃ المشاع ثابت نہیں ہوتا، کیونکہ یہ کہنے سے کہ میرا حصہ تمہارے لئے ہے ہبہ مقصود نہیں ہے، بلکہ آپ کا مقصد انکو دینے سے انکار کرنا ہی تھا، البتہ انکار کے لئے آپ ﷺ نے ایک ایسا انداز اختیار فرمایا جس سے اسکی معقولیت ظاہر ہو جائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے تو صرف اپنا حصہ تمہیں دینے کا حق حاصل ہے حالانکہ اس گچھے میں تمام مسلمانوں کا حصہ ہے، اور ان کے مقابلے میں میرا حصہ انتہائی کم بھی ہے اور غیر متعین بھی، اب اگر تم میرے حصے کو اس گچھے سے الگ کر سکتے ہو تو الگ کر کے لے لو، لیکن ظاہر ہے کہ نہ ان کے لئے الگ کرنا ممکن تھا، اور اگر کسی طرح الگ کر بھی لیتے تو اس سے فائدہ اٹھانا ممکن نہ ہوتا، لہذا عملاً اسکا مطلب یہی تھا کہ انہیں دینے سے انکار کر دیا گیا۔

---

(۱) ابو داود في المراسيل، الترغيب: (۲۳۸)۔

(۲) روى احمد عن عبادة بن الصامت، وقال العلامة العثماني في إعلاء السنن (۱۶: ۸۱): وفيه راو لم يسم مجمع الزوائد (۵: ۳۳۸)، قلت: وله شواهد فهو صالح للاعتقاد۔

اس بات کی تائید ائمہ ثلاثہ کی استدلال کردہ دوسری روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا آخری جزو در حقیقت احناف کے اوپر بیان کردہ موقف کی تائید کرتا ہے، وہ روایت یہ ہے:

عن عمرو بن شعیب عن أبیه عن جده قال: سمعت النبی ﷺ وقد جائه رجل ومعه کبة من شعر، فقال: أخذت هذه من المغنم لأصلح بردعة لی، فقال النبی ﷺ: ما کان لی ولبنی عبد المطلب فهو لك، فقال أما إذا بلغت ما أری فلا إرب لی فیها، ونبذها۔[1]

حضرت عمرو بن شعیب اپنے والد اور دادا سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضور ﷺ کے بارے میں سنا کہ ایک مرتبہ ان کے پاس ایک آدمی آیا، اور اس کے پاس بالوں کا ایک گچھا تھا، اور اس نے کہا کہ یہ میں نے مال غنیمت میں سے لیا ہے تاکہ میں اس کے ذریعہ سے پالان کے کمبل کو ٹھیک کرلوں، تو حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا جو حصہ میرا اور عبد المطلب کی اولاد کا ہے وہ تمہارا ہے، تو وہ کہنے لگا کہ اگر مجھے اتنا ملے گا تو مجھے اسکی کوئی خواہش نہیں ہے، چنانچہ اس نے پھینک دیا۔

مذکورہ بالا روایت سے پتہ چلا کہ وہ حضور ﷺ کے اس قول: ما کان لی ولبنی عبد المطلب فهو لك (جو حصہ میرا اور عبد المطلب کی اولاد کا ہے وہ تمہارا ہے)، اس جملہ کا مطلب وہ یہ نہیں سمجھے کہ مجھے اتنا حصہ ہبہ کیا گیا ہے، بلکہ انہوں نے اسے منع کرنے پر ہی محمول کیا، اور وہ سمجھ گئے کہ اس گچھے میں سے حضور ﷺ اور بنی عبد المطلب کا جو حصہ ہوگا اول تو وہ تقسیم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کسی کو دینے کے قابل ہو جاتا، اور اگر بالفرض تقسیم کر کے اس کا کوئی حصہ متعین بھی کر دیا جاتا تو اسکی مقدار اتنی نہ بنتی کہ جس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے، لہذا اس کو لینا بیکار تھا، لہذا اس نے حضور ﷺ کے منع کرنے پر عمل کیا اور اسے اپنے پاس نہ رکھا، بلکہ پھینک دیا۔

(۱) نسائی، الهبة، حدیث ۳٦۲۸، ابو داود، جهاد، حدیث: ۲۳۱۹، مسند احمد، حدیث: ٦٤٤١۔

تیسری روایت کا جواب:

ائمہ ثلاثہ اس روایت سے بھی استدلال کر کے ہبۃ المشاع کو جائز قرار دیتے ہیں:

"عن عمرو بن سلمة الضمريؓ قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ حتى أتينا الروحاء، فرأينا حمار وحش معقورا، فأردنا أخذه، فقال رسول الله ﷺ دعوه فإنه يوشك أن يجيء صاحبه، فجاء رجل من بهز، وهو الذي عقره، فقال: يا رسول الله شأنكم بالحمار، فأمر رسول الله ﷺ أبا بكر أن يقسمه بين الناس"[1]

حضرت عمرو بن سلمہ الضمریؓ سے مروی ہے کہ ہم حضور ﷺ کے ساتھ (سفر پر) نکلے یہاں تک کہ ہم روحاء کے مقام پر پہونچے، تو ہم نے ایک جنگلی گدھے کو زخمی حالت میں پایا، ہم نے اسے پکڑنے کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے فرمایا: اس کو چھوڑ دو، ہو سکتا ہے کہ اسکا کوئی مالک ہو اور وہ اسے لینے آ جائے، پھر ایک آدمی بہز سے آیا اور کہنے لگا کہ یہ میں نے زخمی کیا تھا، اور اب یہ آپ کا ہے، تو حضور ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ کو حکم دیا کہ اس کے گوشت کو سب لوگوں میں تقسیم کر دو۔

ائمہ ثلاثہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جنگلی گدھے (زیبرے) کے مالک نے وہ گدھا تمام مسلمانوں کو ہبہ کر دیا تھا جو ہبۃ المشاع تھا، اور آپ ﷺ نے اسے جائز قرار دیا۔

حنفیہ اس دلیل کا یہ جواب دیتے ہیں کہ در حقیقت اس شخص نے وہ گدھا تمام مسلمانوں کو نہیں بلکہ حضور ﷺ کو ہبہ کیا تھا، اور حضور ﷺ نے اسے تقسیم کر کے مسلمانوں کو ہبہ کروا دیا، لہذا اس روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضور ﷺ نے مشاع کو ہبہ کیا ہے۔

---

(۱) احمد والنسائی (٦:٤٥٦)۔

اسکے علاوہ اس واقعے میں یہ احتمال بھی ہے کہ اس نے گدھا ہبہ نہیں کیا تھا بلکہ سب مسلمانوں کو اس کا گوشت کھانے کی محض اجازت دی تھی جسے فقہ کی اصطلاح میں "اباحت" کہتے ہیں، اور مشاع طور پر ہبہ تو ناجائز ہے لیکن اباحت جائز ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص بہت سے آدمیوں کی دعوت کرے اور سب کو مشترک طور پر کھانے کی اجازت دے تو اسے کوئی ناجائز نہیں کہتا۔

ہبۃ المشاع کے بارے میں فریقین کے دلائل کا خلاصہ اوپر ذکر کر دیا گیا ہے، لیکن دونوں طرف کے دلائل پر غور کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس مسئلے میں فریقین میں سے کسی کے پاس قرآن وسنت کی کوئی صریح نص نہیں ہے۔ ائمہ ثلاثہ نے جن احادیث سے استدلال کیا ہے ان کا جواب تو پہلے دیا جا چکا ہے، لیکن حنفیہ نے جو دلیلیں پیش کی ہیں ان پر غور کرنے سے بھی اول تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان کے پاس اس مسئلہ میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا کوئی حدیث مرفوع نہیں ہے، البتہ انہوں نے ایک تو حضرت صدیق اکبرؓ کے اثر سے استدلال کیا ہے، دوسرے حضرت عمرؓ کے اثر سے، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی اثر بھی ہبۃ المشاع کے مسئلہ میں صریح نہیں ہے، ان دونوں کا اصل مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ہبہ قبضہ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، جہاں تک ہبۃ المشاع کے مسئلہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں ان دونوں آثار میں کوئی صریح ممانعت موجود نہیں، بعض علمائے حنفیہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ان دونوں آثار میں دو لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں، ایک قبضہ، دوسرے حیازۃ، چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اثر کے الفاظ یہ ہیں:

فلو كنت جددتيه واحتزتيه كان ذلك لك

اگر تم اسے توڑ لیتیں اور اسے اپنی حیازت میں لے آتیں تو یہ کھجوریں تمہاری ہوتیں۔

اور حضرت فاروق اعظمؓ کے اثر کے الفاظ یہ ہیں:

لا نحل إلا لمن حازه وقبضه عن أبيه۔

ہبہ اسی شخص کیلئے درست ہے جو اسے اپنی حیازت میں لے لے، اور اپنے والد

سے اسے قبضہ کرلے۔

علمائے احناف کا کہنا یہ ہے کہ قبضہ میں لینے کے علاوہ ان دونوں اثروں میں حیازت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ تقسیم کے معنی پر دلالت کرتا ہے، لہٰذا ان دونوں آثار کا تقاضا یہ ہے کہ تقسیم کے بغیر ہبہ جائز نہیں ہے، لیکن یہ استدلال اس لئے مخدوش ہے کہ حیازت میں لینے کے معنی لازما تقسیم کرنے کے نہیں ہوتے، بلکہ بعض اوقات یہ لفظ قبضہ ہی کے مرادف ہوتا ہے، اور بعض اوقات اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ چیز جسے حیازت میں لیا گیا ہے کسی شخص کے ضمان میں آجائے، چنانچہ یہی مطلب عربی لغت کی کتابوں میں کیا گیا ہے۔

تاج العروس میں حیازت کے معنی یہ بیان کیے گئے ہیں:

الحوز الجمع وضم الشيء وكل من ضم شيئا إلى نفسه من مال أو غير ذلك، فقد حازه واحتازه إليه۔

وقال أبو عمرو: الحوز (الملك) يقال: حازه يحوزه إذا ملكه وقبضه واستبد به۔[1]

حوز کے معنی جمع کرنے اور ملانے کے ہیں، جو مال یا غیر مال اپنے ساتھ ملالیا جائے اسے بھی حوز کہتے ہیں، اور ابو عمرو نے کہا ہے کہ حازہ و یحوزہ اس وقت کہتے ہیں جب کوئی شخص کسی چیز کا مالک بن جائے اس پر قبضہ کرلے، اور ہمیشہ کے لئے اسکا ہو جائے۔

اور لسان العرب میں بھی یہی مفہوم بیان کیا گیا ہے:

الحوز الجمع وكل من ضم شيئا إلى نفسه من مال أو غير ذلك، فقد حازه

(۱) الزبيدى، (محب الدين أبو الفيض) السيد محمد مرتضى الحسينى الواسطى، تاج العروس من جواهر القاموس ۱۳۰۷ھ الخيريه مصر: فصل الحاء من الراى (۱۴:۲۸)۔

حوزا وحیازۃ وحازہ إلیہ، واحتازہ إلیہ حازہ یحوزہ إذا قبضہ وملکہ واستبد بہ۔ (۱)

حوز کے معنی جمع کرنے اور کسی مال یا غیر مال کو اپنے ساتھ ملانے کے ہیں، حازہ حوزا حیازۃ اور حازہ الیہ کے یہی معنی ہیں۔ حازہ یحوزہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس پر قبضہ کر کے مالک بن جائے، اور ہمیشہ کیلئے وہ چیز اسکی بن جائے۔

ان عبارتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حیازت کے معنی قبضہ کرنے اور اس طرح مالک بن جانے کے ہیں کہ وہ شئے مکمل اختیار میں آجائے، لہذا اس لفظ سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ قبضہ کے علاوہ تقسیم کرنا بھی ہبہ کی لازمی شرط ہے۔

بعض علمائے احناف نے حضرت صدیق اکبرؓ کے اثر سے استدلال کرتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہؓ کو کئے ہوئے ہبہ کو جو غیر نافذ قرار دیا ہے، اسکی وجہ یہ تھی کہ جب تک حضرت عائشہؓ کھجوروں پر قبضہ نہ کرتیں، درخت پر لگی ہوئی کھجوریں ان کے اور حضرت صدیق اکبرؓ کے درمیان مشترک رہتیں، اسی لئے حضرت صدیق اکبرؓ نے قبضہ کی شرط لگائی، تاکہ وہ تقسیم کر کے اپنا حصہ لے سکیں، اور ہبۃ المشاع لازم نہ آئے، لیکن یہ دلیل بھی درست معلوم نہیں ہوتی، وجہ یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہؓ کو کھجوروں کا کوئی متناسب حصہ مثلاً پانچواں یا دسواں حصہ ہبہ نہیں کیا تھا، بلکہ ایک متعین پیمانہ کی کھجوریں یعنی بیس وسق ہبہ کی تھیں، ہبہ کی صحت کے لئے ان بیس وسق کی تعیین ضروری تھی، اور جب تک کہ تعیین نہ ہو یہ کہنا درست نہیں تھا کہ کھجوریں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت عائشہؓ کے درمیان مشاع ہو گئی ہیں، بلکہ حضرت صدیق اکبرؓ کے ارشاد کا حاصل یہ تھا کہ انہوں نے کچھ غیر متعین بیس وسق کھجوریں حضرت عائشہؓ کو ہبہ کیں، اور یہ اس ہبہ کی صحت کے لئے ضروری تھا کہ بیس وسق کھجوریں پہلے متعین ہوں پھر حضرت عائشہؓ اس پر قبضہ کریں، متعین کرنے کے لئے حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ فرمایا: فلو کنت جددتیہ (اگر تم ان کو

(۱) جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور، لسان العرب (۶۳۰:۷۱۱)، المعرف العلمیہ، لاہور: مادۃ حوز (۳۸۸:۳)۔

کاٹ لیتیں) اور قبضہ کرنے کے لئے یہ فرمایا: واحتزتیہ (اور قبضہ کر لیتیں) لہذا یہاں ہبۃ المشاع کا کوئی سوال ہی نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں آثار صرف اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ہبہ کی تکمیل کے لئے قبضہ ضروری ہے، آگے حنفیہ نے یہ نکتہ اٹھایا ہے کہ ایک مشترک چیز کے مشاع حصہ پر قبضہ ممکن نہیں، اور قبضہ کی صحت کے لئے اسے تقسیم کرنا ضروری ہے، اس لئے قبضہ کے لازمی ہونے سے خود بخود تقسیم بھی لازم ہو جاتی ہے، لیکن یہ استدلال بھی متعدد وجوہ سے مخدوش ہے۔

۱۔ تمام فقہائے کرام نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ تمام چیزوں کے قبضہ کے لئے کوئی ایک طریقہ متعین نہیں ہے، بلکہ مختلف چیزوں کے قبضہ کا طریقہ الگ الگ ہو سکتا ہے، روپے پیسے کا قبضہ یہ ہے کہ وہ ہاتھ میں آجائے، لیکن کسی گھر کا قبضہ یہ ہے کہ اسکی چابی ہاتھ میں آجائے، لہذا ایک مشترک چیز کے قبضہ کے لئے صرف یہی طریقہ متعین نہیں ہونا چاہئے کہ ہر شریک جدا کر کے اس پر قابض ہو، بلکہ اصل مدار اس پر ہونا چاہیے کہ اس حصہ پر قبضہ کرنے والے کو ایسا ہی مکمل تصرف حاصل ہو گیا ہے، جیسا پچھلے مالک کو حاصل تھا، فرض کیجئے کہ ایک مکان زید اور بکر میں مشاع طور پر مشترک تھا، تو ان میں سے ہر ایک کو اپنے حصہ کے بقدر مکان پر کچھ تصرفات کرنے کا حق حاصل تھا، اگر زید اپنا مشاع حصہ خالد کو ہبہ کرے تو خالد کا اس حصہ پر قبضہ اس طرح متحقق ہو سکتا ہے کہ زید اس کے حق میں ایک دستاویز لکھدے کہ میں اپنے حصہ کے تمام حقوق وملکیت وتصرف خالد کو منتقل کرتا ہوں، اور پھر عملاً خالد مکان پر وہ تصرفات شروع کر دے جو پہلے زید انجام دے رہا تھا، اس طرح عرف عام میں بھی قبضہ منتقل سمجھا جاتا ہے۔

۲۔ خود حنفیہ نے ناقابل تقسیم اشیاء میں ہبۃ المشاع کو جائز قرار دیا ہے، جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہاں خود حنفیہ تقسیم کے بغیر قبضہ کی تکمیل کے قائل ہیں، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قبضہ تقسیم کے بغیر بھی مکمل ہو سکتا ہے، چنانچہ اگر ایک کار زید اور بکر کے درمیان مشترک ہو تو حنفیہ بھی یہ کہتے ہیں کہ زید صرف اپنا حصہ خالد کو ہبہ کر سکتا ہے، سوال یہ ہے کہ اس ہبہ میں خالد کا قبضہ متحقق ہوا یا نہیں؟ اگر متحقق نہیں ہوا تو ہبہ کیسے درست ہوا؟ اور اگر قبضہ متحقق ہوا تو اسکے معنی سوائے اسکے کیا ہیں کہ تقسیم کے بغیر بھی قبضہ ہو سکتا ہے۔

۳۔ یہ بات ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ خود حنفیہ کے نزدیک مشاع کی بیع جائز ہے، دوسری طرف یہ اصول مسلم

ہے کہ جبتک کوئی چیز کسی انسان کے قبضہ میں نہ آجائے، وہ اسے کسی کو فروخت نہیں کر سکتا، اب اگر اس اصول کو درست مانا جائے کہ تقسیم کے بغیر کسی شئے پر قبضہ درست نہیں ہو سکتا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شریک اپنا مشاع حصہ فروخت بھی نہ کر سکے، کیونکہ غیر منقسم ہونے کی وجہ سے وہ حصہ اس کے قبضہ میں نہیں، اور قبضہ کے بغیر آگے بیع جائز نہیں، لہذا حنفیہؒ نے جو مشاع کی بیع کو جائز قرار دیا ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خود حنفیہ کے نزدیک غیر منقسم حصہ پر فی الجملہ قبضہ ممکن ہے، لہذا حنفیہ نے ہبۃ المشاع کے ناجائز ہونے پر جو دلائل پیش کئے ہیں وہ درحقیقت اس بات کے دلائل ہیں کہ ہبہ کے مکمل ہونے کے لئے قبضہ ضروری ہے، ان سے براہ راست ہبۃ المشاع کا عدم جواز معلوم نہیں ہوتا، اور چونکہ مذکورہ بالا دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مشاع کا قبضہ بھی فی الجملہ ممکن ہے اس لئے ہبۃ المشاع کے عدم جواز کے دلائل اتنے زیادہ مضبوط نہیں ہیں۔

امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ نے اس موضوع پر بڑی فاضلانہ بحث فرمائی ہے، انہوں نے فریقین کے دلائل پر غور و خوض کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ درحقیقت حنفیہ نے ہبۃ المشاع کو جو منع کیا ہے، اسکی اصل وجہ یہ ہے کہ اگر تقسیم کے بغیر کسی مشترک چیز کا کوئی حصہ کسی کو ہبہ کر دیا جائے تو اسکی تعیین میں جھگڑے پیدا ہونے کا امکان ہے، اور جن مقامات پر شریعت نے جھگڑوں کے اندیشہ سے کسی فعل کو منع کیا ہو اسمیں بہت زیادہ تشدد مناسب نہیں، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

قلت: والذی تبین لی أن توسیع البخاری وتضییق الحنفیه کلاهما لیس بمرضی للشارع، فإن رفع الشیوع والإبهام مطلوب عنده البتة، أماإنه فی أی مرتبة فلینظر فیه، فلیس نسقه إلی هدره کما زعمه البخاری، ولا العض به کما قاله الحنفیة، والذی أراه أن النهی عنه لکونه مفضیاإلی النزاع، وکل أمر یکون النهی عنه لا یشدد فیه الشارع بنفسه بل ربما یغمض عنه أیضا، فلا ینبغی التشدد فیه إلخ۔ (۱)

---

(۱) کشمیری، علامه انورشاه، فیض الباری شرح البخاری (۳۷۲:۳)۔

> جو بات مجھے سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ امام بخاری کی اس مسئلہ میں وسعت (کشادگی) اور احناف کی اس مسئلہ میں سختی (تضییق) یہ دونوں در حقیقت شارع (شریعت) کا مقصود نہیں ہیں، بات دراصل یہ ہے کہ شیوع اور ابہام کو دور کرنا شریعت کو یقیناً مطلوب ہے، لیکن یہ مطلوب کس درجہ کا ہے، اس پر غور کرنا چاہیے، لہذا نہ تو ہبہ کو مطلقاً جائز کہنا صحیح ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ نے کہا ہے، اور نہ ہی اس پر سختی کرنا مناسب ہے جیسا کہ احناف کا مذہب ہے، البتہ میرا خیال یہ ہے کہ مشاع کے ہبہ سے ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں نزاع کا امکان اور خطرہ ہے، اور ہر ایسا معاملہ جس میں ممانعت کی وجہ نزاع ہو اس میں شارع کی طرف سے اصل میں سختی نہیں ہوتی، بلکہ (اس کے برعکس) بعض اوقات اس میں اغماض (چشم پوشی) سے کام لیا جاتا ہے، لہذا اس میں تشدد اور سختی مناسب نہیں ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے جو منصفانہ محاکمہ فرمایا ہے اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ عام حالات میں ایک مشترک چیز کا ہبہ کرنے کے لئے مناسب یہی ہے کہ ہبہ کرنے والا اپنا حصہ الگ کر کے کسی کو ہبہ کرے، لیکن بہت سے حالات میں ایسا کرنا عملاً سخت دشوار ہوتا ہے، اور اگر مشترک حالت میں ہی ہبہ کر دیا جائے تو اس میں جھگڑے کا بھی کوئی خاص امکان نہیں ہوتا، ایسے حالات میں ہبۃ المشاع کو جائز قرار دینا چاہیے۔

اس مسئلہ کو ہم نے قدرے تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کرنا مناسب سمجھا کہ موجودہ دور میں شرکت الملک کے دوران ایسی بہت سی صورتیں پیش آتی ہیں، جہاں تقسیم کے بغیر کوئی شریک اپنا حصہ کسی کو ہبہ کر دیتا ہے، مثلاً جائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے حصص مشاع ہوتے ہیں، اور انکے ہبہ کے لئے انہیں تقسیم کرنا عملاً ممکن نہیں ہوتا، اس قسم کی متعدد صورتیں مشارکہ کے موضوع پر ہماری آئندہ بحث میں آئیں گی، ایسے مواقع پر حضرت شاہ صاحب کے بقول اتنا تشدد مناسب نہیں جس سے معاملات میں ناقابل برداشت تنگی لازم آئے، جب یہ صورتیں مشارکہ کے تحت زیر بحث آئیں گی، تو ہم ہبۃ المشاع کی مکمل بحث کو دوہرانے کے بجائے اس بحث کی طرف اشارہ پر اکتفا کریں گے جو یہاں ذکر کی گئی ہے۔

اجارۃ المشاع کا مسئلہ

مشاع (مشترک) چیز کو کرایہ پر دینے کا کیا حکم ہے؟ اس بارے میں تفصیل ہے:[1]

ا: اگر ایک شریک اپنا کل یا بعض حصہ کسی دوسرے شریک کو کرایہ پر دے تو بالاتفاق تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

ب: اگر دو شریک اپنی کل مشترک جائیداد کسی اجنبی کو کرایہ پر دیں تو بالاتفاق تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

ج: اگر ایک شریک کسی اجنبی (غیر شریک) کو اپنا حصہ کرایہ پر دے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

د: اگر تین یا اس سے زیادہ شرکاء ہوں اور ان میں سے ایک شریک کسی ایک دوسرے شریک کو اپنا حصہ کرایہ دے تو بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الحصکفی ، محمدعلاء الدین ، الدر المختار شرح تنویر البصار ، (و) تفسد ایضا (بالشیوع) بان یوجر نصیبا من داره أو نصیبه من دار مشترکة من غیر شریکه أو من أحد شریکه، أنفع الوسائل، وعمادیة من الفصل الثلاثین، واحترز بالأصلی عن الطاری فلا یفسد علی الظاهر کأن آجر الکل ثم فسخ فی البعض أو آجر الواحد فمات أحدهما، أو بالعکس وهو الحیلة فی إجارة المشاع، کما لو قضی بجوازه، إلا إذا آجر کل نصیبه أو بعضه (من شریکه) فیجوز (إلی قوله) قلت، و البدائع، لو آجر مشاعا یحتمل القسمة فقسمه وسلم جاز لزوال المانع، ولو أبطلها الحاکم ثم قسمه وسلم لم یجز، و الشامی ،محمد امین الشهیر بابن عابدین، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی تحت قوله بالشیوع أی فیما یحتمل القسمة أو لا عنده وعلیه الفتوی، (۶:۴۸)، الاجارة الفاسدة۔

آخری دو صورتوں میں مشاع شئے کے کسی ایک حصہ کو کرایہ پر دینا امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ممنوع ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ مشاع شئے کے حصے جب تک تقسیم نہ کئے جائیں اس کے ہر ہر حصہ میں دوسرے شریک کا حصہ ہے، لہٰذا اگر اسے اجارہ (کرایہ) پر دیدیا جائے تو اس کے کسی ایک حصہ کو تقسیم کئے بغیر سپرد کرنا اور قبضہ دلانا ممکن نہیں ہے، لہٰذا وہ حصہ تسلیم (سپرد) کرنے کے قابل نہ ہوا، اور جب کوئی شئے سپرد کرنے اور قبضہ دینے کے قابل نہ ہو تو اس میں باہم اختلاف اور نزاع پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے، لہٰذا نزاع سے بچنے کے لئے ان دو صورتوں میں اجارہ جائز نہ ہوگا، جیسے غصب کردہ مال کسی دوسرے کو اجارہ پر نہیں دے سکتے کیونکہ اسے بھی سپرد کرنا اور حوالہ کرنا فی الحال ممکن نہیں ہوتا، اسی طرح مشاع شئے کے ایک حصہ سپرد کرنا بھی ممکن نہیں، لہٰذا اسکا اجارہ بھی ناجائز ہوگا، ہاں البتہ اگر وہ دوسرے شریک کی اجازت سے کل مال کو کرایہ پر دیدے تو جائز ہے، کیونکہ اب وہ سپرد کرنے کے قابل ہوگا، البتہ اگر اس کا شریک راضی نہ ہو تو چونکہ اسے اس کے مال میں کوئی ولایت اور قدرت حاصل نہیں ہے، لہٰذا وہ اپنے حصہ کے ساتھ دوسرے کے حصہ کو کرایہ پر نہیں دے سکتا۔

اوپر بیان کردہ صورتوں سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بقیہ تمام ائمہ کے نزدیک یعنی امام مالک، امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے نزدیک مشاع شئے کو اجارہ پر دینا مطلقاً جائز ہے، اور انکی دلیل یہ ہے کہ جس طرح مشاع کی بیع جائز ہے، اسکو اجارہ (کرایہ) پر دینا بھی جائز ہونا چاہیے، اور اجارہ اسے کہا جاتا ہے کہ اپنے نفع اٹھانے کا حق کسی دوسرے کو منتقل کر دیا جائے، اور انتفاع مشاع کے برقرار رہتے ہوئے بھی ممکن ہے وہ اس طرح کہ مشاع چیز کو تہایؤ (باری باری استعمال کرنے) پر دیدیا جائے، یا اس مکان کو خالی کر کے کسی اجنبی کو دیدیا جائے اور مشترک آمدنی (کرایہ) باہم تقسیم کر لی جائے۔[1]

اس کے علاوہ اگر کوئی شخص اپنے حصہ کو کرایہ پر دے رہا ہے تو وہ اپنے ہی مملوک حصہ پر عقد اور تصرف کر رہا ہے، جس کا اسے مکمل اختیار حاصل ہے، لہٰذا وہ اپنے حصہ کو کرایہ پر دے سکتا ہے، اور مزید یہ بات بھی ہے کہ اگر دو

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية، مكتبه امداديه ملتان (ص: ۳۰۱)۔

شریک اپنے اپنے حصہ کو اکٹھے کرایہ پر دیں تو بالاتفاق سب کے نزدیک جائز ہے، تو پھر ان میں سے ایک شریک کو بھی اختیار ہونا چاہیے کہ وہ اپنا حصہ کرایہ پر دے۔

امام ابو حنیفہؒ اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اس صورت میں جواز کی وجہ عدم نزاع (جھگڑے کا نہ ہونا) ہے، کیونکہ اس صورت میں وہ سپرد کرنے کے قابل ہے، اس وجہ سے نزاع کا امکان ختم ہو گیا، لہذا اس کا اجارہ جائز ہو گیا، اور جتنی ایسی صورتیں ہیں جن میں مشاع شئے کو اجارہ پر دینے میں کوئی نزاع نہ ہو ان میں مشاع کو اجارہ پر دینا جائز ہے، مثلاً دو شریک ملکر کسی اجنبی کو کرایہ پر دیں، یا ایک شریک دوسرے شریک کو کرایہ پر دے یا اور کوئی ایسی صورت ہو جسمیں نزاع کا امکان نہ ہو تو اس میں مشاع کو اجارہ پر دینا جائز ہو گا، البتہ ایسی تمام صورتوں میں جہاں نزاع کا امکان ہو تو نزاع سے بچنے کے لئے ایسا عقد ناجائز سمجھا جائیگا، مثلاً اگر ایک شریک کسی اجنبی کو اپنا حصہ کرایہ پر دے یا کل تین یا زیادہ شریک ہوں اور ان میں سے ایک شریک کسی ایک دوسرے شریک کو اپنا حصہ کرایہ پر دے تو یہ جائز نہ ہو گا، کیونکہ وہ تسلیم اور قبضہ کے قابل نہیں ہے، لہذا نزاع کا امکان ہے، اس وجہ سے اسکا اجارہ بھی جائز نہیں۔ [1]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة المقدسي، أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ (۵۵۳:۵، الاجارة)، محمد بن ابراهيم، ملتقى الأبحر، بيروت، مؤسسه الرساله، (۱۶۲:۲)، الاجارة۔

شرکت العقد

مقالہ کی ابتدا میں شرکت کی لغوی اور اصطلاحی تعریفیں گذر چکی ہیں، اب عقد کے لغوی معنیٰ ذکر کئے جاتے ہیں۔

عقد کے لغوی معنیٰ:

زبیدی نے تاج العروس میں عقد کے معنیٰ یہ بیان کئے: رسی کی گرہ، خرید و فروخت، عہد، باندھنا، بندھن، لیکن بعد میں اس کا اکثر استعمال بیوع، عہد و پیمان وغیرہ کے معنوں میں ہونے لگا۔[۱]

شیخ سعدی ابو جیب فرماتے ہیں:

,العقد ما عقد به البناء جمعه العقود، والعهد، واتفاق بين طرفين يلتزم بمقتضاه كل منهما تنفيذ ما اتفقا عليه كعقد البيع والزواج،،[۲]

عقد وہ چیز ہے جسکے ذریعہ عمارت کھڑی کی جائے اسکی جمع عقود ہے، اور اسکے دوسرے معنی ہیں عہد اور دو فریقوں کے درمیان ایسا اتفاق جسکی رو سے ان میں سے ہر ایک اپنے اوپر یہ بات لازم کرلیتا ہے کہ جس چیز پر اتفاق ہوا ہے اسے عمل میں لائے گا۔

عقد کے اصطلاحی معنیٰ:

مجلۃ الاحکام العدلیہ میں عقد کے معنیٰ یہ کئے گئے ہیں:

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الزبيدى ، (محب الدين أبو الفيض) السيد محمد مرتضى الحسينى الواسطلى،تاج العروس من جواهر القاموس ۱۳۰۷ھ، الخيريه مصر، (۲:۴۲٦)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: السعدى ،(أبو) حبيب،القاموس الفقهى (عربى) لغة واصطلاحاً،من علماء القرن الخامس عشر مطبعة المدنى القاهره (۲۵۵)۔

,,العقد التزام المتعاقدين، وتعهدهما، امراً وهو عبارة عن ارتباط الإيجاب والقبول،،

عقد نام ہے دو باہم معاملہ کرنے والوں کے کسی معاملہ پر التزام اور عہد کرنے کا، اور وہ ایجاب اور قبول کے باہم ربط سے عبارت ہے۔(۱)

شرکتِ عقد کی اصطلاحی تعریفات

فقہاءِ امۃ رحمہم اللہ تعالی نے شرکت العقد کی متعدد تعریفیں فرمائی ہیں، جس میں سے مختلف مذاہب کی اہم ترین تعریفات ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

احناف کی تعریف:

,,هی عبارة عن العقد بين المتشاركين فی الأصل والربح،،(۲)

شرکت عقد دو شریکوں کے درمیان اصل سرمائے اور منافع میں شرکت کا معاملہ کرنے کا نام ہے۔

مالکیہ کی تعریف:

علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد بن احمد الدردیرؒ نے شرکت العقد کی تعریف یوں ذکر کی ہے:

,,الشركة عقد مالكی مالين فأكثر علی التجر فيهما معا، أو علی عمل

(۱) الاتاسی، شرح مجلة الأحكام، محمد خالد، مکتبہ اسلامیہ ،کوئٹہ۱۴۰۳ھ(۱۰۳۴۹:۱)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں:شيخ زاده ،عبد الله الرحمن بن الشيخ محمد بن سليمان المعروف بداماد آفندی ، مجمع الأنهر شرح ملتقی الأبحر، دار الطباعة، ۱۹۷۷ء(۷۱۴:۱)، والحصکفی ، محمدعلاء الدين ، الدر المختار شرح تنوير البصار مع الشامی ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی (۳۹۹:۴)۔

بینھما، والربح بینھما،،[1]

شرکت مال کے دو یازیادہ مالکوں کے درمیان اس معاہدے کا نام ہے کہ وہ دونوں کے مشترک مال سے تجارت کرینگے، یا اس معاہدے کا کہ وہ دونوں مل کر کوئی کام کرینگے اور نفع دونوں کے درمیان تقسیم ہو گا۔

شوافع کی تعریف:

,, ثبوت الحق فی شیء لاثنین فأکثر علی جھة الشیوع[2]

دو یا زیادہ افراد کا کسی چیز کے اندر بطور اشتراک حق ثابت ہو۔

ما یحدث بالاختیار بین اثنین فصاعدا من الاختلاط لتحصیل الربح،،[3]

شرکت العقد یہ ہے کہ دو یا زیادہ افراد کے اپنے اختیار سے منافع حاصل کرنے کے لئے کوئی اختلاط وجود میں لایا جائے۔

حنابلہ کی تعریف:

,,شرکة العقد ھی الاجتماع فی الاستحقاق أو التصرف،،[4]

شرکت العقد استحقاق یا تصرف میں اجتماع کا نام ہے۔

خلاصہ:

اگر مذکورہ بالا تعریفات پر غور کیا جائے تو حاصل یہ نکلتا ہے کہ شرکت عقد (Partnership) یہ ہے کہ دو یا کئی

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الدردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغیر علی اقرب المسالك، مصر، شرکة مکتبة ومطبعة مصطفی البابی الحلبی ۱۳۷۴ھ، (۳:۴۵۵)۔

(۲) دیکھئے: بجیرمی، حاشیة البجیرمی علی شرح منھج الطلاب، المکتبہ الاسلامیہ ترکی۔ (۲:۹۳)۔

(۳) دیکھئے: العسقلانی، احمد بن علی، للحافظ ابن حجر ۸۵۲ھ، فتح الباری مصر، المطبعة البھیہ المصریہ ۱۳۴۸ھ (۵:۱۲۹)۔

(۴) دیکھئے: المغنی والشرح الکبیر للإمامین الھمامین موفق الدین بن قدامہ و شمس الدین بن قدامہ المقدسی (۴:۱۰۹)

افراد ایجاب و قبول کے ذریعہ ایک ایسا معاہدہ کریں جسکی رو سے وہ یا تو اپنے اپنے مال کو اکٹھا کر کے اسے تجارت میں لگائیں یا وہ سب مل کر کوئی نفع بخش عمل کریں، اور دونوں صورتوں میں حاصل شدہ نفع انکے درمیان تقسیم ہو۔

شرکت العقد کی اقسام

فقہائے کرامؒ نے شرکت العقد کی مختلف قسمیں بیان کی ہیں، فقہائے احنافؒ کے نزدیک شرکت العقد کی چھ قسمیں ہیں:

۱۔ شرکت الأعمال ۲۔ شرکت الأموال ۳۔ شرکت الوجوہ۔

اور پھر ان تینوں قسموں کی دو قسمیں ہیں، ۱۔ شرکت المفاوضہ، ۲۔ شرکت العنان، اس طرح کل ملا کر چھ قسمیں بن جاتی ہیں۔[۱]

شرکت الأموال:

دو یا زیادہ افراد اپنا معین سرمایہ اس شرط پر لگائیں کہ انمیں سے ہر ایک یا بعض افراد کام کریں گے، اور نفع دونوں میں مشترک ہو گا، مثلاً زید اور بکر ایک لاکھ روپے ملا کر لگائیں اور یہ طے کر لیں کہ ہم دونوں نفع میں سے آدھا آدھا لیں گے۔[۲]

شرکت الأعمال:

اسے شرکت صنائع، ابدان یا تقبل بھی کہا جاتا ہے، اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ دو یا زیادہ افراد کوئی ایسا کاروبار شروع کرتے ہیں جس میں لوگوں کے کام اجرت پر کئے جائیں، اور جو کمائی ہو اسمیں دونوں شریک ہوں، اب دونوں

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع في ترتیب الشرائع، بیروت، موسسۃ التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی (٦:٥٦، ٥٧)۔

(۲) حوالہ بالا (٦:٥٦، ٥٧)۔

شریکوں میں سے جو شخص بھی کوئی کام لے گا اسکی انجام دہی دونوں کو لازم ہوگی، اور جو مزدوری ایک کے کام کرنے سے حاصل ہوگی وہ طے شدہ شرح کے مطابق دونوں کے درمیان تقسیم ہوگی، اگرچہ دوسرے نے وہ کام نہ کیا ہو، مثال کے طور پر زید اور عمر درزی کے کام پر اشتراک کرلیں کہ ہم مل کر کپڑے سیا کریں گے، اور اسکی جو مزدوری ہوگی وہ دونوں میں آدھی آدھی یا کسی اور شرح سے تقسیم ہوگی، اب اگر صرف زید کپڑے سیئے اور عمر نہ سیئے، یا زید کے مقابلے میں کم سئے تب بھی سلائی کی اجرت دونوں پر طے کردہ شرح کے مطابق تقسیم کی جائے گی۔[۱]

شرکت الأعمال میں ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہے، کسی ایک شریک کو کام دے کر دوسرے شریک سے مطالبہ کیا جاسکتا ہے، کسی بھی شریک کو اجرت دی جاسکتی ہے۔[۲]

مختلف پیشہ ور بھی آپس میں مل کر ایک شراکتی ادارہ قائم کرسکتے ہیں، اسی طرح سروسز کے کاروبار میں بھی اشتراک کیا جاسکتا ہے، جسکی تفصیل آگے تیسرے باب میں ذکر کی جائے گی۔

نفع کی تقسیم کام کے اندازے پر نہیں بلکہ حسبِ قرارداد ہوگی، اگر یہ طے کیا کہ ہر شخص اپنے کام کے بقدر منافع کمائے یا کچھ طے نہ ہوا ہو تو شرکت نہیں رہے گی۔[۳]

شرکت الوجوہ:

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسۃ التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی (٦:٧٦)۔ وأیضا وإن عمل أحدهما دون الآخر بأن مرض أو سافر أو بطل فالأجر بينهما على ما شرطا (٦: ٧٦)۔

(۲) حوالہ بالا : فصار وكيله فيه (إلى قوله) ولصاحب العمل أن يطالب بالعمل أيهما شاء لوجوب على كل واحد منهما ولكل واحد منهما أن يطالب صاحب العمل بكل الأجرة (إلى قوله) أيهما وضع صاحب العمل برئ (٦:٧٦)۔

(۳) حوالہ بالا:لأن الأجر في هذه الشركة إنما يستحق بضمان العمل بالعمل ٦:٧٦، وأيضا: ويجوز شرط التفاضل في الكسب أو اشترط التفاضل في الضمان بأن شرط لأحدهما ثلثي الكسب وهو الأجر وللآخر الثلث وشرطا العمل عليهما كذلك سواء عمل الذى شرط له الفضل أو لم يعمل بعد أن شرطا العمل عليهما لأن استحقاق أصل الأجر بأصل العمل لا بالعمل،(٦: ٧٦)۔

اسے بعض فقہاو کرام شرکت الذمم بھی کہتے ہیں اسکی صورت یہ ہوتی ہے کہ شریک افراد کے پاس مال نہیں ہوتا وہ اپنی وجاہت اور اپنی ساکھ کے ذریعہ تاجروں کے یہاں سے سامان ادھار لاتے ہیں، اور نقد فروخت کر کے نفع حاصل کرتے ہیں، جو انمیں تقسیم ہوتا ہے، شرکت کی یہ صورت بھی صحیح ہے، شرکت کی یہ قسم صرف امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، ائمہ ثلاثہؒ کے نزدیک یہ شرکت جائز نہیں ہے،

اس شرکت میں بھی ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوتا ہے نفع بقدر ضمان تقسیم ہوگا، اس کے خلاف مقرر کرنا جائز نہیں ہے[1]، خریدے ہوے مال کی قیمت ہر ایک پر اس کے حصہ کے بقدر واجب ہوگی، اگر شروع میں یہ طے کیا کہ جو چیز بھی خریدی جائیگی وہ نصف نصف ہوگی تو ہر ایک چیز کی نصف قیمت واجب ہوگی، اور نفع بھی نصف تقسیم ہوگا، اس کے خلاف کرنا جائز نہیں ہے، اسی طرح نقصان بھی ہر شریک پر اس کے خریداری کے تناسب سے آیگا۔

یہ شرکت کی ابتدائی تین قسمیں تھیں، اب ان میں سے ہر ایک کی دو قسمیں ہیں

۱۔ شرکت المفاوضہ ۲۔ شرکت العنان۔

۱۔ شرکت المفاوضہ :

دو یا زیادہ شریک اس طرح شراکت کریں کہ اپنا مکمل سرمایہ جو کہ برابر سرابر ہو وہ سب اکٹھا کر کے کسی کاروبار میں لگا دیں، ان کا مال حقوق تجارت، عمل و نفع سب بالکل مساوی ہوں، اس شرکت میں ہر شریک دوسرے کا وکیل اور کفیل ہوتا ہے، یہ شرکت نادر پائی جاتی ہے، مثلاً زید اور عمر ہزار ہزار روپے لگا کر سرمایہ کاری کریں، اور ان میں ہر ایک کا نفع نصف نصف ہو، حقوق تجارت بھی برابر ہوں، تو یہ مفاوضہ کہلائے گی، لیکن اگر کسی ایک شخص کے سرمایہ میں ذرا سا بھی اضافہ ہو گیا تو وہ فوراً مفاوضہ سے بدل کر عنان بن جائے گی، ہر شے ء میں مساوات اور برابری برقرار رہنا چونکہ

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، سن۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت ،موسسۃ التاریخ العربی سن۱۴۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، (۵:۱۳۳): الربح بینھما علی قدر الضمان فانشرطا لأحدھما فضل ربح علی حصتہ من الضمان فالشرط باطل ویکون الربح بینھما علی قدر ضمانھما عن المشتری الخ (۶:۶۵)۔

مشکل کام ہے لہذا مفاوضہ کا وجود بہت کم ہوتا ہے، زیادہ تر عنان ہی ہوتا ہے، اس لئے آگے ہماری بحث کا موضوع زیادہ تر عنان ہی ہوگا، اسی لئے مفاوضہ کے بارے میں مزید تفصیل ذکر نہیں کی جائیگی۔

۲۔ شرکت العِنان:

دو یا زیادہ افراد اس طرح شریک ہوں کہ ہر ایک کا سرمایہ عمل، حقوق و نفع مساوی نہ ہوں اسمیں ہر شریک دوسرے کا صرف وکیل ہوتا ہے کفیل نہیں ہوتا، مثال کے طور پر اگر زید اور عمر مل کر شرکت کریں اور زید ایک ہزار روپے کا سرمایہ لگائے اور عمر ڈیڑھ ھزار روپے کا سرمایہ لگائے اور منافع بھی اس تناسب سے طے کرلیں تو یہ شرکتِ عنان کہلائے گی۔[۱]

شرکت المضاربۃ:

دو افراد کا اس طرح شرکت کرنا کہ ایک طرف سے مال ہو، اور دوسرے کی طرف سے عمل، اور نفع میں دونوں شریک ہوں، صاحب مال کو رب المال یا سرمایہ کار کہتے ہیں، جبکہ عمل کرنے والے کو عامل اور مضارب کہتے ہیں، جو مال لگایا جاتا ہے وہ رأس المال (Capital) اور سرمایہ کہلاتا ہے، مثلاً زید اپنا سرمایہ بکر کو دے اور یہ کہے کہ تم اس سرمایہ سے تجارت کرو، اور جو نفع حاصل ہوگا، اس کا نصف نصف ہم دونوں لیں گے، یہ شرکتِ مضاربت ہے، زید رب المال ہوگا، بکر مضارب اور سرمایہ رأس المال کہلائیگا۔[۲]

فقہاءِ مالکیہؒ نے شرکت العقد کی پانچ قسمیں بیان کی ہیں، البتہ بعض مالکیہؒ نے مضاربت کو بھی شرکت العقد میں داخل فرما کر کل چھ قسمیں بیان کی ہیں، شرکت عقد کی پانچ قسمیں یہ ہیں:

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع ،بيروت ،موسسة التاريخ العربی ١٤١٧ھ،ایچ ایم سعید کمپنی:(٦:٥٦)۔

(۲) دیکھئے: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علی بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ،مكتبه امداديه ملتان: المضاربة عقد يقع على الشركة بمال من أحد الجانبين ومراده الشركة فی الربح وهو يستحق بالمال من أحد الجانبين والعمل من الجانب الآخر وكاالمضاربة بدونها۔ (٣:٢٥٥)۔

۱۔مفاوضہ ۲۔عنان ۳۔جبر ۴۔عمل ۵۔ذِمم

فقہاء شافعیہؒ نے شرکتِ عقد کی صرف ایک قسم کو جائز کہا ہے، چنانچہ فرمایا:

,,إن الشركة الجائزة نوع واحد فقط وهي شركة العنان،،
جائز شرکت صرف ایک قسم ہے،اور وہ شرکتِ عنان ہے۔[1]

فقہاء حنابلہ نے شرکتِ العقد کی چار قسمیں بیان کی ہیں:

۱۔ شرکت العنان ۲۔ شرکت الوجوہ ۳۔ شرکت الابدان ۴۔ شرکت المفاوضہ۔[2]

شرکت العقد کے ارکان

رکن لغت کے لحاظ سے کسی شئ کی ماہیت کے ایسے اجزاء کو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ نہ پائے جائیں تو وہ ماہیت باقی نہ رہے۔

شرکت العقد کے ارکان کیا ہیں،اس بارے میں فقہاء امت کی مختلف آراء ہیں:

فقہاء حنفیہؒ کا مسلک یہ ہے کہ شرکت کا صرف ایک رکن ہے،اور وہ عقد کا صیغہ ہے، یعنی ایجاب اور قبول،اس کو متعاقدین (دو عقد کرنے والے شریک) کے درمیان ربط کا نام بھی دیا جاسکتا ہے، کیونکہ اسی ربط کے ذریعہ عقد شرکت کا تحقق ہوتا ہے،اس ایجاب و قبول کے علاوہ بقیہ چیزیں شرکت العقد کی شرائط تو ہیں، لیکن ارکان نہیں ہیں کیونکہ ان کے اوپر شرکت العقد کا وجود موقوف نہیں ہے۔

علامہ بغدادیؒ فرماتے ہیں:

(۱) ملاحظہ فرمائیں: تكملة شرح المهذب للمطيعي (۱۳:۵۰۹)، ومغنى المحتاج للرملي (۲:۲۱۲)۔

(۲) دیکھئے: المغنى لابن قدامة (۵:۳۱)، والكافي لابن قدامة (۲:۲۵۷)۔

,,رکنها الإیجاب والقبول، وهو أن یقول أحدهما: شرکتك فی کذا کذا، ویقول الآخر: قبلت،،[1]

شرکت العقد کا رکن ایجاب اور قبول ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کہے کہ میں نے تمہیں اس اس چیز میں شریک کرلیا، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا۔

مجلۃ الأحکام العدلیۃ میں ذکر کیا گیا ہے کہ:

رکن شرکة العقد إلخ

شرکت العقد کا رکن ایجاب اور قبول ہے، خواہ تلفظ کے ذریعہ ہو یا معنی کے ذریعہ، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہکر ایجاب کرے: میں نے تمہیں اتنے درہم میں لینے اور دینے میں شریک کرلیا، اور دوسرا شخص کہے کہ میں نے قبول کرلیا، یہ لفظی ایجاب اور قبول ہے، اس سے شرکت منعقد ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو ایک ہزار درہم دے اور کہے کہ تم بھی اسمیں دراہم شامل کرلو، اور ان سے مال خرید لو، پھر دوسرے شخص نے اس کے حکم کی تعمیل کی تو شرکت منعقد ہو جائیگی، اسلئے کہ اس نے معنوی طور پر قبول کرلیا ہے[2]، اسی قسم کی بات درمختار میں بھی ذکر کی گئی ہے۔[3]

البتہ فقہاء مالکیہ اور حنابلہ کا مذہب یہ ہے کہ شرکت العقد کے تین ارکان ہیں: ۱۔ صیغہ ۲۔ عاقدین ۳۔ معقود علیہ، یعنی لفظ، دو افراد عقد کرنے والے اور وہ جس پر عقد کیا گیا ہے۔

چنانچہ علامہ دردیرؒ نے ذکر فرمایا:

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: مجمع الضمانات فی مذهب الإمام أبو حنیفةؒ: (۲۹٤)۔

(۲) دیکھئے: مجلة الأحکام العدلیة مع شرح مجلة الأحکام، مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ ۱٤۰۳ھ، (٤: ۱۳۳)۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: الحصکفی، محمد علاء الدین، الدر المختار شرح تنویر الأبصار (٤: ۳۰۵)۔

فأركانها ثلاثة العاقدان، والمعقود عليه هو المال والصيغة۔[(۱)]

اس کے ارکان تین ہیں: عاقدین، معقود علیہ یعنی مال اور صیغۂ ایجاب وقبول۔

اور علامہ بہوتی حنبلیؒ نے یہ ذکر کیا ہے:

وأركانها: عاقد، ومعقود عليه وصيغه[(۲)]

اس کے ارکان یہ ہیں: عقد کرنے والا جس پر عقد کیا جائے اور وہ لفظ جس کے ذریعہ عقد ہو۔

فقہاء شافعیہؒ میں شرکت العقد کے ارکان کے بارے میں دو قول ہیں، بعض کہتے ہیں کہ تین رکن ہیں جبکہ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ پانچ رکن ہیں۔

شوافعؒ میں سے امام نوویؒ کے نزدیک تین ارکان ہیں، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

,,ولها ثلاثة أركان: الأول العاقدان، والثانی الصيغة، والثالث المال المعقود عليه،،[(۳)]

شرکت کے تین رکن ہیں پہلا رکن عاقدان (دو عقد کرنے والے)، دوسرا صیغہ، اور تیسرا وہ مال جس پر عقد کیا جائے۔

اسی طرح شوافعؒ میں سے علامہ رملیؒ کے نزدیک شرکت العقد کے پانچ ارکان ہیں:

---

(۱) اللردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغیر علی اقرب المسالك(۳:۴۵۵)، مصر، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابی الحلبی ۱۳۷٤ھ، (۳:۴۵۷)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الروض المربع (۲:۳۲)۔

(۳) دیکھئے: روضة الطالبين وعمدة المفتين (٤:۲۷۵)۔

ولها خمسة أركان: عاقدان، ومعقود عليه وعمل وصيغة۔ (۱)

شرکت العقد کے پانچ رکن ہیں عاقدین (دو عقد کرنے والے) معقود علیہ (جس پر عقد کیا جائے) عمل اور صیغہ (لفظ ایجاب وقبول)۔

گویا انہوں نے متعاقدین میں سے ہر عاقد کو الگ رکن شمار کیا، اسی طرح عمل کو الگ مستقل رکن قرار دیا، جبکہ ان کے علاوہ فقہاء کرامؒ نے متعاقدین کو ایک رکن قرار دیا ہے، اور عمل کو مال کے تابع بنایا ہے، اس طرح اگر غور کیا جائے تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شافعیہ، حنابلہ اور مالکیہ کے درمیان شرکتِ عقد کے ارکان کی تعداد کے بارے میں جو اختلاف ہے وہ صرف اجمال اور تفصیل کی حیثیت سے ہے، کیونکہ جن حضرات نے ہر عاقد کو الگ رکن قرار دیا، اور معقود علیہ (جس پر عقد کیا گیا ہو) میں مال اور عمل کو الگ الگ رکن مانا، ان کے نزدیک شرکت کے پانچ رکن بن گئے، اور جنہوں نے عاقدین کو ایک رکن اور معقود علیہ کے دونوں جزو یعنی مال اور عمل کو ایک رکن قرار دی ان کے نزدیک کل تین ارکان ہو گئے ہیں، اس بات کی تائید علامہ احمد الصاوی مالکیؒ کے قول سے ہوتی ہے:

فأركانها ثلاثة أى إجمالا، وأما تفصيلا فخمسة، اثنان فى العاقدين، واثنان فى المعقود عليه، والصيغة۔ (۲)

اس کے کل تین ارکان ہیں اجمالی طور پر یا تفصیلی طور پر پانچ ارکان ہیں، دو عاقدین، دو معقود علیہ اور ایک صیغہ۔

لیکن ان تمام باتوں پر غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بظاہر احناف کا قول زیادہ راجح ہے، کیونکہ یہ رکن کے معنی لغوی کے زیادہ قریب ہے، اس وجہ سے کہ ایجاب وقبول ہی ایسے قوی جزو ہیں کہ جن کے بغیر شرکت عقد کا وجود ہی نہیں ہوتا، اور ان کے علاوہ عاقدین اور معقود علیہ اگرچہ شرکتِ عقد کے لئے اہم اور ضروری ہیں، لیکن جس قدر

---

(۱) نهاية المحتاج للرملى (٥:٤)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الدردیر، احمد بن محمد الدرديرى ١٢٠١ھ، الشرح الصغير على اقرب المسالك (٣:٤٥٥)، مصر، شركة مكتبة ومطبعة مصطفى البابى الحلبى ١٣٧٤ھ (٣:٤٥٧)۔

اہمیت ایجاب و قبول کی ہے اتنی اہمیت انکی نہیں، کیونکہ وہ عقد کے اندر داخل نہیں بلکہ خارج ہیں، اور خارج شئے رکن نہیں ہوتی بلکہ شرط ہوتی ہے، لہذا بہت سے فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ متعاقدین اور معقود علیہ شرکت العقد کی شرائط میں سے ہیں، چنانچہ علامہ رملیؒ فرماتے ہیں:

,,وإن الفاعل إنما جعل ركنا في البيع نظرا للعقد المرتب ووجوده عليه كالمعقود عليه، ولكن التحقيق أنهما شرطان لأنهما خارجان عن العقد،،[1]

فاعل کو بیع کے اندر رکن بنایا گیا ہے اس پر مرتب عقد کو، اور اس کے وجود کو دیکھتے ہوئے، جسطرح معقود علیہ کو بھی رکن بنایا گیا، لیکن تحقیق یہ ہے کہ یہ شرط ہیں، اس لئے کہ یہ عقد سے خارج ہیں۔

شرکت العقد کا رکن ایجاب و قبول

یہ بات گذشتہ صفحات میں ذکر کی جاچکی ہے کہ احناف کے نزدیک شرکت العقد کا رکن ایجاب و قبول ہے، ذیل میں ایجاب و قبول کے لغوی و اصطلاحی مفہوم ذکر کیا جائیگا۔

ایجاب کے لغوی معنی:

,,القاموس الفقہی لغۃً واصطلاحاً،، میں ایجاب کے لغوی معنی یہ ذکر کئے گئے ہیں:

,,الإثبات لأيّ شيء كان وهو نقيض السلب، ولقد سمّي الإيجاب لكون الموجب بإيجابه يثبت للآخر حق القبول،،۔[2]

---

(۱) نهاية المحتاج للرملي (۱:۴۳)۔

(۲) القاموس الفقهي لغةً واصطلاحاً (۲: ۳۷)۔

کسی بھی شئے کا اثبات، اور یہ نہ ہونے کی ضد ہے، اور اسکا نام ایجاب اسلئے رکھا گیا ہے کہ ایجاب کرنے والا ایجاب کے ذریعہ دوسرے شخص کے لئے قبول کا حق ثابت کر دیتا ہے۔

ایجاب کے اصطلاحی معنیٰ:

مجلۃ الأحکام العدلیۃ میں ایجاب کی تعریف یوں کی گئی ہے:

,,الإیجاب أوّل کلام یصدر من أحد المتعاقدین لأجل إنشاء التصرف، وبھا یوجب ویثبت التصرف،،۔[۱]

ایجاب وہ پہلا کلام ہے جو کسی معاملے کے دو فریقوں میں سے کسی ایک سے صادر ہو، تاکہ کسی قسم کے تصرف کو پیدا کیا جاسکے، اس کلام کے ذریعہ ایجاب ہوگا اور تصرف ثابت ہوگا۔

اس سے ملتی جلتی بات درّ مختار میں ذکر کی گئی ہے:

,,الإیجاب ھو ما یذکر أولا من کلام أحد المتعاقدین المراد ھھنا إثبات الفعل الخاص الدّال علی الرضاء الواقع أولا،،۔[۲]

ایجاب وہ ہے جو دو عقد کرنے والوں میں سے کسی ایک کا پہلا کلام ہو، اور علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں: اس سے مراد کسی خاص فعل کا اثبات ہے جو ابتدائی رضامندی پر دلالت کرے۔

---

(۱) مجلۃ الأحکام العدلیۃ مع شرح مجلۃ الأحکام، مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ ۱۴۰۳ھ (۴:۱۰۱)۔

(۲) الحصکفی، محمدعلاء الدین، الدر المختار شرح تنویر البصار، و الشامی، محمد امین الشھیر بابن عابدین، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی (۴:۵۰۶)۔

قبول کے لغوی معنی:

لغت کے لحاظ سے قبول کے معنی رضا مندی، یا کسی چیز کی طرف نفس کے میلان کے ہیں۔ [(۱)]

قبول کے اصطلاحی معنی:

مجلۃ الأحکام العدلیۃ میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ:

,, القبول ثاني كلام يصدر من أحد المتعاقدين لأجل إنشاء التصرف، وبه يتمّ العقد،،۔ [(۲)]

قبول دو عقد کرنے والوں کا دوسرا کلام ہے، تاکہ تصرف کو پیدا کیا جاسکے، اور اس کے ذریعہ عقد مکمل ہو جاتا ہے۔

درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام میں یہ بات اور تفصیل سے ذکر کی گئی ہے:

جو کلام بھی ایجاب کے بعد کسی تصرف کے پیدا کرنے کے لئے آئے اور اس سے مقصود عقد مکمل کرنا ہو وہ قبول کہلاتا ہے، خواہ وہ کلام خریدار کی طرف سے ہو یا فروخت کرنے والے کی جانب سے، چنانچہ اگر بائع کہے کہ میں نے اپنا یہ مال اتنے روپے میں تمہیں فروخت کردیا اور خریدار کہے کہ میں نے خرید لیا، یا خریدار یوں کہے کہ میں نے تمہارا فلاں مال اتنے میں خریدا اور اس کے جواب میں بائع کہے کہ میں نے فروخت کردیا تو پہلی صورت میں خریدار کا قول قبول ہوگا، اور دوسری صورت میں بائع کا قول قبول ہوگا۔ [(۳)]

اب تک جو بات ذکر کی گئی وہ مطلقاً ایجاب اور قبول کے مفہوم کے بارے میں تھی، البتہ یہ مسئلہ کہ شرکت العقد

---

(۱) القاموس الفقهي لغة واصطلاحا۔

(۲) مجلة الأحكام العدلية مع شرح مجلة الأحكام، مكتبه اسلاميه، كوئٹه ۱۴۰۳ھ (۲:۴ ۱۰)۔

(۳) درر الحكام شرح مجلة الأحكام (۱:۱ ۹)۔

میں ایجاب وقبول کا کیا طریقہ ہے؟ تو اس کی تفصیل یہ ہے کہ شرکت العقد میں ایجاب اور قبول یا تو لفظی ہوگا یا معنوی، لفظی کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے آدمی سے یوں کہے کہ میں نے تم کو اتنے روپے کے لین دین میں شریک بنالیا، اور دوسرا آدمی یہ کہے کہ میں نے قبول کیا، یہ ایجاب اور قبول لفظی ہے، اور معنوی کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص یوں کہے کہ یہ ایک ہزار روپے تم رکھ لو اور اپنے پاس سے اس میں ایک ہزار اور ملالو، اور پھر کل مال سے کوئی شئے خرید کر تجارت کرلو، دوسرے آدمی نے لفظی طور پر جواب دینے کے بجائے اس کے حکم کی تعمیل کی، یہ ایجاب وقبول معنوی کہلائے گا۔[1]

ایجاب وقبول کا صیغہ اور لفظ:

علامہ علاء الدین کاسانیؒ "بدائع الصنائع" میں فرماتے ہیں:

> ایجاب اور قبول بعض اوقات ماضی کے صیغہ سے اور بعض اوقات حال کے صیغے سے ہوتا ہے، ماضی کے صیغہ سے ہونے کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے میں نے بیچ دیا اور خریدار کہے کہ میں نے خرید لیا، ان صیغوں کو بولنے سے عقد کا رکن ایجاب وقبول مکمل ہوگیا، یہ الفاظ اگرچہ ماضی کے ہیں لیکن اہلِ لغت کے نزدیک مؤثر زمانہ حال میں ہوتے ہیں، اور عرف اور شریعت میں بھی اصل وضع کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔

بعض اوقات حال کے صیغوں سے بھی ایجاب وقبول ہوتا ہے، اسکی مثال یہ ہے کہ بائع (فروخت کرنے والا) خریدار سے کہے میں یہ چیز تم کو اتنے میں بیچتا ہوں، اور اس سے مراد ایجاب ہو پھر مشتری کہے کہ میں نے خرید لی، یا میں یہ چیز تم سے خریدتا ہوں، تو اس صورت میں بھی رکن ایجاب وقبول مکمل ہوجائے گا، اور بیع منعقد ہوجائے گی۔[2]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن نجیم فی البحر الرائق (۱۸۸:۵)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت موسسۃ التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، (۱۳۳:۵)۔

ایجاب و قبول مستقبل کے لفظ سے نہیں ہو سکتا، مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں یہ چیز تمہیں بیچوں گا اور خریدار کہے کہ میں خریدوں گا تو یہ صحیح نہیں ہے، اس سے بیع کا وعدہ تو ہوگا، لیکن بیع منعقد نہیں ہوگی۔

اس بارے میں بھی فقہاء کرامؒ کا اتفاق ہے کہ استفہام کے صیغہ سے ایجاب و قبول منعقد نہیں ہوگا، مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہدے کہ کیا تم مجھ سے یہ چیز اتنے میں خریدتے ہو؟ یا یوں کہدے کہ کیا تم نے یہ شئے اتنے میں فروخت کردی؟ اور بائع اس کے جواب میں کہدے کہ میں نے فروخت کردی، تو اس وقت تک بیع منعقد نہیں ہوگی جب تک پھر مشتری یہ نہ کہدے کہ میں نے خرید لی۔

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا امر کے صیغہ سے بیع منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں؟ .مثال کے طور پر اگر خریدار بائع سے کہے اپنا غلام مجھے فروخت کردو، اور بائع یہ کہدے کہ میں نے فروخت کیا تو فقہاء کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت تک بیع منعقد نہیں ہوگی جب تک خریدار یہ نہ کہدے کہ میں نے خرید لیا، اسی طرح اگر بائع خریدار سے یہ کہے کہ مجھ سے یہ چیز خرید لو، اور پھر خریدار کہے کہ میں نے خرید لی تو بیع اسوقت تک منعقد نہیں ہوگی جب تک بائع یہ نہ کہدے میں نے فروخت کیا۔ (۱)

اگرچہ مندرجہ بالا تفصیل جو علامہ کاسانیؒ نے بیان کی ہے خرید و فروخت ایجاب و قبول کے بارے میں تھی، لیکن یہی تفصیل شرکت کے اندر بھی جاری ہوگی، کیونکہ شرکت بھی بیع و شراء (خرید و فروخت) کی طرح ایک عقد ہے۔

لہٰذا اگر کوئی شخص دوسرے سے یہ کہے کہ میں نے تمھارے ساتھ شرکت کی، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا، تو شرکت منعقد ہو جائیگی، اسی طرح اگر حال کا صیغہ استعمال کیا اور کہا کہ میں تمہیں شریک بناتا ہوں اور دوسرا کہدے کہ میں نے قبول کیا تو صحیح ہے، البتہ اگر استفہام کا صیغہ استعمال کر کے کہا کہ کیا تم مجھے شریک کرتے ہو؟ اور دوسرا شخص کہے کہ میں نے شریک کیا تو شرکت منعقد نہیں ہوگی تاوقتیکہ دوسرا شخص یہ نہ کہدے کہ میں نے قبول کیا۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسۃ التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، (۱۳۳:۵)

اسی طرح اگر کسی نے امر کا صیغہ استعمال کر کے کہا کہ تم مجھے شریک بنالو، اور دوسرے نے کہا کہ میں نے شریک بنالیا، تو اس وقت تک شرکت منعقد نہ ہوگی جب تک پہلا یوں نہ کہدے کہ میں نے قبول کیا۔

مذکورہ بالا مذہب فقہاء احناف کا تھا، البتہ مالکیہ مذہب یہ ہے کہ علامہ حطاب مالکیؒ فرماتے ہیں:

,,وليس للإيجاب والقبول لفظ معين، وكل فهم منها الإيجاب والقبول، لزم به البيع وسائر العقود إلا أنّ في الألفاظ ما هو صريح مثل بعتك بكذا، فيقول: قبلت، أوابتعت منك، فيقول: بعت، فهذا يلزمهما، وأما ألفاظ المحتملة فلا يلزم البيع بمجردها، حتى يتنزل بها عرف أو عادة، أو ما يدل على البيع مثل أن يقول المبتاع: بكم؟ فيقول البائع: بدينار، فيقول: قبلت،،۔ [۱]

ایجاب اور قبول کے لئے کوئی متعین لفظ نہیں ہے، ہر وہ لفظ جس سے ایجاب و قبول سمجھ میں آتا ہو ان سے بیع اور تمام عقود (معاملات) لازم ہو جاتے ہیں، پھر ان میں جو الفاظ بالکل صریح ہیں مثلاً میں نے تمہیں یہ اتنے کا فروخت کیا، اور دوسرا کہے کہ میں نے قبول کیا، یا خریدار کہے کہ میں نے خریدا، اور بائع جواب میں کہے کہ میں نے بیچ دیا، تو ان سے بیع لازم ہو جائیگی، البتہ جو ایسے الفاظ ہیں جو بالکل صریح نہیں ہیں بلکہ دوسرے معنی کا احتمال بھی رکھتے ہیں، تو صرف ان الفاظ سے بیع لازم نہیں ہوگی، یہاں تک کہ کوئی عرف یا عادت ایسی بن جائے جس سے خرید و فروخت ہونے لگے، مثلاً خریدا کہے یہ کتنے کا ہے؟ اور فروخت کرنے والا کہے کہ ایک روپے کا، پھر خریدار کہے کہ میں نے قبول کیا۔ (تو بیع منعقد ہو جائیگی)۔

اور الشرح الصغیر میں علامہ دردیرؒ فرماتے ہیں:

---

(۱) مواهب الجليل للعلامة الحطاب (۲۲۹:٤)۔

,,وما دلّ على الرضاء من قول أو إشارة أو كتابة من الجانبين أو أحدهما

اى أنه ينعقد به العقد،،۔[۱]

اور ہر وہ قول یا اشارہ یا تحریر جانبین میں سے کسی ایک یا دونوں کی طرف سے ہو جو

رضامندی پر دلالت کرے اس سے بیع منعقد ہو جائیگی۔

خلاصہ یہ کہ مالکیہ کے نزدیک ایجاب وقبول ہی عقد کے انعقاد کے لئے معیار ہے، خواہ اس کا مفہوم لفظ ,,فعل،، اشارہ یا تحریر کے ذریعہ ادا ہو۔[۲]

البتہ فقہاء شافعیہؒ شرکت کے انعقاد میں اسے لفظ کے بولنے کو ضروری سمجھتے ہیں جس سے تجارت یا تصرف کرنے کی اجازت ظاہر ہوتی ہو، سوائے تحریر اور گونگے شخص کے ایسے اشارہ کے جو لفظ کی مانند ہو، وہ بھی شوافع کے یہاں عقد شرکت کے منعقد ہونے میں معتبر ہے، چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

,,الثانى الصيغة، ولا بد من لفظ يدل على الإذن فى التجارة والتصرف،،۔

دوسرا صیغہ ہے اور ایسے لفظ کا موجود ہونا ضروری ہے جو تجارت اور تصرف میں

اجازت ظاہر کرتا ہو۔[۳]

یہی بات علامہ رملیؒ نے بھی فرمائی ہے:

,,ويشترط فيها لفظ صريح من كل للآخر يدل على الإذن للمتصرف من

كل منهما، أو من أحدهما فى التصرف، أى التجارة بالبيع والشراء،

وكاللفظ الكتابة وإشارة الأخرس المفهمة،،۔[۴]

(۱) الدردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ء، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک، مصر، شرکۃ مکتبۃ ومطبعۃ مصطفی البابی الحلبی ۱۳۷۴ء (۴۱:۳)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: شرح الخرشی علی مختصر الخلیل (۵:۵)۔

(۳) روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتیین (۲۷۵:۴)۔

(۴) نہایۃ المحتاج للرملی (۴:۵)۔

اس میں دونوں طرف سے ایسا صریح لفظ ہونا ضروری ہے جس سے دونوں یا ایک تصرف کرنے والوں کے لئے اجازت ظاہر ہو، یعنی خرید و فروخت کے ذریعہ تجارت کرنے کی اجازت، لفظ تحریر یا گونگے کا سمجھ میں آنے والا اشارہ ضروری ہے۔

فقہاء حنابلہؒ کا مسلک ایجاب و قبول کے بارے میں بالکل وہی ہے جو احناف کا ہے، البتہ ایک روایت سے یہ اضافہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک امر کے صیغہ سے بھی ایجاب و قبول ہو جاتا ہے بشرطیکہ ایجاب سے پہلے قبول ذکر کیا جائے۔[1]

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

,,إنها تنعقد بكل ما دل على مقصودها، من قول أو فعل، فكل ما عدّه الناس بيعا وإجارة فهو بيع وإجارة، وإن اختلف اصطلاح الناس فى الألفاظ والأفعال انعقد العقد عند كل قوم بما يفهمونه بينهم من الصيغ والأفعال، ليس لذلك حد مستمر لا فى شرع ولا فى لغة، بل يتنوع بنوع اصطلاح الناس كما تتنوع لغاتهم،،۔[2]

ایجاب و قبول ہر ایسے قول یا فعل سے منعقد ہو جاتا ہے جو مقصود بیان کر دے، ہر وہ عقد جسے لوگ بیع یا اجارہ کہنے لگیں وہی بیع اور اجارہ بن جائیگا اگرچہ مختلف جگہوں میں الفاظ اور اصطلاحات میں اختلاف ہو، لہذا عقد ہر ایسے لفظ سے منعقد ہو جائیگا جس سے اس زمانہ کے لوگ جو مراد لیتے ہو، اس کے لئے کوئی مخصوص تعریف نہ شریعت میں ہے اور نہ ہی لغت میں، بلکہ یہ لوگوں کی اصطلاح کے مطابق بدلتا رہتا ہے، جس طرح لغات بدلتی رہتی ہیں۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الكافى لابن قدامه (۳:۳)۔

(۲) مجموع الفتاوىٰ لابن تيميه (۲۹:۷)۔

مذکورہ بالا تمام اختلافات اور مذاہب کی روشنی میں خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ ایجاب و قبول میں دو باتیں قابل غور ہیں۔

ایجاب و قبول کا صیغہ کیا ہونا چاہئے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ماضی اور حال کے صیغہ سے اگر ایجاب و قبول کیا جائے تو بالاتفاق عقد صحیح ہو جائیگا، البتہ صیغۂ استقبال سے احناف کے نزدیک تو منعقد نہیں ہوگا، البتہ مالکیہ کے نزدیک عرف کا اعتبار ہوگا، اور شوافع کے نزدیک مطلقاً منعقد ہو جائے گا، اور حنابلہ کی دو روایتیں ہیں، ایک سے جواز اور دوسرے سے ناجائز ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ کہ آیا ایجاب و قبول کے لئے لفظ ضروری ہے یا غیر لفظ مثلاً معنی تحریر، اشارہ وغیرہ سے بھی ایجاب و قبول ہو سکتا ہے؟

اس بارے میں مذاہب کا خلاصہ یہ ہے کہ مالکیہؒ کے نزدیک معیار ایجاب و قبول کا قابل فہم ہونا ہے، خواہ وہ کسی بھی طرح ہو اشارہ، کتابت، معنی یا لفظ سے، البتہ جمہور کے نزدیک اشارہ سے ایجاب و قبول نہیں ہو سکتا اِلا یہ کہ کوئی حاجت ہو مثلاً گونگا آدمی اشارہ سے ایجاب و قبول کر سکتا ہے۔ البتہ کتابت اور تحریر کے ذریعہ بالاتفاق ایجاب و قبول منعقد ہو جاتا ہے، اس لئے کہ وہ خطاب کرنے اور بولنے کے قائم مقام ہے، البتہ فعل سے، سوائے امام شافعیؒ کے سب کے نزدیک ایجاب و قبول منعقد ہو جاتا ہے۔

سرمایہ کی فراہمی

شرکت الأموال کے اندر سرمایہ کی فراہمی کی شرائط۔

فقہاء کرامؒ نے شرکت الأموال کے سرمایہ کیلئے کچھ شرائط بیان کی ہیں، جنہیں ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ سرمایہ متعین اور حاضر ہونا چاہیے:

پہلی شرط یہ ہے کہ شرکت العقد میں بوقتِ عقد سرمایہ متعین اور حاضر ہونا چاہیے، لیکن اس شرط کے ضروری ہونے پر تمام فقہاء متفق نہیں ہیں، ذیل میں ائمہ اربعہ کے مذاہب اس مسئلہ کے بارے میں بیان کئے جاتے ہیں:

احناف کا مذہب:

شرکت کیلئے سرمایہ کا عقد کے وقت معین اور موجود ہونا تو ضروری نہیں ہے البتہ خریداری یا تجارت کی ابتدا میں متعین اور موجود ہونا ضروری ہے۔

علامہ کاسانیؒ بدائع الصنائع میں اس مسئلہ کے بارے میں فرماتے ہیں:

,,ومنها: أن يكون رأس مال الشركة عينا حاضرة لا دينا ولا مالا غائبا، فإن كان غائبا لا تجوز عنانا كانت أو مفاوضه، لأن المقصود من الشركة الربح وذلك بواسطة التصرف، ولا يمكن في الدين ولا المال الغائب فلا يحصل المقصود، وإنما يشترط الحضور عند الشراء لا عند العقد، لأن عقد الشركة يتم بالشراء، فيعتبر الحضور عنده، حتى لو دفع إلى رجل ألف درهم، فقال له: اخرج مثلها واشتر بهما، وبع، فما ربحت يكون بيننا، فأقام المامور البينة أنه فعل جاز، وإن لم يكن المال حاضرا من الجانبين عند

العقد لما کان حاضرا عند الشراء،،۔[1]

ان شرطوں میں سے ایک یہ ہے کہ شرکت کا مال معین اور حاضر ہونا چاہئے، قرض اور غائب نہ ہونا چاہئے، لہذا اگر غائب ہوا تو جائز نہیں خواہ شرکتِ عنان ہو یا مفاوضہ، اس لئے کہ مقصود شرکت سے نفع کمانا ہے، اور وہ تصرف کر کے ہی کمایا جاسکتا ہے، لہذا اگر مال واجب الاداء یا قرض ہو یا موجود نہ ہو تو اس مال میں تصرف کیسے کیا جاسکتا ہے؟ اور بغیر تصرف کے نفع کا حصول ممکن نہیں ہے، لہذا مقصود حاصل نہ ہوگا، البتہ سرمایہ کی موجودگی عقد کے وقت ضروری نہیں ہے، بلکہ خریداری کے وقت موجود ہونا چاہیے، چنانچہ اگر کسی شخص نے دوسرے آدمی کو ایک ہزار روپے دیئے اور اس سے کہا کہ اتنے ہی پیسے تم بھی ملالو اور پھر اس مجموعہ کا جو نفع ہوگا وہ ہم باہم تقسیم کرلیں گے، چنانچہ دوسرے آدمی نے اس کی تعمیل کر کے اس پر گواہ بنالئے، تو یہ شرکت جائز ہوگی اگرچہ مال دونوں طرف سے وقتِ عقد موجود نہیں تھا، لیکن چونکہ خریداری کے وقت موجود ہوگیا لہذا شرکت جائز ہوگئی۔

مالکیہ کا مذہب:

فقہاء مالکیہؒ کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ سرمایہ کو عقد کے وقت بھی موجود ہونا ضروری ہے، لہذا اگر دونوں طرف سے مال موجود نہ ہو بلکہ ایک طرف سے مال آجائے اور دوسری جانب سے مال نہ آئے تو شرکت کی صحت کیلئے دو شرطیں ضروری ہونگی، ورنہ شرکت صحیح نہ ہوگی اور وہ شرطیں یہ ہیں:

ا۔ دونوں شریک اس وقت تک کام شروع نہ کریں جب تک غائب مال نہ آجائے۔

۲۔ غائب مال بہت دور نہیں ہونا چاہیے، بعض مالکیہ نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ وہ دو دن کے اندر اندر آسکے،

---

(۱) الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، (۶۰:۶)، و الحصکفی ، محمدعلاء الدین ، الدر المختار شرح تنویر البصار (۳۱۱:۴)۔

اور بعض نے یہ کہا کہ زیادہ سے زیادہ اسکی آمد میں دس روز لگیں۔ [1]

حنابلہ اور شوافع کا مذہب:

فقہاء حنابلہؒ اور شوافعؒ کے یہاں مال کا معین اور موجود ہونا بوقت عقد ضروری ہے، چنانچہ اگر مال موجود نہ ہو، یا واجب الاداء یا قرض ہو تو بغیر کسی قید اور شرط کے شرکت ناجائز ہوگی۔

اور شوافع اور حنابلہ کے نزدیک اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ شرکت کے اندر جانبین کے مال کے مخلوط ہونے کی شرط لگاتے ہیں، اور مال اسی صورت میں مخلوط ہو سکتا ہے جب وہ حاضر ہو، لہذا بوقتِ عقد مال کا موجود ہونا ضروری ہے۔ [2]

یہ سرمایہ کے موجود ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں تمام مذاہب کا خلاصہ تھا، البتہ تمام مذاہب میں راجح مذہب احناف کا ہی ہے، کیونکہ شرکت کا مقصد دو مالوں کے درمیان تصرف کر کے منافع کمانا ہے، لہذا عقد کے وقت دونوں مالوں کا موجود ہونا ضروری نہ ہوا بلکہ تصرف کے وقت یعنی خرید و فروخت کے وقت بھی اگر کم از کم ایک فریق کا مال موجود ہو تو وہ بھی کافی ہے۔

۲۔ سرمایہ کا معلوم ہونا:

سرمائے کی مقدار کا معلوم ہونا بھی فقہاء کرام کے نزدیک شرکت کے عقد کے لئے ضروری ہے، لیکن اس بارے میں اختلاف ہے کہ وہ مقدار کا علم آیا وقتِ عقد ضروری ہے یا خریداری اور تجارت کی ابتدا کے وقت؟

احناف کا مذہب اس بارے میں یہ ہے کہ سرمایہ کی مقدار کا متعین ہونا عقد کے وقت ضروری نہیں بلکہ تصرف خریداری یا تجارت کی ابتداء کے وقت ضروری ہے، شوافع کے مذہب کا ایک قول بھی اس کے مطابق ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الخرشي على مختصر الخليل (٤٢:٦) حاشية الدسوقي (٣٥٠:٣)۔

(۲) دیکھئے: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)،المغنی، مكتبة الرياض السعودية ١٤٠٣ھ (١٩:٥)، نجیب ، محمد نجیب المطيع، تكمله المجموع شرح المهذب ، مطبعة الإمام، مصر(٥١٠:١٣)۔

علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

,,أما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد ليس بشرط لجواز الشركة بالأموال عندنا، لأن الجهالة لا تمنع جواز العقد بل لافضائها إلى المنازعة، وجهالة رأس المال وقت العقد لا تفضى إلى المنازعة، لأنه يعلم مقداره ظاهرا أو غائبا، لأن الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء، فيعلم مقدارها فلا تؤدى إلى جهالة مقدارالربح وقت القسمة،،۔[1]

شرکت کے جواز کے لئے راس المال کی مقدار کا علم عقد کے وقت شرط نہیں ہے، اس لئے کہ علم نہ ہونا وہ عقد کیلئے مضر ہوتا ہے، جس کی وجہ سے نزاع کا امکان ہو، اور بوقت عقد سرمایہ کا معلوم نہ ہونا نزاع کا باعث نہیں ہوتا، کیونکہ خریداری اور تجارت کے وقت قیمت کی ادائیگی کے وقت عموماً دراہم اور دیناروں کو وزن کرلیا جاتا ہے، اور اس طرح مقدار بھی معلوم ہو جاتی ہے، لہذا مقدار معلوم نہ ہونے سے منافع کی تقسیم کے وقت نزاع پیدا نہیں ہوتا، لہذا بوقتِ عقد مقدار معلوم ہونا ضروری نہیں ہے۔

البتہ فقہاء مالکیہ اور حنابلہؒ کے نزدیک سرمایہ کی مقدار کا علم بوقت عقد ضروری ہے، اور شوافع کا دوسرا قول بھی اس کے مطابق ہے۔[2]

۳۔ سرمایہ کا مخلوط ہونا:

فقہاء کرام کے نزدیک اس بارے میں اختلاف ہے کہ عقد کے وقت شرکت میں سرمائے کا مخلوط ہونا ضروری ہے

(۱) . الكاسانى،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع، بيروت ،موسسة التاريخ العربى ۱۴۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، و فى نهاية المحتاج للرملى (۵:۸)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: نهاية المحتاج للرملى (۵:۸)، ا بن قدامة المقدسى(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)،المغنى، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ(۵:۱۹)، حاشية الدسوقى (۳:۵۱۹)۔

یا نہیں؟اس بارے میں مذاہب کی تفصیل درج ذیل ہے:

احناف کا مذہب:

عقدِ شرکت میں سرمائے کا مخلوط ہونا شرط اور ضروری نہیں ہے، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جن اشیاء میں وکالت جائز ہوتی ہے ان میں شرکت بھی جائز ہوتی ہے، اور وکالت کے جواز کے لئے سرمایہ کے مخلوط ہونے کی شرط نہیں ہے۔

لہذا اگر سرمایہ میں دونوں طرف سے مال الگ الگ جنس کے ہوں تو بھی شرکت صحیح ہے، مثلاً اگر ایک آدمی کے درہم اور دوسرے کے دینار ہوں، یا ایک کے نقد ہوں دوسرے کی ریزگاری ہو، یا ایک کے پیسے نئے اور دوسرے کے پرانے ہوں، تو ان تمام صورتوں میں شرکت صحیح رہے گی، اور اگر منافع ہوا تو دونوں نفع میں شریک ہوں گے، اسی طرح اگر خسارہ ہوا تو اس میں بھی دونوں شریک ہوں گے۔

شوافع کا مذہب:

شرکت الاموال اس وقت صحیح ہوتی ہے، جب دونوں طرف سے سرمایہ کو اس طرح مخلوط کر دیا جائے کہ آپس میں امتیاز باقی نہ رہے، اور یہ اختلاط بوقتِ عقد یا کم از کم کسی بھی تصرف سے پہلے ہونا چاہیے، لہذا اگر دونوں سرمایہ کو اس طرح مخلوط کیا گیا کہ دونوں میں امتیاز کا امکان باقی ہو جیسے ایک طرف سے درہم دئے جائیں اور دوسری جانب سے دینار یا کسی صفت کے ذریعہ جانبین کے سرمائے کی پہچان ہو سکے تو صحیح نہ ہوگا۔[1]

مالکیہ کا مذہب:

شرکت کے عقد میں سرمایہ کے مخلوط ہونے کی شرط تو نہیں ہے، البتہ اس کے ضمان (Risk) میں داخل ہونے کے لئے شرط ہے کہ مال مخلوط کر دیا جائے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دو افراد کوئی شرکت کا کاروبار کریں، اور اپنا اپنا سرمایہ مخلوط نہ کریں تو شرکت جائز تو ہو گی البتہ اگر کسی ایک کا مال ہلاک ہو جائے تو دوسرے پر اس کا تاوان نہ آئے گا، بلکہ مکمل نقصان اسی کا سمجھا جائے گا جس کا وہ مال تھا، لیکن اگر اس مال کو مخلوط کر دیا جائے اور پھر اس میں سے کچھ ہلاک

(۱) ملاحظہ فرمائیں: مغني المحتاج للشربيني (۲:۲۱٤)، روضة الطالبين للنووي (٤:۲۷۷)۔

ہو جائے تو اس صورت میں نقصان دونوں کا سمجھا جائے گا۔ (۱)

سرمایہ مخلوط ہونے کے بارے میں مزید تفصیل تیسرے باب میں (انشاءاللہ) آگے ذکر کی جائے گی۔

حنابلہ کا مذہب:

شرکت کے جائز ہونے کے لئے سرمایہ کا مخلوط ہونا تو ضروری نہیں ہے، البتہ اسکا متعین اور حاضر ہونا ضروری ہے۔ (۲)

مال شرکت شرکاء کے پاس امانت ہوتا ہے، اور ہر شریک اس مال میں امین (امانتدار) ہوتا ہے۔

سرمایہ نقد ہونا ضروری نہیں ہے:

اگر سرمایہ نقدی میں نہ ہو بلکہ سامان ہو تو اس طرح شراکت کی جائے کہ ایک فریق دوسرے سے کہے کہ میں نے اپنے سامان کا ایک چوتھائی تمہارے سامان کے تین چوتھائی سے بدلا، پھر اس مشترکہ مال کو سرمایۂ شرکت بنالیا جائے، لوگوں کے ذمہ جو قرض ہو اسے وصول کرے بغیر سرمایۂ شرکت نہیں بنا سکتے، اسکے بارے میں مزید تفصیل تیسرے باب میں (انشاءاللہ) آگے ذکر کی جائے گی۔ (۳)

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الخطاب، المواهب شرح مختصر خليل، دارصادر،بيروت: (۲۵:۵)۱، الشرح الكبير للدردير مع حاشية الدسوقي ،دارالفكر بيروت: وما ابتيع بغيره فبينهما فانه صريح في الصحة مع انتفاء الخلط ، فليكن شرطاً في الضمان المفهوم من اللزوم اى ضمان المالين منهما ان خلطاهما حسا ۔۔۔۔۔ ولو حكماً۔ (قوله:فليكن الخ) انها بعد لزومها بالعقد يكون ضمان كل مال من صاحبه قبل الخلط فان وقع الخلط ولو حكماً فالضمان منهما فاذا اشترى احدهما بماله قبل الخلط فهو بينهما لانها لزمت و ما ضاع فهو من صاحبه۔ (۴۹:۳)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں:ابن قدامة المقدسي(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)،المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ (۲۰:۵)۔

(۳) ملاحظہ ہو: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) على بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، مكتبه امداديه ملتان ومجلة الأحكام العدلية مع شرح مجلة الأحكام، مكتبه اسلاميه ،كوئٹه ۱٤۰۳ھ۔

شرکت العقد کی عمومی شرائط

دوسرے معاملات کے صحیح ہونے کیلئے جو عمومی شرائط ہوتی ہیں وہی شرائط شرکت العقد کے صحیح ہونے کے لئے بھی ہیں جنہیں مختصراً ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱۔ متعاقدین، معاملہ طے کرنے والے دو افراد۔

۲۔ متعاقدین کی اہلیت، متعاقدین کے درمیان اہلیتِ تجارت ہونا بھی شرط ہے، اور وہ اہلیت یہ ہے کہ متعاقدین عاقل، بالغ اور آزاد ہوں۔

۳۔ معقود علیہ کا ہونا، جس چیز پر عقد کیا جا رہا ہے وہ موجود ہو، یعنی قیمت اور شئے۔

شرکت العقد کی خصوصی شرائط

فقہاء کرامؒ نے خاص طور پر شرکت العقد کے لئے کچھ شرائط ذکر فرمائی ہیں جنہیں ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

۱:۔ وکالت کے قابل ہونا:

وکالت کے قابل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شرکاء میں سے ہر شریک وکیل بننے یا وکیل بنانے کے قابل ہو، اسکی ضرورت اسلئے ہے کہ شرکاء میں سے ہر ایک شریک تجارت، صنعتکاری وغیرہ میں شرکت کر کے نفع کماتا ہے، لہذا دونوں شرکاء میں سے جو کوئی بھی مشترکہ مال میں تصرف کرے گا اسمیں دوسرے شریک کا حصہ ہوگا، لہذا جب تک اس دوسرے شریک کی جانب سے اس میں تصرفات مثلاً خرید و فروخت وغیرہ کی اجازت اور توکیل نہ ہو، وہ اس میں تصرف کیسے کر سکتا ہے؟ اور بغیر تصرف کے تجارت نہیں کر سکتا، لہذا ہر شریک دوسرے کا وکیل ہوگا۔

اسی وجہ سے شرکت کی متعدد اقسام میں نہ صرف وکالت داخل ہے، بلکہ شرکت کی ان اقسام کی اساس اور بنیاد ہی

وکالت پر ہے۔[۱]

اوپر جو شرط ذکر کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ متعاقدین کے اندر وکیل بننے کی صلاحیت ہو، اس کے علاوہ احناف کے نزدیک ایک شرط یہ بھی ہے کہ معقود علیہ (جس چیز پر عقد کیا جائے) بھی وکالت کی صلاحیت رکھے، لہٰذا ایسی اشیاء میں شرکت نہیں ہوسکتی جو وکالت کی صلاحیت نہ رکھیں، مثلاً مباح چیزیں جیسے لکڑی جمع کرنے میں شرکت یا گھاس کاٹنے میں شرکت یا مباح علاقوں سے پھل توڑنے کے عمل میں شرکت وغیرہ وکالت کی صلاحیت نہیں رکھتیں، لہٰذا ان چیزوں میں وکیل بنانا موکل کے لئے صحیح نہیں ہے، کیونکہ وکالت کا مفہوم یہ ہے کہ وکالت کے ذریعہ وکیل ایسی چیز پر اختیار حاصل کرتا ہے جو پہلے سے اس کے لئے مباح نہ ہو مثلاً کسی کو اپنا مال فروخت کرنے کا وکیل بنانا، اسمیں وکیل کو موکل کا مال فروخت کرنے کی اجازت اسے وکیل بنانے کے بعد ہوئی ہے، اسے پہلے یہ اختیار نہ تھا کہ وہ اپنے موکل کا مال فروخت کردے، جبکہ لکڑی جمع کرنے اور گھاس کاٹنے وغیرہ کے کام پر وکیل بغیر موکل کے حکم کے بھی اختیار رکھتا ہے، لہٰذا ایسی چیزوں میں وکالت اور نیابت کی ضرورت ہی نہیں، وہ وکیل خود ہی ان اشیاء کا مالک بن جائے گا، اور مؤکل مالک نہ ہوگا۔[۲]

۲:۔ نفع معلوم ہو:

شرکت صحیح ہونے کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ نفع کا تناسب طے کرلیا جائے، یعنی ہر شریک کو کل نفع کا کتنا حصہ یا

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الاتاسی، شرح مجلة الأحكام، محمد خالد، مكتبه اسلاميه، كوئته ۱٤٠٣ھ (٤: ٣٢٢)، الكاساني، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ٥٨٧ھ۔

بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسة التاريخ العربي ۱٤۱۷ھ، ايچ ايم سعيد كمپنى، (٦: ٦٥)، الحصكفي، محمد علاء الدين۔

الدر المختار شرح تنوير البصار و الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ايچ ايم سعيد كمپنى (٤: ٣٢٣)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: علي حيدر، درر الحكام شرح مجلة الأحكام، بيروت، دار الكتب العلميه (٣: ٣٦١)۔

والدر المختار مع الشامي، محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ايچ ايم سعيد كمپنى (٤: ٣٠٥)۔

کتنے فیصد ملے گا، اسکی وجہ یہ ہے کہ منافع ہی شرکت کے عقد میں معقود علیہ ہے، اگر وہ متعین نہ ہو تو معقود علیہ کے بارے میں لاعلمی (جہالت) رہے گی، جس کی وجہ سے عقد فاسد ہو جائیگا، لہٰذا منافع کی شرح متعین ہونا ضروری ہے۔[1]

۳:۔ نفع مشاع ہونا چاہیے:

نفع و نقصان میں ہر شریک شامل ہوگا، کسی ایک شریک کو کل یا بعض یا نقصان کے لئے مخصوص کر دینے سے شرکت باطل ہو جائے گی۔

شرکتِ عقد کی ایک شرط یہ ہے کہ حاصل ہونے والا نفع تمام شرکاء میں مشترک ہو، جیسے پچاس فیصد، چالیس فیصد، پچیس فیصد وغیرہ، مال کی ایک معین مقدار بطور نفع کسی شریک کے لئے مقرر نہ کی جائے، جیسے نفع میں سے ایک ہزار روپے اس شریک کو ضرور ملیں گے، اس طرح لگائے گئے سرمایہ کے کسی حصہ کو نفع مقرر نہ کیا جائے، مثلاً اگر اس طرح مقرر کیا کہ ہر شریک کو اس کے سرمایہ کے دس فیصد کے برابر نفع ملے گا، تو اس سے شرکت باطل ہو جائے گی۔[2]

شرکاء کے حقوق اور اختیارات

شرکت کا عقد کرنے کے بعد شرکاء کے کچھ حقوق اور اختیارات ہوتے ہیں، جنہیں اس باب میں ذکر کرنا مقصود ہے۔

۱: شرکت کا مال فروخت کرنا:

دونوں شریکوں میں سے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مشترک سامان تجارت کو فروخت کرے، اس لئے کہ شرکت میں ہر شریک ایک دوسرے کا وکیل (نمائندہ) بھی ہوتا ہے، چنانچہ اگر وہ مشترک مال میں سے کوئی خرید

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسۃ التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، (۶:۵۱)، والإنصاف للمرداوی (۵:۴۱۲)۔

(۲) حوالہ بالا۔

وفروخت کرے گا تو جائز ہوگا، ظاہر ہے کہ شرکت کا مقصود تجارت اور پیسہ کمانا ہوتا ہے، اور تجارت بغیر خرید وفروخت کے ممکن نہیں، لہذا ہر شریک مالِ شرکت کو فروخت کر سکتا ہے، البتہ اسکو اتنی قیمت پر فروخت نہ کرے جسے غبن فاحش[1] کہا جائے، البتہ معمولی کمی بیشی سے قیمت مقرر کرنا جائز ہے۔[2]

۲: شرکت کے مال سے خریداری کرنا:

شرکاء میں سے ہر شریک کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اس مال شرکت کے ذریعہ نقد یا ادھار کوئی مال خریدیں، کیونکہ یہ بات پیچھے بھی ذکر کی جاچکی ہے کہ شرکت کا مقصود اکٹھے تجارت کرنا ہوتا ہے، اور تجارت خرید وفروخت کے بغیر مشکل ہے، لہذا شرکت کے مال سے خریداری کرنا جائز ہے۔[3]

۳: تجارت کے لئے کسی کو اجرت پر رکھنا:

اگر کاروبار کی مصلحت کا تقاضا ہو تو شریک کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ سامانِ تجارت کی خرید وفروخت کے لئے وہ کوئی ملازم رکھ لے، کیونکہ ہر کام خود انجام دینا ممکن نہیں ہوتا۔[4]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، فلأحد شریکی العنان أ ن یبیع مال الشرکة لأنها بعقد الشرکة إذن کل واحد لصاحبه ببیع مال الشرکة، ولأن الشرکة تتضمن الوکالة، فیصیر کل واحد منهما وکیل صاحبه بالبیع، ولأن غرضهما من الشرکة الربح وذلك بالتجارة وما التجارة إلا البیع والشراء إلخ (٦٨:٦)۔

(۲) حوالہ بالا، وله أمة یشتری بالنقد والنسیئة لما قلنا فی البیع (٦٨:٦)۔

(۳) غبنِ فاحش فقہ کی ایک اصطلاح ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اسکی عام بازاری قیمت سے اتنی کم قیمت میں بیچی جائے یا اتنی زیادہ قیمت میں خریدی جائے کہ اس تجارت کے لوگ عام طور سے اتنی کمی بیشی کو اصول تجارت کے خلاف سمجھتے ہوں۔

(٤) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، له أن یستأجر من یعمل فی البضاعة بعوض (٦٨:٦)۔

۴: شرکت کا مال امانت رکھوانا:

شریک کو یہ بھی اختیار ہے کہ وہ شرکت کا مال کسی شخص کے پاس امانت رکھوادے، اس لئے کہ بعض اوقات امانت رکھوانے کی ضرورت تاجر کو پڑتی رہتی ہے، اور بعض اوقات مال کی حفاظت کے لئے اجرت پر کسی کو دینا پڑتا ہے، جو جائز کام ہے تو پھر بغیر معاوضہ کے کسی کو مال بطور امانت دینا بدرجہ اولی جائز ہوا۔[۱]

۵: شرکت کے مال کو مضاربت پر دینا:

شریک کے لئے شرکت کے مال کو مضاربت پر دینا جائز ہے یا نہیں؟ اس بارے میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں منقول ہیں، ایک بروایت امام محمدؒ نے کتاب الاصل میں ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ شریک کو مال شرکت مضاربت پر دینا جائز ہے، اور دوسری روایت حضرت حسن ابن زیادؒ نے یہ نقل کی ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مالِ شرکت کو مضاربت پر دینا ناجائز ہے، پہلی روایت پر فتوی ہے۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جب شریک کے لئے مالِ شرکت میں کام کرنے کے لئے کوئی ملازم (اجیر) رکھنا جائز ہے، اور اس کو شرکت کے مال میں سے تنخواہ دینا بھی جائز ہے جو ہر حالت میں ملازم کو دینی پڑتی ہے خواہ تجارت میں نفع ہو یا نفع نہ ہو، تو پھر شریک کے لئے یہ بدرجہ اولی جائز ہوگا کہ وہ شرکت کا مال بطورِ مضاربت کسی کو دیدے، کیونکہ مضاربت میں مضارب کو صرف اس کے کام کی وجہ سے کچھ نہیں ملتا، اگر منافع ہو تو اسمیں سے حصہ ملتا ہے، اور اگر نفع نہ ہو تو پھر مضارب کو کچھ دینا نہیں پڑتا، لہذا جب ملازم رکھنا جائز ہوا کہ اسے ہر حال میں پیسے ملیں گے چاہے نفع نہ ہو تو مضاربت بدرجہ اولی جائز ہوئی کہ اسمیں بغیر نفع کے مال نہیں ملے گا۔[۲]

اسی طرح فقہاء کرامؒ نے شریک کے بہت سے مزید حقوق واختیارات ذکر فرمائے ہیں، مثلاً یہ کہ وہ شرکت کا مال کسی کے پاس گروی رکھ سکتا ہے، حوالہ قبول کر سکتا ہے وغیرہ وغیرہ، لیکن ان تمام جزوی تفصیلات میں جائے بغیر یہ اصول سمجھ لینا کافی ہے کہ تجارت کی مصلحت کے لئے جتنے تصرفات عام طور سے تاجروں میں معروف ومشہور ہیں شریک کو مال

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسة التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، وله أن یودع لأن الإیداع من عادة التجار ومن ضرورات التجارة أیضاً إلخ (٦:٦٩)۔

(۲) حوالہ بالا، (٦:٦٩)۔

تجارت میں وہ سب تصرفات کرنے کا حق حاصل ہے، البتہ وہ تصرفات کرنے کا حق حاصل نہیں جو یا تو کاروبار کے لئے واضح طور پر مضر ہیں یا تاجروں میں اس کا رواج نہیں۔

شرکت کا مال ہبہ یا قرض دینا:

چنانچہ شرکاء میں سے کسی بھی شریک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ مال شرکت کسی کو ہبہ کرے، البتہ معمولی چیز کا ہبہ جائز ہے مثلاً روٹی، گوشت وغیرہ، اسی طرح کسی شریک کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ شرکت کا مال کسی کو قرض دیدے، کیونکہ قرض کوئی نفع بخش معاملہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ تو ایک تبرع اور احسان ہے اور دوسرے کے مال کے ذریعہ احسان اور تبرع کرنا صحیح نہیں۔

البتہ اگر کسی شریک نے مشترکہ تجارت کے لئے کوئی مال قرض لیا تو اسکی ادائیگی دونوں کے ذمہ لازم ہوگی۔ [1]

منافع کی تقسیم کے بنیادی اصول

شرکت کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ شرکت کا معاہدہ کرتے وقت ہی تمام شرکاء واضح طور پر یہ طے کرلیں کہ منافع کی تقسیم کس معیار پر عمل میں آئے گی؟ عام اصول تو یہ ہے کہ فریقین باہمی رضامندی سے منافع کی جو شرح طے کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، لیکن شریعت نے ان کے اس اختیار پر چند اصولی پابندیاں عائد کی ہیں، جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔

ا۔ جب تجارت میں منافع حاصل ہو تو اس نفع کو سرمایہ کے تناسب کے بجائے حاصل ہونے والے حقیقی نفع کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے، مثلاً اگر زید اور بکر نے شرکت کا عقد کیا اور دونوں نے ایک ایک ہزار روپے لگائے، اور اس سے تجارت کی، اور دو سو روپے نفع حاصل ہوا، تو نفع لگائے ہوئے سرمایہ یعنی دو ہزار روپے کے نصف نصف یا چوتھائی وغیرہ کے حساب سے دینا طے نہ کیا جائے، بلکہ جو نفع حاصل ہوا یعنی دو سو روپے اس کا نصف یا چوتھائی یا تہائی وغیرہ طے کیا

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسة التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، (٦:٧٢)۔

جائے۔

۲۔مال کی ایک معیّن مقدار کو بطور نفع کسی شریک کے لئے طے نہ کیا جائے مثلاً اگر زید اور بکر نے ایک ایک ہزار روپے کو تجارت میں لگایا،اور یہ طے کیا کہ زید کو ہر مہینہ سو روپے ملیں گے خواہ نفع تھوڑا ہو یا زیادہ،یہ صورت جائز نہیں ہے، اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس طرح طے کیا جائے کہ جو نفع حاصل ہو گا اس کا نصف یا چوتھائی یا تہائی زید کو ملے گا۔[1]

۳۔اگر دو شرکاء یہ طے کریں کہ ہر شریک کو نفع کا اتنا فیصد حصہ ملے گا جتنا فیصد اس نے سرمایہ لگایا ہے تو یہ صورت جائز ہے خواہ دونوں کی سرمایہ کاری کا تناسب برابر ہو یا کم وبیش، نیز چاہے دونوں نے کام کرنا طے کیا ہو یا دونوں میں سے ایک کا کام کرنا طے ہوا ہو، مثلاً اگر زید اور بکر نے ایک ایک ہزار روپے تجارت میں مشترک طور پر لگائے، گویا کہ دونوں کی سرمایہ کاری کا تناسب نصف نصف ہے،اور انہوں نے اسی تناسب سے نفع طے کیا کہ جو نفع حاصل ہو گا وہ آدھا آدھا تقسیم کریں گے تو جائز ہے،اس صورت میں یہ بھی جائز ہے کہ دونوں شریک شرکت کیلئے کام کرنا طے کریں اور یہ بھی جائز ہے کام کرنا صرف ایک شریک کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہو۔[2]

۴۔جس شریک کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ وہ ضرور کام کریگا اسکا نفع سرمایہ کاری کے تناسب سے زائد مقرر کیا جائے تو بالاتفاق جائز ہے، خواہ دوسرا کام کرے یا نہ کرے، مثلاً زید اور بکر نے ایک ایک ہزار روپے مشترک طور پر

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: العالمگیریة (۲:۳۰۲) وأن يكون الربح معلوم القدر فإن كان مجهولا تفسد الشركة، وأن يكون الربح جزأ شائعا في الجملة لا معينا، فإن عينا عشرة أو مائة أو نحو ذلك كانت الشركة فاسدة۔

(۲) دیکھئے: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر المرغيناني الرشداني، الهداية ، مكتبه امداديه ملتان ، لا يجوز الشركة إذا شرط لأحدهما دراهم مسماة من الربح لأنه شرط يوجب انقطاع الشركة فعساه لا يخرج إلا قدر المسمى لأحدهما ونظيره في المزارعة (۲:۵۹۵)۔

مزید ملاحظہ ہو: الكاساني، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربي ۱٤۱۷ھ،ايچ ايم سعيد كمپني إذا شرطا الربح على قدر المالين متساويا أو متفاضلا فلا شك أنه يجوز، ويكون الربح بينهما على الشرط سواء شرط العمل عليهما أو على أحدهما، (٦:٦٢)۔

تجارت میں لگائے،اور زید کے کام کرنے کی شرط لگائی گئی،اور نفع کے بارے میں یہ طے ہوا کہ دو تہائی زید کو اور ایک تہائی بکر کو ملیگا، تو جائز ہے،اسی طرح اگر بکر کے کام کرنے کی شرط بھی لگائی گئی ہو تب بھی زید کے نفع کا تناسب اسکی سرمایہ کاری سے زائد ہو سکتا ہے۔ (۱)

اس صورت میں بالفرض اگر زید اور بکر کی سرمایہ کاری برابر نہ ہوتی مثلاً زید دو ہزار روپے اور بکر ایک ہزار روپے مشترک طور پر تجارت میں لگاتا تو اگر بکر کے لئے کام کی شرط لگائی گئی ہو تو بکر اپنے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ نفع حاصل کر سکتا ہے، مثلاً دونوں نصف نصف لے سکتے ہیں (خواہ زید کے کام کرنے کی شرط ہو یا نہ ہو)۔ (۲)

۵۔ جس شخص نے شرط لگائی کہ کام نہیں کرے گا،اس کے لئے سرمایہ کاری کے تناسب سے زیادہ مقرر کرنا جمہور کے نزدیک ناجائز ہے۔

مثلاً زید اور بکر نے مشترکہ طور پر ایک ایک ہزار کی سرمایہ کاری کی اور یہ طے کیا کہ صرف زید کام کریگا، بکر کام نہیں کریگا،البتہ بکر کو نفع اسکی سرمایہ کاری کے تناسب سے زیادہ ملے گا، مثلاً زید کو ایک تہائی اور بکر کو دو تہائی نفع ملے گا تو یہ صورت جائز نہیں ہے (۳)،البتہ حنابلہ کی کتابوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انکے نزدیک یہ صورت

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: وإن کان المالان متساویین فشرط لأحدهما فضلا علی ربح ینظر إن شرطا العمل علیهما جمیعا جاز والربح بینهما علی الشرط فی قول أصحابنا الثلاثة۔ وإن شرطا العمل علی أحدهما فإن شرطاه علی الذی شرطا له فضل الربح جا ز والربح بینهما علی الشرط۔

(۲) حوالہ بالا، (٦:٦٣) ,,وإن کان المالان متفاضلین و شرط التساوی فی الربح فهو علی هذا الخلاف إن ذلك جائز عند أصحابنا الثلاثة إذا شرط العمل علیهما، وکان زیادة الربح لأحدهما علی قدر رأس ماله بعمله، وأنه جائز۔ وإن شرط العمل علی أحدهما فإن شرطاه علی الذی رأس ماله أقل جاز ویستحق قدر ربح ماله بماله، والفضل بعمله،،۔

(۳) حوالہ بالا(٦:٦٣)،إن کان المالان متساویین وإن شرطا العمل علی أحدهما، وإن شرطاه العمل علی أقلهما ربحا لم یجز، لأن الذی شرطا له الزیادة لیس له فی الزیادة مال ولا عمل ولا ضمان، وقد بینا أن الربح لا یستحق إلا بأحد هذه الأشیاء الثلاثة۔

بھی جائز ہے۔[۱]

مذکورہ بالا صورت میں اگر زید اور بکر کی سرمایہ کاری مساوی نہ ہوتی مثلاً زید ایک ہزار اور بکر دو ہزار روپے شرکت کے کاروبار میں لگاتا اور یہ طے کیا جاتا کہ صرف وہ شریک جس کا سرمایہ زیادہ لگا ہے یعنی بکر کام کریگا، اور نفع دونوں کو برابر ملے گا، گویا کہ زید کو اسکی سرمایہ کاری کے تناسب سے نفع زیادہ حاصل ہوگا تو بھی جائز نہیں ہے، ہاں البتہ اگر دونوں کام کریں تو جائز ہوگا۔[۲]

۶۔ جو شخص کام نہیں کریگا اس کے لئے سرمایہ کاری کے تناسب سے کم مقرر کرنا باتفاق جائز ہے۔

مثال کے طور پر زید اور بکر نے مشترکہ سرمایہ کاری کی اور ایک ایک ہزار روپے لگائے، اور یہ طے کیا کہ صرف زید کام کرے گا، بکر کام نہیں کریگا، اور زید کو دو تہائی اور بکر کو ایک تہائی نفع کا ملے گا تو جائز ہے، اس صورت میں زید کو اصل نفع اس کے سرمایہ کی وجہ سے اور زائد نفع اس کے کام کی وجہ سے سمجھا جائیگا۔[۳]

مذکورہ بالا صورت میں اگر زید اور بکر کی سرمایہ کاری مساوی نہ ہوتی مثلاً زید ایک ہزار اور بکر دو ہزار روپے لگاتا اور یہ طے کیا جاتا کہ وہ شخص کام کریگا جس کا سرمایہ کم لگا ہے یعنی زید، اور نفع مساوی تقسیم ہوگا، (گویا کہ زید کو اس کے سرمایہ کے تناسب سے نفع زیادہ ملے گا) تو بھی جائز ہے، اس صورت میں اگر نفع تین سو روپے ہوا تو ڈیڑھ سو روپے دونوں کو ملیں

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد) ،المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ، والربح على ما اصطلحا عليه، يعني في جميع أقسام الشركة ،(۵:۱٤۰)۔

(۲) دیکھئے: الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربي ۱٤۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، وإن كان المالان متفاضلين وشرط التساوى في الربح فهو على هذا الخلاف إن ذلك جائز عند أصحابنا الثلاثة إذا شرطا العمل عليهما، وإن شرطا العمل۔ وإن شرطاه على صاحب الأكثر لم يجز لأن زيادة الربح في حق صاحب الأقل لا يقابلها مال ولا عمل ولا ضمان۔ (٦:٦٣)۔

(۳) حواله بالا، ،،وإن كان المالان متساويين، فإن شرطا العمل على أحدهما، فإن شرطاه على الذي شرطا له فضل الربح جاز، والربح بينهما على الشرط، فيستحق ربح رأس ماله بماله والفضل بعمله، (٦:٦٣)۔

گے، زید کو سو روپے تو اس کے سرمایہ کاری کے تناسب سے نفع ملا، اور پچاس روپے کام کرنے کی وجہ سے ملے۔[۱]

۷۔ دونوں فریقوں کے کام کرنے کی شرط ہو اس کے باوجود سرمایہ کاری کے تناسب سے منافع کا تناسب مختلف ہو، تو اس کے جواز میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

مثلاً زید اور بکر نے مشترکہ سرمایہ کاری میں ایک ایک ہزار روپے لگائے اور یہ طے کیا کہ دونوں کام کریں گے، البتہ زید کو کل نفع کا ایک تہائی اور بکر کو دو تہائی ملے گا، تو احناف اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جائز ہے، البتہ امام مالک اور امام شافعیؒ اور امام زفر رحمہم اللہ کے نزدیک یہ صورت جائز نہیں، ان کے نزدیک شرکت کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ نفع اور نقصان دونوں فریقوں کے مال کے تناسب کے مطابق ہونے چاہییں، لہذا جب دونوں کا سرمایہ برابر ہو تو نفع نصف نصف کے حساب سے ہی مقرر کرنا ضروری ہے ورنہ شرکت صحیح نہ ہوگی۔

دراصل اس اختلاف کی بنیاد ایک اصولی اختلاف پر ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیا شرکت میں نفع کا استحقاق مال کی وجہ سے ہوتا ہے یا محنت اور عمل کی وجہ سے؟

امام شافعی اور امام مالکؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ شرکت میں تمام تر نفع مال سے منسوب ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر شرکت قائم کرتے وقت فریقین نفع کی تقسیم کا کوئی تناسب آپس میں طے نہ کریں تو ہر ایک کو اس کے مال کے تناسب سے (Pro-rata) ہی نفع تقسیم کیا جاتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نفع مال ہی سے حاصل ہوتا ہے، اور جب دونوں کا مال برابر ہو تو نفع کا تناسب بھی برابر ہونا چاہیے۔[۲]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسة التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، وإن كان المالان متفاضلين وشرطا التساوي في الربح، فإن شرط العمل على أحدهما فإن شرطاه على الذي رأس ماله أقل جاز ويستحق قدر ربح ماله بماله والفضل بعمله، (۶۳:۶)۔

(۲) دیکھئے: حاشية الدسوقي على الشرح الكبير (۳۵۴:۳)، (وتفسد بشرط التفاوت) في ذلك ويفسخ العقد إن اطلع على ذلك قبل العمل، فإن اطلع عليه بعده فض الربح على قدر المالين أو لكل أجر عمله للآخر، فإذا كان لأحدهما الثلث وللآخر الثلثان ودخلا على المناصفة في العمل والربح فليرجع صاحب الثلثين على صاحب الثلث بسدس الربح

دوسری طرف حنفیہ اور حنابلہ یہ کہتے ہیں کہ نفع کا سبب صرف مال نہیں، بلکہ محنت اور عمل بھی ہے، اور اگر بالفرض دونوں شریکوں کا مال برابر بھی ہو تو دونوں کے عمل کے مقدار اور کارکردگی کی نوعیت میں تفاوت ہو سکتا ہے، یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اس کاروبار میں زیادہ تجربہ کار یا زیادہ محنتی ہو اور دوسرا اس کے مقابلے میں کم ہو، بلکہ حنفیہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کہتے ہیں کہ مال اور عمل کے علاوہ ضمان بھی نفع کے استحقاق کا سبب ہوتا ہے، ضمان کا مطلب ہے کسی بات کی ذمہ دار لینا، اور جب دو شریک کوئی کاروبار شروع کرتے ہیں، تو اس کاروبار کی ذمہ داریاں دونوں پر عائد ہوتی ہیں، لہذا اگر بالفرض ایک شخص عملاً کام نہ بھی کرے تب بھی چونکہ اس نے کاروبا کی ذمہ داری لی ہوئی ہے، اس لئے نفع کا کچھ حصہ اس ذمہ داری کے مقابلے میں بھی ہے، لہذا اگر ایک شریک کی ساکھ بازار میں زیادہ ہے اور اس پر لوگ دوسرے شریک کے مقابلے میں زیادہ اعتماد کرتے ہیں تو وہ بھی اپنی ساکھ کی وجہ سے زیادہ نفع کا مستحق ہو سکتا ہے۔[1]

ویرجع صاحب الثلث بسدس وادعی أجرة العمل، (قوله: ولکل أجر عمله للآخر) أی الذی عمله من الآخر ثم إن المصنف أطلق أجر العمل علی حقیقته ومجازه، فحقیقته الأجرة التابعة للعمل ومجازه الربح التابع للمال، والقرینة علی ذلك قوله، ولکل لدلالته علی الحالتین، وإلا فالذی له أجر العمل الذی عمله عن الآخر عند اشتراط التفاوت إنما هو أحدهما، والنووی،(الحافظ أبو زکریا) محی الدین بن شرف، شرح المهذب المسمی بالمجموع المنهاج مع مفتی المحتاج، (۱٤:۷۱، ۷۲)، وشرح منح الجلیل علی مختصر العلامة خلیل (۳:٤۹٤)۔

(۱) **ملاحظہ فرمائیں**: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد) ،المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱٤۰۳ھ(۵: ۳۱) محمد بن ابراهیم موسی، شرکات الأشخاص بین الشریعة والقانون، جامعة الامام محمد بن سعود الاسلامیه ریاض، ۱٤۰۱ھ۔ (٤:٤٤۵، ٤٤۲) الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی (٦: ٦۳)، وذکر ابن أبی شیبه فی مصنفه: قال حدثنا عبد الصمد بن عبد الوارث عن شعبه قال: سألت الحکم وحمادا وقتاده عن رجلین اشترکا فجاء أحدهما بألفین، وجاء الآخر بألف، فاشترکا، واشترطا أن الوضعیه بینهما والربح نصفین، فقال الربح علی ما اشترطا علیه، والوضیعه علی المال، (مصنف ابن ابی شیبه ٦:۳/ کتاب البیوع،ادارة القرآن، کراچی)۔

نقصان کی تقسیم کے بنیادی اصول

اس بات پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اگر شرکت کے کاروبار میں نقصان ہو جائے تو ہر شریک کا نقصان اس کے مال کے تناسب سے ہوگا، یعنی جتنے فی صد کسی کی سرمایہ کاری ہے اتنا ہی فیصد وہ نقصان میں حصہ دار ہے، فرض کیجئے کہ زید اور خالد آپس میں شریک ہیں، زید نے کاروبار میں چالیس فیصد سرمایہ لگایا ہے، اور خالد نے ساٹھ فیصد، اب اگر کاروبار میں سو روپے کا نقصان ہوا تو اس میں سے چالیس روپے کا نقصان زید کو برداشت کرنا ہوگا، اور ساٹھ فی صد خالد کو۔ یہ اصول شریعت کی طرف سے مقرر ہے، لہٰذا تمام شرکاء مل کر بھی اس میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں اگر زید اور خالد دونوں باہمی رضامندی سے یہ طے کر لیں کہ اگرچہ زید کی سرمایہ کاری کا تناسب چالیس فی صد ہے، مگر وہ نقصان پچاس فی صد برداشت کرے گا تو یہ شرکت شرعاً صحیح نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ شرکت کے کاروبار میں نقصان ہر شریک کے مال کے تناسب سے ہوگا، اور اس قاعدہ کی بنیاد حضرت علیؓ کا اثر ہے جس میں انہوں نے فرمایا:

,,الوضيعة على المال والربح على ما اصطلحوا عليه،،[1]

یعنی نقصان مال (کے تناسب) سے ہوگا، اور منافع اس طرح تقسیم ہوگا جیسے شرکاء آپس میں طے کر لیں۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: مصنف عبد الرزاق، عن علی فی المضاربة والشريكين، الوضيعة على المال والربح على ما اصطلحوا عليه، (كنز العمال ١٥:٤٨٢، ٤٠١٧٦)۔

دیکھئے: مصنف بن أبى شيبة، عن علی فی المضاربة أو الشريكين قال سفيان: لا أدرى أيهما قال: الربح على ما اصطلحا عليه والوضيعة على المال، (٦:٤، حديث ١٠، البيوع)۔

و ابن حزم فى المحلى (٨:١٤٦) من طريق وكيع، وفى رواية أخرى لمصنف عبدالرزاق (٨:١٤٧ حديث ٨١)۔

حضرت علیؓ کے اس اثر کی بنیاد پر تمام ائمہ کرام وفقہاء عظام کا اس بارے میں اجماع ہے، چنانچہ موسوعۃ الإجماع میں مذکور ہے کہ:

اتفقوا علی أن الربح والخسران فی الشرکة بین الشرکاء کل بقدر ماله۔
فقہاء کرام اس بارے میں متفق ہیں کہ نفع اور نقصان شرکت میں شرکاء کے مابین ان کے مال کی بقدر ہوگا۔

اس اصول پر ائمہ اربعہ متفق ہیں، چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور کتاب ,,بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،، میں علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

,,والوضیعة علی قدر المالین متساویا ومتفاضلا، لأن الوضیعة اسم لجزء هالك من المال، فیتقدر بقدر المال۔[1]
نقصان دونوں کے مال کے تناسب سے ہوگا اس لئے کہ نقصان مال کے ہلاک ہونے والے جزء کا نام ہے، تو وہ مال کی مقدار کے برابر ہوگا۔

امام مالک بن انسؒ کی کتاب المدونۃ الکبری میں مذکور ہے:

قال: الوضیعة عند مالك علیهما علی قدر رؤس أموالهما،،[2]
نقصان دونوں شریکوں کے اوپر ان کے سرمایہ کے تناسب سے ہوگا۔

فقہ شافعی کی تشریح کرتے ہوئے امام نوویؒ المجموع شرح المہذب میں فرماتے ہیں:

(۱) دیکھئے: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی، : لنا قوله ﷺ: الربح علی ما شرطا والوضیعة علی قدر المالین،(و ابن الهمام، فتح القدیر ۷٦۷ المکتبة الرشیدیة کوئٹه) ،تحته: ولم یعرف فی کتب الحدیث وبعض المشایخ ینسبه إلی علیؓ، (۳۹۷:۵، الشرکة)۔

(۲) مالك، مالك بن انس الأصبعی، رواته الإمام سحنون التنوخی،المدونة الکبری، دار الکتب العلمیه، بیروت۔(۶۰۹:۳)۔

,,ویقسم الربح والخسران علی قدر المالین،،[۱]
نفع اور نقصان دونوں کے مالوں کے بقدر تقسیم ہوگا۔

فقہ حنبلی کی کتابوں میں بھی یہی اصول مذکور ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ کی کتاب المغنی میں ہے:

,,الخسران فی الشرکۃ علی کل واحد منھما بقدر مالہ، فإن کان مالھما متساویا فی القدر فالخسران بینھما نصفین، وإن کان أثلاثا فالوضیعۃ أثلاثا لا نعلم فی ھذا خلافا بین أھل العلم،وبہ یقول أبو حنیفۃ والشافعی وغیرھما،،۔

شرکت میں نقصان ان دونوں میں سے ہر ایک پر ان کے مال کے بقدر ہوگا، لہٰذا اگر ان کا مال مقدار میں برابر ہو تو نقصان دونوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم ہوگا، اور اگر دونوں کا سرمایہ تہائیوں میں ہے تو نقصان بھی تہائیوں میں ہوگا، ہم اس مسئلہ میں اہل علم کے درمیان کسی کا اختلاف نہیں پاتے، یہی بات امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور ان کے علاوہ حضرات فرماتے ہیں۔[۲]

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نقصان بہر صورت شرکاء کے سرمایہ کے تناسب سے ہوگا، خواہ نقصان کی کوئی بھی وجہ ہو۔

(۱) النووی،(الحافظ أبو زکریا) محی الدین بن شرف، شرح المھذب المسمی بالمجموع المنھاج مع مغنی المحتاج(٢٠٦-٢٦١) مطبعۃ العاصمۃ القاھرۃ ١٩٧٦م دار إحیاء التراث بیروت (٧١:١٤)۔

(۲) ابن قدامۃ المقدسی(أبو محمد عبد اللہ بن أحمد بن محمد)،المغنی، مکتبۃ الریاض السعودیۃ ١٤٠٣ھ(٣٨:٥)۔

فسخ شرکت اور اس کے بنیادی اصول

فسخ شرکت سے ہماری مراد شرکت کا ختم ہونا ہے، جسکی تین مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں:۔

ایک یہ کہ جس مقصد کے تحت شرکت قائم کی گئی تھی وہ پورا ہو جائے۔

دوسرے یہ کہ مقصد پورا ہونے سے پہلے فریقین شرکت کا معاملہ ختم کر دیں۔

تیسرے یہ کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے جسکی بناء پر شرکت خود بخود ختم ہو جائے۔

ان تینوں صورتوں کی کچھ تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے:

۱:۔ شرکت کے مقاصد کی تکمیل:

فسخ شرکت کی پہلی صورت یہ ہے کہ جس مقصد کے پیش نظر شرکت کی گئی تھی وہ حاصل ہو گیا، مثلاً یہ کہ دو افراد نے کسی مخصوص معاملہ کے لئے شرکت قائم کی تھی، فرض کیجئے کہ وہ ایک مخصوص مقدار کا کپڑا خرید کر ایک ہی مرتبہ اس کو فروخت کرنا چاہتے تھے، اور انہوں نے مشترک سرمائے سے کپڑا خرید کر فروخت کر دیا، اس صورت کے احکام سادہ اور واضح ہیں۔ یعنی اگر کاروبار میں نفع ہوا ہے تو وہ طے شدہ شرح کے حساب سے تقسیم کر لیا جائے گا، اور اگر نقصان ہوا ہے تو ہر فریق اپنی سرمایہ کاری کے تناسب سے اسے برداشت کرے گا، اور اب ان کے درمیان شرکت کا رشتہ برقرار نہیں رہے گا۔

۲:۔ فریقین کا شرکت کو فسخ کرنا:

شرکت کے عقد میں فریقین میں سے ہر ایک کو یہ حق حاصل ہے کہ عقد شرکت جس وقت چاہے ختم کر دے، البتہ صرف ایک شرط ہے وہ یہ کہ جو فریق شرکت ختم کرنا چاہتا ہو وہ دوسرے فریق کو شرکت ختم کرنے کی اطلاع یا نوٹس

دے، پھر شرکت کے سرمایہ کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ سب سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ کل اثاثے نقد شکل میں ہیں یا جنس (سامان) کی شکل میں اگر تمام اثاثے نقد ہوں اور کچھ منافع بھی حاصل ہوا ہو تو سب سے پہلے فریقین اپنے حصص کے تناسب سے سرمایہ واپس لیں گے اس کے بعد منافع تقسیم کرلیں گے، البتہ اگر اثاثے نقد شکل میں نہ ہوں تو شرکاء اس سرمایہ کر فروخت کر کے نقد بنائیں گے، اور پھر اسے باہم تقسیم کرلیں گے۔

اگر اثاثے نقد شکل میں نہ ہوں تو مضاربت میں تو بالاتفاق مضارب اس سامان کو فروخت کر کے نقد شکل میں لائے گا، پہلے مضارب رب المال کو اسکا سرمایہ واپس دے گا، سرمایہ واپس دینے کے بعد اگر کچھ بچے گا تو وہ نفع کہلائیگا پھر اسے باہم طے کردہ تناسب سے تقسیم کرینگے، لیکن شرکت کے بارے میں اس صورت میں اختلاف ہے، امام طحاویؒ نے شرکت کو مضاربت پر قیاس کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ اس میں بھی شرکاء پہلے اس سامان کو نقد شکل میں لائیں گے، پھر اسے تقسیم کریں گے، جبکہ دوسرے علماء احناف کی رائے یہ ہے کہ جنس کی شکل میں بھی شرکت کو فسخ کر کے تقسیم کیا جاسکتا ہے، اس صورت میں اثاثے جس شکل میں بھی موجود ہوں وہ اسی شکل میں سرمایہ کاری کے تناسب سے تقسیم کر لئے جائیں گے۔

ان علماء احناف کی دلیل یہ ہے کہ مضاربت اور شرکت میں یہ فرق ہے کہ شرکت میں تمام شرکاء مال شرکت پر قبضہ اور مکمل اختیار رکھتے ہیں ان میں سے ہر شریک مال شرکت پر تصرف کا اختیار رکھتا ہے، لہذا اسے یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ اپنے حصہ شرکت کی حد تک دوسرے کو تصرف سے منع کردے، اور جب ایسا کرے گا تو شرکت فسخ ہو جائے گی، لیکن مضاربت میں جب مال مضارب کے پاس جنس (سامان) کی شکل میں منتقل ہو جائے تو اس پر تمامتر تصرف مضارب ہی کا ہوتا ہے، رب المال کو اس میں کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہیں، لہذا وہ مضارب کو اس حالت میں تصرف سے روک نہیں سکتا، البتہ جب وہ تصرف کر کے سامان کو نقد شکل میں لے آئے تو اسے تقسیم کر کے مضارب کو مزید تصرف سے روکا جاسکتا ہے۔[1]

(۱) ملاحظہ ہو: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسة التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی (۶:۷۷)۔

مذکورہ بالا تفصیل تو اس وقت تھی جب عقد شرکت میں کل دو شرکاء ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شریک شرکت کو فسخ کرنا چاہے، لیکن اگر عقد شرکت میں دو سے زائد شرکاء ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شریک شرکت فسخ کرنا چاہے تو اس بات کی تو سب فقہاء کرام نے صراحت کی ہے کہ وہ (کم از کم اپنے حصہ کی حد تک) شرکت کو فسخ کر سکتا ہے، بشرطیکہ بقیہ شرکاء کو مطلع کر دے کہ میں اپنی شرکت ختم کر رہا ہوں[1]، البتہ بقیہ شرکاء کے بارے میں کیا حکم ہے، آیا اس صورت میں انکی سابقہ شرکت بر قرار رہے گی یا ان کی شرکت بھی فسخ ہو جائے گی؟ اس بارے میں عصری قوانین میں تو اس کی صراحت ملتی ہے کہ اگر تین یا تین سے زیادہ شرکاء ہوں تو کسی ایک شریک کے شرکت سے نکلنے سے پوری شرکت فسخ نہیں ہوتی صرف اسی شریک کی اپنے حصہ کی حد تک شرکت ختم ہوتی ہے، بقیہ تمام شرکاء اپنی شرکت بر قرار رکھ سکتے ہیں[2]، البتہ کتبِ فقہ میں اس بارے میں کوئی صریح جزئیہ تو نہیں ملا، لیکن اس سے ملتے جلتے بعض مسائل میں فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ بقیہ شرکاء کی شرکت بر قرار رہتی ہے، مثلاً فقہاء کرامؒ نے کسی ایک شریک کے مر جانے، یا پاگل ہونے یا خدانخواستہ مرتد ہو جانے کی صورت میں فرمایا کہ اگر شرکاء کی تعداد دو سے زیادہ ہو تو شرکت صرف میت، یا پاگل یا مرتد کے حق میں تو ختم ہو گی، البتہ بقیہ شرکاء کی شرکت بر قرار رہے گی، اور اسکی وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ شرکت کے اندر وکالت بھی پائی جاتی ہے کہ ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل بھی ہے اور وکالت کا یہ حکم ہے کہ وکیل کی موت سے وکالت ختم ہو جاتی ہے، لہذا اگر کوئی شریک مر جائے تو گویا کہ وکیل مر گیا، اس وجہ سے وکالت ختم ہو گئی اور جب وکالت ختم ہو گئی تو شرکت بغیر وکالت کے رہ گئی جو کہ نا ممکن ہے، لہذا شرکت بھی خود بخود ختم ہو گئی، لیکن چونکہ بقیہ شرکاء حیات ہیں انکی وکالت بحالہ بر قرار ہے، اس وجہ سے انکی شرکت بھی بر قرار رہے گی اور وہ فسخ نہیں ہو گی۔[3]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: در الحکام شرح مجلة الأحکام لعلی حیدر، تنفسخ الشركة بفسخ احد الشريكين ولكن يشترط ان يعلم الآخر بفسخه، ولا تنفسخ الشركة مالم يعلم الآخر فسخ الشريك (۳:۰ ۳۹ ماده:۱۳۵۳)۔

(۲) دیکھئے: الوسيط فی شرح القانون المدنی للسنهوری، فاذا توافرت الشروط المتقدمه الذكر فی انسحاب الشريك من الشركة ترتب علی انسحابه انقضاء الشركة بحكم القانون، ولكن يجوز لباقی الشركاء ان يتفقوا علی بقاء الشركة فيما بينهم وحدهم۔ (۵:۳۷۳-الشركة)۔

(۳) ملاحظہ ہو: الاتاسی، شرح مجلة الأحکام، محمد خالد، مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ ۱٤٠٣ھ، اذا مات احد الشريكين او

اس سے ملتا جلتا ایک اور مسئلہ ہے جس پر قیاس کرتے ہوئے یہ حکم لگایا جاسکتا ہے کہ بقیہ شرکاء کے حق میں شرکت برقرار رہنی چاہیے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر فریقین کے درمیان مزارعت (بٹائی) کا معاملہ ہو، اور ان میں سے کوئی ایک فریق مزارعت کا عقد ختم کرنا چاہے، اور اس میں دوسرے فریق کا کوئی ضرر ہو (مثلاً دوسرے فریق کے بیج ضائع ہونے کا خطرہ ہو یا عامل کی محنت ضائع ہونے کا خوف ہو) تو عقد مزارعت ختم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اس سے دوسرے فریق کو ضرر اور نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہے، جس سے بچانے کے لئے مزارعت ختم نہیں کی جاسکتی،[1] اسی پر قیاس کرتے ہوئے شرکت میں بھی اگر پوری شرکت ختم کردی جائے تو بقیہ شرکاء کے ضرر اور نقصان کا اندیشہ ہے، اور بقیہ شرکاء کو ضرر اور نقصان سے بچانا بھی ضروری ہے، اسی لئے فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شریک اپنی شرکت ختم کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ دوسرے شرکاء کو مطلع کرے ورنہ ان کو ضرر پہونچنے کا اندیشہ ہے۔[2] امام مالکؒ کے نزدیک عقد مضاربت عقد لازم ہے کاروبار شروع کرنے کے بعد کسی ایک فریق کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ عقد فسخ کرے، کیونکہ اس میں

جن جنونا مطبقا تنفسخ الشركة لكن في صورة كون الشركاء ثلاثة او اكثر تنفسخ الشركة في حق الميت او المجنون وحده وتبقى بين الآخرين، ومثل الموت الحقيقي الموت الحكمي بان ارتد احدهما ولحق بدار الحرب و حكم بلحاقه ،وهذا لان الشركة تتضمن الوكالة فهي شرط لها ابتداء وبقاء الى قوله: والوكالة تبطل بالموت واللحاق، فاذا بطلت الوكالة بطلت الشركة يعني شركة العقد الخ، (٤:٢٧٧ ماده ٣٥٢)۔

(١) ملاحظہ فرمائیں: الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، ٥٨٧ه ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربي ١٤١٧ه، ايچ ايم سعيد كمپني، ولوامتنع صاحبه(اى الذى ليس له بذر) ليس له ذلك الا من عذر، وعقد المعاملة لازم ليس لواحد منهما ان يمتنع الا من عذر، (٦:١٨٢/المزارعة)۔

وفيه ايضا ولا تنفسخ بنفس العذر ان لم يمكن الفسخ بان الزرع لم يدرك ولم يبلغ مبلغ الحصاد لا يباع في الدين، ولا يفسخ الى ما ان يدرك الزرع لان في البيع ابطال حق العامل الخ، (٦:١٨٣/الزراعة)۔

مزید دیکھئے: و الشركات للخياط، واذا كان الفقهاء مجمعين على استمرار عقد المزارعة لو طلب احد الطرفين فسخه اذا كان الضرر متحققا الخ، (١:١٩)۔

(٢) حوالہ بالا، وان كان غائبا ولم يبلغه الفسخ لم يجز الفسخ ولم ينفسخ العقد لان الفسخ من غير علم صاحبه

دوسرے کا نقصان ہے۔[1]

خلاصہ یہ کہ بقیہ شرکاء کا لحاظ کرتے ہوئے ان کو ضرر سے بچانا بھی لازمی ہے، لہذا اگر دورانِ شرکت کسی ایک شریک کے نکلنے سے دوسرے شرکاء کی شرکت بھی فسخ کردی جائے تو ان (دوسرے شرکاء) کو نقصان ہونے کا اندیشہ ہے کیونکہ موجودہ دور میں بڑی بڑی تجارتوں اور صنعتوں میں شراکت کی جاتی ہے اور خصوصا مشترک سرمائے کی کمپنیوں میں تو بہت سے حصہ دار اور شرکاء ہوتے ہیں، اور ان میں کسی بھی وقت شریک کے اپنی ذاتی مجبوری کی وجہ سے شرکت ختم کرنے کا امکان ہے، لہذا اگر ہم اسکی وجہ سے پورے کاروبار کو متاثر کریں اور تمام شرکاء کے شرکت کے عقد کو فسخ کردیں تو بقیہ سب حصہ داروں کو نقصان ہوگا، لہذا شریعت کے اصولوں کی روشنی میں دوسرے مسائل پر قیاس کرتے ہوئے اور دوسرے شرکاء کو ضرر سے بچانے کی خاطر یہی کہنا چاہیے کہ کسی ایک شریک کے چلے جانے سے بقیہ شرکاء کی شرکت

اضرارا بصاحبه،(٦:٧٧) وابن رجب، ابو الفرج عبد الرحمن سـ٧٩٥ـه، القواعد فی الفقه الاسلامی، دار المعرفه، بیروت۔ ص:١١١۔

(١) ملاحظہ ہو: والحصکفی ، محمدعلاء الدین ، الدر المختار شرح تنویر البصار، اذا استمر احد الشریکین علی البیع والشراء بعد وفاة شریکه فیکون غاصبا لحصة شریکه منذ الوفاة ویعود الربح والخسار علیه، ۔علی حیدر،درر الحکام شرح مجلة الأحکام، بیروت، دار الکتب العلمیه، (٣٨٨:٣)، اذا بطلت الشرکة بموت احد الشریکین او بجنونه فالربح الذی حصل بعد ذلك للعامل،۔

مزید دیکھئے: و القرطبی، أبو الولید محمد بن أحمد بن رشد القرطبی، بدایة المجتهد ونهایة المقتصد، مکتبة الکلیة، الأزهریة،١٣٨٦ه۔، انه اجمع العلماء علی ان اللزوم لیس من موجبات عقد القراض وان لکل واحد منهما فسخه مالم یشرع العامل فی القراض، واختلفوا اذا شرع العامل فقال مالك : هو لازم وهو عقد یورث فان مات وکان للمقارض بنون امناء کانوا فی القراض مثل ابیهم وان لم یکونوا امناء کان لهم ان یاتوا بأمین۔ وقال الشافعی وابو حنیفةؒ: لکل واحد منهم الفسخ اذا شاء ولیس هو عقد یورث، فمالك الزمه بعد الشروع فی العمل لما فیه ضرر، ورآه من العقود الموروثة، بدایة المجتهد لابن محمد (١٩٨:٢) تحت القول فی احکام القراض۔

متاثر نہیں ہوگی، اور انکی شرکت بدستور جاری رہے گی[1]۔

۳:۔ جبری فسخ:

شرکت کے فسخ ہونے کی تیسری صورت یہ ہے کہ ایسے حالات یا واقعات نمودار ہوں جنکی وجہ سے شرکت یا تو خود بخود فسخ ہو جائے یا اسے فسخ کرنا پڑے، اسکی مثالیں ذیل میں مذکور ہیں:

اگر کوئی شریک مر جائے تو شرکت فسخ ہو جائے گی چاہے دوسرے شریک کو اسکی وفات کا علم بھی نہ ہو، پھر اگر دوسرے شریک نے تقسیم کرنے کے بجائے خرید و فروخت جاری رکھی اور کاروبار کرتا رہا یہاں تک کہ اس مال سے نفع ہوا تو وہ اپنے شریک کے حصہ کی حد تک غاصب سمجھا جائیگا، اور تمام نفع اور نقصان اب صرف اس شریک کے اوپر ہوگا جو زندہ ہے۔

مثلاً اگر کسی کاروبار میں صرف دو شریک عمر اور بکر تھے، اب اگر عمر کا انتقال ہو جائے تو شرکت فسخ ہو جائے گی، اور بکر کو چاہیے کہ وہ عمر کا سرمایہ اس کے ورثاء کو دیدے، لیکن اگر اس نے ایسا نہ کیا بلکہ سابقہ کاروبار کو جاری رکھا تو وہ عمر کے سرمایہ کی حد تک غاصب سمجھا جائے گا، غصب کا حکم شرعاً یہ ہے کہ اگر کوئی شخص غصب کئے ہوئے مال سے تجارت کرے تو اسے غصب کا شدید گناہ تو ہوتا ہے لیکن اس تجارت سے جو نفع حاصل ہو وہ غاصب کی ملکیت میں آجاتا ہے تاہم چونکہ ملکیت ایک ناجائز عمل کے نتیجے میں حاصل ہوئی اس نفع کو صدقہ کرنا واجب ہے، لہذا بکر کو عمر کا حصہ استعمال کرنے کا گناہ ہوگا، لیکن اب اس کو جتنا بھی نفع ہوگا یا جو بھی نقصان ہوگا وہ صرف بکر کا ہوگا، البتہ عمر کے سرمایہ سے جو نفع حاصل ہوا ہے اسے صدقہ کرنا واجب ہوگا، عمر کے ورثاء کو صرف عمر کا لگایا ہوا سرمایہ یا اسکی زندگی میں جتنا نفع حاصل ہوا تھا وہ ملے گا، مرنے کے بعد جو کاروبار کیا گیا اسکا نفع نہیں ملے گا۔

---

(۱) **ملاحظہ فرمائیں:** ابن رجب، ابو الفرج عبد الرحمن سـ۷۹۵ھ، القواعد فی الفقه الاسلامی، دار المعرفه، بیروت۔، التفاسخ فی العقود الجائزة متی تضمن ضررا علی احد المتعاقدین او غیرهما ممن له تعلق بالعقد لم یجز ولم ینفذ الا ان یمکن استدراك الضرر بضمان او نحوه فیجوز علی ذلك الوجه، ص: ۱۱۰۔

مذکورہ بالا صورت وہ تھی جب صرف دو شریک شرکت کا عقد کریں اور ان میں سے کسی ایک کا انتقال ہو جائے، لیکن اگر دو شرکاء سے زائد ہوں مثلاً تین یا چار شریک ملکر کوئی شرکت کریں اور پھر کسی ایک شریک کا انتقال ہو جائے تو شرکت صرف میت کے حق میں تو فسخ ہوگی البتہ بقیہ شرکاء کی شرکت جاری رہے گی۔ (۱)

۲: کوئی شریک پاگل ہو گیا، یا ایسا دائمی مریض یا معذور ہو گیا کہ جس میں اسکی عقل جاتی رہی اس شخص کی شرکت کے بارے میں وہی تفصیل ہے جو اوپر میت کے بارے میں گذری، کہ اگر کل دو شرکاء ہوں اور ان میں سے کوئی ایک پاگل ہو جائے تو پوری شرکت فسخ ہو جائے گی، اور اگر دو سے زائد شرکاء ہوں تو صرف اس شریک کی شرکت فسخ ہوگی جو پاگل ہوا، باقی شرکاء اپنی شرکت جاری رکھیں گے۔ (۲)

۳: اگر کوئی شریک خدانخواستہ مرتد ہو کر دار الحرب چلا جائے، اور حاکم اس کے دار الحرب چلے جانے کا فیصلہ کردے، تو شرکت فسخ ہو جائے گی، کیونکہ ایسا شخص میت کے حکم میں سمجھا جاتا ہے، لہذا اس کے تمام وہی احکام ہوں گے جو پیچھے کسی شریک کے مر جانے کی صورت میں بیان کئے گئے ہیں۔ (۳)

---

(۱) تفصیلات کے لئے دیکھئے: الاتاسی، شرح مجلة الأحکام، محمد خالد، مکتبه اسلامیه ،کوئٹه۱٤۰۳ھ ٤:(۲۷۷ ماده ۱۳۵۲)، اذا مات احد الشریکین او جن جنونا مطبقا تنفسخ الشرکة لکن فی صورة کون الشرکاء ثلاثة او اکثر تنفسخ الشرکة فی حق المیت او المجنون وحده وتبقی بین الآخرین۔

(۲) دیکھئے: علی حیدر، درر الحکام شرح مجلة الأحکام (۳۸۸:۳ مادة ۱۳۵۲)، لو جن احد الشریکین جنونا مطبقا فانفسخت الشرکة وعمل الشریك بعد ذلك فیکون غاصبا فی حصة الشریك المجنون منذ اطباق الجنون علیه ویکون الربح والضرر عائدا علیه وفی هذا الحال یطیب له الربح الذی یعود له من حصته ولکن لا یطیب له الربح الحاصل من حصة شریکه فیلزمه التصدق به، اما فی صورة کون الشرکاء ثلاثة او اکثر فیکون انفساخ الشرکة فی حق المیت او المجنون فقط، وتبقی الشرکة فی حق الآخرین۔

مزید دیکھئے: والاتاسی، شرح مجلة الأحکام، محمد خالد، مکتبه اسلامیه ،کوئٹه۱٤۰۳ھ، الصغیر والمجنون والمعتوه محجورون لذاتهم ای بدون حاجة الی حجر الحاکم، (مادة۹۵۷)۔

(۳) ملاحظہ فرمائیں: الاتاسی، شرح مجلة الأحکام، محمد خالد، (مکتبه اسلامیه ،کوئٹه۱٤۰۳ھ)، ومثل الموت الحقیقی الموت الحکمی بان ارتد احدهما ولحق بدار الحرب وحکم بلحاقه(ص:۲۷۷ /مادة: ۱۳۵۲)۔

۴: کسی ایک شریک کو مجور کر دیا گیا، مجور فقہ کی اصطلاح میں ان لوگوں کو کہا جاتا ہے جن کے تصرفات قولیہ (زبانی تصرفات) پر یہ پابندی لگائی گئی ہو کہ وہ اپنی زبان کے ذریعہ کوئی معاملہ یا عقد نہ کر سکیں، ہاں البتہ اگر وہ اپنے کسی فعل سے کوئی کام کر بیٹھیں تو اس کے نتائج کے وہ ذمہ دار ہوں گے، مثلاً اگر انہوں نے کوئی جرم کر لیا تو وہ سزاوار ہوں گے[1]، جو لوگ مجور ہوتے ہیں ان کی دو صورتیں ہیں: ایک تو وہ لوگ ہیں جن کو مجور بنانے کے لئے حاکم کے فیصلہ کی ضرورت ہی نہیں ہوتی، وہ از خود مجور ہو جاتے ہیں جیسے پاگل یا چھوٹے بچے[2]۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے کہ جنہیں مجور بنانے کے لئے حاکم کے فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً:

(الف) کوئی مفلس آدمی اتنا مقروض ہو جائے کہ اس کے اوپر قرضہ اس کے کل سرمایہ کے برابر یا زیادہ ہو[3]۔

(ب) یا کوئی شخص اتنا بے وقوف ہو جائے جو اپنے تمام مال کو غلط جگہوں پر خرچ کر دیتا ہو، اور وہ اسراف کر کے اپنا مال ضائع کرتا ہو، اور جسے تجارت کرنے کا علم اور ڈھنگ نہ ہو، اور وہ لین دین میں ہمیشہ غفلت کرتا ہو، یا تجارت میں اپنی بے وقوفی کی وجہ سے اکثر دھوکہ کھا جائے[4]۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الاتاسی، شرح مجلة الأحكام، محمد خالد، (مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ ۱۴۰۳ھ)، الحجر هو منع شخص مخصوص عن تصرفه القولى لا الفعلى، لان الحجر من الحكميات الخ(ص:۵۳۴/ مادة:۹۴۱)۔

(۲) ملاحظہ ہو: سلیم رستم باز اللبنانی، شرح المجله (دار إحياء التراث الاسلامى بيروت)، الصغير والمجنون والمعتوه محجورون لذاتهم اى بدون حاجة الى حجر الحاكم الخ، (ص:۵۳۸/ مادة: ۹۵۷)۔

(۳) حوالہ بالا، للحاكم ان يحجر المديون بطلب الغرماء (ماده ۹۵۹) وايضا فيه المديون المفلس وهو من كان دينه مساويا لماله او ازيد منه اذا خاف غرمائه ان يضيع ماله بالتجارة او ان يخفيه او يجعله وراجعوا الحاكم طالبين حجره عن التصرف فى ماله حجره الحاكم، (شرح المجلة لرستم باز ماده: ۹۹۹ ص:۵۵۴)۔

(۴) حوالہ بالا، (ماده ۹۵۷ ص:۵۳۸)، اعلم ان اسباب الحجر ستة، الرق، والصغر، والجنون، وضرر المعاملة، والدين، والسفه۔ وايضا فيه: السفيه هو الذى ينفق ماله فى غير موضعه و يبذر نفقاته ويضيع امواله ويتلفه بالاسراف والذين لا يزالون يغفلون فى اخذهم واعطائهم ولا يعرفون طريق تجارتهم وتمتعهم بسبب بلاهتهم (الى قوله) والغبن فى التجارات من غير محمدة، (شرح المجلة لرستم باز ص:۵۳۵ المادة ۹۴۶)۔

۵: دو شریکوں میں سے کسی ایک شریک کا مال مخلوط ہونے اور اس سے خریداری کرنے سے پہلے برباد ہو گیا تو شرکت فسخ ہو جائے گی، مثلاً زید اور بکر نے شرکت کا عقد کیا اور ایک ایک ہزار روپے دونوں نے لگائے، اگر دونوں کی رقمیں علیحدہ علیحدہ ہوں اور ابھی ان سے کوئی خریداری نہ کی گئی ہو پھر زید کا مال ہلاک ہو جائے تو شرکت ختم ہو جائیگی، نقصان صرف زید ہی کا ہوگا[1]، البتہ اگر دونوں نے مال اس طرح ملا دیا کہ وہ قابل امتیاز نہ ہو اور خریداری کرنے سے پہلے کچھ مال ہلاک ہو جائے تو شرکت فسخ نہ ہو گی، بلکہ نقصان دونوں کا سمجھا جائے گا۔[2]

---

(۱) هلاك راس مال احد الشريكين قبل الخلط وقبل الشراء اذا هلك راس مال احد الشريكين فقط قبل الخلط والشراء تبطل الشركة۔

(۲) ملاحظہ ہو: علی حيدر،درر الحكام شرح مجلة الأحكام، بيروت، دار الكتب العلميه(مادة:۱۳۵۲ ص:۳۸۹): اما اذاتلف مقدار من راس المال بعد خلط راس المال بصورة لا تقبل التمييز فيكون خسار المقدار المتلف عائدا على كليهما والباقي مشتركا بينهما اما اذا تميز بعد الخلط فالظاهر انه كعدم الخلط۔

مزید دیکھئے: علی حيدر،درر الحكام شرح مجلة الأحكام، بيروت، دار الكتب العلميه، واذا تلف راس المال بعد الشراء اى ان احد الشريكين اشترى مالا للشركة براس المال الذى وضعه للشركة وتلف رأس مال الآخر قبل وضعه فى الشركة فيكون المال المشترى مشتركا الخ (ماده ۱۳۵۲ ص، ۳۸۹)۔

شرکت کے اثاثوں کا تصفیہ

پیچھے شرکت کے فسخ کے احکام بیان کئے گئے ہیں، اسی سے متعلق یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ اگر شرکت فسخ کردی جائے تو اثاثے شرکاء کو واپس کیسے ملیں گے؟ آیا انکو نقد بنانا ہوگا یا انہیں جوں کا توں تقسیم کردیا جائے گا، یا اس کے علاوہ کوئی اور شکل ہوگی؟ آگے اس بارے میں تفصیل ذکر کی جائے گی، البتہ اس تفصیل میں جانے سے پیشتر یہ معلوم ہونا ضروری ہے کہ فسخ شرکت کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شرکت میں کل دو شرکاء ہوں اور ان میں سے کوئی ایک یا دونوں شرکت فسخ کرنا چاہیں۔

۲۔ شرکت میں دو سے زائد شرکاء ہوں، اور کوئی ایک شریک شرکت فسخ کرنا چاہے۔

ان دونوں صورتوں میں اثاثوں کے تصفیہ کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے:

۱۔ اگر شرکت میں کل دو شریک ہوں تو جیسا کہ پیچھے بیان کیا گیا ہے، ہر شریک کو یہ اختیار ہے کہ وہ شرکت کو فسخ کردے، بشرطیکہ وہ دوسرے شریک کو اسکی اطلاع دیدے، اس صورت میں اگر دوسرے شریک کو شرکت کے فسخ ہونے کی اطلاع ہو جائے یا وہ پہلے ہی سے دوسرے شریک کے ساتھ شرکت ختم کرنے پر متفق ہو تو شرکت فسخ ہو جائے گی، اور اب تمام اثاثوں کے تصفیہ کا طریقہ یہ ہوگا کہ سب سے پہلے اس کاروبار سے جو نفع حاصل ہوا ہے وہ باہمی طے کردہ تناسب کی بنیاد پر تقسیم کردیا جائے گا، اس کے بعد جو اثاثے باقی بچیں تو ان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر تمام اثاثے نقد شکل میں ہوں تو وہ تمام بآسانی شرکاء کے حصص کے تناسب سے تقسیم کردئے جائیں۔

مثال کے طور پر زید اور عمر میں جب شرکت قائم ہوئی تو زید نے چالیس ہزار روپے اور عمرو نے ساٹھ ہزار روپے لگائے، لیکن نفع کے بارے میں آپس میں یہ طے پایا کہ وہ آدھا آدھا تقسیم ہوگا، اب ایک لاکھ روپے سے کاروبار کیا گیا، پھر

شرکت ایسے وقت فسخ کرنے کی نوبت آئی جب تمام اثاثے نقد شکل میں کل ایک لاکھ بیس ہزار روپے تھے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ کاروبار میں بیس ہزار کا نفع ہوا، چونکہ نفع آدھا آدھا تقسیم کرنا تھا اس لئے اس بیس ہزار میں سے دس ہزار زید کے اور دس ہزار عمر کے ہونگے، باقی ایک لاکھ روپے میں سے چالیس ہزار زید کے اور ساٹھ ہزار عمر کے سمجھے جائیں گے، کیونکہ دونوں نے اسی تناسب سے سرمایہ کاری کی تھی، گویا کہ مجموعی طور پر زید کو پچاس ہزار اور عمر کو ستر ہزار روپے ملے، لیکن اگر اثاثے نقد شکل میں نہ ہوں، بلکہ سامان کی شکل میں ہوں تو شرکاء کو اختیار ہے کہ یا تو انہیں فروخت کر کے نقد بنائیں یا انہیں جوں کا توں تقسیم کرلیں، لیکن اگر ان کے درمیان اختلاف ہو گیا کہ کچھ شرکاء یہ چاہتے ہوں کہ ان اثاثوں کو بیچ کر نقد بنایا جائے اور کچھ یہ چاہتے ہوں کہ انہیں نقد بنائے بغیر تقسیم کیا جائے تو اگر انہیں نقد بنائے بغیر آسانی سے تقسیم کرنا ممکن ہو تو انہیں اسی طرح (نقد بنائے بغیر) ہی تقسیم کیا جائیگا[1]، کیونکہ فسخ شرکت کے وقت تمام اثاثے مشترک ملکیت میں تھے، اور شریک کو یہ اختیار تھا کہ وہ اپنا حصہ الگ لے سکے، لہٰذا اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا کہ تم پہلے اپنے حصے کو فروخت کرو، اور پھر اس کے بدلہ نقد رقم تمہیں دی جائے گی، البتہ اگر اثاثے ایسے ناقابلِ تقسیم ہوں کہ انکو الگ الگ کر کے اجزاء میں تقسیم نہ کر سکتے ہوں، مثلاً مشینری وغیرہ تو انہیں فروخت کر کے نقد رقم شرکاء کو دی جائے گی۔[2]

جب سامان کی شکل میں اثاثوں کو تقسیم کرنا پڑے تو اس کا طریقِ کار یہ ہوگا کہ پہلے تمام اثاثوں کی بازاری قیمت لگائی جائے گی، اگر یہ مجموعی قیمت دونوں شریکوں کے لگائے ہوئے مجموعی سرمایہ سے زیادہ ہو تو وہ زیادہ مقدار کاروبار کا نفع تصور ہوگی، اور پہلے اسے نفع کے طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کیا جائیگا، اس کے بعد جو اثاثے باقی بچیں وہ کاروبار

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)،المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱۴۰۳ھ، فعلی هذا إن اتفقا علی البیع أو القسمة فعلا أو إن طلب أحدهما القسمة والآخر البیع أجیب طالب القسمة دون طالب البیع، (المغنی مع شرح الکبیر ۵:۱۳۳)۔

(۲) ملاحظہ ہو: المرغینانی ،الهدایة فی متن فتح القدیر، المکتبة الرشیدیه، کوئٹه(۸:۳۵۰/القسمة)، إلا أنهما إذا کانت من جنس واحد أجبر القاضی علی القسمة عن طلب أحد الشرکاء لأن فیه معنی الإفراز لتقارب المقاصد۔ وإن کانت أجناسا مختلفةً لا یجبر القاضی علی قسمتها لتعذر المعدلة باعتبار فحش التفاوت فی المقاصد ولو تراضوا علیها جاز لأن الحق لهم۔

کا اصل سرمایہ سمجھا جائیگا، جسے سرمایہ کاری کے تناسب سے تقسیم کیا جائیگا، فرض کیجئے کہ زید اور عمر میں جب شرکت قائم ہوئی تو زید نے چالیس ہزار روپے لگایا اور عمر نے ساٹھ ہزار روپے، لیکن نفع کے بارے میں آپس میں یہ طے پایا کہ وہ آدھا آدھا تقسیم ہوگا، اب ایک لاکھ روپے سے سامان خرید لیا گیا، پھر شرکت ایسے وقت فسخ کرنے کی نوبت آئی جب تمام سرمایہ سامان کی شکل میں تھا، تو اب اس سامان کی بازاری قیمت لگائی جائے گی، فرض کیجئے کہ سامان کی مجموعی بازاری قیمت ایک لاکھ بیس ہزار بنی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کاروبار میں بیس ہزار کا نفع ہوا، چونکہ نفع آدھا آدھا تقسیم کرنا تھا اس لئے اس بیس ہزار میں سے دس ہزار زید کے اور دس ہزار عمر کے ہونگے، باقی ایک لاکھ روپے کے اثاثوں میں چالیس ہزار زید کے اور ساٹھ ہزار عمر کے سمجھے جائیں گے، کیونکہ دونوں نے اسی تناسب سے سرمایہ کاری کی تھی، مجموعی اثاثوں میں زید کے اثاثوں کی قیمت پچاس ہزار اور عمر کے اثاثوں کی قیمت ستر ہزار ہوگی، جس کے معنی یہ ہیں کہ پچاس ہزار کے اثاثے زید کو دئے جائیں گے اور ستر ہزار کے اثاثے عمر کو، اگر ان اثاثوں کا تعین باہمی رضامندی سے کر لیا جائے فبہا، ورنہ مختلف اثاثوں کو یونٹس میں تقسیم کر کے قرعہ اندازی کے ذریعہ بھی تقسیم عمل میں آسکتی ہے۔

۲۔ مذکورہ بالا صورت وہ تھی جب کل دو شرکاء ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شریک شرکت فسخ کرنا چاہے، لیکن اگر شرکت میں دو سے زائد شرکاء ہوں اور ان میں سے کوئی ایک شریک مر جائے یا پاگل ہو جائے، یا خدا نخواستہ مرتد ہو جائے، یا ایک شریک شرکت سے نکل جائے تو ان تمام صورتوں میں اگر بقیہ شرکاء بھی شرکت ختم کرنا چاہیں تو ان کے حصص کے تصفیہ کا طریقہ تو وہی ہے جو نمبر ایک میں بیان ہوا، لیکن اگر بقیہ شرکاء اپنا کاروبار جاری رکھنا چاہیں تو حصص کا تصفیہ باہمی رضامندی سے ہو سکتا ہے، اور وہ شریک جو اپنی شرکت جاری رکھنا چاہتا ہے وہ اس شریک کا حصہ خرید سکتا ہے جو شرکت سے علیحدہ ہونا چاہ رہا ہے، کیونکہ یہ بات پیچھے آچکی ہے کہ ایک شریک کے نکلنے سے پوری شرکت کا ختم ہونا ضروری نہیں ہے، تاہم اس صورت میں الگ ہونے والے شریک کے حصہ (Share) کی قیمت باہمی رضامندی سے متعین کی جائے گی، لیکن اگر حصص کی قیمت کے تعین میں کسی قسم کا اختلاف پایا جائے اور شرکاء کسی ایک فیصلہ پر متفق نہ ہو پائیں، تو علیحدہ ہونے والا شریک بقیہ شرکاء کو اس بات پر مجبور کر سکتا ہے کہ یا تو شرکت کے تمام اثاثے نقد بنائے جائیں، اور پھر تقسیم عمل میں لائی جائے، یا ان اثاثوں کو اسی طرح (بغیر نقد بنائے) تقسیم کر لیا جائے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شرکاء عقدِ شرکت کی ابتداء میں کیا یہ طے کر سکتے ہیں کہ کسی ایک شریک کے شرکت سے علیحدہ ہونے کی صورت میں اس وقت تک تمام اثاثوں کو تقسیم نہیں کیا جائے گا، یا انہیں نقد نہیں بنایا جائے گا، جب تک شرکاء کی اکثریت انہیں تقسیم کرنے یا نقد بنانے پر رضامند نہ ہو اس شرط کے مطابق اگر کوئی شریک شرکت سے علیحدہ ہونا چاہے تو اس کے اپنے سرمایہ کو واپس لینے کی صرف ایک شکل ہوگی کہ وہ اپنا حصہ کسی دوسرے شریک کو فروخت کردے، اور وہ بقیہ شرکاء کو تمام اثاثے تقسیم کرنے یا نقد بنانے پر مجبور نہ کر سکے، کیا اس شرط کے ساتھ شرکت کرنا شرعاً جائز ہے؟

اسلامی فقہ کی روایتی کتب اس سوال پر خاموش دکھائی دیتی ہیں، تاہم شرعی نقطہ نظر سے اگر ایسی شرط ابتدائے عقد میں لگادی جائے تو بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی، موجودہ دور اور جدید حالات اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ایسی شرط عائد کرنے میں کوئی حرج نہ ہو، کیونکہ آج کل کی اکثر تجارتیں اس وقت کامیاب ہوتی ہیں جب ان میں بغیر کسی خلل کے پابندی اور مستقل مزاجی سے کام کیا جائے، اگر کسی ایک شریک کے شرکت سے علیحدہ ہونے پر کاروبار کے تمام اثاثے تقسیم کردیئے جائیں یا انہیں نقد بنادیا جائے تو اس میں بقیہ شرکاء کو ناقابل تلافی نقصان پہونچ سکتا ہے، خصوصاً اگر کوئی کاروبار بہت بڑی رقم سے شروع کیا گیا، اور کئی شرکاء نے مل کر اتنی بڑی رقم ایک طویل المیعاد منصوبہ (Long term project) کیلئے بطور سرمایہ کاری (Investment) لگائی، اور پھر اس منصوبے کے بالکل ابتدائی زمانے میں کوئی شریک تمام اثاثے نقد بنوانا چاہے تو اگر اسے اس بات کا غیر مشروط اختیار دیدیا جائے کہ وہ جب چاہے شرکت سے علیحدہ ہو کر تمام اثاثے تقسیم یا نقد کروالے تو یہ نہ صرف بقیہ تمام شرکاء کے لئے ایک عظیم نقصان کا باعث بنے گا، بلکہ ملک و ملت کی ترقی کے لئے ایک بڑی رکاوٹ اور خسارے کا سبب بنے گا، لہٰذا مذکورہ بالا شرط عائد کر کے بقیہ شرکاء کو عظیم ضرر اور نقصان سے بچانے میں کوئی شرعی قباحت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے:

,,المسلمون علی شروطهم إلا شرطا حرّم حلالاً أو أحلّ حراماً،،[1]

یعنی مسلمانوں پر آپس کی شرطوں کی پابندی لازم ہے، سوائے ایسی شرطوں کے جو حرام کو حلال اور حلال کو حرام بنادیں۔

(۱) بخاری (الإجارة) و الترمذی، جامع السنن (حدیث: ۱۲۷۲، الأحکام)۔

مضاربت کی تعریف اور اس کے احکام

مضاربت کا مطلب:

مضاربت دو فریقوں کے درمیان اس معاہدے کو کہتے ہیں جس کی رو سے ایک فریق سرمایہ کی فراہمی اپنے ذمہ لیتا ہے، اور دوسرا فریق اپنی محنت پیش کرتا ہے، اور نفع میں دونوں شریک ہوتے ہیں، صاحب مال کو رب المال اور سرمایہ کار کہتے ہیں، جبکہ عمل کرنے والے کو عامل اور مضارب کہتے ہیں اور جو مال لگایا جاتا ہے وہ راس المال اور سرمایہ کہلاتا ہے۔

مضاربت کی دو قسمیں:

مضاربت منعقد ہونے کیلئے ایجاب وقبول ضروری ہے اس ایجاب وقبول کے وقت اگر رب المال نے مضارب پر کوئی قید نہیں لگائی بلکہ اس سے یہ کہا کہ جس طرح چاہو تجارت کرو تو یہ مطلق مضاربت ہے، اور اگر کسی مخصوص تجارت کی شرط عائد کردی، مثلاً یہ کہا کہ کراچی میں تجارت کرنی ہوگی، تو یہ مضاربت مقیدہ کہلاتی ہے، اور اس صورت میں مضاربت کے لئے ان شرائط کی پابندی ضروری ہے[1]۔

مضارب مطلق مضاربت میں تجارت کے وہ تمام امور انجام دے سکتا ہے جو عرف عام میں تاجر کرتے ہیں[2]، اور اس کے لئے مستقل اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، البتہ سرمایہ کار کی اجازت کے بغیر کسی دوسرے کو مضاربت پر

---

(۱) ملاحظہ ہو: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية، مكتبه امداديه ملتان (۲۵۸:۳)، وإن خص له رب المال التصرف في بلد بعينه أو في سلعة بعينها لم يجز له أن يتجاوزها۔

(۲) حواله بالا، وإذا صحت المضاربة مطلقة جاز للمضارب أن يبيع ويشتري ويوكل ويسافر ويبضع ويودع۔ (۲۵۷:۳)۔

نہ مال دے سکتا ہے، اور نہ شرکت کر سکتا ہے، اسی طرح رب المال کی اجازت کے بغیر مضاربت کے مال میں اپنا مال نہیں ملا سکتا۔ (۱)

سرمایہ کی تفصیل

مضاربت میں سرمایہ رب المال فراہم کرتا ہے، اور مضارب کام کرتا ہے، لہذا رب المال کو چاہیے کہ وہ سرمایہ جو باہم عقد مضاربت میں طے ہوا ہے مضارب کو دیدے، اور پھر وہ سرمایہ مضارب کے پاس آنے کے بعد رب المال کے عمل دخل سے نکل جائے گا، البتہ اطمینان کے لئے وہ نگرانی کر سکتا ہے، اسی طرح مضارب کی اجازت سے وہ اس کے ساتھ کام بھی کر سکتا ہے (۲)۔

رہا یہ سوال کہ سرمایہ کیسا ہونا چاہیے، کیا سرمایہ نقد ہونا ضروری ہے، یا غیر نقدی اشیاء مثلاً سامان تجارت سرمایہ بن سکتا ہے؟ اس کے بارے میں مکمل تفصیل تو انشاء اللہ آگے ذکر کی جائے گی، البتہ اتنا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مضاربت بھی اسی سرمایہ سے درست ہوتی ہے جس سرمایہ سے شرکت، اور شرکت کے سرمایہ کے بارے میں احناف یہ فرماتے ہیں کہ سرمایہ نقدی کی شکل میں ہونا چاہیے، سامان یا زمین اور لوگوں کے ذمہ قرض کو سرمایہ نہیں بنایا جا سکتا، البتہ احناف کے علاوہ بعض فقہاء کرام کے مذہبوں میں غیر نقدی اشیاء مثلاً کوئی سامان وغیرہ کو بھی سرمایہ بنایا جا سکتا ہے، تمام مذاہب کی تفصیل انشاء اللہ آگے ذکر کی جائیگی (۳)۔

جیسا کہ ابھی ذکر ہوا کہ احناف کے نزدیک غیر نقدی اشیاء مثلاً سامان کو مضاربت کا سرمایہ تو نہیں بنایا جا سکتا، البتہ اگر رب المال کوئی سامان مضارب کو دیکر یہ کہے کہ تم یہ سامان فروخت کر دینا اور اس سے جو رقم حاصل ہو اسے بطور

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية، مكتبہ امدادیہ ملتان (۳:۲۵۸)، ولا يضارب إلا بإذن يأذن له رب المال، أو يقول له: اعمل برأيك، إلى قوله: وكذا الشركة والخلط بمال نفسه فيدخل تحت هذا القول: (أي اعمل برأيك ۳:۲۵۸)۔

(۲) حواله بالا، ولا بد أن يكون المال مسلما إلى المضارب ولا يد لرب المال فيه، (۳:۲۵۶)۔

(۳) حواله بالا، ولا تصح إلا بالمال الذي تصح به الشركة، (۳:۲۵۶)۔

سرمایہ مضاربت میں لگادینا تو یہ صورت جائز ہے[1]، اسی طرح اگر رب المال مضارب سے یہ کہدے کہ فلاں آدمی کے ذمہ میرا قرض ہے تم اس سے وصول کر لو، اور وصول کرنے کے بعد اس سرمایہ کو مضاربت میں لگادو تو بھی جائز ہے[2]، تاہم ان تمام صورتوں میں سرمایہ کی مقدار متعین کرنا ضروری ہے کہ اتنے اتنے پیسے تم مضاربت میں لگانا، لیکن اگر سرمایہ کی مقدار متعین نہ کی جائے بلکہ وہ مبہم رہے تو یہ مضاربت صحیح نہ ہو گی۔[3]

مضاربت کے اخراجات

مضاربت کے اندر مضارب کو صرف منافع میں سے حصہ ملتا ہے، عام دنوں میں اس کے کھانے، پینے، لباس، سواری یادوائی کا خرچہ مضاربت کے سرمایہ میں سے وصول نہیں کیا جائے گا، البتہ اگر مضارب کسی ایسے سفر پر تجارت کی غرض سے گیا جہاں پر اسکو رات گذارنی پڑی، تو اس صورت میں مذکورہ بالا اخراجات کا خرچہ مضاربت کے سرمایہ میں سے ادا کیا جائے گا، لیکن اگر وہ کسی ایسے سفر پر گیا جہاں پر رات نہ گذاری بلکہ دن دن میں ہی لوٹ آیا تو پھر اس کے ان اخراجات کا خرچہ مضاربت کے مال میں سے ادا نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ اتنے لمبے سفر پر ہی کیوں نہ گیا ہو جو سفر شرعی میں داخل ہے، یعنی اڑتالیس میل سے زائد۔[4]

اسی طرح اگر تجارت کے دوران مضارب کو مزدوروں اور ملازمین کی اجرت یا خرید و فروخت کے اندر کمیشن یا

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغیناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، مكتبه امداديه ملتان، ولو دفع إليه عرضا وقال: بعه واعمل مضاربة في ثمنه جاز، (۳:۲۵٦)۔

(۲) حوالہ بالا، وكذا إذا قال له: اقبض مالي على فلان واعمل به مضاربة جاز، (۳:۲۵٦)۔

(۳) ملاحظہ ہو: المجلة، يشترط في المضاربة كشركة العقد كون رأس المال معلوما، (ص: ۲۷۲، مادة:۱٤۱۱۔

(۴) دیکھیئے: الشامي ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی وإذا سافر ولو يوما (فطعامه وشرابه وكسوته وركوبه وكل ما يحتاجه عادة) اى في عادةالتجار بالمعروف (في مالها)۔ تحت قوله: ولو يوما: لأن العلة في وجوب النفقة حبس ضمه لأجلها فعلم أنه ليس المراد بالسفر الشرعي بل المراد أن لا يمكنه المبيت في منزله فإن أمكن أن يعود إليه في ليلة فهو كالمصر لا نفقة له بحر۔ (الدر المختار ٥:٦٥٧)۔

رنگریز، درزی اور دھوبی کی اجرت دینا پڑے تو وہ بھی مضاربت کے سرمایہ میں سے ادا کی جائے گی، البتہ تمام اخراجات کو اس سامان کی قیمت میں شامل کر دیا جائے گا جو مضارب فروخت کر رہا ہے، چنانچہ اگر مثلاً وہ سلے سلائے کپڑے فروخت کر رہا ہے تو وہ سلائی کی اجرت، دھلائی کی اجرت اور کپڑے کی قیمت تینوں ملا کر سلے ہوئے کپڑے کی قیمت مقرر کر سکتا ہے[1]۔

مضارب اگر اپنے شہر کے اندر رہتے ہوئے تجارت کرے تو اس کا نفقہ یا کھانے پینے، لباس پوشاک، سواری اور دوائی کا خرچہ مالِ مضاربت میں سے نہیں ادا کیا جائے گا، بلکہ اگر اسے نفع حاصل ہوا تو وہ صرف اس نفع میں حصہ دار ہوگا، جو اس نے رب المال کے ساتھ طے کیا تھا، اسی طرح اگر مضارب نے دورانِ تجارت کوئی اجیر یا ملازم رکھا، تو اسکی تنخواہ مضاربت کے سرمایہ سے ادا کی جائے گی، لیکن اسکا بھی کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات کا نفقہ اس مضاربت کے سرمایہ میں سے ادا نہیں کیا جائے گا، بلکہ اسکو صرف تنخواہ ہی ملے گی، جس کے ذریعہ وہ اپنے اخراجات پورے کر سکتا ہے۔

اگر مضاربت کا عقد کسی وجہ سے فاسد ہو گیا تو اس صورت میں مضارب اجیر کی مانند ہوگا، یعنی اسے کسی بھی صورت میں خواہ وہ سفر پر جائے یا اپنے شہر میں تجارت کرے اجرت مثل کے علاوہ کوئی نفقہ یا خرچہ مضاربت کے سرمایہ میں سے نہیں دیا جائیگا[2]، اور اجرت مثل کا مطلب یہ ہے کہ اسکو اس تجارت یا کام کی اتنی اجرت یا تنخواہ دی جائے گی

---

(۱) ملاحظہ ہو: الحصکفی، محمد امین الشهير بابن عابدين، رد المحتار على الدر المختار، ایچ ایم سعید کمپنی، وإن باع المتاع مرابحة حسب ما أنفق على المتاع من الحملان وأجرة السمسار، والقصار والصباغ ونحوه مما اعتيد ضمير وبقول البائع قام على بكذا وكذا يضم إلى رأس المال ما يوجب زياده فيه حقيقة أو حكما أو اعتاده التجار كأجرة السمسار هذا هو الأصل لا يضم ما انفقه على نفسه لعدم الزيادة والعادة ، تحته: قد سبق في المرابحة أن العبرة في الضم لعادة التجار فإذا أجرت بضم ذلك يضم۔ (الدرالمختار ۵:۶۵۸، المضاربة)

(۲) دیکھئے: و المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) على بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، مكتبه امداديه ملتان: وإذا عمل المضارب في المصر فليست نفقته في المال وإن سافر فطعامه وشرابه وكسوته وركوبه في

جتنی عموماً اس قسم کے کام میں کسی آدمی کو دیجاتی ہے، البتہ (جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے) وہ اجرت اس منافع سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے جو اسکو صحیح مضاربت کی صورت میں ملتا، اسی طرح ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ اجرت مثل فاسد مضاربت میں اسوقت دی جاتی ہے جب کوئی نفع حاصل ہوا ہو، لیکن اگر اس صورت میں کوئی نفع ہی نہیں ہوا تو پھر کوئی اجرت نہیں دی جائے گی[1]۔

نفع اور نقصان کی تقسیم

جب مضاربت کا عقد کیا جائے تو شرکت العقد کی طرح دونوں شرکاء، یعنی مضارب اور رب المال کے لئے ضروری ہے کہ نفع کی تقسیم کی شرح طے کرلیں کہ کون کتنا نفع لے گا، لیکن اگر انہوں نے عقد کی ابتدا میں یہ طے نہ کیا کہ کون کتنا لے گا تو وہ نفع دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا۔

نفع طے کرنے کے دوران ایک بات یہ پیش نظر رہنی چاہیے کہ نفع کی کوئی مقدار اسطرح متعین نہ کی جائے کہ مثلاً میں کل نفع میں سے سو روپے لوں گا، یا تم مجھے ہر مہینہ ایک ہزار روپے دینا، بلکہ نفع اس طرح طے کیا جائے کہ کل نفع کا ایک تہائی، ایک چوتھائی، یا نصف مضارب لے گا، اور باقی رب المال لے گا، یا اس طرح طے کیا جائے کہ کل نفع کا چالیس فیصد یا پچاس فیصد مضارب کو اور بقیہ رب المال کو ملے گا۔

المال، ووجه الفرق أن النفقه تجب بإزاء الاحتباس كنفقة القاضی ونفقة المرأة والمضارب فی المصر ساكن بالسكنی الأصلی، وإذا سافر صار محبوسا بالمضاربة، فيستحق النفقة فيه، وهذا بخلاف الأجير لأنه يستحق البدل لامحالة، فلا يتضرر بالإنفاق من ماله، أما المضارب فليس له إلا الربح وهو فی حيز التردد، فلو أنفق من ماله يتضرر به، وبخلاف المضاربة الفاسدة لأنه أجير،(۲۶۷:۳)۔

(۱) ملاحظہ ہو: مجلة الأحكام العدلية مع شرح مجلة الأحكام، مكتبه اسلاميه ،كوئٹه ۱۴۰۳ھ، استحقاق رب المال للربح بماله فيكون جميع الربح له فی المضاربة الفاسدة والمضارب بمنزلة أجيره يأخذ أجر المثل، لكن لا يتجاوز المقدار المشروط حين العقد ولا يستحق أجر المثل إن لم يكن ربح۔ (۲۷۵)۔

اسی طرح ایک بات یہ بھی ضروری ہے کہ سرمایہ کی نسبت سے نفع مقرر نہ کیا جائے، مثلاً یہ کہ سرمایہ کا نصف یا ایک تہائی مضارب لے گا، اور بقیہ رب المال لے گا۔

خلاصہ یہ کہ کسی ایک کے لئے نفع کی مخصوص مقدار مقرر کرنے سے مضاربت فاسد ہو جائے گی[1]۔

اگر کسی وجہ سے مضاربت فاسد ہو جائے تو تمام سرمایہ نفع سمیت رب المال کو دیا جائے گا، اور مضارب اجیر (ملازم) کی مانند ہوگا، اور اس کو اجرت مثل دی جائیگی، یعنی مضارب نے جو کچھ محنت کی اور کمایا اگر اس کے لئے کسی شخص کو ملازم رکھا جاتا اور اس کو جو تنخواہ دی جاتی وہی تنخواہ یا اجرت اسی مضارب کو ملے گی، البتہ وہ اجرت مثل نفع کی اس مقررہ مقدار سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے جو رب المال اور مضارب نے طے کی تھی، مثلاً اگر مضارب اور رب المال نے مضاربت میں نفع نصف نصف طے کیا، اور نفع ایک ہزار روپے ہوا، تو مضارب کو پانچ سو روپے ملنے چاہییں، لیکن چونکہ وہ مضاربت کسی وجہ سے فاسد ہو گئی ہے، لہٰذا اب اسکو نفع کے بجائے اجرت مثل دی جائے گی، اور وہ اجرت مثل اس صورت میں پانچ سو سے زیادہ ہونی چاہیے۔

مضاربت فاسدہ میں مضارب کو نفع کے بجائے اجرت دینے کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس تجارت میں نفع ہوا ہو، لیکن اگر نفع نہیں ہوا تو مضارب کو بالکل اجرت مثل نہیں دی جائیگی، لہٰذا اگر مثلاً زید اور عمر نے ایک ہزار روپے پر مضاربت کا معاملہ کیا، زید رب المال تھا اور عمر مضارب، کسی وجہ سے مضاربت فاسد ہو گئی تو اگر اس مضاربت میں بالکل

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المجلة، يشترط في المضاربة كشركة العقد كون رأس المال معلوما وتعيين حصة العاقدين من الربح جزءًا شائعا كالنصف والثلث لكن إذا عبر بالشركة على الإطلاق كقوله: والربح مشترك بيننا، فيكون مصروفا إلى المساواة ويقسم الربح مناصفة بين رب المال والمضارب، إذا فقد شرط من هذه الشروط المذكوره مثلاً إذا لم تكن حصة العاقدين من الربح جزءًا شائعا بل تعين لأحدهما من الربح كذا قرشا فتفسد المضاربة۔(۲۷۲)، و المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن على بن عبد الجليل ، الهداية ، مكتبه امداديه ملتان، ومن شرطها أن يكونالربح بينهما مشاعا، لا يستحق أحدهما مسماة من الربح، (۳:۲۰۶)۔

نفع نہ ہوا تو سارا سرمایہ زید کو واپس دیا جائیگا، اور عمر کو کچھ نہیں ملے گا[۱]۔

اگر مضاربت میں خواہ وہ مضاربت صحیح ہو یا فاسد کسی قسم کا کوئی نقصان ہو جائے، مثلاً کوئی چیز تلف ہو جائے تو اس نقصان کی تلافی اولاً نفع میں سے کی جائے گی، پھر اگر سارا نفع پورا ہو جائے اور نقصان باقی رہے تو پھر اسکی تلافی سرمایہ میں سے کی جائے گی، اور مضارب کے اوپر کوئی ضمان یا تاوان نہیں آئے گا[۲]۔

اگر مضاربت کے پورے کاروبار میں خسارہ ہو گیا اور نفع بالکل نہ ہوا تو وہ خسارہ صرف رب المال کا سمجھا جائے گا، اور مضارب پر اسکا کوئی تاوان نہیں آئیگا، چاہے وہ دونوں ابتداء میں یہ طے کریں کہ اگر خسارہ ہوا تو وہ دونوں کا سمجھا جائے گا، اس طے کرنے کا کوئی اعتبار نہیں ہو گا، خسارہ صرف رب المال کا ہو گا، الا یہ کہ مضارب نے کسی غفلت، لاپروائی سے شرائط کی خلاف ورزی یا بد دیانتی کا ارتکاب کیا ہو اور اسکی بنا پر نقصان ہوا ہو، تو جتنا نقصان ان اسباب کی وجہ سے ہوا، اسکی ذمہ داری مضارب پر ہو گی۔

مضاربت کا اختتام

مضاربت کی اگر کوئی مدت مقرر ہوئی ہے تو مدت پوری ہونے سے مضاربت خود ختم ہو جائے گی[۳]۔

---

(۱) ملاحظہ ہو: المجلة، استحقاق رب المال للربح بماله فيكون جميع الرب له في المضاربة الفاسدة والمضارب بمنزلة أجيره يأخذ أجر المثل لكن لا يتجاوز المقدار المشروط حين العقد ولا يستحق أجر المثل إن لم يكن ربح (۲۷۵)۔

(۲) دیکھئے: المجلة، إذا تلف مقدار من مال المضاربة فيحسب في أول الأمر من الربح ولا يسر إلى رأس المال، وإذا تجاوز مقدار الربح وسرى إلى رأس المال فلا يضمنه المضارب سواء كانت المضاربة صحيحة أو فاسدة، على كل حال يكون الضرر والخسارة عائدا إلى رب المال، وإذا شرط كونه مشتركا بينه وبين المضارب فلا يعتبر ذلك الشرط، (۲۷۶)۔

(۳) مزید دیکھئے: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) علي بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية، مكتبه امداديه ملتان، وكذلك إن وقت للمضاربة وقتا بعينه يبطل العقد بمضيه، (۲۵۹:۳)۔

اگر سرمایہ کار نے مضارب کو معزول کیا تو جب تک مضارب کو اس کا علم نہیں ہوگا، وہ مضارب ہی رہے گا، اور اس کا عمل مضاربت میں شمار ہوگا۔[1]

مضاربت کا حساب کر کے اسے اس طرح ختم کیا جائے گا کہ مضاربت کے تمام سامان کو فروخت کر کے رقم نقدی کی صورت میں لائی جائے گی، مضاربت کے جو قرض اور واجب الاداء رقوم لوگوں کے ذمہ ہیں وہ وصول کی جائیں گی[2]، مضارب اور سرمایہ کار نے دوران مضاربت جو نفع علی الحساب وصول کر لیا تھا، اسے بھی شمار کیا جائے گا، اور جب کل سرمایہ حاصل ہو جائے گا تو اسمیں سے سرمایہ کار کا سرمایہ الگ کیا جائے گا، بقیہ رقم نفع کہلائیگی، اور یہ نفع مضارب و سرمایہ کار میں مقررہ قرارداد کے مطابق تقسیم ہوگا، اگر کچھ رقم باقی نہ بچے تو مضارب کو کچھ نہ ملے گا، اور اگر سرمایہ کار کی اصل سرمایہ کی رقم بھی پوری نہ ہوئی تو دورانِ مضاربت اگر مضارب و سرمایہ کار نے نفع وصول کیا تھا وہ واپس لے کر سرمایہ میں ملایا جائے گا، اور اگر اصل سرمایہ پورا ہو کر کچھ رقم باقی بچ گئی تو وہ نفع ہے، اسے تقسیم کر لیا جائے گا، ورنہ مضارب کو کچھ نہیں ملے گا[3]۔

اگر سرمایہ کار یا مضارب وفات پا جائے یا پاگل ہو جائے تو مضاربت ختم ہو جائے گی۔

مضارب کی مختلف حیثیتیں

مضارب مختلف حالات میں مختلف حیثیتوں کا حامل ہوتا ہے، چنانچہ اسکی مندرجہ ذیل حیثیتوں کو واضح طور پر

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغینانی، (برھان الدین ابو الحسن) علی بن عبد الجلیل أبو بکر الرشدانی، الهدایة، مکتبہ امدادیہ ملتان: وإن عزل رب المال المضارب ولم یعلم بعزله حتی اشتری وباع فتصرفه جائز، وإن علم بعزله والمال عروض فله أن یبیعها ولا یمنعه العزل عن ذلك، (۳:۲٦٤)۔

(۲) حوالہ بالا: وإذا افترقا وفی المال دیون وقد ربح المضارب فیه أجبره الحاکم علی اقتضاء الدیون، (۳: ٢٦٤)۔

(۳) حوالہ بالا: وما هلك من مال المضاربة فهو من الربح دون رأس المال، فإن زاد الهالك علی الربح فلا ضمان علی المضارب لأنه أمین، وإن کانا یقتسمان الربح والمضاربة بحالها ثم هلك المال بعضه أو کله ترادا الربح حتی یستوفی رب المال رأس المال۔ (۳: ٢٦٤)۔

ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

۱۔ امین (Trustee): سب سے پہلے مضارب رب المال کے دیئے ہوئے سرمایہ کا امانت دار (امین) ہے، امین کا شرعی حکم یہ ہوتا ہے کہ وہ سرمائے کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہ کرے، اور اس کے باوجود کسی آسمانی آفت سے سرمایہ برباد ہو جائے تو اس پر کوئی تاوان نہیں آتا، مضارب بھی چونکہ امین ہے اس لئے کسی آسمانی آفت کے نتیجہ میں اگر سرمایہ برباد ہو جائے یا کم ہو جائے تو وہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے، البتہ اگر یہ نقصان اسکی کسی غفلت، کوتاہی یا بے تدبیری یا رب المال کی عائد کردہ شرائط کی مخالفت کی وجہ سے ہو تو پھر اس کے ذمہ تاوان آتا ہے[1]۔

۲۔ وکیل (Agent): مضارب کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ رب المال کے سرمایہ کو تجارت میں استعمال کرنے کے لئے رب المال کا وکیل (Agent) ہے، اور رب المال اس کا موکل (principal) ہے، لہذا اس حیثیت میں اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے موکل یعنی رب المال کی تمام ہدایات کی پابندی کرے[2]۔

۳۔ شریک (Partner): مضارب کی تیسری حیثیت یہ ہے کہ جب تجارت کرنے کے نتیجہ میں سرمایہ بڑھ جائے یعنی نفع حاصل ہو جائے تو اس نفع میں وہ رب المال کا شریک ہے، اور طے شدہ تناسب سے نفع وصول کرنے کا حقدار ہے[3]۔

۴۔ ضامن (Liable): مضارب کی چوتھی حیثیت اس وقت سامنے آتی ہے، جب وہ کاروبار میں کسی غفلت، کوتاہی، بد دیانتی یا شرائط کی کسی خلاف ورزی کا مرتکب ہو، اس صورت میں وہ اپنی غلطیوں کے نتیجہ میں ہونے والے نقصان کا ذمہ دار ہوتا ہے، یعنی اگر مذکورہ افعال کے نتیجہ میں کاروبار میں نقصان ہو گیا تو مضارب کے لئے ضروری ہے کہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) على بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، مكتبہ امدادیہ ملتان، ثم المدفوع إلى المضارب أمانة في يده، لأنه قبضه بأمر مالكه۔(۳، ۲۰۵)۔

(۲) وهو وكيل فيه لأنه يتصرف فيه بأمر مالكه (۳:۲۰۵)۔

(۳) دیکھیے: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) على بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، مكتبہ امدادیہ ملتان: وإذا ربح فهو شريك فيه لتملكه جزءاً من المال بعمله، (۳:۲۰۵)۔

وہ رب المال کے نقصان کی تلافی کرے[1]۔

۵۔ اجیر (Employee): مضارب کی پانچویں حیثیت اسوقت سامنے آتی ہے، جب مضاربت کے معاہدے میں کسی شرعی نقص کی وجہ سے مضاربت فاسد ہو جائے، اس صورت میں مضارب طے شدہ نفع کے بجائے اتنی اجرت کا حقدار ہوتا ہے جو اس قسم کے کام کے لئے عام طور سے بازار میں لوگوں کو دیجاتی ہے۔

فرض کیجئے کہ زید نے ایک لاکھ روپے عمر کو دے کر اس سے مضاربت کا معاملہ کیا، لیکن فریقین کے لئے نفع کا کوئی فیصد حصہ طے کرنے کے بجائے رب المال نے یہ کہدیا کہ میں بہر صورت دس ہزار روپے ماہانہ لیا کروں گا، معاہدے کی یہ شرط چونکہ شرعی احکام کے منافی ہے، اسلئے اس شرط کے نتیجہ میں مضاربت فاسد ہو گئی، اب اگر عمر نے مضاربت کے فاسد ہونے کے باوجود ایک لاکھ کے سرمایہ سے تجارت کی اور اس سے نفع حاصل ہوا تو وہ مضارب کی حیثیت میں نفع کا حقدار نہیں ہوگا، البتہ اس صورت میں وہ زید کا اجیر سمجھا جائے گا، اور اتنی اجرت یا تنخواہ کا مستحق ہوگا جو عام طور سے اس قسم کے کام پر اس جیسے آدمی کو دی جاتی ہے، دوسرے الفاظ میں اگر زید عمر کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرنے کے بجائے اسے اپنے کاروبار کے مینیجر کے طور پر ملازم رکھتا تو بازار کے عام معیار کے لحاظ سے اس کو کتنی تنخواہ یا اجرت دیتا، بس اتنی ہی تنخواہ یا اجرت اب مضارب کو دینی ہوگی، لیکن اگر نفع نہ ہو تو مضارب کو کوئی تنخواہ یا اجرت نہیں ملے گی[2]۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: المرغيناني، (برهان الدين ابو الحسن) على بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، مكتبه امداديه ملتان، ثم المدفوع إلى المضارب أمانة في يده، لانه قبضه بأمر مالكه (۳:۲۵۵)۔

وفيه أيضا، الوديعة أمانة في يد المودع إذا هلكت لم يضمنها لقوله عليه السلام: ليس على المستعير غير المغل ضمان، ولا على المستودع غير المغل ضمان، (۳:۲۷۱)۔

وأيضا فيه، وإن خص رب المال التصرف في بلد بعينه أوفي سلعة بعينها لم يجز له أن يجاوزها، فإن خرج إلى غير تلك البلدة فاشترى ضمن، وكان ذلك له وله ربحه۔ (۳:۲۵۸)۔

(۲) دیکھئے: المجلة، استحقاق رب المال للربح بماله فيكون جميع الربح له في المضاربة الفاسدة والمضارب بمنزلة أجيره يأخذ أجر المثل لكن لا يتجاوز المقدار المشروط حين العقد ولا يستحق أجر المثل إن لم يكن ربح، (۲۷۵)۔

مشارکہ یعنی شرکت اور مضاربہ کا مجموعہ اور اس کے احکام

مضاربہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص پیسہ لگاتا ہے، جسے رب المال کہتے ہیں اور دوسرا شخص اس کے ذریعہ تجارت کرتا ہے، جسے مضارب کہا جاتا ہے، عموماً مضارب اپنے پاس سے پیسے نہیں لگاتا، بلکہ رب المال سے سرمایہ لے کر کاروبار کرتا ہے، لیکن اگر مضارب بھی اپنا کچھ سرمایہ اسی کاروبار میں لگانا چاہے تو اس معاملے میں مضاربت کے ساتھ شرکت بھی جمع ہو جائے گی، مثلاً اگر زید (رب المال) نے عمر (مضارب) کو ایک لاکھ روپے بطور مضاربہ دیئے، اسمیں عمر (مضارب) نے اپنے پاس سے پچاس ہزار روپے اور شامل کر لئے تو یہ معاملہ شرکت اور مضاربت دونوں کا مجموعہ ہوگا۔

یہ صورت بھی شرعی اعتبار سے جائز ہے، اور اس صورت میں مضارب کے لئے جائز ہے کہ وہ نفع میں دو حیثیتوں سے شریک ہو، ایک شریک کی حیثیت سے، کیونکہ اس نے اپنا سرمایہ بھی لگایا ہے، اور ایک مضارب کی حیثیت سے، کیونکہ وہ اپنے رب المال کے روپے سے کاروبار میں محنت کر رہا ہے، ان دونوں حیثیتوں کے لحاظ سے ایسے مضارب کے لئے منافع کا الگ الگ فی صد حصہ مقرر کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اس صورت میں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ مضارب کے لئے جو حصہ بحیثیت مضارب مقرر کیا جائے، اس میں تو دونوں فریق آزاد ہیں، جتنا فی صد حصہ چاہے مقرر کرلیں، چنانچہ باہمی رضامندی سے یہ بات طے کی جاسکتی ہے کہ رب المال کا حصہ زیادہ اور مضارب کا حصہ کم ہوگا، لیکن جو حصہ بحیثیت شریک مقرر کیا جائے اس میں ان تمام احکام کی رعایت ضروری ہوگی، جو پیچھے شرکت کے منافع کی تقسیم کے زیر عنوان بیان کئے گئے ہیں، لہذا چونکہ یہ بات طے ہے کہ شرکت والے حصہ میں بھی صرف مضارب ہی محنت کرے گا رب المال محنت نہیں کرے گا اس لئے شریک کی حیثیت میں مضارب کا حصہ نفع اس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے کم مقرر نہیں کیا جاسکتا، مثال سے اس بات کی وضاحت ہوگی:

فرض کیجئے زید نے عمر کو ایک لاکھ روپے بطور مضاربت دئے، اور پچاس ہزار روپے عمر نے اپنی طرف سے (زید کی

رضامندی سے) اسی کاروبار میں شامل کر لئے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ کاروبار کے کل سرمایہ میں ایک تہائی حصہ عمر کا ہے، اور دو تہائی حصہ زید کا ہے، زید کے دو تہائی حصے (ایک لاکھ) میں عمر مضارب ہے، اور مضارب ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے لئے نفع کا کوئی بھی تناسب باہمی رضامندی سے طے کر سکتے ہیں، لیکن جو ایک تہائی سرمایہ عمر نے خود لگایا ہے، اس میں عمر کے نفع کا حصہ ایک تہائی سے کم نہیں ہو سکتا، کیونکہ اگر اس کا حصہ ایک تہائی سے کم مقرر کیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ زید کا حصہ دو تہائی سے بڑھ گیا، حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ کاروبار میں کام نہیں کرے گا، اور شرعاً نفع میں اس کا حصہ اس کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے زیادہ مقرر نہیں کیا جا سکتا جیسا کہ پیچھے اسکی تفصیل گذر چکی ہے۔

اب مذکورہ مثال میں اگر یہ بات طے کی گئی کہ عمر کو شریک کی حیثیت میں ایک تہائی نفع ملے گا، اور باقی دو تہائی مضاربت کی وجہ سے زید اور عمر میں آدھا آدھا تقسیم کیا جائے گا، تو اگر کاروبار کا کل نفع ایک سو پچاس فرض کیا جائے تو اس میں ایک تہائی یعنی پچاس عمر کو شریک کی حیثیت میں ملیں گے، اور باقی دو تہائی کا آدھا حصہ یعنی پچاس اس کو مضارب کی حیثیت میں ملیں گے، اور باقی پچاس زید کو رب المال کے طور پر دیئے جائیں گے۔

اس بات کو مندرجہ ذیل نقشہ کی مدد سے بھی سمجھا جا سکتا ہے:

مذکورہ بالا صورت کے جائز ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں اگر چاروں اماموں کے مذاہب پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف امام مالکؒ کے نزدیک یہ صورت جسے شرکت اور مضاربت کا مجموعہ بھی کہا جا سکتا ہے مکروہ

تحریمی یا نا جائز ہے، البتہ ان کے علاوہ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک عقد کی یہ صورت بالکل جائز ہے، مندرجہ ذیل عبارتوں اور حوالوں سے یہ بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

احناف کا مذہب:

شمس الائمہ سرخسیؒ تحریر فرماتے ہیں:

,,خلط ألف المضاربة بألف من ماله قبل الشراء جاز،،
یعنی اگر کسی نے مضاربت کے ایک ہزار روپے کے ساتھ اپنے مال کے ایک ہزار روپے خریداری سے پہلے ملا دئے تو جائز ہے[۱]۔

شوافع کا مذہب:

شوافع کے مذہب میں بھی عقد کی یہ صورت جائز ہے، چنانچہ علامہ رملی شافعیؒ تحریر فرماتے ہیں:

,,ولو خلط ألفين له بألف لغيره، ثم قال له فارضتك على أحدهما وشاركتك في الآخر جاز،،
اگر کسی نے اپنے دو ہزار روپے دوسرے شخص کے ایک ہزار روپے سے ملائے، اور کہا کہ ان دو ہزار میں سے ایک ہزار بطور قراض (مضاربت) ہیں، اور دوسرے ایک ہزار تمہارے ایک ہزار روپے کے ساتھ شرکت کے عقد کے طور پر ہیں تو یہ صورت جائز ہے[۲]۔

حنابلہ کا مذہب:

---

(۱) السرخسی، المبسوط (۱۳۳:۲۲)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الرملی، محمد بن احمد ۱۰۰۴ھ، نہایۃ المحتاج، بیروت، احیاء التراث العربی (۵: ۲۲۰)، مزید ملاحظہ ہو: ابن حجر المکی، تحفۃ المحتاج (۴۱۷:۴)۔

امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک بھی شرکت اور مضاربت کو ایک عقد میں جمع کرنا جائز ہے۔

المغنی لابن قدامہ میں ذکر کیا گیا ہے:

القسم الرابع: أن يشترك مالان وبدن صاحب أحدهما، فهذا يجمع شركة ومضاربة وهو صحيح، فلو كان بين رجلين ثلاثة آلاف درهم، لأحدهما ألف، وللآخر ألفان، فأذن صاحب الألفين لصاحب الألف، يتصرف فيها على أن الربح بينهما نصفين صح، ويكون لصاحب الألف ثلث الربح بحق ماله والباقي هو ثلثا الربح بينهما[1]۔

چوتھی قسم یہ ہے کہ دو آدمیوں کا مال مشترک ہو، اور انہی میں سے ایک شخص کا بدن (عمل) استعمال ہو یہ صورت شرکت اور مضاربت کا مجموعہ ہے، اور یہ صحیح ہے چنانچہ اگر دو افراد کے درمیان تین ہزار درہم میں شرکت ہو، اور ان میں سے ایک کے ایک ہزار اور دوسرے کے دو ہزار ہوں، اور دو ہزار والے نے ایک ہزار والے کو تصرف (اور کام کرنے) کی اجازت دیدی ہو، اور یہ طے کیا ہو کہ نفع باہم نصف نصف تقسیم ہوگا، تو یہ صورت صحیح ہے، ایک ہزار والے شخص کو منافع کا ایک تہائی اس کے مال کی وجہ سے ملے گا، اور باقی دو تہائی ان دونوں کے درمیان نصف نصف تقسیم ہو جائے گا۔

امام مالکؒ کی بعض تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا صورت انکے نزدیک مکروہ ہے، چنانچہ المدونہ الکبری میں ذکر کیا گیا ہے:

,,قلت: فإن أخرج أحدهما ألف درهم، والآخر ألفي درهم، فاشتركا على أن الربح بينهما نصفين والوضيعة بينهما نصفين، أو اشترطا أن الوضيعة

(۱) ا بن قدامة المقدسی(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد)،المغنی، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ (۲۷:۵)۔

والربح على قدر رؤوس أموالهما على أن يعمل صاحب الألف بجميع المال وحده، ويكون عليه العمل وحده؟ قال مالكؒ: لا خير في هذه الشركة،،[1]

میں نے عرض کیا کہ اگر ان دو افراد میں سے کسی ایک نے ایک ہزار روپے اور دوسرے نے دو ہزار روپے نکالے اور اس طرح شراکت کی کہ نفع و نقصان باہم نصف نصف تقسیم کریں گے، یا یہ طے کیا کہ نفع و نقصان سرمایہ کے تناسب سے تقسیم ہو گا، اور کام کے بارے میں یہ طے کیا کہ ایک ہزار والا کام کرے گا اور سارے مال میں اکیلا تجارت کرے گا کیا یہ صورت جائز ہے؟ امام مالکؒ نے ارشاد فرمایا: اس شرکت میں کوئی خیر نہیں ہے۔

---

(۱) مالك، مالك بن انس الأصبحي، رواته الإمام سحنون التنوخي، المدونة الكبرى، دار الكتب العلمية، بيروتؒ (۶۰۹:۳)، وأيضا فيه: قلت: هل يجوز أن أخرج ألف درهم ورجل آخر ألف درهم، فنشترك على أن الربح بيننا نصفين والوضيعة علينا نصفين، على أن يعمل أحدنا دون صاحبه؟ قال مالك: لا تجوز هذه الشركة بينهما إلا أن يستويا في رأس المال وفي العمل، (۶۰۹:۳)۔

تیسرا باب
شرکت سے متعلق قابل تحقیق عصری مسائل

تیسرا باب: شرکت سے متعلق قابل تحقیق عصری مسائل

کیا سرمائے کا نقد ہونا ضروری ہے؟

شرکت کے اندر سرمایہ کیسا ہونا چاہیے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ جو لوگ شرکت قائم کریں ان میں سے ہر شخص اپنی سرمایہ کاری کا حصہ نقد فراہم کرے؟ یا کوئی شریک اپنا حصہ جنس کی صورت میں بھی دے سکتا ہے؟ اس کے بارے میں فقہاء کرامؒ کی آراء مختلف ہیں۔

احناف کا مذہب:

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جنس (سامان) کی شکل میں سرمایہ لگا کر شرکت العقد وجود میں لانا جائز نہیں خواہ وہ سامان مثلی اشیاء میں سے ہو خواہ قیمتی اشیاء میں سے ہو۔[1]

مالکیہ کا مذہب:

اس کے برعکس مالکیہ کے نزدیک جنس کی شکل میں سرمایہ فراہم کر کے شرکت مطلقاً جائز ہے، خواہ وہ سامان

(۱) ملاحظہ ہو: الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (۵۹:۶)، لا تصح الشركة فی العروض۔
و مجلة الأحكام العدلیه،جماعة العلماء،نور محمد کتب خانه،کراچی، لا تصح الشركة على الأموال التى ليست معهودة من النقود كالعروض، والعقار، أى لاتجوز أن تكون هذه رأس مال للشركة (۱۳۴۲:۴)
و السرخسی ،محمد بن أحمد بن أبی سهل شمس الأئمه الإمام الكبير أبو بكر، المبسوط للسرخسی ۱۹۴-۲۵۶ إدارة القرآن كراچی (۱۱: ۱۵۹)۔

مثلیات میں سے ہو، خواہ قیمیات میں سے ہو، نیز یہ بھی جائز ہے کہ دونوں شریک اپنا سرمایہ جنس کی صورت میں فراہم کریں اور یہ بھی جائز ہے کہ ایک شریک نقد روپیہ لائے اور دوسرے کا سرمایہ جنس کی شکل میں ہو۔[1]

مالکیہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شریک سامان کی صورت میں سرمایہ فراہم کرے تو اس کے حصہ کا تعین اس سامان کی بازاری قیمت کی بنیاد پر کیا جائیگا[2]، مثلاً اگر زید اور بکر نے شرکت العقد اس طرح کیا کہ دونوں ایک ایک کار لے کر آئے جنکی قیمت ایک ایک لاکھ روپے تھی، اور دونوں نے یہ کہا کہ ہم اپنی ان دونوں کاروں میں شراکت کرتے ہیں اور اسکو بیچ کر تجارت کریں گے، تو یہ شرکت جائز ہے، کیونکہ یہ سمجھا جائیگا کہ دونوں نے اسکی مالیت یا قیمت ایک ایک لاکھ روپے میں شرکت کی ہے، چنانچہ اگر کسی وقت کاروبار ختم کرنا ہوا اور ان میں سے ایک کار فروخت ہو چکی ہو اور دوسری فروخت نہ ہوئی ہو، اور اسمیں پچاس ہزار روپے کا نفع بھی حاصل ہوا ہو تو وہ نفع کسی ایک کار والے کا نہیں ہوگا، بلکہ دونوں اس نفع کے برابر حق دار ہوں گے۔

شوافع کا مذہب:

شوافع نے عروض (سامان) کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ سامان اگر مثلیات میں سے ہو تو اس کے ذریعہ شرکت جائز ہے، اور اگر قیمیات میں سے ہو تو اس میں شرکت جائز نہیں، مثلیات سے مراد وہ اشیاء ہوتی ہیں جن کی مثل عموماً دستیاب ہو، چنانچہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی ملک میں سے ایسی چیز ضائع کر دے تو اسپر واجب ہوتا ہے کہ وہ اس جیسی کوالٹی کی چیز مالک کو لا کر دے، مثلاً انڈے، چاول یا گندم وغیرہ مثلیات میں داخل ہیں، اور قیمیات سے مراد وہ اشیاء ہوتی ہیں جن کی مثل ملنا مشکل ہو، لہذا ایسی چیز ضائع کرنے کی صورت میں اس جیسی چیز دینے

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الدردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغیر علی اقرب المسالك للدردیر، وتصح (بعین) من جانب (وبعرض) من آخر، و(عرضین) من کل جانب عرض (مطلقا) اتفقا جنسا أو اختلفا، کعبد وحمار أو ثوب۔

(۲) ملاحظہ ہو۔ ابن قدامة (أبو محمد عبد اللہ بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱۴۰۳ھ۔، فیجب أن تصح الشرکة والمضاربة بها کالأثمان، ویرجع کل واحد منهما عند المفاصلة بقیمة ماله عند العقد، کما اننا جعلنا نصاب زکاتها قیمتها۔ (۵:۱۲۵)۔

کے بجائے اسکی بازاری قیمت ضائع کرنے والے کے ذمہ لازم ہوتی ہے، مثلاً جانور کہ ہر جانور میں کچھ خصوصیات ایسی ہوتی ہیں جو دوسرے میں نہیں پائی جاتیں، لہذا اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے جانور ہلاک کرے تو اس پر قیمت کا تاوان آتا ہے۔[۱]

حنابلہ کا مذہب:

حنابلہ کی اس بارے میں دو روایتیں ہیں، ایک روایت میں وہ احناف کی طرح سامان میں شرکت کو ناجائز کہتے ہیں اور دوسری روایت میں جائز کہتے ہیں[۲]، اور جس روایت میں وہ جائز کہتے ہیں اس میں یہ فرماتے ہیں کہ ان عروض کی قیمت کو بوقت عقد راس المال (سرمایہ) بنادیا جائے جسکی مثال پیچھے امام مالکؒ کے مذہب میں گذری ہے۔

خلاصہ یہ کہ احناف اور حنابلہ کے ظاہر مذہب میں غیر نقد سامان شرکت میں سرمایہ نہیں بن سکتا، اور مالکیہ کے نزدیک اور امام احمد کی دوسری روایت میں مطلقاً بن سکتا ہے، اور شوافع کے نزدیک مثلیات میں بن سکتا ہے اور قیمیات میں نہیں۔

مالکیہ کے دلائل:

(۱) ملاحظہ فرمائیں۔ نجیب، محمد نجیب المطیع، تکملہ المجموع شرح المهذب ، مطبعة الإمام، مصر (۱۳:۸، ٥): وقد فرق أصحابنا بين ماله مثل وبين مالا مثل له فأما لا مثل له كالنباتات والحيوانات ،وما أشبهما، فلا يصح عقد الشركة عليهما، و في نهاية المحتاج (١٢٤:٥)، وابن قدامة (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ١٤٠٣ھ۔(٥: ١٢٥)۔

(۲) دیکھئے: ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ١٤٠٣ھ، فأما العروض فلاتجوز الشركة فيها في ظاهر المذهب، نص عليه أحمد في رواية أبي طالب وحرب وحكاه ابن المنذر، وعن أحمد رواية أخرى أن الشركة والمضاربة تجوز بالعروض، وتجعل قيمتها وقت العقد رأس، قال أحمد: إذا اشتركا في العروض يقسم الربح على ما اشترطا، (١٢٤:٥، ٢٥)،وابن قدامه، عبد الرحمن بن محمد شمس الدين بن قدامه المقدسي ٦٨٢ھ ، الكافي (٢٥٨:٢)۔

مالکیہ کا کہنا ہے کہ شرکت کا مقصود یہ ہے کہ کچھ افراد اپنے سرمایہ کو ملا کر کاروبار کریں، اور پھر اس سے نفع کمائیں، اور یہ کام جس طرح نقد مال میں ہو سکتا ہے، جنس میں بھی ہو سکتا ہے، لہذا نقد کی طرح جنس (غیر نقد اشیاء) میں بھی شرکت جائز ہونی چاہیے۔[۱]

احناف کے دلائل:

امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ کے ظاہر مذہب میں غیر نقد سامان شرکت میں سرمایہ نہیں بن سکتا، ان کے دلائل کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱:۔ احناف یہ کہتے ہیں کہ اگر جنس (سامان) میں شرکت کی جائے تو دونوں شریکوں کا مال مخلوط نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ اور قابل امتیاز ہے، مثلاً اگر زید اور بکر نے گاڑیوں کے کاروبار میں شرکت کی، ایک کار زید اور دوسری کار بکر لایا، ان دونوں میں سے ہر کار مکمل طور پر اپنے اصلی مالک کی ملکیت میں ہے، لہذا اگر زید کی کار فروخت کی گئی تو اسکا تمام نفع نقصان زید کو پہونچے گا، اور بکر کو اسکی قیمت میں کسی قسم کا حصہ لینے کا حق حاصل نہ ہوگا، لہذا جب تک دونوں کی پراپرٹی یا مملوکہ سامان قابل امتیاز رہے گا اسوقت تک شرکت قائم نہیں ہو سکتی، اس کے برعکس اگر دونوں کا سرمایہ نقد شکل میں ہو، اور دونوں کو مخلوط کر دیا جائے تو اب ہر ایک کے پیسے قابل شناخت یا قابل امتیاز نہ رہیں گے، کیونکہ نقد مال قابل امتیاز شئے نہیں ہوتی، لہذا اب وہ ایک مشترک سرمایہ (Pool) سمجھا جائے گا، اور اسطرح دونوں کے درمیان شرکت قائم ہو جائے گی۔[۲]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ (۵:۱۲۵)، لأن مقصود الشركة جواز تصرفهما في المالين جميعا، وكون ربح المالين بينهما وهذا يحصل في العروض كحصوله في الأثمان، فيجب أن تصح الشركة والمضاربة بها كالأثمان۔

(۲) ملاحظہ ہو۔ الكاساني، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (۶:۵۹)، لأن معنى الوكالة من لوازم الشركة والوكالة التي يتضمنها الشركة لا تصح في العروض، وتصح في الدراهم والدنانير فإ ن من قال لغيره: بع عرضك على أن يكون ثمنه بيننا لا يجوز، وإذا لم تجز الوكالة التي هي من ضرورات الشركة لم تجز الشركة، ولو قال له: اشتر بألف درهم من مالك على أن يكون ما شتريته بيننا جاز۔

۲:۔ایسے بہت سے حالات پیش آتے ہیں جب شرکاء کو شرکت فسخ کرنی پڑتی ہے اور فسخ کر کے سرمایۂ حصص واپس تقسیم کرنا پڑتا ہے،اگر شرکاء نے نقد مال مثلاً ایک ایک لاکھ (یعنی کل دولاکھ) روپے کی سرمایہ کاری کی اور پھر شرکت فسخ کی تو کل نفع کو اسی تناسب سے تقسیم کیا جاسکتا ہے،لیکن اگر دونوں نے نقد مال کے بجائے جنس کی شکل میں مال لگایا تو واپس تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے،کیونکہ ہو سکتا ہے کہ وہ سامان (سرمایۂ شرکت) اس وقت فروخت ہو چکا ہو،لہذا اگر سرمایہ اسکی مالیت (Value) کی بنیاد پر تقسیم کیا جائے تو یہ ممکن ہے کہ اسکی مالیت (Value) بڑھ چکی ہو،لہذا یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شریک تو سارا منافع لے جائے اور دوسرے شریک کو کچھ نہ ملے،کیونکہ اس نے جس سامان کی سرمایہ کاری کی تھی اسکی مالیت بڑھ گئی،اس کے برعکس اگر کسی ایک کے سامان کی قیمت گھٹ جائے تو ممکن ہے کہ دوسرا شریک پہلے شریک کے سامان کی اصل قیمت کا کچھ حصہ اپنے سرمایہ کاری والے حصہ کے ساتھ وصول کرے،مثال کے طور پر زید نے ایک کار اور بکر نے دوسری کار بطور سرمایہ کاری شرکت میں لگائی،اور پھر دونوں کاریں فروخت ہو گئیں،اسکے بعد کسی وجہ سے شرکت فسخ کرنی پڑی تو ظاہر ہے کہ وہ کاریں تو اب دونوں کو واپس کرنا ممکن نہیں ہے،لہذا انکی بازاری قیمت دی جائے گی،اب اگر کسی ایک مثلاً زید کی کار کی قیمت بڑھ جائے مثلاً ڈیڑھ لاکھ ہو جائے اور وہ ڈیڑھ لاکھ بطور سرمایہ زید کو واپس دیا جائے،جبکہ کل نفع پچاس ہزار ہی ہو،تو بکر کو نفع کا کوئی حصہ نہیں ملے گا،اور اگر بکر کو اسکی کار کی پوری قیمت واپس دی جائے تو زید کو اسکی کار کی قیمت سے کم ملے گا،اور اس کے برعکس اگر زید کی کار کی قیمت گھٹ جائے مثلاً اصلی قیمت بوقت عقد ایک لاکھ تھی اب پچاس ہزار ہو گئی اور منافع کل پچاس ہزار ہوا،تو اگر پچاس ہزار زید کو دیئے جائیں اور ایک لاکھ بکر کو دیدیں تو غور کرنے سے یہ لازم آتا ہے کہ زید کی کار کی اصل قیمت جو ایک لاکھ تھی اسکا نصف بکر کو مل گیا،تو زید کو نقصان ہوا،لیکن بکر کو نقصان نہ ہوا۔[1]

---

(۱) دیکھیے: ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ۱٤۰۳ھ لأن الشرکة تقتضی الرجوع عند المفاصلة برأس المال أو بمثله وھذہ لا مثل لھا فیرجع إلیه وقد تزید قیمة جنس أحدھما دون الآخر فیستوعب بذلك جمیع الربح أو جمیع المال، وقد یتضمن قیمته فیؤدی إلی أن یشارکه الآخر فی ثمن ملکه الذی لیس بربح،ولا علی قیمتھا لأن القیمة غیر متحققة القدر فیفضی إلی التنازع، وقد یقوم الشیء بأکثر من قیمته، ولأن القیمة قد تزید فی أحدھما قبل بیعه فیشارکه الآخر فی العین المملوکة، (۵:۱۲۵)۔

شوافع کے دلائل:

امام شافعیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اگر غیر نقد اشیاء کے ذریعہ شرکت کی جائے تو اگر سامان مثلیات میں سے ہو تو شرکت جائز ہے، اور اگر قیمیات میں سے ہو تو شرکت جائز نہیں ہے، امام شافعیؒ نے مثلیات اور قیمیات کے درمیان حکم میں فرق کر کے دراصل احناف اور حنابلہ کی دوسری دلیل کا جواب دیا ہے کہ اگر شرکاء مثلیات میں شرکت کریں اور پھر کسی وقت شرکت فسخ کر کے سامان واپس لوٹانا چاہیں تو چونکہ سرمایہ حصص دراصل وہ سامان ہے جسکی مثل آسانی سے بازار میں دستیاب ہے تو وہ اس سامان کو لے کر آسانی سے واپس کر سکتے ہیں، لیکن اگر وہ سامان قیمیات میں سے ہو کہ اسکی بعینہ مثل ملنی مشکل ہو تو چونکہ احناف کی دوسری دلیل کا اعتراض برقرار رہتا ہے، لہذا اس میں شرکت جائز نہیں ہے۔ (۱)

قیمیات اور مثلیات کے درمیان حکم میں فرق کر کے شوافع نے اگرچہ احناف کی دوسری دلیل کا جواب تو دیدیا ہے لیکن پہلی دلیل کا جواب اس حل سے بھی نہیں بن پاتا، لیکن اس دلیل کے جواب میں خود فقہاء احناف نے ایک حیلہ تجویز فرمایا ہے، وہ یہ کہ اگر شرکاء مثلیات کو سرمایۂ شرکت بنا کر شرکت کرنا چاہتے ہیں تو پہلی دلیل کے اعتراض سے بچنے کا ایک حل یہ ہے کہ دونوں شرکاء کے سامان کو اسطرح مخلوط کر دیا جائے کہ ایک دوسرے کا سامان قابل شناخت اور قابل امتیاز نہ رہے، اور مخلوط کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے سے کہے کہ میں نے اپنے سامان کا نصف تمہارے سامان کے نصف سے بدل کر فروخت کر دیا، اس طریقہ سے دونوں کا مال دو دو نصف ہو جائے گا، اور اس طرح اسمیں شرکت ملک قائم ہو جائیگی، پھر اس کے بعد اس مال مشترک میں عقد کر کے شرکت العقد قائم کرلی جائے، مثلاً اگر زید کے پاس ایک کلو گندم اور بکر کے پاس بھی ایک کلو گندم ہو ان کو مخلوط کرنے کا طریقہ تو آسان ہے کہ دونوں کو مکس

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی، مکتبة الریاض السعودية ۱۴۰۳ھ (۵:۱۲۵): وقال الشافعي: إن كانت العروض من ذوات الأمثال كالحبوب والادهان جازت الشركة بها فی أحد الوجهين، لأنها من ذوات الأمثال اشبهت النقود ویرجع عند المفاصلة بمثلها، وإن لم تكن من ذوات الأمثال لم يجز وجها واحدا لأنه لا یمکن الرجوع بمثلها۔

کر دیا جائے، اور پھر ایک دوسرے کا گندم قابل شناخت نہیں رہے گا، البتہ اگر زید اور بکر کی علیحدہ علیحدہ دو کاریں ہوں اور ان میں شرکت کرنا چاہیں تو اس میں مخلوط کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زید اپنی کار کا نصف حصہ بکر کی کار کے نصف حصہ کے بدلہ فروخت کردے، تو گویا زید کی کار کے دو حصے ہو گئے، ایک زید کا دوسرا بکر کا، اسی طرح بکر کی کار کے دو حصے ہو گئے ایک زید کا اور دوسرا بکر کا، اسطرح دونوں کی کاریں دونوں کے درمیان مشترک ہو گئیں، اب وہ دونوں عقد کے ذریعہ سے یہ طے کرلیں کہ ہم ان دونوں کاروں سے شرکتِ کا کاروبار کرتے ہیں، اس طرح شرکت العقد جائز ہو جائے گی۔

اسی طرح اگر دو فریقوں میں سے ایک کے پاس نقد روپیہ اور دوسرے کے پاس سامان اور وہ شرکت کا عقد کرنا چاہیں تو اسکا حیلہ احناف نے یہ بتایا ہے کہ سامان کا مالک اپنا آدھا سامان دوسرے کو اسکے نصف روپے کے عوض فروخت کردے، اور دونوں قبضہ کرلیں، پھر تمام روپے اور سامان کو ملا دیا جائے، تو روپیہ اور سامان دونوں کے درمیان مشترک ہو جائے گا، پھر اس میں عقد شرکت کرلیں تو جائز ہو گا۔ (۱)

تمام مذاہب اور انکے دلائل کی روشنی میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ اگر شرکاء غیر نقود (جنس) میں شرکت کرنا چاہیں تو امام مالکؒ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، البتہ ان کے سرمایۂ حصص کا تعین عقد شروع کرتے وقت کی بازاری قیمت کی بنیاد پر ہو گا، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اگر سامان مثلیات میں سے ہو تو اس میں شرکت جائز ہے، اور قیمیات میں سے ہو تو ناجائز ہے، اور احناف کے نزدیک اگر سامان مثلیات میں سے ہو اور پھر اسکو مخلوط کر کے ناقابل امتیاز بنا دیا جائے تو اس میں شرکت جائز ہے لیکن اگر سامان قیمیات میں سے ہو تو اسے سرمایۂ شرکت بنا کر شرکت نہیں کی جا سکتی۔

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے "امداد الفتاوی" (۲) میں ذکر فرمایا ہے کہ عروض (جنس) میں شرکت کے بارے میں اگرچہ فقہاء کرام کا اختلاف ہے لیکن موجودہ زمانے کی ضروریات اور ابتلائے عام کی وجہ سے امام مالکؒ کے مذہب پر فتوی دیا جا سکتا ہے، کیونکہ اس سے عصر جدید کی مشکلات اور پریشانیوں کے حل کرنے میں زیادہ مدد مل سکتی ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: کاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسة التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی، (۵۹:۶)، والدر المختار (۳۱:٤)۔

(۲) تھانوی، مولانا اشرف علی، امداد الفتاوی، مکتبہ دار العلوم کراچی (۴۹۵:۳) کتاب الشرکۃ۔

لہٰذا اگر امام مالکؒ کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے عروض میں شرکت کو جائز قرار دیا جائے تو احناف اور حنابلہ کی دلیل کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر دو شرکاء اپنا اپنا سامان لے کر عقد شرکت میں داخل ہوں تو یہ متصور کیا جاسکتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا نصف دوسرے کے نصف کے بدلہ میں فروخت کر دیا، مثلاً اگر زید اور بکر علیحدہ علیحدہ دو کاروں میں شرکت کریں تو یہ مطلب سمجھا جائے کہ زید نے اپنی کار کا نصف بکر کی نصف کار کے بدلہ میں فروخت کیا، اور اس طرح دونوں افراد دونوں کاروں کے نصف کے مالک بن گئے، اور دونوں کا مال مخلوط ہو گیا کہ اب دونوں کے حصے ایک دوسرے سے شناخت کے قابل نہ رہے، لہٰذا امام احمد اور امام ابو حنیفہؒ کے مذہب پر بھی عمل ہو گیا۔

خلاصہ یہ کہ شرکت کے کاروبار کے لئے سرمایہ کا نقد ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ عروض (جنس) بھی سرمایہ شرکت بن سکتے ہیں، البتہ ان اشیاء کی عقد کے وقت بازاری قیمت کے ذریعہ حصص کا تعین ہو گا۔

جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ شرکت کے سرمایہ کے لئے نقد ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ عروض (جنس) بھی سرمایہ شرکت بن سکتے ہیں، لہٰذا جس طرح یہ جائز ہے کہ شرکاء نقد سرمایہ سے شرکت کریں، یہ بھی جائز ہے کہ تمام شرکاء یا بعض شرکاء عروض (جنس) کے ذریعہ شرکت کریں، اس مسئلہ کی وجہ سے موجودہ زمانے کی تجارت اور شرکت کے بعض اور مسائل بھی حل ہو جاتے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ اگر کوئی شخص کسی چلتی ہوئی صنعت (Industry) میں اپنا روپیہ لگائے اور صنعت کار کے ساتھ شرکت کرلی تو یہ جائز ہے، مثلاً زید کا ایک کپڑے کا کارخانہ ہو اور بکر اس میں ایک لاکھ روپے ڈال کر اس کارخانہ میں حصہ دار بن جائے، اور اس طرح زید اور بکر اس کپڑے کی صنعت میں شرکت کرلیں، اس صورت میں زید کا سرمایہ عروض (جنس) کی شکل میں ہوا اور بکر کا سرمایہ نقد شکل میں، لہٰذا زید کے کارخانے کی قیمت لگا کر اسکا سرمایہ متعین کیا جائیگا اور اسکی بنیاد پر شرکت قائم کی جاسکے گی کیونکہ یہ بات پیچھے آچکی ہے کہ سرمایۂ شرکت کا نقد ہونا لازمی نہیں ہے۔

۲۔ موجودہ زمانے کی تجارت میں ایک اصطلاح مرجر (Merger) کہلاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دو یا زیادہ تجارتی فرمیں مل کر ایک مشترک تجارتی ادارہ بنالیتی ہیں، اور پھر وہ کاروبار کرتے ہیں، اس شرکت میں بھی شرکاء (یعنی مختلف فرموں) کا سرمایۂ شرکت صرف نقد نہیں ہوتا بلکہ نقد اور جامد دونوں طرح کے اثاثوں سے اشتراک

ہوتا ہے، یہ صورت بھی شرعاً جائز ہے۔

۳۔ کمپنی قائم کرتے وقت اگر کمپنی قائم کرنے والے لوگ نقد سرمایہ کے علاوہ اپنے جامد اثاثوں، سامان تجارت اور بلڈنگ وغیرہ کے ذریعہ شرکت قائم کریں تو انکی قیمت لگا کر انہیں نقد روپے کی شکل میں متعین کیا جائے گا، اور اس طرح یہ شرکت جائز ہو جائے گی۔

کیا سرمائے کا مخلوط ہونا ضروری ہے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کچھ افراد کسی کاروبار میں شرکت کرنا چاہتے ہوں تو کیا ان کے سرمائے کا مخلوط ہونا ضروری ہے؟ مثال کے طور پر اگر زید اور بکر یہ معاہدہ کریں کہ ہم دونوں ایک ایک ہزار روپے سے کپڑے کے کاروبار میں شرکت کرتے ہیں، پھر دونوں نے اپنے اپنے ہزار روپے اکٹھے نہیں کئے بلکہ زید کے پیسے زید کے پاس اور بکر کے پیسے بکر کے پاس رہے، پھر زید نے ایک ہزار روپے سے کپڑا خریدا، تو کیا وہ کپڑا زید کا سمجھا جائے گا، یا زید اور بکر دونوں کا سمجھا جائے گا، چنانچہ اگر اس کو آگے فروخت کیا تو اس سے جو نفع یا نقصان ہوگا وہ صرف زید کا ہوگا، یا بکر بھی اس میں حصہ دار ہوگا؟ اس مسئلہ کے جواب سے پیشتر یہ دیکھنا چاہیے کہ آیا مذکورہ بالا صورت میں زید اور بکر کے سرمایہ کے مخلوط ہوئے بغیر شرکت وجود میں آگئی تھی یا نہیں؟ اگر شرکت صحیح ہوگئی تو نفع نقصان دونوں کا ہوگا، ورنہ صرف زید کا نقصان ہوگا، لہذا مسئلہ کا مدار اس پر ہوا کہ کیا شرکت کے انعقاد اور صحیح ہونے کے لئے سرمایہ کا مخلوط ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اس بارے میں فقہائے کرام کے مذاہب ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں:

شوافع کا مذہب:

امام شافعیؒ کے مذہب میں شرکت الاموال میں سرمایہ اس قدر مخلوط کرنا ضروری ہے کہ شرکاء کے اموال میں امتیاز باقی نہ رہے، اور یہ اختلاط کا عمل تصرف سے پہلے ہونا چاہیے، لہذا اگر کسی طرح بھی شرکاء کے اموال میں امتیاز کا امکان باقی رہے تو اس سے شرکت وجود میں نہیں آتی، مثلاً اگر ایک فریق نے چاندی اور دوسرے نے سونا دیا، تو امتیاز کا امکان باقی ہے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ جب تک دونوں کے اموال کو مخلوط نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ہر مال اپنے اصل مالک کی ملکیت میں رہے گا، اور وہ دونوں کا مشترک مال نہیں بنے گا، جب وہ اسی کی ملکیت میں رہے گا تو اس سے جو تجارت کی جائے گی، اس کے نفع کا بھی وہی حقدار ہوگا، کیونکہ حقیقۃً وہی مالک ہے، لہٰذا دوسرا شریک اس نفع کا حقدار نہ ہوگا، اس وجہ سے اس طرح شرکت وجود میں نہیں آسکتی۔[1]

أئمہ ثلاثہ کا مذہب:

امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک اگرچہ اصول یہی ہے کہ شرکت محض معاہدے سے منعقد ہو جاتی ہے، شرکاء کی طرف سے مال کا ملانا ضروری نہیں ہے، البتہ ان کے نزدیک اس میں تفصیل یہ ہے کہ جب دو شریکوں نے شرکت کا معاہدہ کر لیا، اور مثلاً یہ طے پا گیا کہ دونوں شریک ایک ایک لاکھ روپے مشترک کاروبار میں لگائیں گے، لیکن ابھی دونوں نے اپنا اپنا سرمایہ ملایا نہیں، بلکہ ہر شخص کا سرمایہ اسی کے پاس ہے تو اس دوران اگر ایک شریک اپنے ایک لاکھ روپے سے شرکت کے لئے کوئی سامان خرید لے تو وہ سامان دونوں کا مشترک سمجھا جائے گا، چنانچہ اگر اس سامان کی فروختگی سے کچھ نفع ہوا تو وہ بھی طے شدہ شرح کے موافق دونوں کا مشترک نفع ہوگا، اور اگر وہ سامان ضائع ہو جائے، تو نقصان بھی دونوں کا سمجھا جائے گا۔

لیکن اگر سرمائے کو مخلوط کرنے اور اس سے کوئی چیز شرکت کے لئے خریدنے سے پہلے یہ ایک لاکھ روپیہ جو ایک شریک کے پاس تھا کسی طرح ضائع ہو جائے، تو اس نقصان میں دونوں شریک نہیں ہوں گے، بلکہ یہ اسی شخص کا نقصان

(۱) ملاحظہ ہو: الشربینی المطیب (من أعیان علماء الشافعیین) مغنی المحتاج إلی معرفة معانی ألفاظ المنهاج للنووی من أبناء القرن العشر من الهجرة، (۲۱٤:۲)۔ و(الحافظ أبو زکریا) محی الدین بن شرف النووی ۲۰٦-۲٦۱ مطبعة العاصمة القاهرة ۱۹۷٦م دار إحیاء التراث بیروت۔ و روضة الطالبین للنروی، (۲۷۷:٤)۔ ورملی، محمد بن احمد ٤ـ ۱۰۰ھ، نهایة المحتاج،بیروت، احیاء التراث العربی (۷۰٦:٥)، ۔ و نجیب ، محمد نجیب المطیع، تکمله المجموع شرح المهذب ، مطبعة الإمام، مصر(۵۱:۱۳)۔ والنووی،(الحافظ أبو زکریا) محی الدین بن شرف، شرح المهذب المسمی بالمجموع المنهاج مع مفتی المحتاج(٦٧:١٤)۔

سمجھا جائے گا، جس کے قبضہ سے وہ روپیہ ضائع ہوا، البتہ دوسرے شریک کے نفع میں حصہ دار بننے کے لئے اسکے ذمے ضروری ہوگا کہ جتنا سرمایہ اس نے شرکت قائم کرنے کے لئے اپنے ذمے لیا تھا اتنا سرمایہ وہ دوسرے شریک کو کہیں اور سے فراہم کرے، اس کے برعکس اگر وہ دونوں اپنے اپنے مال کو ملا دیتے اور پھر ایک لاکھ روپیہ ہلاک ہوتا تو اس نقصان میں دونوں شریک ہوتے، اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ مالکیہ کے نزدیک شرکت قائم ہونے کے بعد اگر شریکوں نے اپنا مال مخلوط نہ کیا ہو تو بھی وہ ممتاز مال کے منافع میں تو حصہ دار ہوتے ہیں، لیکن اس کے نقصان میں اس وقت تک حصہ دار نہیں ہوتے جب تک انہوں نے اپنا اپنا مال مخلوط نہ کر لیا ہو، البتہ ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مخلوط کرنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ دونوں مال حسی طور پر بالکل گھل مل جائیں، بلکہ اگر ایک شریک نے اپنا سرمایہ کسی تھیلی میں رکھ کر دوسرے شریک کے حوالہ کر دیا، اور دوسرے شریک کا سرمایہ بھی الگ تھیلی میں ہے، لیکن یہ دونوں تھیلیاں ایک ہی شریک کے قبضہ میں ہیں، تو اگرچہ یہ دونوں تھیلیاں حسی طور پر آپس میں گھلی ملی نہیں ہیں، بلکہ دونوں باہم ممتاز ہیں، اس کے باوجود دونوں تھیلیوں کو ایک شخص کے تصرف میں دیدینے سے حکمی طور پر دونوں کو مخلوط ہی تصور کیا جائے گا، لہذا اگر ایسی حالت میں کوئی ایک تھیلی ضائع ہو جائے، تو یہ نقصان بھی دونوں برداشت کریں گے۔[1]

حنفیہ، مالکیہ، اور حنابلہ چونکہ شرکت کے انعقاد کے لئے سرمایہ مخلوط کرنا ضروری نہیں سمجھتے ان کے مذہب کی بنیاد پر ہمارے دور کے ایک اہم مسئلے میں واضح رہنمائی ملتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کئی کمپنیاں یا تجارتی ادارے شرکت اسطرح کریں کہ ہم فلاں صنعت لگا کر کاروبار کرتے ہیں، اور اس صنعت کو مشینوں کی درآمد کرنے کے لئے ابھی سرمایہ اکٹھا (مخلوط) نہیں کیا، اور ان میں سے کسی ایک کمپنی نے زیرو مارجن پر ایل سی کھلوائی، اور یہ ایل سی برآمد کنندہ کے پاس

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الكاساني، علاء الدين ابو بكر بن مسعود ، بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع (٦٠:٦)، ابن قدامة المقدسي (أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد، المغني، مكتبة الرياض السعودية ١٤٠٣ھ۔ (١٢٩:٥)، ابن قدامه، عبد الرحمن بن محمد شمس الدين بن قدامه المقدسي ٦٨٢ھ الشرح الكبير على المغني، بيروت، دار الكتاب العربي (١١٧:٥)، (٢٥٨:٢) بهوتي، منصور بن يونس ١٠٥١ھ ، كشاف القناع عن متن الاقناع، عالم الكتب، دار الفكر، بيروت۔ (٤٨٨:٣)، الانصاف للمرداوى (٤١٢:٥)، مواهب الجليل للحطاب (١٢٥:٥)، الشرح الكبير للدردير مع حاشية الدسوقي (٣٤٩:٣، ٣٥٠)۔

اس کے بینک کے واسطے سے پہونچی، جسکی بنیاد پر بر آمد کنندہ نے سامان جہاز میں لوڈ کروادیا، اور اس سامان کی رسیدیں اور متعلقہ کاغذات اپنے بینک کی معرفت در آمد کنندہ کے بینک کے پاس بھیجا، جب یہ رسیدیں یہاں پہونچیں، تو در آمد کنندہ کمپنیوں نے سرمایہ اکٹھا کر کے اسکی قیمت کی ادائیگی اپنے بینک کو کردی، (تاکہ در آمد کنندہ کا بینک بر آمد کنندہ کے بینک کو وہ رقم ادا کردے) پھر در آمد کنندہ کے بینک نے وہ رسیدیں در آمد کنندہ کمپنی کے ایجنٹ کو دی جسکو دکھا کر اسنے وہ سامان بندرگاہ سے چھڑوالیا۔

شافعی مسلک کے لحاظ سے اس صورت میں در آمد کردہ سامان شرکت کی ملک نہیں بن سکتا، بلکہ وہ صرف اسی شخص یا کمپنی کا ہوگا، جس نے ایل سی کھلوائی، کیونکہ ایل سی کھلواتے وقت شرکاء نے سرمایہ مخلوط نہیں کیا تھا، اور سرمائے کو مخلوط کئے بغیر ان کے نزدیک شرکت وجود میں نہیں آتی، لہذا ایل سی کھلوانے کے نتیجہ میں جو خریداری ہوتی وہ شرکت کی طرف سے نہ ہوتی، اگر یہ خریداری شرکت کی طرف سے کرنی ہے تو امام شافعیؒ کے مذہب کے مطابق تمام شرکاء کو پہلے سرمایہ اکٹھا کرنا ہوگا، پھر ایل سی کھلوانی ہوگی، اس کا نقصان یہ ہے کہ ان تمام اداروں کی خطیر رقمیں مدتِ دراز تک منجمد ہو کر رہ جائینگی، اس کے برعکس اگر حنفیہ مالکیہ، اور حنابلہ کا مسلک اختیار کیا جائے، تو اس صورت میں ان تمام اداروں کو پہلے سے رقمیں بلاک (Block) کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ ایل سی کوئی ایک شریک کھلوادے، تو وہ ایل سی شرکت کی طرف سے سمجھی جائے گی، اور رقموں کی ادائیگی بعد میں بھی کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح مذکورہ صورت میں اگر سامان راستے میں تلف ہو جائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک نقصان کی ذمہ داری صرف ایل سی کھلوانے والے پر ہوگی، لہذا سامان کی تباہی یا نقصان کی صورت میں سارا نقصان بھی اسی کمپنی کو برداشت کرنا پڑے گا، اگرچہ وہ سامان تمام کمپنیوں کے لئے منگوایا گیا تھا، اور ان کا باہم شرکت کا معاہدہ بھی تھا، لیکن چونکہ انہوں نے سرمایہ بوقتِ عقد مخلوط نہیں کیا تھا، لہذا ان کا معاہدہ شرکت بیکار ہو گیا، اسلئے بقیہ کمپنیوں پر اس کا تاوان نہیں ہوگا۔

اسکے برعکس اگر ائمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق شرکت کی صحت کے لئے سرمایہ کو مخلوط کرنا ضروری نہ سمجھا جائے تو اس صورت میں اگرچہ سرمایہ بعد میں فراہم کیا گیا، لیکن شرکت ابتدائے عقد ہی سے وقوع پذیر ہوگئی، اور پھر اس صورت میں اس سامان کی ذمہ داری تمام کمپنیوں پر عائد ہوگی، لہذا تباہی کی صورت میں سامان کا سارا نقصان تمام کمپنیوں کو

برداشت کرنا ہوگا، لہذا اگر شرکت کی صحت کے لئے سرمایہ کو مخلوط کرنا لازمی قرار نہ دیا جائے تو دو اہم فائدے حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ تباہی کی صورت میں اتنا عظیم نقصان ایک کمپنی پر عائد نہیں ہوتا، بلکہ تمام شرکاء (کمپنیاں) نقصان میں شریک ہوتے ہیں۔

۲۔ اگر سرمایہ ابتدائے عقد میں فراہم کر دیا جائے تو سامان کی فراہمی کی مدت تک سرمایہ جامد رہتا ہے، جسکا کمپنیوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر سرمایہ بعد میں فراہم کیا جائے تو اس دوران اس سرمایہ سے مزید کاروبار کیا جاسکتا ہے، اور سرمایہ بلاک نہیں رہتا۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ائمہ ثلاثہ کا مذہب موجودہ دور کی ضروریات کو زیادہ بہتر طریقے سے پورا کرتا ہے۔

کیا شرکت کسی میعاد کی پابند ہو سکتی ہے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا شرکت کے عقد کو کسی محدود مدت کے لئے مقید کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ شرکت کو کسی میعاد کے پابند کرنے کی دو صورتیں ہیں:

۱۔ شرکت کی کوئی ایسی انتہائی مدت مقرر کردی جائے کہ جس کے بعد شرکت ختم ہو جائے، اور اس انتہائی یا زیادہ سے زیادہ مدت کے بعد کسی قسم کا کاروبار نہ کیا جائے۔

۲۔ کم سے کم یا چھوٹی سے چھوٹی مدت مقرر کی جائے، جس کے اندر رہتے ہوئے شرکت لازمی ہو اور اس مدت کے دوران کوئی شریک اس شرکت کو فسخ نہ کر سکے۔

پہلے ہم قسم اول کے بارے میں غور کرتے ہیں کہ کیا شرکت کی کوئی زیادہ سے زیادہ ایسی مدت مقرر کی جاسکتی ہے کہ جس کے بعد شرکت خود بخود ختم ہو جائے؟ مثلاً زید اور عمر اس طرح شرکت کریں کہ ہم ایک سال کے لئے شرکت کرتے ہیں، اسمیں جو نفع ہوگا وہ طے شدہ شرح سے تقسیم ہوگا، (اور ایک سال بعد شرکت ختم ہو جائے گی)، آیا یہ جائز ہے یا نہیں؟، اس بارے میں فقہاء کرام کے مختلف مذاہب ہیں، جنہیں ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:۔

احناف کا مذہب:

شرکت کو کسی میعاد کے پابند کرنے کے بارے میں احناف کے مذہب کی دو روایتیں ہیں۔

پہلی روایت یہ ہے کہ شرکت کو کسی بھی میعاد کے ساتھ مشروط اور پابند کیا جاسکتا ہے، کیونکہ شرکت در حقیقت توکیل (دوسرے کو وکیل بنانا) ہے، اور وکالت میں مدت طے کی جاسکتی ہے۔[1]

دوسری روایت یہ ہے کہ شرکت کو کسی میعاد کا پابند کرنا جائز نہیں ہے، اس بناء پر کہ شرکت در حقیقت توکیل (دوسرے کو وکیل بنانا) ہے اور اس روایت کے مطابق وکالت میں میعاد کی پابندی صحیح نہیں ہے، لیکن اصح قول یہی ہے کہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: الشیخ نظام الدین رئیس جماعة من علماء الهند من القرن الحادی عشر، الفتاوی الهندیه المعروف بالفتاوی العالمگیریه من علماء الهند من القرن الحادی عشر، مکتبه ماجدیه، کوئٹه، وإن وقتا هل یتوقت بالوقت المذکور روی بشر عن أبی یوسفؒ عن ابی حنیفةؒ أنه یتوقت، والطحاوی ضعف هذه الروایة، وصححها غیره من المشایخ وهو الصحیح(۲:۳۰۲) الشرکة۔، و فی تکملة فتح القدیر لقاضی زاده (۷:٦۷) طبع مصر۔

شرکت کو کسی میعاد کا پابند کیا جا سکتا ہے۔[1]

حنابلہ کا مذہب:

فقہائے حنابلہ کے نزدیک شرکت کو کسی میعاد کا پابند کیا جا سکتا ہے، اس وجہ سے کہ شرکت کے اندر وکالت شامل ہوتی ہے، اور ان کے مذہب میں وکالت کو کسی میعاد یا مدت کا پابند کیا جا سکتا ہے، لہذا شرکت کو بھی کسی مدت کا پابند کیا جا سکتا ہے۔[2]

مالکیہ کا مذہب:

فقہائے مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ شرکت کسی میعاد کی پابند نہیں ہو سکتی، لہذا دو شرکاء کے لئے یہ جائز نہیں کہ مثلاً وہ ایک سال یا دو سال کے لئے شرکت کا عقد کریں۔

حاشیہ الرہونی میں ذکر کیا گیا ہے کہ:

ولا تكون الشركة إلى أجل ويكون لكل منهما أن ينحل عنها متى

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الشامی ،محمد امین الشهير بابن عابدين، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ٤:٢٩٨ مطبعة الحلبی مصر ١٣٨٦ھ، ثم إذا وقتها فهل تتوقت بالوقت حتى لا تبقى بعد مضيه؟ فيه روايتان كما فى توقيت الوكالة، وتمامه فى البحر عن المحيط، ولم يذكر ترجيحا، وجزم فى الخانيه بأنها تتوقت حيث قال: والتوقيت ليس بشرط لصحة هذه الشركة والمضاربة، وإن وقتا لذلك وقتا بأن قال: ما اشتريت اليوم فهو بيننا صح التوقيت، فما اشتراه بعد اليوم يكون للمشترى خاصة، وكذا لو وقت المضاربة لأنها والشركة توكيل ،والوكالة مما يتوقت، اه، لكن سيذكر الشارح فى كتاب الوكالة عن البزازيه الوكيل إلى عشرة أيام وكيل فى العشرة، وبعدها فى الأصح تأمل، (٤:٣١٢، الشركة)۔

(۲) دیکھیے: الشرح الكبير لابن قدامة المقدسى (٥:١٣٨) و ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسى)، المغنى، مكتبة الرياض السعودية ١٤٠٣ھ (المضاربة ٥:٦٩)۔

أحب۔(۱)

شرکت کسی مدت تک نہیں ہو سکتی، دونوں شرکاء میں سے ہر ایک کو اختیار ہے، جب چاہیں اسے ختم کر دیں۔

انکے نزدیک جس طرح شرکت میں میعاد مقرر نہیں کی جا سکتی اسی طرح مضاربت میں بھی میعاد مقرر نہیں کی جاسکتی۔(۲)

شوافع کا مذہب:

فقہائے شوافع کا مذہب بھی مالکیہ کی طرح ہے، یعنی یہ بھی شرکت کو کسی میعاد کے پابند بنانے کو ناجائز کہتے ہیں(۳)، انکی دلیل یہ ہے کہ شرکت کی کوئی میعاد مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس میعاد کے گذرنے کے بعد شرکت کی طرف سے خرید و فروخت ممنوع ہو گی، لہذا میعاد کا تعین در حقیقت شریک کو شرکت کا سامان بیچنے سے منع کرنا ہے، اور شرکت کا منشاً یہی ہے کہ سامان بیچ کر نفع کمایا جائے، لہذا جس طرح یہ ناجائز ہے کہ شرکت کے آغاز ہی میں سامان نہ بیچنے کی شرط لگائی جائے اسی طرح میعاد کے خاتمے پر بھی یہ شرط ناجائز ہو گی۔(۴)

انکے نزدیک جس طرح شرکت میں میعاد مقرر نہیں کی جا سکتی اسی طرح مضاربت میں بھی میعاد مقرر کرنا صحیح نہیں، اور اسکی وجہ بھی یہی ہے کہ مضاربت کا سامان بیچنا مضارب کا حق ہے، جس سے اسکا نفع وابستہ ہے اور میعاد کا تعین

---

(۱) حاشية الرهوني على شرح الزرقاني على متن خليل، المطبعة الأميرية بمصر طبعة أولى ۱۳۰٦ھ (۳۸:٦)۔

(۲) حاشية الرهوني على شرح الزرقاني على متن خليل، المطبعة الأميرية بمصر طبعة أولى ۱۳۰٦ھ، لأن فيه تضييقا على العامل يدخل عليه مزيد غرر (۳۸:٦)۔

(۳) المحلى، جلال الدين محمد بن احمد المحلى ۸٦٤ھ، شرح المنهاج، مصر، دار احياء الكتب العربيه (۱:۴۲۲)۔

(۴) ملاحظہ ہو: نجيب، محمد نجيب المطيع، تكمله المجموع شرح المهذب، مطبعة الإمام، مصر۔ (۱۴: ۲۰۰)، وأيضا فيه كما أن التوقيت ليس من مقتضى العقد ولا فيه مصلحة له أشبه إذا شرط أن لا يبيع، أما في المضاربة فلأن العامل يستحق البيع لأجل الربح، فإذا شرط المنع منه فقد شرط ما ينافي مقتضاه، فلم يصح، اه۔

اسے اس حق سے محروم کرتا ہے۔ [(۱)]

مذکورہ بالا اختلاف اس بارے میں تھا کہ شرکت کی زیادہ سے زیادہ یا انتہائی مدت مقرر کرنا کیسا ہے؟۔

اب دوسرا مسئلہ لیجئے یعنی شرکت کو کسی ایسی چھوٹی سے چھوٹی یا کم سے کم مدت کے پابند کردیا جائے کہ جس کے دوران کسی بھی شریک کو شرکت فسخ کرنے کا حق نہ ہو، آیا یہ صورت جائز ہے یا ناجائز؟ اس بارے میں فقہائے احناف کی کتابوں میں تو کوئی صراحت نہیں ملی، البتہ حنابلہ کی ایک مشہور کتاب الانصاف للمرداوی میں اس مسئلہ کے بارے میں امام احمد بن حنبلؒ کی دو روایتیں ذکر کی گئی ہیں، جن میں سے ایک روایت سے جواز کا پتہ چلتا ہے، اور دوسری سے عدم جواز کا، البتہ پہلی روایت کو اصح قرار دے کر اس کے مطابق فتویٰ دیا گیا ہے۔ [(۲)]

لہٰذا امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب میں شرکت کو کسی ایسی مدت کا پابند کیا جاسکتا ہے جس کے دوران کسی شریک کو شرکت فسخ کرنے کا حق حاصل نہ ہو، موجودہ تجارتی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے حنابلہ کا یہ موقف مصلحت کے عین مطابق ہے اسلئے کہ اگر ایسا لا محدود اختیار شرکاء کو دیدیا جائے کہ وہ جب چاہیں شرکت کو فسخ کردیں تو یہ لا محدود اختیار موجودہ حالات اور زمانے میں بہت سے مسائل کھڑے کر سکتا ہے، کیونکہ بہت سی تجارتی کمپنیاں اور اداروں کو شرکت کے نتائج اور منافع حاصل کرنے میں کچھ وقت درکار ہوتا ہے، مزید بر آں انہیں متواتر اور مستقل اجتماعی کوششوں کی بھی حاجت ہوتی ہے، ایسے میں اگر کوئی شریک کسی تجارت یا عقد شرکت کے بالکل ابتدائی مراحل میں شرکت ختم کردے تو بہت سے شرکاء کی نہ صرف سرمایہ کاری (Investment) ضائع چلی جائے گی، بلکہ انکی کوششیں بھی بے سود ہو کر رہ جائیں گی۔ لہٰذا اگر فریقین ابتدائے عقد میں یہ طے کرلیں کہ ہم میں سے کوئی شریک بغیر کسی سخت مجبوری کے فلاں مدت

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: نجیب، محمد نجیب المطیع، تکملہ المجموع شرح المهذب، مطبعة الإمام، مصر۔ (۱٤:۲۰۰)۔

(۲) دیکھئے: المرداوی، علی بن سلیمان المرداوی ۸۸۵ھ، الانصاف، بیروت، دار احیاء التراث العربی ۱٤۰۰ھ (۵:٤۲۳) : والشروط فی الشركة ضربان، صحيح وفاسد، فالفاسد مثل أن يشترط...... لا يفسخ الشركة مدة بعينها ونحو ذلك، ...... ويخرج فی سائرها روايتان و شمل قسمين، أحدهما لا يفسد العقد وهو الصحيح من المذهب المنصوص عن الإمام أحمدؒ، صححه فی التصحيح۔

تک شرکت سے دست بردار نہیں ہوگا تو بظاہر یہ شریعت کے کسی اصول سے متصادم نہیں ہوتا[1]، خصوصاً حضور اکرم ﷺ کی ایک مشہور حدیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہے، کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا:

,,المسلمون علی شروطهم إلا شرطا حرّم حلالاً أو أحل حراماً،،[2]

یعنی مسلمان جو شرائط طے کرلیں وہ ان پر لازمی ہیں سوائے ان شرطوں کے جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام بنادیں۔

لہذا موجودہ حالات میں یہی موقف مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شرکاءِ شرکت کو کسی کم سے کم مدت کا پابند کرسکتے ہیں، جس کے دوران کسی شریک کو شرکت کے فسخ کرنے کا اختیار نہ ہو، البتہ اگر اس مدت کے دوران وہ خود شرکت سے نکلنا چاہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنا حصہ یا تو کسی باہر کے آدمی کو بیچ دے یا پھر دوسرے شرکاء اس کا حصہ خرید لیں، اس پہلو پر مفصل بحث پیچھے ,,فسخِ شرکت،، کے زیر عنوان گذر چکی ہے۔

(۱) ملاحظہ فرمائیں: محمد بن ابراهيم، شركات الأشخاص بين الشريعة والقانون، جامعة الامام محمد بن سعود الاسلاميه ۱۴۰۱ھ (۳۳۹): لما كانت الشركة عقدًا جائزاً كان لكل من الشركاء أن ينسحب منها شريطة أن لا يكون فى ذلك أضرار، وأن لا تكون موقتة بوقت عند من يرى جواز التوقيت من الفقهاء۔

(۲) الترمذی، جامع السنن (حدیث: ۱۲۷۲/الأحكام)، وبخاری (الإجارة)۔

کاروبار کو نقد بنائے بغیر منافع کی تقسیم

مشترک کاروبار خواہ شرکت کی شکل میں ہو، یا مضاربت کی شکل میں دونوں صورتوں میں کاروبار کا مکمل تصفیہ تو ظاہر ہے کہ اس وقت ہوتا ہے جب کاروبار کے تمام اثاثے نقد میں تبدیل کر لئے جائیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اثاثوں کو مکمل طور پر نقد میں تبدیل کرنے سے پہلے بھی نفع کی تقسیم ممکن ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں ہمیں شرکت اور مضاربت دونوں پر الگ الگ غور کرنا ہوگا۔

شرکت کی صورت:

جہاں تک شرکت کا تعلق ہے اس میں نفع کی حتمی تقسیم کے لئے یہ کوئی لازمی شرط نہیں ہے کہ شرکت کے سارے اثاثے نقد ہو جائیں، کیونکہ کاروبار کے تمام اثاثے خواہ کسی بھی شکل میں ہوں شرکاء کی مشترک ملکیت میں ہوتے ہیں، اس لئے وہ جب چاہیں ان اثاثوں کو باہم طے شدہ شرح کے مطابق تقسیم کر سکتے ہیں، علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

ولنا علی جواز القسمة أن المال لهما، فجاز لهما أن يقتسما بعضه كالشريكين، أو نقول: إنهما شريكان، فجاز لها قسمةالربح قبل المفاصلة كشريكي العنان۔[1]

(۱) ابن قدامة، أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی ،المغنی، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ(٥:٦٤)

> اور ہماری دلیل تقسیم کے جائز ہونے پر یہ ہے کہ وہ مال ان دونوں کا ہے، لہذا ان کے لئے جائز ہے کہ اس میں سے کچھ دونوں شرکاء کی مانند تقسیم کرلیں، یا ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ دونوں شریک ہیں، لہذا ان کے لئے نفع کی تقسیم جدا ہونے سے قبل شرکتِ عنان کے شریکین کی مانند جائز ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ شرکت کی صورت میں منافع کی تقسیم سالانہ ماہانہ، یا کسی بھی بنیاد پر ہوسکتی ہے، اور اس کا طریقہ یہی ہوگا کہ اثاثوں کی قیمت لگا کر اسکی بنیاد پر نفع نقصان کا حساب کیا جائے، اگر نقصان ہو تو ہر ایک کے لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے ہر ایک شریک پر ڈالا جائے، اور نفع ہو تو طے شدہ شرح سے آپس میں تقسیم کرلیا جائے خواہ اثاثے بذاتِ خود بانٹ لئے جائیں یا باہمی رضامندی سے کوئی اور طریقہ اختیار کرلیا جائے۔

اور اگر شرکت کا کاروبار جاری رکھنا ہے تو اس سال میں ہونے والے منافع کو باہم تقسیم کرکے باقی اثاثوں سے کاروبار کو جاری بھی رکھا جاسکتا ہے۔

مضاربت کی صورت:

البتہ مضاربت کی صورت میں تقریبا تمام فقہائے کرام اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ اسمیں نفع کی حتمی تقسیم کاروبار کو نقد بنانے (Liquidation) کے بغیر ممکن نہیں، اسکی وجہ یہ ہے کہ مضاربت کی صورت میں تمامتر سرمایہ ایک فریق یعنی رب المال کا ہوتا ہے، دوسرے فریق یعنی مضارب کی طرف سے سرمایہ کاری بالکل نہیں ہوتی، اس لئے ابتدائی سرمایہ سے جو اثاثے بھی خریدے جائیں وہ رب الملال کی ملکیت ہوتے ہیں، مضارب کا نفع صرف اسی صورت میں واجب الاداء ہوتا ہے جب ان اثاثوں کو فرخت کرکے انکی قیمت حاصل ہوجائے جس پر پہلا حق رب المال کا ہوتا ہے کہ وہ اپنا اصل لگایا ہوا سرمایہ واپس لے، پھر اگر کچھ بچے تو وہ کاروبار کا نفع شمار کرکے فریقین کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جائے، یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جب تمام اثاثے بیچ دئے گئے ہوں، اگر کچھ اثاثے ابھی فروخت نہ ہوئے ہوں تو یہ معلوم نہیں ہوسکتا کہ مضارب نفع کا حقدار ہے یا نہیں؟ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ اثاثے جب فروخت ہوں تو اتنی کم قیمت پر فروخت ہوں کہ اس میں سے رب المال کے سرمایہ کی واپسی کے بعد کچھ بھی باقی نہ بچے، جس کے معنی یہ

ہیں کہ مضارب کسی بھی نفع کا حقدار نہ ہو۔

اسی بناء پر فقہ کی قدیم کتابوں میں یہ اصول تقریبا مسلّم سمجھا گیا ہے کہ اگر اثاثوں کے نقد ہونے سے پہلے مضاربت کا نفع اندازے سے تقسیم کر بھی لیا گیا ہو تو یہ تقسیم محض عبوری اور عارضی تو ہو سکتی ہے، لیکن مستقل اور حتمی نہیں ہو سکتی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس تقسیم کے تحت جو بھی ادائیگی ہو گی علی الحساب ہو گی، چنانچہ بعد میں جب بھی اثاثوں کو نقد بنانے کی نوبت آئے تو اس وقت کاروبار کا حتمی حساب ہو گا، اور اس حتمی حساب کی رو سے عارضی تقسیم کے تحت دی ہوئی رقموں میں کمی بیشی کی جائے گی، فرض کیجئے کہ کاروبار کے کسی درمیانی مرحلہ پر یہ سمجھ کر کہ کاروبار میں بیس فیصد نفع ہوا ہے، دس فیصد رقم مضارب کو دیدی گئی، بعد میں جب اثاثے نقد بنے تو پتہ چلا کہ یہ اثاثے رب المال کا اصل سرمایہ واپس کرنے کے لئے بھی کافی نہیں، جسکا مطلب یہ ہے کہ مجموعی کاروبار میں نقصان ہوا، لہذا جو دس فیصد نفع مضارب کو دیا گیا تھا وہ اس سے واپس لے کر رب المال کے سرمایہ کی کمی پوری کی جائے گی، اسی طرح اگر بعد میں یہ پتہ لگا کہ کاروبار کے مجموعی حساب کی رو سے نفع بیس فیصد نہیں بلکہ پچاس فیصد ہوا ہے تو مضارب کو دے گئے دس فیصد میں پندرہ فیصد کا مزید اضافہ کیا جائے گا (جبکہ مضاربت کا معاہدہ نصفا نصف ہو)۔

اس اصول پر تمام فقہاء متفق نظر آتے ہیں، ذیل میں اس موضوع پر مذاہب اربعہ کی کتابوں سے کچھ حوالے بطور مثال پیش کئے جاتے ہیں:

احناف کا مذہب:

عبدالرحمٰن جزائریؒ حنفیہ کا مذہب اس طرح بیان فرماتے ہیں[1]:

,,الحنفية قالوا: لا تصح قسمةالربح قبل أن يقبض صاحب المال رأس ماله، فإذا قسم الربح قبل ذلك وقعت القسمة موقوفة فإن قبض المالك رأس المال صحت وإلا بطلت القسمة، وإذا قسم الربح وبقي رأس المال في يد المضارب ففسخ عقد المضاربة ثم جدد عقد مضاربة آخر فإن

(۱) جزائری، عبد الرحمن ،کتاب الفقه علی المذاهب الاربعه، لاهور، محکمه اوقاف ۱۹۷۱ء (۶۱:۳) مبحث فی قسمة الربح۔

الربح الذی قسم تنفذ قسمته ولا یرد بعد ذلك،،

حنفیہ کہتے ہیں کہ نفع کی تقسیم اس وقت تک درست نہیں جب تک صاحب سرمایہ اپنے اصل سرمایہ پر قبضہ نہ کرلے، اگر نفع اس سے پہلے تقسیم کرلیا گیا ہو تو یہ تقسیم عارضی (موقوف) ہوگی، پھر اگر مالک نے اصل سرمایہ پر قبضہ کرلیا تو (یہی تقسیم) صحیح ہو جائیگی ورنہ کالعدم قرار پائے گی، البتہ اگر نفع تقسیم کرلیا جائے، اور اصل سرمایہ مضاربت پر مال لے کر کاروبار کرنے والے ہی کے پاس ہو، پھر مضاربت کا یہ معاہدہ ختم کر کے ایک نئے معاہدے کے تحت ازسر نو مضاربت شروع کی جائے تو جو نفع تقسیم کیا جاچکا، اسکی تقسیم نافذ ہو جائے گی، اور یہ نفع پھر واپس نہ لیا جاسکے گا۔

اوپر احناف کا جو مسلک بیان کیا گیا ہے، اس کی صراحت خود حنفی فقہاء نے دلائل کے ساتھ کی ہے، صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ:

،،وإن کان یقتسمان الربح والمضاربة بحالها، ثم هلك المال بعضه أو کله ترادا الربح حتی یستوفی رب المال رأس المال، لأن قسمة الربح لا تصح قبل استیفاء رأس المال، لأنه هو الأصل وهذا بناء علیه وتبع له،،[1]

اگر مضاربت علی حالہا قائم ہے، مگر فریقین نے نفع تقسیم کرلیا ہے، اور اس کے بعد سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو جائے تو دونوں نفع واپس کردیں گے، تاکہ صاحبِ سرمایہ اصل سرمایہ کو پورا واپس لے سکے، کیونکہ نفع کی تقسیم اصل سرمایہ کو پورا کرلینے سے پہلے درست نہیں ہوتی، وہ (سرمایہ) بنیاد ہے، اور یہ (نفع) اسی پر مبنی اور اس کے تابع ہے۔

---

(۱) ملاحظہ ہو۔ المرغینانی، (شیخ الاسلام) برهان الدین ابو الحسن) علی بن عبد الجلیل أبو بکر الرشدانی، الهدایة ، مکتبه امدادیه ملتان(۲۶۵:۳) المضاربه فصل فی العزل والقسمة۔

احناف کے نزدیک نفع کاروبار میں نفع واقع ہونے پر نہیں بلکہ نفع کی تقسیم عمل میں آنے پر متحقق ہوتا ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

,,وإنما يظهر الربح بالقسمة وشرط جواز القسمة قبض رأس المال فلا تصح قسمة الربح قبل قبض رأس المال،،(۱)

نفع تقسیم سے نمودار ہوتا ہے، اور تقسیم کے جائز ہونے کی شرط یہ ہے کہ اصل سرمایہ پر قبضہ کرلیا جائے، چنانچہ (مالک کے) اصل سرمایہ پر قبضہ کر لینے سے پہلے نفع کی تقسیم درست نہیں ہے۔

علامہ سرخسیؒ اس بات کو دلائل کے ساتھ اس طرح بیان فرماتے ہیں:

,,فقلنا: الربح لا يظهر مالم يسلم جميع رأس المال لرب المال، لأن الربح اسم للفضل فما لم يحصل ما هو الاصل لرب المال لا يظهر الفضل، فقال ﷺ: مثل المؤمن كمثل التاجر لا تخلص له نوافله ما لم تخلص له فرائضه، فالتاجر لا يسلم له الربح حتى يسلم له رأس ماله،،۔

ہمارا کہنا یہ ہے کہ جب تک اصل سرمایہ پورے کا پورا صاحب سرمایہ کو نہ دے دیا جائے نفع نمودار ہی نہیں ہوتا، کیونکہ نفع اضافہ کا نام ہے، جب تک خود اصل سرمایہ صاحب سرمایہ کو نہ مل جائے اس میں اضافہ ظاہر نہیں ہو سکتا، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا مومن کی مثال تاجر کی طرح ہے کہ اس کے نوافل اس وقت تک خالص نہیں ہوتے جبتک اسکے فرائض خالص نہ ہوں، اسی طرح تاجر کو اسوقت تک نفع نہیں دیا جاتا جب تک اس کا سرمایہ اسے واپس نہ مل جائے۔

شوافع کا مذہب:

(۱) الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع للكاساني (٦: ١٠٧، المضاربة)۔

عبدالرحمٰن جزائری شوافع کا مذہب اس طرح بیان فرماتے ہیں:

,,الشافعية قالوا: يصح قسمة الربح قبل أن يقبض رأس المال، إلا أن الربح إذا قسم قبل بيع جميع السلع، وقبل أن يصبح راس المال (ناضا)، أى يتحول عن عروض تجارة إلى نقد، فإن ملك الربح لا يستقر، فلو حصل بعد القسمة خسارة فى رأس المال جبرت بالربح، فيرد الجزء الذى أخذه العامل منه ويحسب الجزء الذى أخذه رب المال من رأس المال،،[1]

شافعیہ کہتے ہیں کہ مالک کے سرمایہ پر قبضہ کرنے سے پہلے نفع کی تقسیم درست ہے، مگر جب بھی تمام اشیاء تجارت فروخت ہونے اور اصل سرمایہ کے نقد شکل اختیار کر لینے سے پہلے نفع کی تقسیم عمل میں لائی جائے گی تو اس نفع پر ملکیت نہیں قائم ہوگی، اگر اس تقسیم کے بعد سرمایہ میں کوئی نقصان ہوا تو اسکی تلافی نفع میں سے کی جائے گی، جو حصہ نفع کاروباری فریق کو دیا گیا ہو اسے واپس لیا جائے گا، اور جو حصہ صاحب سرمایہ نے لیا ہو اسے اصل سرمایہ میں سے وضع کر لیا جائے گا۔

شوافع کا یہی مذہب مشہور شافعی محدث، اور فقیہ علامہ نوویؒ نے بھی ذکر فرمایا ہے[2]:

,,والأظهر أن العامل يملك حصته من الربح بالقسمة لا بالظهور، ...... والنقص الحاصل بالرخص محسوب من الربح ما أمكن، ومجبور به، وكذا لو تلف بعضه بآفة أو غصب، أو سرقة بعد تصرف العامل فى الأصح، فإن تلف قبل تصرفه فمن رأس المال فى الأصح، ولو استرد

(۱) جزائری، عبد الرحمن، کتاب الفقه على المذاهب الاربعه، لاهور، محکمه اوقاف ۱۹۷۱ء، (۳:۶۱، قسمة الربح)۔

(۲) النووی، منهاج الطالبين (۶۵)۔

المالك بعضه قبل ظهور ربح و خسران رجع رأس المال إلى الباقي،،۔

راجح یہی ہے کہ مضاربت پر کاروبار کرنے والا اپنے حصہ نفع کا مالک نفع کی تقسیم ہونے پر ہوتا ہے، نہ کہ نفع کے واقع ہونے پر،...... نرخ گر جانے سے جو خسارہ ہوتا ہے اس کی تلافی جہاں تک ممکن ہو نفع میں سے کی جائے گی، اسی طرح اگر کچھ مال کسی آفتِ سماوی یا غصب یا چوری کی وجہ سے کاروباری فریق کے کاروبار شروع کرنے کے بعد ضائع ہو جائے تو اسکی تلافی بھی نفع میں سے کی جائیگی، زیادہ صحیح رائے یہی ہے، اور اگر یہ ضیاع کاروباری فریق کے تصرف سے پہلے واقع ہو زیادہ صحیح رائے کے مطابق وہ اصل سرمایہ میں سے محسوب ہوگا، اگر مالک سرمایہ کا کچھ حصہ نفع یا نقصان واقع ہونے سے پہلے لے لے تو باقی سرمایہ ہی اصل قرار پائے گا۔

مالکیہ کا مذہب:

,,المالكية قالوا: القاعدة في ذلك أن رأس المال إذا خسر منه شيء بالعمل فيه أو تلف بآفة سماوية، أو سرقة لص، فإن الخسارة تجبر من الربح بمعنى أن الباقي بعد التلف أو الخسارة يكمل بالربح، ثم إن زاد شيء بعد ذلك يقسم بين المالك والمضارب، بحسب الشرط الذى دخلا عليه، فإذا قسم الربح قبل أن يقبض المالك رأس ماله عمل بهذه القاعدة فير الذى أخذ من الربح، ويكمل به رأس المال في حال الخسارة،،[۱]

مالکیہ کہتے ہیں کہ اس بارے میں قاعدہ یہ ہے کہ اصل سرمایہ میں اگر کاروبار کرنے کے سبب کوئی نقصان ہو یا کسی آسمانی آفت کی وجہ سے یا چوری کی وجہ سے اس کا کوئی حصہ ضائع ہو جائے تو اس کمی کی تلافی نفع میں سے کی جائے گی، یعنی ضیاع یا خسارے کے بعد اصل سرمایہ کا جو حصہ بچا ہے اس میں پچھلا نفع ملا کر اصل

(۱) جزائری، عبد الرحمن، کتاب الفقه على المذاهب الاربعه، لاهور، محكمه اوقاف ۱۹۷۱ء (۶۲:۳)۔

سرمایہ کو پورا کیا جائے گا، اس کے بعد بھی اگر فاضل بچے تو وہ کاروباری فریق اور صاحبِ سرمایہ کے درمیان اسی شرط کے مطابق تقسیم پائیگا، جو انہوں نے شروع میں طے کی تھی، اگر صاحب سرمایہ کے اصل سرمایہ پر قبضہ پانے سے پہلے نفع تقسیم کر لیا گیا ہو تو اسی قاعدے کے مطابق عمل کیا جائے گا، اور نفع میں سے جو کچھ لیا گیا ہو اسے واپس کر کے نقصان کی صورت میں اصل سرمایہ کو پورا کیا جائے گا۔

مالکیہ کا جو مذہب اوپر بیان کیا گیا اسکی تائید خود مالکیہ کی دوسری کتب سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ علامہ احمد الدردیر الشرح الصغیر میں فرماتے ہیں:

,,وجبر خسره ...... بالربح وما زاد بعد الجبر فبينهما على ما شرطه، مالم يقبض المال من العامل، فإنه قبضه رب ناقصا عن أصله، ثم رده له فلا يجبر بالربح، لأنه حينئذٍ صار قراضا مؤتنفا،،[1]

جب مال میں گھاٹا ہو...... تو اس کمی کو نفع میں سے پورا کیا جائے گا، اور اس کمی کی تلافی کے بعد جو نفع باقی بچے وہ فریقین کے درمیان انکی طے کردہ شرط کے مطابق تقسیم پائے گا، یہ اسی وقت تک ہے جب تک اصل سرمایہ کاروباری فریق سے واپس نہ لیا جائے، اگر صاحب سرمایہ نے اصل سرمایہ کو گھاٹے کے ساتھ واپس لے لیا پھر اسے کاروباری فریق کو دوبارہ دیا تو اب اس میں جو کمی (پہلے ہو چکی) ہے اسکی تلافی (آئندہ) نفع سے نہیں کی جائے گی، کیونکہ اب یہ مضاربت کا ایک نیا معاہدہ قرار پائے گا۔

حنابلہ کا مذہب:

,,الحنابلة قالوا: لايستحق المضارب شيئا من الربح حتى يتسلم رأس

(۱) الدردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغير على اقرب المسالك (۳: ۷۰۰) باب القراض۔

المال إلى صاحبه، والخسارة تجبر من الربح، ...... ويقوم مقام القبض بالفعل أن تباع كل السلع، ويصير رأس المال نقدا، فإذا تحاسبا بعد ذلك واقتسما الربح ولم يقبض رب المال ماله وأنفق معه على أن يعمل فيه مضاربة، فربح فإن ذلك الربح لا يجبر الخسران السابق،،[1]

حنابلہ کہتے ہیں کہ جب تک مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے والا اصل سرمایہ کو اسکے مالک کو واپس نہ کردے، وہ نفع میں سے کسی حصہ کا حقدار نہ ہوگا،......اور نقصان کی تلافی نفع میں سے کی جائے گی، یہ بات قبضہ کے قائم مقام سمجھی جائے گی، کہ تمام اشیاء فروخت کر دی جائیں، اور اصل سرمایہ نقد کی صورت اختیار کرلے، اسکے بعد اگر دونوں فریق حساب فہمی کریں، اور نفع تقسیم کرلیں مگر صاحب سرمایہ اپنے سرمایہ پر قبضہ نہ کرے بلکہ کاروباری فریق سے یہ طے کرے کہ وہ اس سرمایہ کے ذریعہ مضاربت کے اصول پر کاروبار کرے گا، پھر اس کاروبار میں نفع ہو تو اس نفع سے سابق کاروبار کے نقصان کی تلافی نہیں کی جائیگی۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

،،وليس للمضارب ربح حتى يستوفي رأس المال يعني أنه لا يستحق أخذ شيء من الربح حتى يسلم رأس المال إلى ربه، ومتى كان في المال خسران وربح جبرت الوضيعة من الربح، سواء كان الخسران والربح في مرة واحدة أو الخسران في صفقة والربح في أخرى،،[2]

مضاربت پر سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے والے کو اس وقت تک کوئی نفع

(۱) جزائری، عبد الرحمن، كتاب الفقه على المذاهب الاربعه، لاهور، محكمه اوقاف ۱۹۷۱ء (۶۲:۳) مبحث في قسمة الربح۔

(۲) ابن قدامة، أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي، المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ (۵۷:۵)۔

نہیں ملے گا جب تک اصل سرمایہ پورا واپس نہ لے لیا جائے، یعنی اصل سرمایہ مالک کو لوٹا دینے سے پہلے اسے نفع میں سے کچھ لینے کا حق نہیں ہے، جب مال میں گھاٹا اور نفع دونوں ہوں تو نقصان کی تلافی نفع سے کی جائے گی، خواہ نقصان اور نفع ایک ہی مرتبہ کے کاروبار میں ہوا ہو، یا ایک تجارت میں گھاٹا ہو، اور دوسری تجارت میں نفع۔

مشارکہ اور کاروبار کا تسلسل:

ان عبارتوں سے بظاہر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مضاربت میں جب تک تمام اثاثے مکمل طور پر نقد نہ ہو جائیں اس وقت تک نفع کی حتمی تقسیم کا کوئی راستہ نہیں، اس اصول کے تحت اس مضاربت میں تو کوئی خاص عملی دشواری پیش نہیں آسکتی جو کسی محدود مقصد یا محدود مدت کے لئے عمل میں لائی گئی ہو، مثلاً مضاربت صرف اس کام کے لئے تھی کہ اس سے ایک مرتبہ فصل کی گندم خرید کر اسے فروخت کیا جائے گا، تو گندم کی فروختگی کے بعد حتمی تقسیم بھی ہو جائے گی، اور مضاربت ختم بھی ہو جائے گی، یا مثلاً رب المال اور مضارب کے درمیان یہ بات طے ہوئی تھی کہ ہمارا یہ تعلق صرف ایک سال کے لئے ہے، سال کے ختم پر ہم بہر صورت یہ مضاربت ختم کر دیں گے، چنانچہ سال کے ختم پر تمام اثاثے نقد بنا کر نفع کی تقسیم کر لی جائے گی۔

لیکن اگر کاروبار کثیر المقاصد (Multi purpose) ہو اور مستقل بنیادوں پر جاری رہنے والا ہو تو اسمیں نفع کی حتمی تقسیم کے لئے اثاثوں کو نقد (Liquidation) بنانے کی شرط یہ عملی دشواری پیدا کرتی ہے کہ اس قسم کے کاروبار میں تمام اثاثوں کا نقد ہو جانا عملاً ممکن نہیں ہوتا، اور چونکہ کاروبار مستقل بنیادوں پر قائم کیا گیا ہے، اس لئے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اثاثوں کے نقد ہونے کی نوبت کب آئیگی، ایسی صورت میں اگر نفع کی ہر درمیانی تقسیم کو عبوری اور عارضی سمجھا جاتا رہے تو کم از کم مضارب ایک غیر معینہ مدت تک اس بے یقینی کی کیفیت کا شکار رہ سکتا ہے، کہ خدا جانے آخر کار اسے کچھ ملے گا بھی یا نہیں؟، بالخصوص جب مضاربت کو بینکوں اور مالیاتی اداروں میں تمویل (Financing) یا سرمایہ

کاری (Investment) کے لئے سود کے متبادل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، تو یہ دشواری اور زیادہ گمبھیر ہو جاتی ہے، کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک بینک کے سارے اثاثے نقد میں تبدیل نہ ہو جائیں، اس وقت تک امانت داروں (Depositors) کے ساتھ نفع کی کوئی حتمی تقسیم ممکن نہ ہو، جو ظاہر ہے کہ تقریباً نا قابل عمل بات ہے۔

اس مشکل کا ایک حل تو یہ ہے کہ کثیر المقاصد اور طویل المیعاد کاروبار خواہ وہ بینک کی شکل میں ہوں، یا کسی مالیاتی ادارے کی شکل میں، یا کسی اور صنعتی اور تجارتی ادارے کی شکل میں، عام طور سے تنہا مضاربت پر قائم نہیں ہوتے، یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ تمامتر سرمایہ کسی ایک فریق کا ہو، اور دوسرے فریق نے کاروبار میں کوئی سرمایہ کاری نہ کی ہو، بلکہ عموماً ہوتا یہ ہے کہ ایسے کاروبار میں ورکنگ پارٹنرز بھی اپنا کچھ نہ کچھ سرمایہ کاروبار میں ضرور لگاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ معاملہ تنہا مضاربت کا نہیں رہتا، بلکہ اس کے ساتھ شرکت بھی جمع ہو جاتی ہے جیسے ہم زیر نظر مقالے میں لفظ مشارکہ سے تعبیر کرتے آئے ہیں، اور چونکہ شرکت میں نفع کی حتمی تقسیم تمام اثاثوں کے نقد ہونے کے ساتھ مشروط نہیں ہوتی، اس لئے ان جیسے کاروباروں میں اثاثوں کی قیمت کی بنیاد پر نفع و نقصان کا تعین اس وقت بھی کیا جاسکتا ہے جب اثاثے ابھی نقد نہ بنے ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر بالفرض کاروبار صرف مضاربت پر مشتمل ہو تب بھی مذکورہ مشکلات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمارے دور کے بہت سے علماء کرام نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ نفع کی حتمی تقسیم کے لئے تمام اثاثوں کا حقیقۃً نقد میں تبدیل ہو جانا ضروری نہیں، بلکہ صرف حکماً نقد ہو جانا بھی کافی ہے، جسے وہ آج کل کی عربی اصطلاح میں تنضیضِ حکمی (Constructive liquidation) سے تعبیر کرتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مرحلے پر نفع کی حتمی تقسیم کرنا منظور ہو، اس مرحلے پر تمام غیر نقد اثاثوں کی بازاری قیمت لگا کر یہ فرض کیا جائے کہ یہ اثاثے اس قیمت پر بک چکے ہیں، پھر اس بنیاد پر کاروبار میں نفع نقصان کا حساب کیا جائے، اور اگر اس طریقے سے کاروبار میں نفع ثابت ہو تو وہ طے شدہ شرح کے مطابق آپس میں تقسیم کر لیا جائے۔

تنضیض حکمی کی تفصیلات اور فقہی توجیہ بیان کرنے سے پیشتر اس کے جواز کے بارے میں معاصر علماء کرام کے فتاوی اور انکے دلائل مختصراً ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، چنانچہ اس سلسلے میں علماء کرام کی آراء اور نقطہائے نظر ذیل

میں ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ دلۃ البرکۃ گروپ اور اس کے ذیلی اداروں کی ہیئۃ الرقابہ الشرعیہ (Shariah Supervisory board) کے شائع شدہ فتاوی میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ:

تعتمد الشركة على تحديد الأرباح على احدى طريقتين: التحقيق الفعلى للأرباح بالتنضيض الحقيقى، (تحويل الأصول إلى نقود)۔

التنضيض الحكمى، وذلك بالتقويم للأصول بالقيمة النقدية المتوقع تحقيقها طبقا للمعايير المحاسبية المعتبرة۔[1]

منافع کی تعیین کے سلسلے میں شرکت دو طریقوں میں سے کوئی ایک اختیار کرے گی۔

۱۔ حقیقی تنضیض کا طریقہ: جس میں سرمایۂ شرکت نقد شکل میں منتقل کر کے اصل سرمایہ اور نفع مقرر کیا جائے گا۔

۲۔ تنضیضِ حکمی کا طریقہ: معتبر حسابی پیمانوں اور اندازوں کو مد نظر رکھکر نقود کے ذریعہ اجناس کی قیمت متعین کرنا۔

۲۔ ڈاکٹر عبدالستار ابو غدہ اپنی تصنیف الأجوبۃ الشرعیہ فی التطبیقات المصرفیہ[2] میں فرماتے ہیں:

وبما أن المشاركات فى المصارف و المؤسسات المالية الاسلامية أصبحت مرتبطة بدورات زمنية محددة ،مستمرة، نظرا للطابع الحماعى فى المستثمرين والمخارجة بينهم فقد تعين اعتبار بديل للتنضيض الفعلى،

(۱) فتاوى الهيئة الشرعيه للبركة، الطبعة الأولى (۱۴۱۸/۱۹۹۷) واسم المرتبين، الدكتور عبد السلام ابو غده، وعز الدين خوجه، من منشورات مجموعة دلة البركه، قطاع الأموال شركة البركة للاستثمار والتنميه، المملكة العربية السعودية۔

(۲) ڈاکٹر عبدالستار ابو غده ، الاجوبة الشرعية فى التطبيقات المصرفية، دلة البركة(۹۶:۲) التنضيض۔

فی هذه الحالات وهو التنضیض التقدیری (التقویم) حیث إن الرجوع
للقیمة یعتبر مبدأ شرعیا فی کثیر من التطبیقات الفقهیه کما فی الغصب
وتعذر الالتزام بالمثل فیصار للقیمة، وکذلك فی جزاء محظورات الحج
والصید وغیرها۔

چونکہ بینکوں اور اسلامی مالیاتی اداروں میں سرمایہ کاری طویل المیعاد یا رواں زمانوں سے مرتبط ہے، لہٰذا ان حالات میں سرمایہ کاروں کی اجتماعی طبیعت انکے نفع کی تقسیم کو مد نظر رکھتے ہوئے فقہائے معاصرین نے تنضیض حکمی کو حقیقی تنضیض کا بدل قرار دیا ہے، کیونکہ بہت سی فقہی تطبیقات مثلاً غصب، مثلی اشیاء کا دستیاب نہ ہونا، اور حج یا شکار کی جزاء وغیرہ میں قیمت کی طرف رجوع کرنا اس مسئلے کی شرعی بنیاد ہے۔

۳۔ اسی قسم کی رائے جناب ڈاکٹر عبداللہ عبدالرحیم العبادی نے اپنی تحقیقی تصنیف موقف الشریعہ من المصارف الاسلامیہ المعاصرہ میں بھی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے، جس کا خلاصہ ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

اسلامی بینکوں اور انکی مانند اسلامی کمپنیوں میں یہ ناممکن ہے کہ پہلے مضاربت کے تمام اثاثے نقد بنائے جائیں اور پھر شرکاء کے درمیان نفع تقسیم کیا جائے، کیونکہ اگر ہم نفع کی تقسیم کے لئے پہلے تمام سرمایہ کی حقیقی تنضض کو لازمی قرار دیں تو اس میں موجودہ زمانے میں بہت سی دشواریوں اور مشکلات کا سامنا ہوگا، اسکی وجہ یہ ہے کہ آج کل یہ ناممکن ہے کہ مخلوط اور اجتماعی سرمایہ میں شامل مضاربہ کے تمام معاہدوں کو کسی ایک وقت مقرر پر یکسر ختم کر کے انکے تمام اثاثے نقد شکل میں منتقل کر دیئے جائیں، کیونکہ ان ادروں کا مقصود ہی طویل المیعاد یا رواں اجتماعی سرمایہ کاری ہے، اگر انہیں کسی مختصر مدت میں ختم کر دیا گیا تو مالیاتی اداروں کا نقصان ہوگا، اور منصوبہ پایۂ تکمیل تک پہونچنا مشکل ہو جائے گا، اور اگر انہیں طویل مدت تک برقرار رکھا گیا، اور اس دوران مضاربوں (کاروباری افراد) یا سرمایہ کاروں کو نفع نہیں دیا گیا تو اتنے عرصہ تک کسی نفع کے بغیر کاروبار کرنا مشکل ہو جائے گا، اور اگر بالفرض علی الحساب نفع دیدیا جائے اور انہیں نفع کا عارضی مالک بنایا جائے تو انکے لئے اتنے عرصہ تک کاروبار جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا، کیونکہ اس صورت میں ہر لحظہ یہ خدشہ رہے گا

کہ ممکن ہے مستقبل میں کاروبار میں نقصان ہو جائے، جسکی وجہ سے انہیں حاصل کردہ نفع واپس لوٹانا پڑے، لہذا آج کل کے دور میں سرمایہ کی حقیقی تنضیض (حقیقۃً نقد بنانا) بہت مشکل ہے، اسی وجہ سے ہم اس تنضیض حقیقی کی کسی متبادل شکل تلاش کرنے پر مجبور ہیں، اس سے قبل کے اسکی کوئی متبادل شکل تلاش کرتے ہم نے یہ غور کیا کہ فقہاء کرام کے بیان کردہ اس اصول کا کہ مضاربت میں سرمایہ کو پہلے نقد شکل میں تبدیل کیا جائے، اور اس کے بعد نفع تقسیم کیا جائے، مقصد کیا ہے؟ فقہاء کرام کی کتابوں سے یہ بات واضح ہوئی کہ اس بات پر تمام فقہاء متفق ہیں کہ اس اصول کا مقصد اصلی یہ ہے کہ سرمایہ کار کا سرمایہ محفوظ رہے۔ (۱)

اس مقصود کی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ موجودہ بینکاری اور کمپنیوں کے نظام میں اگر اسلامی مضاربت کے تحت کاروبار کیا جائے اور نفع کی تقسیم کے لئے حقیقی تنضیض کو لازم قرار دینے کے بجائے حکمی تنضیض کو لازم قرار دیں تو بھی فقہاء کرام کا مقصود اصلی (یعنی سرمایہ کاروں کے سرمایہ کی حفاظت) حاصل ہو جاتا ہے، اسکی چند وجوہات ہیں۔

ایک یہ کہ ان اسلامی بینکوں اور کمپنیوں کے قیام کا مقصد غیر سودی سرمایہ کاری ہے، جسکی بنیاد خوف خدا اور تقوی ہے، لہذا ان اداروں سے سرمایہ میں کسی قسم کی خیانت کا اندیشہ بے جا ہوگا۔

دوسرے یہ کہ مذکورہ ادارے روایتی مضارب سے مختلف ہیں کیونکہ پہلے زمانوں میں ایک یا دو مضارب ہوا کرتے تھے، جن پر مکمل اعتماد کرنا مشکل ہوتا تھا، اور اس بات کا امکان رہتا تھا کہ اگر کاروبار کو نقد کئے بغیر فریقین کو نفع تقسیم کر دیا گیا تو اگر بالفرض مستقبل میں نقصان ہو گیا تو رب المال (سرمایہ کار) کا سرمایہ ڈوب جائیگا، اور مضارب سے نفع کی واپس

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الزیلعی، عثمان بن علی ۷۴۳ھ، تبیین الحقائق، مکتبہ امدادی ملتان ۷۴۳ھ، وتتفق المذاهب الأربعة فی أن الربح وقایه لرأس المال، وأنه لا توزیع علی أصحاب المشروع لأیة الارباح إلابعد المحافظة علی رأس المال الحقیقی، ویؤکد ذلك الامام الزیلعی فی کتابه (تبیین الحقائق فی شرح کنز الدقائق، فیقول: الربح تابع ورأس المال أصل، فلا یسلم الربح بدون سلامة رأس المال، (محاسبة الشرکات والمصارف فی النظام الإسلامی للدکتور محمد کمال عطیه ص:(۷۳)۔

بطور سرمایہ مشکل ہو جائے گی، اس کے برعکس ان جدید مالیاتی اداروں میں یہ بات نہیں ہے کہ اسمیں ایک یا دو افراد مضارب ہوں، بلکہ اس میں مجموعہ افراد مضارب ہوتا ہے، جسے شخص قانونی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اور ایسے اداروں کی ایک ساکھ ہوتی ہے جس کی وجہ سے اصل سرمایہ میں خیانت کا امکان نہیں ہوتا، لہذا ان پر سرمایہ کی حفاظت کے سلسلہ میں مکمل اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

تیسرے یہ کہ موجودہ دور میں حساب کتاب کا ایسا جدید نظام اور ماڈرن ٹیکنالوجی وجود میں آچکی ہے کہ جسکی وجہ سے ہر فریق کا سرمایہ، نفع اور اخراجات وغیرہ کے حسابات انتہائی باریکی کے ساتھ کمپیوٹر یا رجسٹروں میں محفوظ ہوتے ہیں، جسکی وجہ سے کسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں رہتا، غرضیکہ مذکورہ بالا تمام وجوہات کی روشنی میں ایسے اداروں پر مکمل اعتماد کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر تنضیضِ حقیقی کو لازم کئے بغیر صرف تنضیض حکمی کے طریقہ پر عمل کیا جائے، تو شرعاً اسکی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس صورت میں مضارب اور سرمایہ کاروں کو جو نفع تقسیم کیا جائے گا، اس کے وہ عارضی مالک کے بجائے حقیقی مالک بن جائیں گے۔ (۱)

۴۔ اوپر ڈاکٹر عبداللہ عبادی کی تنضیضِ حکمی کے بارے میں رائے اور دلیل کا خلاصہ ذکر کیا گیا، اور اس سے پہلے چند معاصر علماء کرام کے تنضیضِ حکمی کے جواز پر فتاوی بھی ذکر کئے گئے تھے، اب اس بارے میں "مجمع الفقہ الاسلامی جدہ"، کے چوتھے اجلاس کی قرارداد ذکر کی جاتی ہے، جس میں شریک تقریباً تمام ممالک کے معروف علماء اور فقہاء نے تنضیضِ حکمی کے جواز پر متفقہ فتوی جاری کیا، مندرجہ ذیل قرارداد سے اسکے جواز کی حتمی دلیل حاصل ہوتی ہے:

ان محل القسمة هو الربح بمعناه الشرعي ، و هو الزائد عن رأس المال و ليس الايراد أو الغلة ـ و يعرف مقدار الربح، اما بالتنضيض أو بالتقويم فهو الربح الذى يوزع بين حملة الصكوك و عا مل المضاربة ، وفقا لشروط

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: موقف الشريعه من المصارف الإسلاميه المعاصرة للدكتور عبدالله عبدالرحيم العبادى (٢٦٥) ، رسالہ دکتورہ: فى الفقه المقارن، كليه الشرعيه بجامعه الازهر مطابع الاتحاد الدولى للبنوك الاسلاميه، مصر۔ وهكذا نبينه الدكتور غريب الجمال فى المصارف وبيوت التمويل (٢٠٩)۔

العقد۔

محل تقسیم صرف منافع ہیں، اور شرعاً منافع وہ حقیقی آمدنی ہے جو ابتداء سے لگائے ہوئے اصل سرمایہ سے زائد حاصل ہوئی ہو، ہر پیداوار اور آمدنی کو منافع نہیں کہا جائے گا۔ اور حقیقی منافع معلوم کرنے کے دو طریقے ہو سکتے ہیں، ایک طریقہ یہ ہے کہ کاروبار کے تمام اثاثے فروخت کر کے نقد بنائے جائیں، اسے اصطلاح میں تنضیض کہتے ہیں، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کاروبار کے تمام اثاثوں کی بازاری قیمت لگا کر حساب کر لیا جائے، جسے تقویم کہا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اصل سرمایہ پر جتنا اضافہ ہوا ہو وہ نفع کہلائے گا، اور وہ سر ٹیفکیٹس ہولڈرز (Cirtificata Holders) اور کمپنی کے درمیان طے شدہ معاہدے کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب تمام سابق فقہاء مضاربت میں نفع کی حتمی تقسیم کے لئے اثاثوں کی نقد پذیری کو لازمی شرط قرار دیتے چلے آئے ہیں تو اس تنضیض حکمی کے تصور کی فقہی بنیاد کیا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تنضیض حکمی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو اثاثے ابھی نقد نہیں ہوئے انکو رب المال یا مضارب میں سے کوئی ایک فریق مال مضاربت سے خود خرید لیتا ہے، اور اسکی قیمت کو اپنے حصہ نفع میں سے منہا کرا دیتا ہے، فرض کیجئے کہ زید رب المال ہے، جس نے سو روپے عمر کو مضاربت پر دیئے، اور یہ طے کیا کہ نفع کا آدھا آدھا حصہ دونوں تقسیم کریں گے، عمر نے سو روپے سے کاروبار شروع کیا، یہاں تک کہ کاروبار میں کچھ اثاثے نقد اور کچھ غیر نقد ہو گئے، اب ایک مرحلہ پر پہونچکر دونوں نے چاہا کہ نفع کی حتمی تقسیم کر لی جائے، مگر اس وقت کاروبار کا آدھا حصہ نقد اور آدھا غیر نقد ہے، اب تنضیض حکمی کا مطلب یہ ہو گا کہ زید کاروبار کے غیر نقد اثاثوں کو اپنی ذات کے لئے خرید لے گا، اور اس خریداری کی وجہ سے جو قیمت اسپر واجب ہوئی وہ اپنے حصہ نفع سے منہا کرا دے گا۔

فرض کیجئے کہ اس مرحلہ پر کاروبار میں پچھتر روپے نقد تھے، اور بازار کی قیمت کے مطابق پچھتر روپے کا سامان تھا، زید نے پچھتر روپے کا سامان خرید لیا، جس سے اس کے ذمہ مال مضاربت کے لئے پچھتر روپے واجب ہو گئے، اور مال

مضاربت کا کل اثاثہ حکماً نقد ہو گیا کیونکہ پچھتر روپے پہلے ہی نقد تھے اب سامان بکنے کے بعد پچھتر روپے مزید نقد ہو گئے، جو زید کے ذمہ واجب الأداء ہیں اس طرح کل اثاثوں کی مالیت ایک سو پچاس روپے ہو گئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ کاروبار میں پچاس روپے کا نفع ہوا، اب ان ڈیڑھ سو روپے میں سے سو روپے زید کے اصل سرمایہ کے طور پر اسے واپس ہونے ہیں، اور پچاس روپے کا نفع دونوں میں آدھا آدھا تقسیم ہوتا ہے، جن میں سے پچیس روپے زید کو اور پچیس روپے عمر کو ملیں گے، نفع کی اس تقسیم کے مطابق زید کا کل استحقاق ایک سو پچیس روپے ہوا، ان ایک سو پچیس روپے میں سے پچھتر روپے اس سامان کی قیمت کے طور پر منہا کئے جائیں گے جو اس نے خریدا، باقی پچاس روپے اسے نقد دیدیئے جائیں گے، دوسری طرف مضارب کا کل نفع پچیس روپے تھا وہ اسے دیدیا جائے گا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کاروبار میں جو نقد پچھتر روپے تھے اس میں سے پچاس روپے زید کو مل گئے، اور ان میں سے پچیس روپے عمر مضارب کو اور نقد اثاثے جوں کے توں زید کی بلا شرکت غیرے ملکیت میں آگئے۔

مذکورہ بالا صورت حال مندرجہ ذیل نقشے سے واضح ہو سکتی ہے:
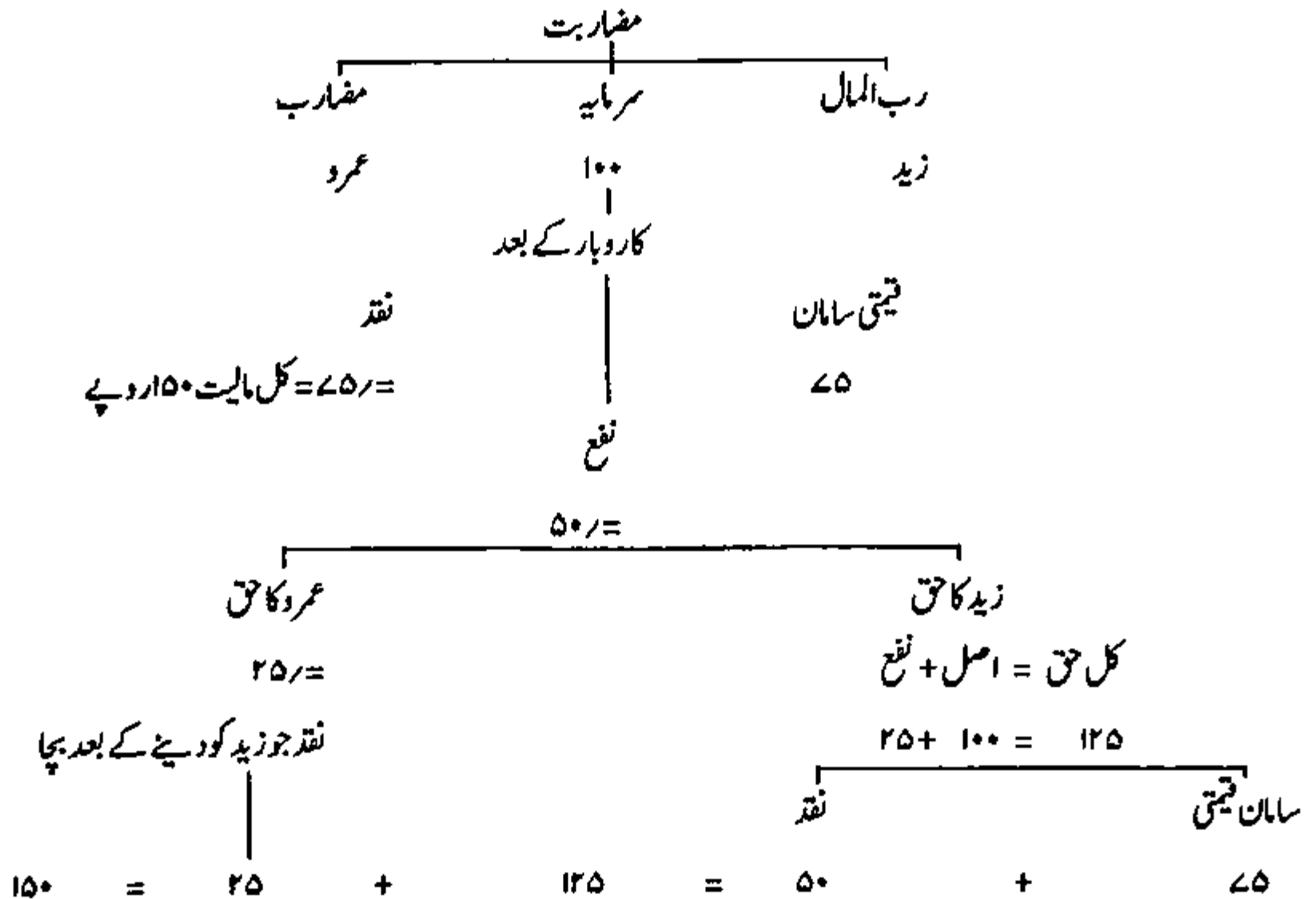
اب ذیل میں اوپر ذکر کردہ تنضیض حکمی کی رائے اور مثال کی تائید میں فقہ حنبلی کی ایک کتاب شرح منتہی الارادات کی ایک عبارت ذکر کی جاتی ہے، جس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کاروبار مضاربت کی انتہاء کے وقت سرمایہ کا حقیقی طور پر نقد ہونا لازمی نہیں ہے، بلکہ اگر عروض (اجناس) کی شکل میں بھی ہوں تو مضاربت فسخ کی جاسکتی ہے، ایسی صورت میں انکی بازاری قیمت لگاکر رب المال کو اس سامان کی قیمت میں سے مضارب کا حصہ نفع منہاکر کے بقیہ سرمایہ کا مالک بنادیا جائے تو جائز ہے، اور یہی تنضیض حکمی ہے، چنانچہ عبارتِ ذیل ملاحظہ ہو:

وحيث فسخت والمال عرض ...... فرضي ربه بأخذه قومه ودفع حصته وملكه۔[1]

جب مضاربت اس حال میں فسخ کردی جائے کہ سرمایہ جنس کی شکل میں ہو،...... اور رب المال اسے لینے پر رضامند ہو تو مضارب اسکی قیمت لگائے گا، اور اس کو اس کا حصہ دیدے گا، اور وہ اس کا مالک بن جائے گا۔

مذکورہ بالا مثال میں تنضیض حکمی کا دوسرا طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو اثاثے ابھی نقد نہیں ہیں انہیں زید یعنی رب المال کے بجائے عمر یعنی مضارب خرید لے، اور انکی قیمت جزوی یا کلی طور پر اپنے حصہ نفع سے منہا کرادے، چنانچہ مذکورہ بالا مثال میں غیر نقد اثاثے پچھتر روپے کے ہیں، جبکہ مضارب کا نفع صرف پچیس روپے ہے تو وہ یہ کرسکتا ہے کہ پچاس روپے رب المال یعنی زید کو دے کر سارے غیر نقد اثاثوں کا خود مالک بن جائے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ زید یعنی رب المال کو وہی ایک سو پچیس روپے مل جائیں گے، جن میں سے سو روپے اس کے اصل ہیں، اور پچیس نفع کا حصہ، اور غیر نقد اثاثے تمامتر مضارب کی ملکیت ہوجائیں گے۔

تنضیض حکمی کے مذکورہ بالا طریقے کے مطابق مضاربت کا حتمی تصفیہ ہوگیا، اب فریقین کو اختیار ہے کہ اگر وہ چاہیں تو آئندہ سال کے لئے دوبارہ شرکت یا مضاربت کا عقد کرلیں۔

تنضیض حکمی کے مذکورہ بالا توجیہ پر یہ سوال ہوسکتا ہے کہ رب المال مضاربت کے مال کو کیسے خرید سکتا ہے جب

---

(۱) ملاحظہ ہو: بھوتی، منصور بن یونس البهوتي ۱۰٤٦ھ، منتهى الارادات، دار الفكر، بيروت، (٦٦٤:١)۔

کہ وہ خود اس کا مال ہے؟ اس کے جواب میں عرض یہ ہے کہ فقہاء کرام کی ایک بڑی جماعت اس بات کی قائل ہے کہ رب المال مضاربت کا مال خرید سکتا ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

ویجوز شراء رب المال من المضارب وشراء المضارب من رب المال، وإن لم یکن فی المضاربة ربح فی قول أصحابنا الثلاثه وقال زفرؒ: هذا بیع ماله بماله، إذ المالان جمیعا لرب المال، وهذا لا یجوز، کالوکیل مع الموکل ،ولنا أن لرب المال فی مال المضاربه ملك رقبة لا ملك تصرف وملکه فی حق التصرف کملك الأجنبی حتی لا یملك رب المال منعه من الصرف فکان مال المضاربة فی حق کل واحد منهما کمال الاجنبی، لذلك جاز الشراء بینهما۔ (۱)

رب المال (سرمایہ کار) کا مضارب سے مال مضاربت خریدنا اور مضارب کا رب المال سے مال مضاربت خریدنا جائز ہے خواہ مضاربت میں کوئی نفع حاصل نہ ہوا ہو، یہ مذہب ہمارے تینوں اماموں کا ہے، اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ یہ تو اپنے مال کو اپنے ہی مال کے عوض فروخت کرنے کی طرح ہے، کیونکہ دونوں مال سرمایہ کار کے ہیں اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی موکل اپنے وکیل کو اپنا مال اپنی طرف سے دیئے ہوئے سرمایہ کے عوض فروخت کردے، اور یہ ناجائز ہے، لیکن ہماری دلیل یہ ہے کہ سرمایہ کار کی اگرچہ سرمایہ مضاربت میں حقیقی ملکیت موجود ہے، لیکن اسے تصرف کا اختیار نہیں ہے، جیسے اجنبی شخص کی مملوکہ اشیاء میں کسی کو تصرف کا اختیار نہیں ہوتا، اور دوسری طرف مضارب کو اس سرمایے میں تصرف کی ملکیت تو ہے لیکن حقیقی ملکیت نہیں ہے، لہذا حقیقی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے وہ مال ایک اجنبی کے مال کی مانند ہے، اور مضارب کو چونکہ

---

(۱) الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع للکاسانی (۱۰۸:٦)۔

تصرف کا اختیار حاصل ہے، لہذا اسے رب المال (سرمایہ کار) تصرف سے روک بھی نہیں سکتا، ان باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ سرمایہ مضاربت ہر ایک کے حق میں اجنبی کے مال کی طرح ہے، اسی لئے ان دونوں کے درمیان خرید وفروخت جائز ہے۔

مذکورہ بالا عبارت کا خلاصہ یہ ہے کہ رب المال مضارب کے ہاتھ سرمایہ مضاربت خرید ناشرعا جائز ہے، اور جہانتک مضارب کی خریداری کا تعلق ہے اس میں تو کوئی اشکال ہی نہیں ہے، کیونکہ وہ اس کا مال ہی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ تنضیض حکمی کی دونوں صورتیں شرعا جائز ہیں، اگر غیر نقد اثاثوں کو رب المال اپنی ملکیت میں لاکر آئندہ مضاربت جاری رکھنا چاہتا ہے تو غیر نقد اثاثے خود خرید کر قیمت اپنے حصہ نفع سے منہا کرادے، اور اگر مضارب ان اثاثوں کا مالک بننا چاہتا ہے، اور آئندہ اسی رب المال سے شرکت کا معاملہ کرنا چاہتا ہے تو اثاثے وہ خرید کر اسکی قیمت اپنے حصہ سے منہا کرادے، اور پھر باہم رضامندی سے دوسرا عقد کرلے، یہاں سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ رب المال کا سرمایہ اس کے قبضہ میں آئے بغیر نیا عقد شرکت یا مضاربت کیسے ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فقہائے کرام نے نئے عقد کے لئے حقیقی قبضہ کرانا ضروری نہیں سمجھا، بلکہ حکمی قبضہ کو بھی کافی سمجھا ہے۔

حکمی قبضہ یہ ہے کہ مضاربت کی صورت میں تنضیض حکمی کی وجہ سے سرمایہ رب المال کی ملکیت میں تو آگیا ہو لیکن عملاً کاروباری فریق کے ہاتھ میں ہو، اور مالک کے ہاتھ میں نہ آیا ہو، البتہ مالک کے لئے یہ پوری طرح ممکن ہو کہ وہ چاہے تو اسی کاروباری فریق کے ہاتھ اس سرمایہ کے ذریعہ ایک نیا کاروباری معاہدہ کرلے، یہ حکمی اور قانونی قبضہ کہلاتا ہے، جس میں رقم ہاتھ میں تو نہیں آتی مگر پوری طرح زیرِ تصرف آجاتی ہے، چونکہ ملکیت اور قبضہ کا اصل جوہر مکمل تصرف ہے، لہذا فقہاء احناف اور حنابلہ نے اسے قبضہ اور واپس ملنے کے ہم معنی قرار دیا ہے، اصل سرمایہ مالک کو حکمی اور قانونی طور پر واپس مل جانے کے بعد سابق کاروبار کے نفع ونقصان کی تقسیم آخری اور قطعی ہو جاتی ہے، اور اب اس

سرمایے سے ایک نیا کاروبار شروع کیا جاسکتا ہے۔[1]

مذکورہ بالا صورت مضاربت سے متعلق تھی، البتہ شرکت کی صورت میں اس میں یہ تفصیل ہے کہ احناف کے نزدیک فسخ شرکت کے لئے چونکہ سرمایہ کا نقد ہونا بھی لازمی نہیں ہے، لہذا ان کے نزدیک مذکورہ بالا صورت میں سرمایے کا حکماً یا حقیقۃً نقد بنانا بھی ضروری نہ ہوگا، چنانچہ اگر سرمایہ شرکاء کے ہاتھ میں ہی رہے خواہ نقد شکل میں ہو یا غیر نقد، دونوں صورتوں میں اگر سرمایے کی تعیین اور حساب کتاب صاف کرلیا جائے، اور سرمایہ مالک کی ملکیت اور تصرف میں آجائے، خواہ عملاً اس کا قبضہ نہ بھی ہو تو اس سرمایہ سے اب نیا عقد کر کے کاروبار کرنا درست ہوجائے گا۔[2]

---

(۱) ملاحظہ ہو: المرغيناني، (شيخ الاسلام) برهان الدين ابو الحسن) على بن عبد الجليل أبو بكر الرشداني، الهداية ، ايج ايم سعيد كمپنى، ۱۹۷۵ء، فلو اقتسما الربح وفسخا المضاربة ثم عقداها فهلك المال لم يترادا الربح الأول،لأن المضاربة الاولى قد انتهت، والثانيه عقد جديد فهلاك المال فى الثانى لا يوجب انتقاض الاول، كما إذا دفع إليه مالا آخر (۳:٦٦٥)، فصل فى العزل والقسمة۔

مزید دیکھئے: جزائرى، عبد الرحمن ،كتاب الفقه على المذاهب الاربعه، لاهور، محكمه اوقاف ۱۹۷۱ء، الحنفيه قالوا: وإذا قسم الربح وبقى راس المال فى يد المضارب ففسخ عقد المضاربة ثم جدد عقد مضاربة آخر فإن الربح الذى قسم تنفذ قسمته ولا يرد بعد ذلك، (۳:٦١)

مزید ملاحظہ فرمائیں: الحنابله قالوا: فإذا تحاسبا بعد ذلك واقتسما الربح ولم يقبض رب المال ماله واتفق معه على أن يعمل فيه مضاربه فربح فإن ذلك الربح لا يجبر الخسران السابق، (۳:٦٢ مبحث قسمة الربح)۔

(۲) ملاحظہ ہو: ابن قدامة،(أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسى) المغنى، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ

نئے فریق کے ساتھ شرکت یا مضاربت

کیا کسی شریک کو یہ اختیار ہے کہ سرمایہ شرکت میں کسی نئے فریق کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاہدہ کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شریک شرکت کے اصول پر نئے فریق سے مزید سرمایہ، مشترکہ کاروبار میں لگانے کے لئے حاصل کرے، یا کسی دوسرے کو دے کر اس کے مال میں شرکت کرے تو اس کے معنی شرکت میں ایک شریک کے اضافہ کے ہیں، یہ اقدام تمام شرکاء کی رضامندی ہی سے کیا جاسکتا ہے، کسی کاروبار میں شریک افراد کو ہر وقت اس بات کا اختیار ہے کہ وہ شرکت کے دوسرے شرعی احکام کی پابندی کرتے ہوئے اس کاروبار میں مزید افراد کو شریک کرلیں، دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی ایک شریک کو ایسا کرنے کا اختیار نہیں ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

,,وليس له أن يشارك إلا أن يؤذن له بذلك لأن الشيء لا يستتبع مثله،،[1]

(۲۵:۵) وبعض مشائخنا فرق بين الشركه والمضاربة فقال: يجوز فسخ الشركة وإن كان رأس المال عروضاً، ولا يجوز فسخ المضاربه لأن المال في يد الشريكين جميعا، ولهما جميعا ولاية التصرف فيملك كل واحد منهما، نهي صاحبه عينا كان المال أو عروضاً، فأما مال المضاربه ففي يد المضارب ولاية التصرف له لا لرب المال، فلا يملك رب المال نهيه بعد ما صار المال عروضاً، (۷۷:٦، الشركه)۔

مزید دیکھئے: (۵: ۲۵) حنابلہ کے نزدیک شرکت کو فسخ کرنے کے لئے بھی سرمایہ کا نقد کرنا ضروری ہے، لہذا اس صورت میں انکے نزدیک بھی تنضیض حکمی کی مذکورہ صورت پر عمل کیا جائے گا۔

مزید ملاحظہ فرمائیں: والشركة من العقود الجائزة تبطل بالفسخ من أحدهما، هذا إذا كان المال ناضاً، وإن كان عرضاً، فذكر القاضي أن ظاهر كلام أحمد إنه لا ينعزل بالعزل، وله التصرف حتى ينض المال كالمضارب إذا عزله رب المال ۔

(۱) دیکھئے: الكاساني، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (٦٩:٦)۔

ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ(۲۲:۵)۔

الدر المختار (٤١٧:٤)۔

کسی ایک شریک کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے فریق کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرے، الا یہ کہ اسے دوسرے شرکاء کی جانب سے اسکی اجازت ہو۔

آگے علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

هذا إذا لم يقل كل واحد منهما لصاحبه: اعمل فی ذلك برأيك، فأما إذا قال ذلك فإنه يجوز لكل واحد منهما المسافرة والمضاربه والمشاركة إلخ،،[1]

یہ اس صورت کا حکم ہے جب ہر شریک نے دوسرے سے یہ نہ کہا ہو کہ تم اپنی صوابدید کے مطابق کاروبار کر سکتے ہو، اگر وہ ایک دوسرے سے ایسا کہدیں تو دونوں شرکاء میں سے ہر ایک کے لئے کاروبار کے سرمایے کے ساتھ سفر کرنا، مضاربت اور مشارکہ کے معاہدہ کو دوسرے کے ساتھ کرنا جائز ہے۔

یہی نوعیت کسی شریک کے مضاربت کے اصول پر کسی نئے فریق سے سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنے کی ہے، اگر یہ سرمایہ مشترکہ کاروبار میں لگانے کے لئے حاصل کیا گیا ہو تو اس کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ وہ مشترک سرمایے میں مزید سرمایہ حاصل کر کے ایک شریک کا اضافہ کر رہے ہیں، لہذا اسمیں بھی تمام شرکاء کی رضامندی درکار ہوگی، کیونکہ اس معاہدے کی اصل نوعیت یہ ہوگی کہ یہ تمام شرکاء کی جانب سے کیا جائے گا، اس کے تحت حاصل شدہ سرمایہ پر جو کچھ نفع آئے گا وہ تمام شرکاء کا مشترک نفع ہوگا، اور انہی شرائط کے مطابق تقسیم کیا جائیگا، جو ان کے درمیان طے پائی ہوں۔

اگر کسی شریک نے مشترک سرمایہ بطور مضاربت کسی نئے فریق کو دوسرے شرکاء سے اجازت لئے بغیر دیا تو اس کا حکم یہ ہے کہ احناف اور مالکیہ کے یہاں اسکی گنجائش ہے، چنانچہ در مختار میں ہے کہ:

،،ولكل من شريكي العنان والمفاوضة أن يستأجر ويضارب لأنهما دون

(۱) الكاسانی،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع (۱۷:٦)۔

الشركة، فتضمنتها، ورد المحتار تحت قوله: يضارب، أى يدفع المال مضاربة وهو الأصح،،[۱]

شرکتِ عنان اور مفاوضہ کے دونوں شرکاء میں سے ہر ایک کو یہ اختیار ہے کہ وہ کرایہ پر لے، اور مضاربت پر مال کسی کو دے، کیونکہ مضاربت شرکت سے کم درجہ رکھتا ہے، لہذا مضاربت کا اختیار بھی شرکت کے عقد میں داخل ہوتا ہے۔

مالکی فقہاء کا بھی یہی مسلک ہے، البتہ انکے نزدیک شرط یہ ہے کہ سرمایہ اتنا زیادہ ہو کہ ایسا کرنے کی گنجائش ہو، ورنہ اسے شرکاء کی اجازت کے بغیر ایسا کرنے کا اختیار نہ ہوگا، علامہ أحمد الدردیر فرماتے ہیں:

،،له أن يقارض، بأن يعطى مالا لغيره قراضا حيث اتسع المال وإلا منع،،[۲]

وہ مضاربت کر سکتا ہے بایں طور کہ سرمایہ دوسرے فریق کو بطور مضاربت دے، بشرطیکہ سرمایہ میں اتنی گنجائش ہو، ورنہ ایسا نہیں کریگا۔

حنبلی فقہاء کے نزدیک سرمایہ مشترک دوسرے شرکاء کی اجازت کے بغیر نہ شرکت پر دیا جاسکتا ہے نہ مضاربت پر۔

کسی شریک کا علیحدہ کاروبار:

اگر کوئی شریک مشترک کاروبار کے علاوہ اپنا الگ سے کوئی ذاتی کاروبار شروع کردے، اور اس میں کسی کے ساتھ شرکت یا مضاربت کا معاہدہ کرلے، تو جائز ہے، اس صورت میں اس ذاتی کاروبار کا نفع سابقہ مشترک کاروبار سے الگ ہی رہے گا، اور اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔[۳]

---

(۱) الدر المختار (٤: ٤١٦:٤١٧)۔

(۲) الدردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغیر علی اقرب المسالك(٣:٤٦٥)۔

(۳) دیکھئے: ابن قدامة المقدسی(أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد ،المغنی، مکتبة الریاض السعودية: له أن يأخذ مالا مضاربة، ويكون ربحه له خاصة لأن المضارب يستحق الربح بعلمه فيختص به كما لو آجر نفسه

ایک شریک کی طرف سے ذاتی سرمایے کا اضافہ:

اس بارے میں فقہائے کرام متفق ہیں کہ اگر ایک شریک اس سرمایے کے علاوہ جو معاہدہ شرکت کے وقت اس نے مشترک کاروبار میں لگایا تھا، اس کاروبار میں مزید ذاتی سرمایہ لگانا چاہے تو ظاہر ہے کہ اسکی نوعیت مشترکہ سرمایہ میں اس شریک کے حصہ میں اضافے کی ہوگی، ایسا تمام شرکاء کے اجازت سے ہی کیا جاسکے گا، یہ کوئی قابل بحث مسئلہ نہیں ہے کیونکہ اس کا حکم بالکل واضح ہے، اگر دوسرے شرکاء اس بات پر راضی ہوں کہ ایک شریک مزید سرمایہ لگائے اور سرمایہ میں اس اضافہ کی روشنی میں نفع کی تقسیم طے شدہ اصول یا کسی نئے اصول پر سب کا اتفاق ہو، تو ایسا کیا جاسکے گا۔

کاروبار کے کسی ایک حصہ میں مشارکہ

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پورے کاروبار میں شرکت ضروری ہے یا اس کے کسی ایک حصہ میں بھی شرکت کی جاسکتی ہے؟ مثلاً اگر کسی شخص کا ایک سپر اسٹور ہو، البتہ اس میں ایک حصہ (Section) میڈیکل اسٹور کا بھی ہو، اور وہ یہ چاہے کہ میڈیکل اسٹور کی حد تک وہ کسی دوسرے کے ساتھ شرکت کرلے، اور بقیہ کاروبار کا وہی تنہا مالک ہو تو یہ عقد کرنا کیسا ہوگا؟

ظاہر ہے کہ شرکت کے اس عقد میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ شریعت میں اس سلسلے میں کوئی ممانعت نہیں ہے، بلکہ جس طرح وہ پورے کاروبار میں کسی شخص کو شریک کرسکتا ہے، اس کے کسی ایک حصہ میں بھی شریک کرسکتا ہے۔

سروسز کے کاروبار میں مشارکہ

سروسز کے کاروبار سے ہماری مراد خدمات میں شرکت ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں شرکت الأعمال سے تعبیر کیا جاتا ہے، موجودہ دور میں اس شرکت کا تصور بھی کافی وسیع ہو چکا ہے، اس سے پہلے کہ ہم موجودہ دور کے سروسز کے کاروبار میں شرکت اور اس کے احکام پر غور کریں چند باتیں روایتی شرکت الأعمال سے متعلق بطور تمہید ذکر کی جاتی ہیں۔

گذشتہ اوراق میں ابتک شرکت الأموال کی اقسام اور ان سے متعلق احکام ذکر کئے گئے، شرکت الأموال میں سرمایہ کے اندر شرکت کی جاتی ہے، شرکت العقد کی دوسری قسم جس میں سرمایہ کے بجائے خدمات اور عمل میں شرکت پائی جاتی ہے اسے شرکت الأعمال کہا جاتا ہے، اس میں دو یا زیادہ افراد کوئی ایسا کاروبار شروع کرتے ہیں جس میں لوگوں کے کام اجرت پر کئے جائیں، اور جو کمائی ہو اس میں دونوں شریک ہوں، مثلاً زید اور عمر درزی کا کام مشترک طور پر کرتے ہیں، اور یہ طے کر لیتے ہیں کہ ہم مل کر کپڑے کی سلائی کریں گے، اور اسکی جو بھی اجرت حاصل ہوگی وہ دونوں میں آدھی آدھی یا کسی اور شرح سے تقسیم ہوگی، یا کچھ افراد مل کر لانڈری کی دوکان کھول لیں، اور لوگوں کے کپڑے دھویا کریں، اور پھر اسپر اجرت وصول کریں، روایتی طور پر یہ شرکت الأبدان یا شرکت الأعمال کہلاتی ہے، ائمہ ثلاثہ یعنی امام ابو حنیفہ[1] امام مالک[2] اور امام أحمد بن حنبل[3] رحمہم اللہ کے مذاہب میں یہ شرکت جائز ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شرکت جائز نہیں ہے[4]، اس شرکت کے کچھ ضروری اصول ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ شرکت الأعمال میں ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے، چنانچہ ان میں سے ہر ایک اپنے لئے یا اپنے

---

(۱) دیکھئے: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع(٧٦:٦)۔

(۲) الدردیر، احمد بن محمد الدردیری ١٢٠١ھ، الشرح الصغیر علی اقرب المسالك(٤٧٤:٣، ٤٧٥)۔

(۳) ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ١٤٠٣ھ (٥:٦)۔

(۴) النووی، (الحافظ أبو زکریا) محی الدین بن شرف النووی ،شرح المهذب المسمی بالمجموع ، دار الفکر، بیروت۔ (٧٢:١٤)۔

ساتھی کے لئے کام لے سکتا ہے، چنانچہ اگر کسی ایک نے بھی کوئی کام وصول کر لیا تو اب دونوں پر کام کی ذمہ داری عائد ہو گئی، لہذا کام کروانے والا اپنے کام کا مطالبہ دونوں شرکاء میں سے کسی ایک سے بھی کر سکتا ہے، خواہ دوسرے شریک نے وہ کام وصول نہ بھی کیا ہو، اسی طرح کام کروانے والا اس کام کی اجرت ان میں سے کسی ایک شریک کو بھی دے سکتا ہے، لہذا اگر اس نے کسی ایک شریک کو کام کی اجرت دیدی تو دوسرے شخص کو گاہک سے اجرت مانگنے کا حق حاصل نہ ہو گا، کوتاہی کی صورت میں کام کروانے والا دونوں شرکاء میں سے کسی سے بھی تاوان وصول کرنے کا استحقاق رکھے گا، البتہ دونوں سے الگ الگ وصول نہیں کرے گا۔[1]

۲۔ اگر کسی ایک شریک نے کام کیا اور دوسرے نے نہ کیا تو کام نہ کرنے والا بھی اجرت میں حصہ دار ہو گا، کیونکہ شرکت الأعمال میں اجرت کا استحقاق عمل یا کام کی وجہ سے نہیں ہوتا، بلکہ صرف کام کی ذمہ داری قبول کرنے کی وجہ سے اسے اجرت ملتی ہے۔

۳۔ شرکت الأعمال میں شرکاء کی آمدنی کا استحقاق صرف کام کی ذمہ داری قبول کرنے کی بنیاد پر ہوتا ہے، (جسے فقہاء کرام ضمان سے تعبیر کرتے ہیں) چنانچہ اگر کام کی ذمہ داری دونوں شرکاء پر برابر ہے تو آمدنی بھی نصف نصف تقسیم ہو گی، اور اگر دونوں شرکاء یہ طے کر لیں کہ کام کی ذمہ داری دونوں پر برابر نہیں ہو گی، بلکہ ایک شریک پر کام کی ذمہ داری مثلاً ایک تہائی اور دوسرے پر دو تہائی ہو گی تو دونوں اجرت بھی اسی حساب سے طے کریں گے، کیونکہ شرکت الأعمال میں اجرت کا استحقاق صرف ذمہ داری کی بنیاد پر ہوتا ہے۔[2]

۴۔ نقصان کی صورت میں بھی نقصان کی ذمہ داری شرکاء پر ان کے اوپر عائد شدہ ذمہ داری کے تناسب سے ہو گی، مثلاً اگر زید اور بکر یہ طے کریں کہ جو کچھ کام بھی وہ قبول کریں گے، ان میں سے ایک تہائی کام کی ذمہ داری زید پر اور بقیہ دو تہائی کی بکر پر ہو گی، تو نقصان کی صورت میں زید ایک تہائی اور بکر دو تہائی نقصان کا ذمہ دار ہو گا۔[3]

---

(٥) ملاحظہ فرمائیں: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (٧٦:٦)۔

(١) ملاحظہ ہو: الکاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (٧٦:٦)، ویجوز شرط التفاضل فی الکسب إذا شرطا التفاضل فی الضمان، بأن شرط لأحدهما ثلثي الکسب وهو الآجر وللآخر الثلث، وشرطا العمل علیهما، لأن استحقاق الأجرة فی هذه الشرکة بالضمان لا بالعمل، کان استحقاق زیادة الأجر بزیادة الضمان لا بزیادة العمل (٧٦:٦)۔

(٢) حواله بالا، (٧٦:٦)۔

اوپر شرکت الأعمال کا روایتی تصور ذکر کیا گیا ہے، جس میں دو افراد کسی کام یا خدمات کی انجام دہی پر شرکت کر لیتے ہیں، اور دونوں کی ان خدمات یا کاموں کی سرانجام دہی کے لئے عمل اور محنت تو کرنی پڑتی ہے، البتہ کوئی خاص سرمایہ لگانا نہیں پڑتا، مثلاً پرانے زمانے میں اگر دو افراد دھوبی کے کام پر اشتراک کرتے، تو انہیں کوئی خاص سرمایہ لگائے بغیر صرف پانی اور صابن سے دھو کر اس پر اجرت وصول کر لیتے، لیکن آج کل کے مشینی دور میں شرکت الأعمال میں محنت کے ساتھ ساتھ اکثر سرمایہ نقد یا غیر نقد شکل میں لگانا پڑتا ہے، مثلاً کپڑے دھونے کی خدمات ہی کو لے لیجئے، آجکل اس کے لئے جدید سے جدید لانڈریاں کھل چکی ہیں، جن میں محنت کے علاوہ کپڑے دھونے کی مشینوں، صابن کیمیکلز، صاف ستھرے پانی، زمین کی فراہمی، اور اشتہار وغیرہ پر کثیر سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے، لہذا موجودہ دور میں شرکت الأعمال کا وہ قدیم تصور کمیاب ہے کہ جس میں بغیر سرمایہ لگائے صرف محنت مزدوری میں اشتراک پایا جاتا تھا، بلکہ اس میں اعمال کے ساتھ ساتھ اور بہت سی چیزیں لگانا پڑتی ہیں جن میں سرمایہ مکان مشینیں وغیرہ شامل ہیں۔

اس مثال کے علاوہ بھی بہت سی مثالیں ایسی ہیں جن میں شرکاء کو خدمات کے ساتھ ساتھ وافر مقدار میں سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے، مثلاً قانونی مشوروں (Legal consultancy) کے لئے کچھ وکلاء وغیرہ مل کر کوئی کمپنی یا ادارہ قائم کر لیں تاکہ لوگوں کے قانونی مسائل حل کرنے میں انکے مدد و معاون ثابت ہوں، اور ان کے قانونی امور نمٹائیں، اور ان سے معاوضہ وصول کر کے باہم تقسیم کریں، اس کے لئے انہیں آفس قائم کرنے کے لئے مناسب جگہ، فرنیچر، آرائش اور اشتہار وغیرہ پر سرمایہ لگانا پڑتا ہے، اور ضروری کتب خریدنی پڑتی ہیں، اسی طرح مکانات اور عمارتوں کے نقشے بنانے کے لئے آرکیٹیکٹ انجینیرز مل کر مدد اور مشاورت کی فراہمی (Consultancy) کا ادارہ قائم کر لیتے ہیں، اس کے لئے بھی مندرجہ بالا چیزوں کے ساتھ آلات اور کمپیوٹر وغیرہ کی بھی ضرورت پڑتی ہے، اور اس کے لئے انہیں اپنی خدمات کے ساتھ ساتھ سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے۔

اسی طرح موجودہ دور میں گاڑیوں اور مشینوں کی مرمت سازی اور سروس وغیرہ کے بڑے بڑے ورکشاپ اور سروس اسٹیشن قائم کئے جاتے ہیں، جن میں کچھ لوگ اس مقصد سے کام کرتے ہیں تاکہ وہ لوگوں کی گاڑیاں یا مشینیں خود یا ملازمین سے مرمت کروا کر ان سے اجرت حاصل کریں، اور پھر اسے باہم تقسیم کریں۔

سروسز کے کاروبار کی ایک اور مثال یہ ہے کہ آج کل بڑے بڑے ہسپتال قائم کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لئے کئی افراد کو مل کر سرمایہ لگانا پڑتا ہے، یہ قسم بھی ایک طرح سے شرکت الأعمال کی ہے، کیونکہ ہسپتال قائم کرنے والے لوگ اس بات کی ذمہ داری لیتے ہیں کہ وہ لوگوں کو علاج فراہم کریں گے، اس کے لئے وہ ہسپتال قائم کرتے ہیں، ڈاکٹروں اور ملازمین کو رکھتے ہیں، مختلف قسم کی مشینیں نصب کرتے ہیں، پھر اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اسے باہم تمام شرکاء طے کردہ تناسب سے تقسیم کر لیتے ہیں۔

یہ تمام صورتیں شرکت الأعمال یا سروسز کے کاروبار کی ہیں، جن میں لوگ خدمات سرانجام دینے کی ذمہ داری قبول کرنے کے علاوہ اپنا اپنا سرمایہ بھی لگاتے ہیں، ان کے علاوہ اور بھی بہت ساری صورتیں اس قسم کی رائج ہیں، لیکن اختصار کی بناء پر چند صورتیں بیان کرنے پر اکتفاء کیا گیا ہے، اب سوال یہ ہے کہ شرکت الأعمال یا سروسز کے کاروبار میں ان صورتوں کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ انکی شرعی حیثیت یا حکم جاننا اسلئے ضروری ہے کہ عصر حاضر میں یہ کاروبار انتہائی اہم شکل اختیار کرنے کے علاوہ دنیا بھر میں رائج بھی ہو چکا ہے، چنانچہ اسکی اہمیت کے پیش نظر ذیل میں اس کا حکم پیش کیا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا کاروبار کا حکم جاننے سے قبل یہ ضروری ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ سرمایہ ایک فریق کی طرف سے ہوگا، یا دونوں کی طرف سے، اور پھر عمل کس فریق کی طرف سے ہوگا، اس طرح اگر غور کیا جائے تو سروسز کے کاروبار کی چار صورتیں بنتی ہیں:

۱: دونوں شرکاء سرمایہ لگائیں، دونوں کام کریں۔
۲: ایک شریک سرمایہ لگائے، دونوں کام کریں۔
۳: دونوں شرکاء سرمایہ لگائیں، ایک کام کرے۔
۴: ایک شریک سرمایہ لگائے اور دوسرا کام کرے۔

مندرجہ بالا چار صورتوں میں سے پہلی دو صورتیں سروسز کے کاروبار میں شرکت سے متعلق ہیں، آگے دونوں کے احکام بالترتیب بیان کئے جائیں گے۔

پہلی صورت:

پہلی صورت یہ ہے کہ دو یا زیادہ افراد ملکر کوئی خدمت سرانجام دینے کی مساوی طور پر ذمہ داری قبول کریں، پھر اس خدمت کی سرانجام دہی کے لئے یا تمام شرکاء مساوی یا کمی بیشی کے ساتھ سرمایہ بھی لگادیں، اور یہ طے کریں کہ جو آمدنی حاصل ہوگی وہ تمام شرکاء میں مساوی تقسیم ہوگی، یہ صورت اکثر مذاہب میں جائز ہے، کیونکہ کام کی ذمہ داری سب نے مساوی طور پر قبول کی ہے، لہذا آمدنی بھی سب کو برابر ملے گی، اور اس صورت میں سرمایہ کی حد تک شرکت الملک ہوگی، اور خدمات کی حد تک شرکت الأعمال سمجھی جائے گی، البتہ امام شافعیؒ کے یہاں چونکہ شرکت الأعمال اصلاً جائز ہی نہیں ہے، لہذا بظاہر اسکی تمام صورتیں ناجائز ہونے کی بناء پر یہ صورت بھی ناجائز ہوگی۔

اس صورت کے جواز پر فقہاء کرامؒ کی تصریحات درج ذیل ہیں:

پہلی صورت:

اس پہلی صورت کی بھی دو شکلیں ہوسکتی ہیں:

الف: اگر دونوں شرکاء سرمایہ لگائیں اور دونوں کام کریں، اور آمدنی بھی مساوی ہو تو اس کے جواز کے بارے میں فقہاء کرام کی تصریحات یہ ہیں:

> ,,ولو أن قصارين اشتركا ولأحدهما اداة القصارين وللآخر بيت على أن يعملا بأداة هذا في بيت هذا على أن الكسب بينهما نصفان، فهذا جائز، وكذلك كل حرفة لأن الكسب يدل العمل والعمل وجب عليهما، وهذه الشركة جائزه وإن لم يخصا صنعة لأن هذا وكيل، فيجوز خاصا كان أو عاما،، (۱)
>
> اور اگر دو دھوبی شرکت کریں، اور ان میں سے ایک کا دھوبی کا سامان اور دوسرے کا گھر ہو، اور یہ طے کریں کہ اس سامان سے اس گھر میں کام کریں گے، اور جو آمدنی ہوگی وہ نصف نصف ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے، اسی طرح ہر پیشہ کا حکم

(۱) الفتاوی التاترخانیه (٥:٦٦٩)۔

ہے، کیونکہ آمدنی کام (قبول کرنے) کی وجہ سے ہے، اور کام دونوں پر واجب بھی ہے، لہٰذا یہ شرکت جائز ہونی چاہیے، اور اگر وہ دونوں کوئی خاص پیشہ طے نہ کریں تو بھی جائز ہے، کیونکہ ایک شریک دوسرے شریک کا وکیل ہے، لہٰذا مخصوص ہو یا غیر مخصوص دونوں صورتیں جائز ہیں۔

اور فتاوی تاتر خانیہ میں ذکر کیا گیا ہے کہ:

وإن تقبلا حمولة معلومة ولم يؤاجرا البغل والبعير ثم إنهما حملا تلك الحمولة على البغل والبعير اللذين أضافوا عقد الشركة إليها فالأجر بينهمانصفان ولا يقسم أجر مثل دابتها۔[1]

اگر دونوں شریکوں نے کوئی مخصوص سواری یا بوجھ لادنا قبول کر لیا اور خچر اور گدھے کو کرایہ پر نہیں دیا پھر انہوں نے اس بوجھ کو ان دونوں سواریوں پر لاد دیا، جس کا ذکر انہوں نے عقد شرکت میں کیا تھا، تو آمدنی دونوں کے درمیان نصف نصف ہوگی، اور ان کے چوپایوں کی اجرتِ مثل تقسیم نہیں کی جائے گی۔

مندرجہ بالا عبارتوں کی طرح کچھ عبارتیں علامہ شامیؒ کی ردالمحتار اور علامہ ابن قدامہ کی المغنی اور علامہ دردیرؒ کی الشرح الصغیر میں بھی ملاحظہ فرمائیں[2]، اس طرح کی تمام عبارتوں میں یہی بات مذکور ہے کہ اگر کچھ افراد کوئی کام کرنے کی ذمہ داری قبول کرلیں پھر اس کام کی سرانجام دہی کے لئے شرکاء اپنی چیزوں سے مدد لے لیں، یا انہیں استعمال کرلیں اور یہ طے کرلیں کہ آمدنی برابر برابر ہوگی، تو یہ شرکت الاعمال کی جائز شکل ہے، البتہ اگر عقد اس طرح کیا جائے کہ شرکت اصلاً کسی کام کی ذمہ داری قبول کرنے پر نہ ہو، اور نہ ہی سرمایہ میں بایں طور شرکت ہو کہ اس سرمایہ کے ذریعہ

(۱) الفتاوی التاترخانیہ (۶۶۹:۵)۔

(۲) ملاحظہ فرمائیں: الشامی ،محمد امین الشهیر بابن عابدین، رد المحتار، کوئٹہ نسخہ (۳۸٤:۳)۔

ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمدالمقدسی) ،المغنی، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ (۷۹:۵)۔

الدردير، احمد بن محمد الدرديری (۱۲۰۱ھ)، الشرح الصغير على اقرب المسالك (٤۷۵:۳)۔

خرید و فروخت کر کے کاروبار کریں گے، بلکہ یہ طے کیا جائے کہ اپنی کسی ملکیت یا جائیداد کی منفعت (Usufruct) فروخت کر کے آمدنی حاصل کریں گے، تو یہ صورت نہ شرکت الأعمال کی ہوگی، نہ ہی شرکت الأموال کی، لہٰذا یہ شرکت فاسد ہوگی، چنانچہ اگر دونوں نے اپنی اپنی املاک یکبارگی کرائے پر دیدیں، اور یہ طے کرلیا کہ کرائے کی آمدنی دونوں کے درمیان تقسیم کی جائے گی تو یہ شرکت صحیح نہیں ہوگی، اور ہر ایک شخص اسکی ملکیت کا کرایہ بازاری نرخ کے حساب سے لے گا۔

چنانچہ علامہ ابن عابدین شامیؒ تحریر فرماتے ہیں:

,,ولو لأحدهما بغل وللآخر بعير، أى وقد اشتركا على أن كلا يؤجر ما لكل واحد والحاصل بينهما فهو باطل أيضا، لأن معنى هذا أن كلا قال لصاحبه، بع منافع دابتك ودابتى على أن ثمنه بيننا، ثم إن آجراهما بأجر معلوم صفقة واحدة فى عمل معلوم قسم الأجر على أجر مثل البغل ومثل أجر الحمل بخلاف ما لو اشتركا على أن يتقبلا الحمولات المعلومة بأجرة معلومة ولم يؤاجر البغل والحمل كانت صحيحة، لأنها شركة التقبل والأجر بينهما نصفان ولا يعتبر زيادة حمل الجمل على حمل البغل كما لا يعتبر فى شركة التقبل زيادة عمل أحدهما كصباغين لأحدهما آلة الصبغ وللآخر بيت يعمل فيه،،(۱)

اور اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کا خچر اور دوسرے کا اونٹ ہو یعنی وہ اس پر شرکت کریں، کہ ان میں سے ہر ایک اپنی ملکیت کو کرایہ پر دیگا، اور جو آمدنی اس سے حاصل ہوگی وہ باہم تقسیم ہوگی، تو یہ بھی باطل ہے، اسلئے کہ اس کے معنی یہ

(۱) الشامى ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار (۳:۳۸٤) (كوئٹه نسخه)۔

الفتاوى التاتارخانيه (٥: ٦٦٩)، وإن آجرا الدابتين جميعا بأعيانهما إلخ۔

ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسى)، المغنى، مكتبة الرياض السعودية ۱٤۰۳ھ(٥:٩)۔

ہیں کہ ان میں سے ہر ایک نے دوسرے سے یہ کہا کہ تم اپنے اور میرے چوپایے کے منافع فروخت کردو، اور جو آمدنی ہوگی وہ باہم تقسیم ہوگی، چنانچہ اگر انہیں متعین کرایہ کے ساتھ ایک ہی بولی میں ایک ہی کام کے لئے کرایہ پر دیا تو چوپایے اور بار برداری کی اجرتِ مثل باہم تقسیم ہوگی، اور اگر اس طرح شرکت کی کہ متعین بار برداریاں متعین اجرت کے ساتھ قبول کریں گے، اور خچر اور اونٹ کو کرائے پر دینے کا معاملہ نہیں ہوا، (بلکہ یہ طے ہوا کہ دونوں مل کر لوگوں کا سامان اٹھائیں گے اور اجرت باہم تقسیم کریں گے) تو یہ شرکت صحیح ہے، کیونکہ یہ شرکت تقبل ہے، اور اونٹ کے زیادہ سامان اٹھانے کا اعتبار کرتے ہوئے اونٹ والے کو زیادہ حصہ نہیں دیا جائے گا، جس طرح شرکت اعمال میں کسی ایک شخص کے زائد کام کرنے کی وجہ سے اسے زیادہ اجرت نہیں دی جاتی اور جیسے دو رنگریزوں میں سے ایک کا رنگنے کا آلہ ہو، اور دوسرے کا گھر ہو تاکہ اسمیں کام کیا جاسکے، اور ان میں سے کوئی ایک زیادہ کام کرے تو اجرت برابر ہی ہوتی ہے۔

ب: اگر ایک شریک کا سرمایہ ہو اور دونوں کا عمل ہو، اور آمدنی بھی نصف نصف طے کی گئی ہو تو یہ بھی جائز ہے، علامہ ابن قدامہؒ لکھتے ہیں:

,,وإن كانت لأحدهما آلة وليس للآخر شيء أو لأحدهما بيت وليس للآخر شيء فاتفقا على أن يعمل ا بالآلة أو في البيت والأجرة بينهما جاز، لما ذكرنا،،[۱]

اگر دو شرکاء میں سے ایک کا آلہ ہو اور دوسرے شریک کا کچھ بھی نہ ہو، یا ایک کا گھر ہو اور دوسرے کا کچھ نہ ہو، اور دونوں یہ طے کریں کہ وہ اس آلہ سے یا گھر میں کام کریں گے، اور دونوں کے درمیان اجرت آدھی آدھی تقسیم ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے۔

(۱) ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسي)، المغني، مكتبة الرياض السعودية ۱٤٠٣ھ(۹:۵)۔

حنفی فقہ کی مشہور کتاب المبسوط للسرخسی میں بھی اسکی تائید میں ایک عبارت موجود ہے، وہ یہ کہ:

إذا أقعد الصانع معه رجلا فی دکانه یطرح علیه العمل بالنصف فهو فاسد فی القیاس إلا أنه استحسن لکونه متعاملا بین الناس من غیر نکیر منکر وفی نزع الناس عما تاملوا به نوع حرج فلدفع هذاالحرج یجوز هذا العقد إذ لیس فیه نص یبطله۔[1]

جب کسی کاریگر نے اپنے ساتھ کوئی شخص اپنی دوکان میں بٹھایا، تاکہ وہ اس کے ساتھ کام میں شریک ہو، اور آمدنی نصف نصف تقسیم ہو، تو قیاس کی رو سے یہ فاسد ہونا چاہیے، مگر یہ خلاف قیاس اور استحسانا جائز ہے کیونکہ یہ طریقہ لوگوں میں رائج ہو چکا ہے، اور کسی نے اس پر نکیر بھی نہیں کی ہے، اور اگر اسے ناجائز قرار دے کر متروک کر دیا جائے تو ایک قسم کا حرج لازم آئے گا، اور اس کے خلاف کوئی صریح نص بھی موجود نہیں ہے، لہٰذا ان وجوہ سے یہ عقد جائز ہوگا۔

دوسری صورت:

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر کچھ افراد مل کر کسی کام کو سرانجام دینے کی مساوی طور پر ذمہ داری قبول کریں، اور اس کام کی سرانجام دہی کے لئے بعض یا تمام شرکاء کی بیشی سے سرمایہ بھی لگا دیں، لیکن آمدنی کے سلسلہ میں یہ طے کریں کہ آمدنی مساوی نہیں ملے گی، یا شرکاء کے لگائے ہوئے سرمایہ کے تناسب سے آمدنی تقسیم کی جائے گی؟ تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ یہ صورت کثیر الوقوع ہے، کیونکہ گذشتہ صفحات میں سروسز کے کاروبار کی جو صورتیں ذکر کی گئی تھیں، انمیں یہ ممکن تھا کہ کوئی ایک شریک زیادہ سرمایہ لگائے اور پھر وہ یہ مطالبہ کرے کہ مجھے میرے سرمایے کے تناسب سے زیادہ

---

(۱) السرخسی ،محمد بن أحمد بن أبی سهل شمس الأئمه الإمام الکبیر أبو بکر، المبسوط للسرخسی ۱۹٤-۲٥٦ إدارة القرآن کراچی، اواخر باب الشرکة الفاسدة (۱۱:۱٥۹)۔

الشیخ نظام الدین رئیس جماعة من علماء الهند من القرن الحادی عشر، الفتاوی الهندیه المعروف بالفتاوی العالمگیریه من علماء الهند من القرن الحادی عشر، مکتبه ماجدیه، کوئٹه (۲:۳۲۹) شرکة الأعمال۔

آمدنی ملنی چاہیے، حالانکہ کام کی ذمہ داری میں تمام شرکاء برابر کے شریک ہیں؟اس صورت کا شرعی حکم یہ ہے کہ اصلا شرکت الاعمال کے قاعدہ کے لحاظ سے تو یہ صورت ناجائز ہونی چاہیے، کیونکہ شرکت للأعمال میں آمدنی کی تقسیم کا یہ اصول ہے کہ آمدنی صرف کام کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے کے حساب سے ہوتی ہے،اور سرمایہ کے حساب سے نہیں ہوتی،اور موجودہ صورت میں سب کی ذمہ داری مساوی ہے،لہذا سب کی آمدنی بھی مساوی ہونی چاہیے، جبکہ یہاں یہ طے کیا گیا ہے کہ سرمائے کے تناسب سے یا کمی بیشی سے آمدنی تقسیم ہوگی،لہذا شرکتُ الاعمال کے اصل قاعدہ کے لحاظ سے یہ صورت ناجائز ہونی چاہیے۔[1]

لیکن فقہاء کرامؒ نے فرمایا ہے کہ یہ صورت بھی خلاف قیاس یا استحسانا جائز ہوگی،اور یہ سمجھا جائے گا کہ یہ عقد شرکت العنان اور شرکت للأعمال کا مجموعہ ہے،اور شرکت العنان میں آمدنی کی تقسیم سرمایے کے تناسب سے ہو سکتی ہے،فقہاء کرامؒ کی مندرجہ ذیل عبارتیں اسکی تائید کرتی ہیں:

فقہ حنبلی کے مشہور مصنف علامہ بہوتیؒ تحریر فرماتے ہیں:

,,وإن كانت لأحدهما، أي الشريكين (على أن يعملا بآلة أو) على أن يعملا (في البيت والأجرة بينهما) أنصافا أو متفاضلة (جاز)،،[2]

اوراگر دو شرکاء میں سے کسی ایک شریک کا آلہ یا گھر ہو اور یہ طے کریں کہ دونوں اس آلہ سے یا اس گھر میں کام کریں گے،اور اٗمدنی دونوں کے درمیان آدھی آدھی یا کمی بیشی سے تقسیم ہوگی، تو یہ صورت جائز ہے۔

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع، ويجوز شرط التفاضل في الكسب إذا شرطا التفاضل في الضمان، بأن شرط لأحدهما ثلثي الكسب وهو الآجر وللآخر الثلث، وشرطا العمل عليهما، لأن استحقاق الأجرة في هذه الشركة بالضمان لا بالعمل، كان استحقاق زيادة الأجر بزيادة الضمان لا بزيادة العمل (٦:٧٦)۔

(۲) بهوتي، منصور بن يونس ١٠٥١ھ، كشاف القناع عن متن الاقناع،عالم الكتب، دار الفكر، بيروت۔(٣:٥٢٠)۔

فقہ حنفی میں فتاوی کی مشہور کتاب الفتاوی العالمگیریہ میں بھی اس کے استحساناً جواز کی عبارت ملتی ہے:

ولو شرطا العمل والمال أثلاثا جاز استحسانا كذا في العيني شرح الكنز وهكذا في التبيين، والهداية، والكافي وهو الصحيح كذا في السراج الوهاج، ولو شرطا أكثر الربح لأدناهما عملا فالأصح الجواز، كذا في النهر الفائق۔[1]

اور اگر آدھا آدھا اور سرمایہ تہائیوں میں (یعنی ایک کا ایک تہائی اور دوسرے کا دو تہائی مال) طے کیا تو استحساناً جائز ہے، اسی طرح عینی شرح کنز، التبیین ہدایہ اور الکافی میں ہے، اور اسی کو السراج الوہاج میں صحیح کہا گیا ہے، اور اگر یہ طے کیا کہ کم عمل والے کو زیادہ نفع ملے گا تو بھی اصح قول کے مطابق جائز ہے، اور یہ بات النہر الفائق میں بھی مذکور ہے۔

مذکورہ بالا عبارت اس بارے میں صریح ہے کہ آمدنی کام کی ذمہ داری کے تناسب کے بجائے اگر کسی اور شرح سے طے کرلیں، مثلاً کم عمل والے کے لئے زیادہ نفع طے کرلیا جائے تو بھی جائز ہے، اسکی فقہی توجیہ یہ ہوگی کہ اس صورت میں یہ عقد شرکت العنان اور شرکت الأعمال کا مجموعہ ہوگا، اور آمدنی کی تقسیم شرکۃ العنان کے مطابق ہوگی، رہا یہ سوال کہ آیا کسی عقد میں شرکت العنان اور شرکت الأعمال جمع کئے جاسکتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض فقہاء کرام کی تصریح کے مطابق ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ علامہ بہوتی فرماتے ہیں:

وليس لولي الأمر المنع بمقتضى مذهبه في شركة الأبدان والوجوه والمساقاة والمزارعة ونحوها مما يسوغ فيه الاجتهاد لأن فيه تضييقا وحرجا والاختلاف رحمة، وإن جمعا أي اثنان فأكثر (بين شركة عنان وأبدان ووجوه ومضاربة صح، لأن كل واحدة منها تصح مفردة، فصحت

---

(۱) الشيخ نظام الدين رئيس جماعة من علماء الهند من القرن الحادي عشر، الفتاوى الهنديه المعروف بالفتاوى العالمگيريه من علماء الهند من القرن الحادى عشر، مكتبه ماجديه، كوئٹه (۲:۳۲۹)۔

مجتمعة، قال ابن منجا: وكما لو ضم ماء طهور إلى مثله۔[1]

کسی صاحب اختیار کو اپنے مذہب کے مقتضی اور مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے شرکۃ الأبدان، وجوہ، مساقاۃ اور مزارعۃ وغیرہ سے روکنا نہیں چاہیے، جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے، ورنہ اس میں بہت مشقت اور حرج لازم آئے گا، اور اختلاف تو رحمت ہے، چنانچہ اگر دو شرکاء یا زائد نے شرکتِ عنان اور ابدان اور وجوہ و مضاربت کو ایک عقد میں جمع کر لیا تو جائز ہوگا، کیونکہ ان میں سے ہر عقد جب تنہا جائز ہے تو مجتمع ہو کر بھی جائز ہوگا، ابن منجا فرماتے ہیں: اسکی مثال ایسی ہے جیسے پاک صاف پانی میں مزید پاک صاف پانی ملا دیا جائے۔

نتائج بحث:

مندرجہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ سروسز کے کاروبار میں شرکت کی وہ تمام صورتیں بھی جائز ہیں، جن میں شرکاء کو خدمات (Services) کے علاوہ بھاری مقدار میں سرمایہ بھی لگانا پڑتا ہے، چنانچہ اگر کچھ شرکاء مل کر اس طرح کا عقد کرلیں، اور نفع کے بارے میں یہ طے کریں کہ سرمایہ کے حساب سے ہوگا، یا کسی اور شرح سے ہوگا تو جائز ہے، اسکی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

۱۔ کچھ شرکاء مل کر قانونی معاونت (Legal Consultancy) کا ادارہ قائم کریں اور انمیں سے کوئی ایک شریک یا مختلف شرکاء سرمایہ بھی لگائیں، اور نفع کی شرح تمام شرکاء کی مساوی نہ ہو تو یہ صورت جائز ہے۔

۲۔ کچھ شرکاء مل کر مکانات کے نقشہ بنانے (Archetechtury) پر شرکت کا عقد کرلیں، اور ان میں سے ایک شریک کچھ سامان اور دوسرا شریک کچھ اور سامان لے آیا اور نفع سرمایے کے حساب سے طے کر لیا تو یہ شکل جائز ہے۔

۳۔ کچھ شرکاء مل کر گاڑیوں کا ورکشاپ یا سروس اسٹیشن قائم کرلیں تو یہ صورت بھی جائز ہے، اور شرکاء کو اختیار

---

(۱) بهوتي، منصور بن يونس ۱۰۵۱ھ، كشاف القناع عن متن الاقناع، عالم الكتب، دار الفكر، بيروت۔(۳:۵۲۲)، وابن المفلح، الفروع للمقنع، شرح المبدع، ۱۳۸۹ھ۔ (۵:۴۳)۔

ہے کہ جو چاہے نفع کا تناسب مقرر کریں۔

۴۔ کچھ شرکاء مل کر ایک بڑا ہسپتال قائم کرلیں، تاکہ لوگوں کا علاج کریں گے، اس صورت میں بھی وہ نفع کا جو چاہے تناسب طے کر سکتے ہیں۔

سروسز کے کاروبار میں مضاربہ

شرکت الأعمال کی جو چار صورتیں ہم نے پیچھے ذکر کی تھیں، ان میں سے شروع کی دو قسموں کا حکم بیان کیا جا چکا ہے، البتہ تیسری اور چوتھی صورت کا حکم اب ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

شرکت الأعمال یا سروسز کے کاروبار کی تیسری اور چوتھی صورت سروسز کے کاروبار میں مضاربت سے تعلق رکھتی ہے، تیسری صورت یہ ہے کہ دونوں شرکاء سرمایہ لگائیں اور ان میں سے ایک کام کرے، مثلاً ایک سواری دو افراد میں مشترک تھی، ان میں سے ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ تم اس سواری کو کرایہ پر دیدو، یا اسے خود کرایہ پر چلاؤ، اور اس سے جو آمدنی حاصل ہو وہ ہم دونوں میں تقسیم کی جائے گی۔[1]

اور چوتھی صورت یہ ہے کہ ایک شریک سرمایہ لگائے اور دوسرا کام کرے، مثلاً ایک شخص دوسرے کو ایک سواری دے کر یہ کہے کہ تم اسے کرایہ پر دو، یا خود کرایہ پر چلاؤ، یا ایک شخص دوسرے کو کپڑے دھونے کا سامان دے کر یہ کہے کہ تم کپڑے دھو، اور اس کی اجرت کے ذریعہ جو آمدنی حاصل ہو، اسے ہم باہم (مثلاً نصف نصف) تقسیم کرلیں گے۔

یہ دونوں صورتیں امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، اور امام مالکؒ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، ان حضرات کے نزدیک یہ عقد

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: الشامی ،محمد امین الشهیر بابن عابدین، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ، مطبعة الحلبی مصر ۱۳۸٦ھ: أما لو كانت الدابة بين اثنين دفعها أحدهما للآخر على أن يوجرهما ويعمل عليهما على أن ثلثي الأجر للعامل والثلث لآخر، وهي كثيرة الوقوع ولا شك في فسادها ، لأن المنفعة كالعروض لا تصح فيها الشركة وحينئذ فالأجر بينهما على قد ملكهما وللعامل أجر مثل عمله (۳:۳۸۲)۔

فاسد ہے، چنانچہ اگر ایسا عقد کیا گیا تو انکے نزدیک اس سے جو آمدنی حاصل ہو گی، اس سے پہلے کام کرنے والے کو اجرت مثل دی جائے گی، پھر اگر کچھ آمدنی بچی تو وہ سرمایہ لگانے والے کو ملے گی، پہلی صورت میں چونکہ سرمایہ یعنی سواری دونوں کے درمیان مشترک تھی، اسلئے باقی آمدنی دونوں کے درمیان اپنے اپنے حصہ ملکیت کے تناسب سے تقسیم ہو جائے گی، اور دوسری صورت میں سرمایہ چونکہ صرف ایک ہے، اسلئے باقی آمدنی پوری کی پوری اس کو ملے گی، البتہ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک معاملہ کی یہ تمام صورتیں مضاربت کے طور پر جائز ہونگی، لہذا آمدنی کا جو تناسب وہ طے کر چکے ہوں، اسی حساب سے باہم تقسیم ہو گی۔(۱)

أئمہ ثلاثہ جو مضاربت کے اس عقد کو فاسد کہتے ہیں انکی دلیل یہ ہے کہ اس عقد میں تین احتمال ہیں:

۱۔ اس عقد کو شرکت سمجھا جائے۔

۲۔ اسے مضاربت قرار دیا جائے۔

۳۔ اسے اجارہ قرار دیا جائے۔

اگر ان تینوں احتمالات پر غور کیا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ یہ نہ تو شرکت ہے نہ مضاربت ہے، اور نہ اجارہ ہے، شرکت میں داخل نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شرکت کی دو قسمیں ہیں: ایک شرکت الأعمال، دوسری شرکت الأموال، اور یہ ان دونوں میں یہ داخل نہیں ہے، شرکۃ الأعمال نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس عقد میں دونوں افراد کے کام سرانجام دینے میں شرکت نہیں پائی جارہی ہے، اسی طرح نہ یہ شرکت الأموال میں داخل ہے، کیونکہ شرکۃ الاموال میں نقد مال میں شرکت ہوتی ہے، اور یہاں پر سرمایہ کاری عروض میں ہے، لہذا اسے شرکت کی کسی قسم میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح اسے مضاربت میں بھی داخل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ مضاربہ میں مضارب (کاروباری فریق) سرمایہ کو

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة، (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی، مكتبة الرياض السعودية ۱۴۰۳ھ (۵: ۱۰، ۱۱) ولو دفع دابته لرجل ليؤجرها والأجر بينهما، فالشركة فاسدة والربح للمالك وللآخر أجر مثله، (الدر المختار ۳: ۳۸۳)، ومثله فی الفتاوی التاترخانية: ولو كان لأحدهما اداة القصارين والحمل من الآخر فاشتركا على هذا فالشركة فاسدة، ويجب على العامل أجر مثل الأداة والربح للعامل، (۵: ۶۶۹)، وراجع للتفصيل مع أدلة المذاهب كلها (۵: ۱۰، ۱۱)۔

خرید و فروخت کر کے کاروبار کرتا ہے، اور وہ چیز بعینہ رب المال یا سرمایہ کار کی ملکیت میں نہیں رہتی، موجودہ صورت میں رب المال کی طرف سے جو چیز فراہم کی جارہی ہے، اسے مضارب فروخت نہیں کررہاہے، بلکہ صرف اسکی منفعت (Usufruct) فروخت کررہاہے یا استعمال کررہاہے، جبکہ وہ شئے بذات خود رب المال کی ملکیت میں ہی رہتی ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اس عقد کو اجارہ قرار دیا جائے کہ رب المال نے جو سرمایہ دوسرے شخص کو دیا ہے اسکی منفعت فروخت کی ہے، جبکہ وہ چیز سرمایہ کار کی ہی ملکیت میں رہتی ہے، گویا کہ سرمایہ کار موجر اور دوسرا شخص مستاجر ہوا، لیکن یہ صورت بھی صحیح نہیں، کیونکہ اجارہ میں اجرت معلوم اور متعین ہونی ضروری ہے، جبکہ اس صورت میں اجرت متعین نہیں ہے، اس وجہ سے یہ اجارہ بھی صحیح نہیں ہوا۔

جب یہ عقد ان تینوں وجہ سے فاسد ہو گیا تو اگر اس عقد کے نتیجہ میں کوئی آمدنی حاصل ہوئی تو آمدنی صاحب سرمایہ کو ملنی چاہیے، اور عامل کو اجرت مثل ملنی چاہیے۔[1]

امام احمد بن حنبلؒ کے دلائل:

امام احمد بن حنبلؒ ان صورتوں کو جائز فرماتے ہیں، انکی دلیل یہ ہے کہ مضاربت میں رب المال نقد سرمایہ مضارب کو دیتا ہے، اور پھر مضارب اس میں محنت کر کے کاروبار کرتا ہے، اور اس سے جو آمدنی اور کمائی حاصل ہوتی ہے، وہ مضارب اور رب المال کے درمیان تقسیم ہوتی ہے، اسی طرح موجودہ صورت میں بھی رب المال نے جو چیز مضارب یا

(۱) ملاحظہ فرمائیں: ابن قدامة (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی، مکتبة الریاض السعودیة (۵: ۸): وإن دفع الرجل دابته إلی آخر لیعمل علیها مایرزق الله بینهما نصفین أو أثلاثا أو کیفما شرطا صح، کره ذلك الحسن والنخعی۔

وقال الشافعیؒ وأبو ثور وابن المنذر وأصحاب الرأی لا یصح والربح کله لرب المال الذی یستحق به العوض منها وللعامل أجر مثله و ان هذا لیس من أقسام الشرکة إلا أن تکون المضاربة ولا تصح المضاربة بالعروض، ولأن المضاربة تکون بالتجارة فی الأعیان، وهذه لا یجوز بیعها ولا إخراجها عن ملك مالکها۔

وقال القاضی یتخرج أن لا یصح بناء علی أن المضاربة بالعروض لا تصح، فعلی هذا إن کان أجر الدابة بعینها فالأجر لمالکها، وإن تقبل حمل شیء فحمله علیها أو حمل علیها شیئا مباحا، فباعه فالأجرة والثمن له وعلیه أجرة مثلها لمالکها۔

عامل کو دی ہے، اگر چہ وہ نقدی نہیں ہے لیکن وہ بھی ایسی چیز ہے، جس میں محنت کر کے کمائی حاصل کی جاسکتی ہے، جیسے مساقات اور مزارعت میں سرمایہ کار کی طرف سے نقد رقم نہیں دی جاتی، البتہ قابل نفع چیز دی جاتی ہے، یعنی درخت یا زمین، عامل اس میں محنت کرتا ہے، اور پھر جو آمدنی حاصل ہوتی ہے اسے باہم تقسیم کیا جاتا ہے، اور انکا مالک بھی نہیں بدلتا، اور مزارعت اور مساقات کو شریعت نے جائز قرار دیا ہے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ کار ایک ایسی چیز عامل کو دے رہا ہے جس میں محنت کر کے آمدنی حاصل کی جاسکتی ہے، لہذا مزارعت اور مساقات پر قیاس کرتے ہوئے مضاربت کی یہ صورت بھی جائز ہونی چاہیے۔

اس قسم کا اختلاف اشتراک عمل کی ایک اور صورت میں بھی ہے، اور وہ یہ کہ ایک کی طرف سے سرمایہ ہو اور دوسرے کی طرف سے کام بھی ہو اور تجارت بھی، مثلاً ایک شخص دوسرے کو دھاگہ کاتنے کے لئے دے اور اس سے کہے کہ اس سے جو کپڑا بنے اسے بازار میں فروخت کر دینا، اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ ہمارے درمیان نصف نصف شرح سے تقسیم ہوگا، یا ایک شخص دوسرے کو کپڑے سینے کے لئے دے، اور اس سے یہ کہے کہ سلائی کے بعد اسے فروخت کر دینا، اور جو آمدنی حاصل ہو اسے ہم باہم مثلاً نصف نصف (یا کسی اور شرح سے) تقسیم کر لیں گے، تو یہ دونوں صورتیں بھی امام ابو حنیفہ اور امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کے نزدیک ناجائز ہیں، لہذا اگر ایسا عقد کر لیا گیا تو تمام رقم مالک کو دی جائے گی، البتہ عامل کو اجرت مثل ملے گی۔

ائمہ ثلاثہ کے دلائل:

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عقد شرکت کا نہیں ہے، بلکہ مضاربہ کا ہے، لیکن اس میں چند خرابیاں ہیں، ایک یہ کہ رب المال نے مضارب (عمرو) کو جو سرمایہ تجارت کے لئے دیا ہے، وہ نقد نہیں ہے، بلکہ عروض (سامان) کی شکل میں ہے، دوسری خرابی یہ ہے کہ اس عقد میں تنہا مضاربت بھی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ استصناع (آرڈر پر مال تیار کرنے کا عقد) بھی پایا جا رہا ہے، اور موجودہ صورت میں استصناع کے لئے جو اجرت طے کی گئی ہے، وہ نامعلوم اور غیر یقینی ہے، جبکہ استصناع میں اجرت کا معلوم ہونا ضروری ہے، اور جب اجرت نامعلوم ہو تو عقد فاسد ہو جاتا ہے، اور اجرت مثل واجب ہوتی ہے۔

امام احمد بن حنبلؒ کے دلائل:

امام احمد بن حنبلؒ کے دلائل وہی ہیں جو سابقہ صورتوں میں گذرے ہیں یعنی یہ کہ وہ اس عقد کو مساقاۃ اور مزارعت پر قیاس کرتے ہوئے جائز قرار دیتے ہیں۔[1]

نتیجۂ بحث:

سروسز کے کاروبار میں مضاربت کی جو صورتیں اوپر ذکر کی گئی ہیں، ان کا اطلاق موجودہ دور کے بہت سے کاروباروں پر ہوتا ہے، کیونکہ یہ بات عین ممکن ہے کہ ایک شخص کے پاس سرمایہ ہو اور دوسرے کے پاس ہنر یا کسی خدمت کی صلاحیت ہو، لیکن اس کے پاس اس صلاحیت کو بروئے کار لانے کے لئے سرمایہ نہ ہو، اور وہ سرمایہ دار سے سرمایہ لے کر اپنی خدمات سرانجام دے، مثلاً ایک ڈاکٹر کے پاس علاج کرنے کے لئے ضروری ساز وسامان اور سرمایہ نہیں ہے، اور ایک سرمایہ دار اسے تمام سرمایہ فراہم کرتا ہے تاکہ اس سے کوئی کلینک یا ہسپتال قائم کرے، اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ باہم مشترک ہو، یا اسی طرح ایک اور مثال لے لیجئے کہ ایک شخص دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ میں تمہیں سرمایہ فراہم کرتا ہوں تم اس سے کاریں خرید کر کرایہ پر چلاؤ، اور اس طرح ایک کمپنی قائم کر لی کہ ایک شخص کا سرمایہ لگا ہوا ہے، اور دوسرا آدمی کاریں کرایہ پر دیتا ہے، اور نفع باہم تقسیم کر لیتے ہیں تو یہ بھی سروسز میں مضاربہ کی ایک شکل ہے۔

اس طرح کی اور بہت سی صورتیں ممکن ہیں، جو موجودہ دور میں رائج ہیں، اور مسلمانوں کے بڑے بڑے کاروبار انہیں بنیادوں پر چل رہے ہیں، اگر اس مسئلہ میں أئمہ ثلاثہ کے مسئلہ پر عمل کر کے کاروبار کو ناجائز قرار دیا جائے تو عظیم حرج لازم آئے گا، اسلئے، تنگی اور پریشانی سے بچانے کیلئے امام احمد بن حنبلؒ کے مذہب کے مطابق عمل کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

---

(۱) ا بن قدامة (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمدالمقدسی) ،المغنی، مكتبة الرياض السعودية : لنا أنها عين تنمی بالعمل عليها، فصح العقد عليها، بعض نمائها كالدراهم والدنانير، و كالشجر فی المساقاة والأرض فی المزارعة وقوله: إنه ليس من أقسام الشركة، ولا هو مضاربة، قلنا نعم لكنه يشبه المساقاة والمزارعة، فإنه دفع لعين المال إلى من يعمل عليها بعض نمائها مع بقاء عينها إلخ (۹:۵)، ومثله فی القواعد النورانيه لابن تيميه (۱۸٤)۔

وأيضا :ا بن قدامة (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمدالمقدسی) ،المغنی، مكتبة الرياض السعودية(۹:۵)، وإن دفع ثوبه إلى خياط ليصله قمصانا يبيعها وله نصف ربحهما يحق بعمله جاز نص عليه فی رواية حرب، وإن دفع غزلا إلى رجل ينسجه ثوبا بثلث ثمنه أو ربعه جاز نص عليه ولم يجز مالكؒ وأبو حنيفةؒ والشافعیؒ شيئا من ذلك لأنه عوض مجهول وقد ذكرنا وجه جوازه۔

جوائنٹ اسٹاک کمپنی

(Joint Stock Company) کی شرعی حیثیت

جوائنٹ اسٹاک کمپنی(Joint Stock Company) کی شرعی حیثیت جاننے سے پہلے بطور تمہید کچھ باتیں ذکر کی جاتی ہیں۔

ملکیت کے لحاظ سے کاروبار کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ شخصی یاذاتی کاروبار (Private Proprieter Ship)

۲۔ شرکت (Partner Ship)

۳۔ کمپنی (Joint Stock Company)

پہلی دو قسموں کا کاروبار بہت قدیم زمانوں سے چلا آرہا ہے، فقہائے کرام نے بھی انکی بنیادی تفصیلات اور ان کے احکام ذکر فرمائے ہیں، اور انکی موجودہ صورتِ حال ماضی سے بنیادی طور پر مختلف نہیں ہے، اور چونکہ شرکت کے بنیادی احکام اس مقالے کے دوسرے اور تیسرے باب میں ابتک بیان کئے گئے ہیں لہذا یہاں انکی تفصیلات کو ذکر کرنا مقصود نہیں ہے، البتہ کمپنی کاروبار کی ایک نئی قسم ہے، جس کا پہلے فقہاء کرام کے دور میں وجود نہ تھا، اس لئے یہاں اس کے احکام بیان کرنا مقصود ہے۔

کمپنی کے لغوی معنی شرکت ہیں اور کبھی رفقائے کار کو بھی کمپنی کہدیا جاتا ہے، بعض دوکانوں کے نام میں ,,فلاں اینڈ کمپنی،، لکھا ہوا ہوتا ہے، اس سے یہ لغوی معنی ہی مراد ہوتے ہیں، جس کو عربی میں ,,فلان وشرکاءہ،، یعنی فلاں اور اس کے شرکاء سے تعبیر کرتے ہیں، اس سے وہ معاشی اور اصطلاحی معنی مراد نہیں ہوتے، جس کا یہاں تعارف کرایا

جارہا ہے۔

لیکن جب "اینڈ" کے لفظ کے بغیر کسی تجارتی ادارے کے نام میں "کمپنی" کا لفظ ہو مثلاً تاج کمپنی، تو اس سے اصطلاحی کمپنی مراد ہوتی ہے، اور عموماً اس کے ساتھ لمیٹڈ کا لفظ بھی ہوتا ہے، جس کی تشریح اب ذکر کی جاتی ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کا تصور:

لمیٹڈ کمپنی کو "الشرکة المحدودة" کہتے ہیں، اس سے مراد مسئولیت (Liability) یعنی ذمہ داری کا محدود (Limited) ہونا ہے، لمیٹڈ کمپنی کے حصہ داروں کی ذمہ داری انکے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حصہ داروں (Share Holders) سے ان کے لگائے ہوے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اسی طرح کمپنی کی ذمہ داری بھی اس کے اثاثوں کی حد تک محدود ہوگی، قرضہ ادا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ کمپنی کے اثاثے قرق کرائے جاسکتے ہیں، اثاثوں سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا[1]، اسی لئے لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لفظ "لمیٹڈ" لکھنا ضروری ہے، تاکہ قرض دینے والا اس بات کو ملحوظ رکھتے ہوئے قرض دے کہ اس مدیون کی ذمہ داری محدود ہوگی، عموما کمپنیاں ہی لمیٹڈ ہوتی ہیں، جبکہ عام طور پر شرکت (Partner Ship) لمیٹڈ نہیں ہوتی، بعض ممالک کمپنی کے بجائے کارپوریشن (Corporation) کا لفظ استعمال کرتے ہیں، اور وہ کمپنی کے نام کے ساتھ لمیٹڈ کمپنی لکھنے کے بجائے (Incorporation) یا اسکا مخفف .Inc لکھتے ہیں۔

کمپنی کی دو قسمیں ہیں

۱۔ پرائیوٹ کمپنی (الشرکة الخاصة) ۲۔ پبلک کمپنی (الشرکة العامة)۔

اب ذیل میں دونوں کی تعریفیں اور دونوں کے درمیان فرق واضح کیا جاتا ہے۔

الف: پرائیوٹ کمپنی (PRIVATE COMPANY) پرائیوٹ کمپنی کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسی کمپنی ہے جس کے ممبران کی تعداد کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ پچاس ہوں، اور اس میں عام لوگوں کو

1. Don Moynihan, Briatitley Ecomomics A Complete Course. Oxford, 1989,P :93. Joint Stock Company P:91.

حصص (Shares) یا تمسکات (Bonds) خریدنے کے لئے مدعو نہیں کیا جاتا[1]، اور اسکے حصص اسٹاک ایکسچینج میں فروخت نہیں ہوتے۔

ب: پبلک کمپنی (Public Company) میں ممبران کی کم از کم تعداد سات ہونی چاہئے، اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں ہے، اور ایسی کمپنیاں عوام کو حصص اور تمسکات خریدنے کے لئے مدعو کر سکتی ہیں، ان کا باقاعدہ پراسپکٹس (Prospectus) شائع کیا جاتا ہے اور انکے حصص بازار حصص میں فروخت ہوتے ہیں، اسی طرح کسی بھی پرائیوٹ کمپنی کی پچیس فیصد یا اس سے زائد حصص ایک یا ایک سے زائد پبلک کمپنی میں ہوں تو وہ پرائیوٹ کمپنی، پبلک کمپنی بن جاتی ہے۔

کمپنی کی مندرجہ بالا دونوں قسمیں محدود ذمہ داری والی یعنی لمیٹڈ ہوتی ہیں قانونی تقاضے کے مطابق پرائیویٹ کے ساتھ پرائیویٹ لکھنا ضروری ہوتا ہے۔[۲]

شرکت اور کمپنی میں فرق

شرکت (Partnership) کو عربی میں الشرکۃ یا شرکۃ الأشخاص کہتے ہیں اور کمپنی کو الشرکۃ المساہمۃ کہتے ہیں، شرکت اور کمپنی میں کئی امتیازی فرق ہیں:

۱۔ شرکت میں ہر شخص کاروبار کے تمام اثاثوں کا مشاع طور پر مالک ہوتا ہے، ہر شریک دوسرے شریک کا وکیل ہوتا ہے، ہر شخص کی ذمہ داری یکساں ہوتی ہے، مثلاً کوئی دین (قرضہ) واجب ہوا تو تمام شرکاء برابر درجے میں ذمہ دار ہوں گے، مگر کمپنی میں ایسا نہیں ہوتا، کمپنی ایک شخصِ قانونی ہے، اس کا الگ وجود ہے، اور حصہ داران کا الگ وجود ہے، حاملین حصص اس حد تک تو کمپنی کے اثاثوں میں شریک ہیں کہ اگر کمپنی تحلیل ہو اور اس کے اثاثے تقسیم ہوں تو ان کو متناسب حصے ملیں گے، لیکن کمپنی کی تحلیل سے پہلے قانون حاملِ حصص کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کمپنی کے اثاثوں

1. F. Livesey Economics Business Decisions, Macdonald and Evans P. 90

2. Don Moynihan, Briatitley Ecomomics A Complete Course. Oxford, 1989,P :93.

میں تصرف کر سکے یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی حامل حصص مدیون (مقروض) ہو اور اس کے اثاثے قرق کئے جائیں تو جو شیئرز اس کے ہاتھ میں ہیں وہ تو قرق ہوں گے، مگر اس کے شیئرز کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں سے اس کا جو حصہ بنتا ہے وہ قرق نہیں ہوگا، اس لئے کہ قانونا کمپنی کے اثاثوں پر اسکو تصرف کا حق حاصل نہیں ہے۔ (۱)

۲۔ شرکت (PartnerShip) میں کاروبار کی طرف سے کسی پر دعوی یا کسی کی طرف سے کاروبار پر دعوی ہو تو تمام شرکاء مدعی یا مدعی علیہ ہوں گے، مگر کمپنی خود ایک شخصِ قانونی ہے، لہذا کمپنی خود ہی مدعی یا مدعی علیہ ہوگی، حاملین حصص (Share Holders) نہیں ہونگے، اس شخصِ قانونی کی نمائندگی عدالت میں انتظامیہ کا کوئی فرد کریگا۔ (۲)

۳۔ شرکت کا الگ سے کوئی قانونی وجود نہیں ہوتا، کمپنی کا الگ سے قانونی وجود ہوتا ہے، جس کو شخصِ قانونی کہا جاتا ہے۔ (۳)

یہ تو کمپنی اور شرکت کے بارے میں امتیازی فرق تھا، اور روایتی شرکت کے احکام گذشتہ صفحات میں بیان ہوتے رہے ہیں، اب کمپنی کے بارے میں شرعی احکام اور اسکی شرعی حیثیت کا جائزہ لیا جائے گا، اس موضوع پر بحث کو دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، ایک حصہ اصولی اور بنیادی طور پر کمپنی کے جواز یا عدم جواز کی بحث سے متعلق ہے اور دوسرا حصہ کمپنی سے متعلق جزوی مسائل کا ہے۔

---

1. A Practical Intraduction to Business, by Koontz aod Fulmer, Rivesed Edition 1978, Publiched at Richard D. Irwin, I.N.C. Ontario, p:125,147.
2. A Practical Intraduction to Business, by Koontz aod Fulmer, Rivesed Edition 1978, Publiched at Richard D. Irwin, I.N.C. Ontario, p:125,147.
3. A Practical Intraduction to Business, by Koontz aod Fulmer, Rivesed Edition 1978, Publiched at Richard D. Irwin, I.N.C. Ontario, p:125,147.

کمپنی کی شرعی حیثیت

جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اتنی بات تو گذشتہ صفحات میں شرکت اور کمپنی کی تعریفات واقسام اور انکے درمیان فرق کے بیان میں واضح ہوتی ہے، کہ کمپنی کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کے لحاظ سے کمپنی شرکت کی معروف اقسام میں سے کسی میں داخل نہیں ہے، فقہاء کرام نے شرکت کی پانچ قسمیں ذکر فرمائی ہیں، اگر مضاربت کو اسمیں شامل کرلیا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، کمپنی کا یہ نظام ان پانچوں میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں ہے، لہذا کمپنی کا کیا حکم ہے؟ آیا اسے شرکت کی روایتی اقسام میں بظاہر داخل نہ ہونے کی وجہ سے ناجائز قرار دیا جائے یا اسے شرکت کی کسی روایتی قسم میں شامل مان کر یا شرکت کی نئی قسم قرار دے کر جائز کہا جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس سلسلے میں اگر تمام آراء کو جمع کیا جائے تو تین قسم کے نقطہائے نظر بنتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ شرکت شرعاً صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الاموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں داخل مانا جائے تو چھ قسمیں ہو جاتی ہیں اور کمپنی ان مذکورہ اقسام میں سے کسی میں بھی بتمام وکمال داخل نہیں ہے، لہذا یہ ناجائز ہے۔

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی ان قسموں میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جاسکتا، اسلئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہائے کرام نے اپنے دور میں شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقرا کر کے اسکی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے، اور پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں

ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو وہ ناجائز ہوگی، لہٰذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی۔

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کسی قسم میں داخل ہے، پھر اسمیں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے، اور بعض کا خیال ہے کہ یہ مضاربہ کی ایک شکل ہے۔

اب ذیل میں مذکورہ بالا تینوں نقطہ نظر علیحدہ علیحدہ دلائل کے ساتھ ذکر کیے جاتے ہیں۔

پہلا نقطہ نظر:

کمپنی کے عقد کے بارے میں پہلا نقطہ نظر یہ بیان کیا گیا ہے کہ شرکت شرعی لحاظ سے صرف روایتی پانچ قسموں یعنی شرکت الأموال، شرکت الاعمال، شرکت الوجوہ، شرکت المفاوضہ، شرکت العنان میں منحصر ہے، اور اگر مضاربت کو بھی اس میں شامل مانا جائے تو چھ قسمیں بن جاتی ہیں، جبکہ کمپنی کا عقد مذکورہ بالا کسی قسم پر پورا نہیں اترتا، لہٰذا یہ ناجائز ہے، یہ نظریہ شیخ تقی الدین النبہانی کا ہے، انکی رائے کے مطابق کمپنی کا عقد شرکت کی کسی بھی روایتی یا معروف اقسام میں داخل نہیں ہے، بلکہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کا پیدا کردہ ایک کاروباری طریقہ ہے، لہٰذا اسے اسلامی شرکت کے کسی طریقے پر منطبق کر کے جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔[1]

ڈاکٹر عیسی عبدہ کی رائے بھی کسی حد تک ان کے مماثل ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

لا علم لنا بأن الفقه الاسلامي يعترف بهذا النوع من الشركات۔

یعنی ہمارے علم میں یہ بات نہیں ہے کہ اسلامی فقہ شرکت (کمپنی) کی اس قسم کا اعتراف اور اعتبار کرتی ہو۔(۲)

---

(۱) النبهانی، الشيخ تقی الدين ، الشركات فی الفقه الإسلامی (۱۳۳) المرزوقی، صالح بن زابن، شركة المساهمة فی النظام السعودی من علماء القرن الخامس عشر جامعه ام القرى مكة المكرمة(۳۱۹)۔

(۲) الدكتور عيسى عبده، العقود الشرعيه(۱۸، ۱۹)۔

ڈاکٹر عیسی عبدہ نے اگرچہ صراحتاً اسے حرام تو نہیں کہا ہے البتہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ انہیں یہ معلوم نہیں ہے کہ اسلام میں کسی نے اسے حلال قرار دیا ہے، اور بعض وجوہ کی بناء پر یہ شرکت کی معروف اقسام پر منطبق بھی نہیں ہو سکتا۔[۱]

گویا کہ شیخ تقی الدین النبہانی اور ڈاکٹر عیسی عبدہ دونوں اس بارے میں متفق ہیں کہ اسے شرکت کی کسی روایتی قسم پر منطبق نہیں کیا جاسکتا، ان کے دلائل ذیل میں ذکر کیے جاتے ہیں:

۱:۔ کمپنی میں دو یا زائد افراد کے درمیان اس قسم کا کوئی عقد نہیں پایا جاتا جو شرکت میں ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ عقد دو افراد کے درمیان ایجاب و قبول کا نام ہے، شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ شرکاء کے درمیان ایجاب و قبول پایا جانا ضروری ہے، اس کے برعکس کمپنی میں جو شخص شرکت کرنا چاہتا ہے وہ محض اپنے ارادے سے جاکر شیئر خرید لیتا ہے خواہ بقیہ شرکاء (شیئر ہولڈرز) کی رضامندی اور قبول پایا جائے یا نہ پایا جائے۔[۲]

۲:۔ شرکت کے روایتی تصور میں دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کر لیتے ہیں کہ وہ اپنے مشترک سرمائے سے تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی کیونکہ اس میں حصہ دار (Share Holder) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سرانجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار بھی نہیں ہوتا، یہ بات بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔[۳]

۳:۔ روایتی شرکت کے جواز کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدن انسانی ہو جو قولی اور فعلی تصرفات کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک

---

(۱) الدکتور عیسی عبدہ، العقود الشرعیہ(۱۸،۱۹)۔

(۲) النبهانی ،الشیخ تقی الدین ، الشرکات فی الفقه الإسلامی (۱۳٤)، الخیاط،عبد العزیز عزت، الشرکات فی الشریعة الإسلامیة و القانون الوضیعی دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ھ (۲:۱٦۱)۔

(۳) النبهانی ،الشیخ تقی الدین ، الشرکات فی الفقه الإسلامی (۱۳٤)، الخیاط،عبد العزیز عزت، الشرکات فی الشریعة الإسلامیة و القانون الوضیعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ (۲:۱٦۱)۔

شخصِ قانونی یا شخص حکمی (Juristic person) ہوتا ہے، جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخصِ قانونی کی کوئی نظیر فقہ کی قدیم کتابوں میں نہیں ملتی۔ [1]

۴:۔ کمپنی کی ایک خصوصیت محدود ذمہ داری (Limited Liability) ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ حاملان حصص (Share holders) کی ذمہ داری ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہو سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہو گیا تو حاملان حصص سے انکے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، محدود ذمہ داری کے اس تصور کی روایتی فقہ اور شرکت میں نظیر دکھائی نہیں دیتی، یہ بات بھی شرکت کے جواز کے لئے مانع ہے۔

۵:۔ روایتی شرکت میں یہ بھی ضروری ہے کہ اگر کوئی شریک مر جائے یا پاگل ہو جائے یا اسے زبانی اور عملی تصرفات سے روک دیا جائے (یعنی فقہی اصطلاح کے مطابق اسے کردیا جائے) یا کوئی شریک عقد شرکت فسخ کردے تو پوری عقدِ شرکت فسخ ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کمپنی میں کسی بھی شریک کی طرف سے ان حالات میں کمپنی کا کاروبار فسخ یا ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ اسی طرح جاری رہتا ہے، یہ بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے۔ [2]

دوسرا نقطہ نظر:

دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ صرف اس وجہ سے کہ کمپنی شرکت کی روایتی اقسام میں داخل نہیں ہے اسے ناجائز نہیں کہا جا سکتا، اس لئے کہ فقہاء کرام نے جو اقسام ذکر فرمائی ہیں وہ منصوص نہیں ہیں، بلکہ فقہاء کرام نے شرکت کی مروجہ صورتوں کا استقراء کر کے اسکی روشنی میں تقسیم فرمائی ہے، پھر کسی نص میں یا فقہاء کے کلام میں یہ صراحت بھی نہیں ہے کہ جو صورت ان اقسام میں داخل نہیں ہے وہ ناجائز ہوگی، لہذا اگر شرکت کی کوئی صورت ان اقسام میں داخل نہ ہو اور شرکت کے اصول منصوصہ میں سے کسی کے خلاف بھی نہ ہو تو وہ جائز ہوگی، یہ نقطہ نظر موجودہ علماء کی بھاری اکثریت کا

(۱) النبهانی، الشیخ تقی الدین، الشرکات فی الفقه الإسلامی (۱۳٤)، الخیاط، عبد العزیز عزت، الشرکات فی الشریعة الإسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ (۱٦٥:۲)۔

(۲) الخیاط، عبد العزیز عزت الشرکات فی الشریعة الإسلامیة والقانون الوضعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ (۲۱۱:۱)۔

ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنیوں اور شرکت کی تمام جدید صورتیں جائز ہیں، بشرطیکہ وہ سود سے پاک ہوں۔

تیسرا نقطہ نظر:

تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ کمپنی شرکت کی کس قسم میں داخل ہے پھر اس میں بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ یہ شرکتِ عنان میں داخل ہے، یہ رائے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ[1] اور موجودہ دور کے اکثر علماءِ عرب اور عجم بشمول ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط[2] اور الاستاذ علی الخفیف[3] اور حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم وغیرہ کی ہے۔[4]

بعض حضرات کا خیال ہے کہ کمپنی کا عقد مضاربہ کی ایک شکل ہے یہ رائے شیخ عبدالوہاب کی ہے کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ کمپنی مضاربہ کے عقد کی مانند ہے، جس میں ایک فریق کا سرمایہ ہوتا ہے جسے رب المال کہا جاتا ہے، اور دوسرے فریق کا عمل جسے مضارب یا عامل کہتے ہیں، اور کمپنی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے، کہ ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے، لہذا یہ مضاربت میں داخل ہے۔[5]

قابلِ ترجیح رائے:

مذکورہ بالا تمام اقوال اور آراء میں سب سے زیادہ ترجیح حضرت تھانویؒ کی رائے کو ہونی چاہیے، کہ کمپنی کا عقد شرکتِ عنان میں داخل ہے، کیونکہ اس میں کمپنی قائم کرنے والے افراد بھی دوسرے شرکاء (Share holders) کی

---

(۱) تھانوی ، مولانا اشرف علی ،امداد الفتاوی،مکتبہ دارالعلوم، کراچی (۳:۴۹۴)۔

(۲) الخیاط،عبد العزیز عزت الشرکات فی الشریعة الإسلامیة والقانون الوضیعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ (۲:۲۸)۔

(۳) الخفیف،علی، الشرکات (۹۷) بحواله الاستاذ سعید العالم، مخطوطه اللمحات من أحکام الشرکات،دارالعلوم کراچی (۲:۳۰٥)۔

(۴) عثمانی ، مولانا محمد تقی ،اسلام اور جدید تجارت ومعیشت ، ادارة المعارف، کراچی(۷۹)۔

(۵) مجلة لواء الاسلام،العدد الثانی عشر ۱۹٥۱ء (ج:٤) بحواله الخیاط،عبد العزیز عزت الشرکات فی الشریعة الإسلامیة والقانون الوضیعی، دار النهضة العربیة بیروت ۱٤۰۷ (۲:۱٥٥،۱٥٦)۔

مانند کمپنی میں حصہ دار ہوتے ہیں، لہذا تمام افراد کمپنی میں شریک ہو جاتے ہیں، البتہ کمپنی قائم کرنے والے لوگ اپنے جامد اثاثوں اور عروض (اجناس) اور مال تجارت کو (قیمت لگا کر) نقد کی طرف محمول کر لیتے ہیں، مثلاً ان لوگوں نے دس ہزار روپے کمپنی قائم کرنے کے لئے جامد اثاثوں مثلاً عمارتوں اور ساز و سامان پر صرف کیا تو اگر سو روپے کا ایک حصہ (Share) ہے تو وہ خود کو سو حصوں کا حصہ دار ظاہر کریں گے، البتہ اس صورت میں کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے شرکت صرف نقد سرمایہ سے نہیں ہوگی، بلکہ شرکت بالعروض ہوگی، جسکے بارے میں اسی باب کے پہلی عنوان ,, کیا سرمائے کا نقد ہونا ضروری ہے،، کے تحت اختلاف مذاہب بیان کر چکے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک یہ صورت جائز ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک اگر عروض ذوات الامثال میں سے ہوں تو جائز ہے، ورنہ ناجائز ہے [۱]، اور احناف کے نزدیک اگر تمام عروض ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط کردئے جائیں تو جائز ہے، [۲] حضرت تھانویؒ و دیگر علماء کرام فرماتے ہیں کہ لوگوں کی ضرورت اور سہولت کے پیش نظر مالکیہ کے قول پر فتوی دینے کی گنجائش ہے۔ [۳]

خلاصہ یہ کہ اسے شرکتِ عنان قرار دیا جاسکتا ہے، اور اس میں سرمایہ لگانے والے آپس میں شرکاء ہیں، اور اس میں شرکتِ عنان کی مانند بعض شرکاء کے حصص زیادہ اور بعض کے کم ہوتے ہیں، جو حضرات اسے یہ کہہ کر مضاربہ قرار دیتے ہیں کہ اس میں مضاربہ کی طرح ایک فریق کا سرمایہ اور دوسرے فریق کا عمل تجارت ہوتا ہے، اس وجہ سے یہ مضاربہ ہے، انکی یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، اور تمام حصہ داروں کا بذاتِ خود اس میں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی سب اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ داران میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارت قائم کر لیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی مانند ہوتی ہے، پھر مجلس ادارت سے منتخب کر کے ایک شخص کو ناظم یا مدیر (Managing Director) بنایا جاتا ہے، جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہذا حقیقت یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے میں بھی تمام شرکاء

(۱) ابن قدامة المقدسي (أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد ،المغني، مكتبة الرياض السعودية (۵:۱۲٤،۱۲۵)۔

(۲) الكاساني، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع للكاساني (۶:۵۹)۔

(۳) تھانوی، مولانا اشرف علی، امداد الفتاوی، مکتبہ دارالعلوم کراچی (۳:۴۹۵)۔

کی حصہ داری ہوتی ہے، لہذا یہ شرکتِ عنان ہے۔

کمپنی کو ناجائز قرار دینے والوں کے دلائل کا جائزہ:

اب ہم سب سے پہلے ذکر کردہ نقطہ نظر رکھنے والے حضرات کے دلائل کا جائزہ لیتے ہیں جو کمپنی کے عقد کو مطلقاً ناجائز کہتے ہیں۔

۱۔ مطلقاً ناجائز کہنے والوں کی سب سے پہلی دلیل یہ تھی کہ کمپنی میں دو یا زیادہ افراد کے درمیان شرکت کا عقد کرنے کے لئے ایجاب وقبول نہیں پایا جاتا، حالانکہ کوئی بھی عقد ایجاب وقبول کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ کمپنی قائم کرنے کا ارادہ سب سے پہلے کسی ایک فرد کے ذہن میں آتا ہے، پھر وہ دوسروں کو اپنے ساتھ شرکت کی دعوت دیتا ہے، تو پہلے شخص کی طرف سے ایجاب پایا گیا، اور اس کے ساتھ اسکی دعوت پر شرکت قبول کرنے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا، اس طرح کمپنی میں ایجاب وقبول کے ساتھ مالی منصوبہ میں عقدِ شرکت پایا گیا، اور شرکاء نے یہ طے کیا کہ وہ نفع نقصان میں شریک ہوں گے، اور اس عقد کو تحریری شکل میں لانے کے لئے وہ متعدد تحریریں تیار کرتے ہیں، مثلاً میمورنڈم اور آرٹیکلز آف ایسوسی ایشن، نیز ایک منشور مرتب کرتے ہیں، جسے پراسپکٹس (Prospectus) کہا جاتا ہے، یہ تمام مسودات اس عقد کے ایک قسم کے تحریری ثبوت ہوتے ہیں، لہذا یہ بات صحیح نہیں، پھر جو لوگ کمپنی قائم ہونے کے بعد بازار سے شیئرز خریدتے ہیں، وہ بیچنے والے کے ساتھ ایجاب وقبول کرتے ہیں کہ ایجاب وقبول نہیں پایا جاتا، کیونکہ کمپنی قائم کرنے والوں کی طرف سے ایجاب ہوا، اور بعد میں شریک ہونے والوں کی طرف سے قبول پایا گیا۔

۲۔ مطلقاً حرام کہنے والے حضرات کی دوسری دلیل یہ تھی کہ شرکت کے روایتی تصور میں یہ ہے کہ دو یا زیادہ شرکاء اس بات پر اتفاق کرتے ہیں کہ وہ اپنے مشترک سرمایہ سے مل کر تجارت کریں گے، یہ بات کمپنی میں نہیں پائی جاتی، کیونکہ اس میں حصہ دار (Share holders) صرف اپنا سرمایہ لگاتے ہیں، کاروبار کا عمل کمپنی یا اس کے ملازمین سرانجام دیتے ہیں، ہر شریک کو کاروبار میں دخل اندازی کا اختیار نہیں ہوتا، یہ باتیں شرکت کے خلاف ہیں۔

ان حضرات کی یہ دلیل بھی صحیح نہیں کیونکہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں شرکت نہیں ہوتی، بلکہ حصہ داروں کے عمل میں بھی اشتراک پایا جاتا ہے، اور وہ اس طرح کہ کمپنی میں حصہ داروں کی تعداد بعض اوقات ہزاروں تک پہونچ جاتی ہے، اور تمام حصہ داران کا بذاتِ خود کامیں حصہ لینا نہ تو ممکن ہے، اور نہ ہی وہ تمام اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، بلکہ وہ تمام حصہ داران میں انتخاب کر کے ایک مجلس ادارت قائم کر دیتے ہیں، جس کی حیثیت ان شرکاء کے وکیل کی ہوتی ہے، اور پھر مجلس ادارت سے منتخب کر کے ایک شخص کو مدیر بنایا جاتا ہے جو تمام تصرفات انجام دیتا ہے، لہٰذا امر واقعہ یہ ہے کہ تصرفات انجام دینے والا شخص تمام حصہ داران کا نمائندہ یا ملازم ہوتا ہے، لہٰذا اسکا ہر فعل حصہ داروں کا فعل ہے اور انہیں اسے ہر قسم کے اعتراض اور نگرانی کا اختیار ہوتا ہے، اور انتخاب میں رائے دہی کا حق ان کے حصص کے تناسب سے ہوتا ہے، یہ طریقہ شرکت یا کمپنی کی مصالح کے عین موافق ہے، اس لئے کہ کمپنی کا سب سے زیادہ خیر خواہ وہی ہو سکتا ہے، جس کا سرمایہ کمپنی میں زیادہ لگا ہوا ہو، لہٰذا کمپنی کو مطلقاً حرام کہنے والوں کا یہ دعوی بالکل بے جا ہے کہ کمپنی میں صرف سرمایہ میں اشتراک پایا جاتا ہے، عمل میں اشتراک نہیں پایا جاتا، اور شرکاء کو کمپنی میں کسی قسم کے عمل دخل کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔[1]

۳۔ جو حضرات کمپنی کے مطلقاً ناجائز ہونے کے قائل ہیں ان کی تیسری دلیل یہ ہے کہ روایتی شرکت کے لئے یہ ضروری ہے کہ شرکت کے ذریعہ کاروبار کرنے والا کوئی ایسا بدنِ انسانی ہو جو تصرفات قولیہ اور تصرفات فعلیہ کی اہلیت رکھتا ہو، اس کے برعکس کمپنی میں شرکاء کی طرف سے کاروبار کرنے والا ایک شخصِ قانونی یا شخصِ حکمی ہوتا ہے، جو کاروبار کی تمام ذمہ داریاں ادا کرتا ہے، اس شخصِ قانونی کی فقہ میں کوئی نظیر نہیں ہے۔

جیسا کہ ہم نے دوسری دلیل کے جواب میں ذکر کیا کہ تصرفاتِ قولیہ وفعلیہ کا اختیار مجلس ادارت کو ہوتا ہے جو شرکاء کی وکیل ہے، لہٰذا کاروبار در حقیقت تمام حصہ دار اپنے وکیل کے واسطے سے انجام دیتے ہیں، البتہ متعدد قانونی پیچیدگیوں کی بنا پر ان شرکاء کے مجموعے کو ,, شخص قانونی،، (Juristic person) کی حیثیت دیدی گئی ہے، اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ ,, شخص قانونی،، کا تصور اسلام میں موجود ہے یا نہیں؟ جائزہ لینے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں اگر چہ

(۱) الخياط، عبد العزيز عزت الشركات في الشريعة الإسلامية والقانون الوضعي، دار النهضة العربية بيروت ١٤٠٧ (١٨٢:٢)۔

شخصِ قانونی کی اصطلاح موجود نہیں ہے، لیکن اس کے نظائر موجود ہیں:

شخصِ قانونی کے نظائر

ا۔ وقف:

وقف کے لئے اگر چہ شخصِ قانونی (Juristic person) کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی، مگر حقیقت میں یہ ایک شخصِ قانونی ہے، اسلئے کہ وقف اشیاء کا مالک بن سکتا ہے، کیونکہ جب کوئی شخص کسی چیز کو وقف کرتا ہے تو وقف کردہ چیز جمہور فقہاء کے نزدیک واقف کی ملکیت سے نکل جاتی ہے، اور جس کے اوپر وقف کیا گیا (جسے موقوف علیہ کہا جاتا ہے) اسکی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی، لہٰذا وہ چیز نہ واقف (وقف کرنے والا) کی ملکیت ہوتی ہے، اور نہ ہی موقوف علیہ کی ملک ہوتی ہے، بلکہ وقف خود ایک مستقل وجود رکھتا ہے، گویا کہ اب وہ ایک شخصِ قانونی کی شکل اختیار کر گیا ہے، لہٰذا اب وہ اشیاء کا مالک بھی بن سکتا ہے، دائن اور مدیون یا موجر اور مستاجر بھی بن سکتا ہے، چنانچہ وقف کا متولی اسکی طرف سے کوئی قرضہ لے سکتا ہے، یا کوئی چیز کرایہ پر لے سکتا ہے، اسی طرح اس کے لئے ضرورت کی کوئی چیز خرید سکتا ہے، اور اس قرضہ یا واجب الاداء کرایہ کی رقم یا قیمت کی ادائیگی کا وجوب در حقیقت وقف پر ہوگا، لہٰذا متولی وقف کی آمدنی سے انکی ادائیگی کرے گا، اسی طرح وقف کی جائیدادیں کرایہ پر بھی دی جاسکتی ہیں، اور اس کے کرایہ کا مستحق وقف ہوگا، اگر وقف کے متولی نے وقف کے لئے ادھار لیا پھر وہ معزول ہو گیا تو اس سے عرض کا مطالبہ نہیں ہوگا، بلکہ نیا متولی وقف کی طرف سے اسکی آمدنی سے اس دین کی ادائیگی کرے گا، لڑائی جھگڑوں اور مقدمات کی صورت میں دراصل وقف ہی مدعی یا مدعی علیہ ہوگا، اور اسکی طرف سے متولی اسکے متعلقہ امور نمٹائے گا۔[1]

---

(۱) ملاحظہ فرمائیں: شامی، محمد امین الشهير بابن عابدين الشامي تنقيح الفتاوى الحامدیه ، دار المعرفه بيروت۔ (۲۱۳:۱)، و الشامی ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ،مطبعة الحلبی مصر ۱۳۸٦ھ (٦١٩:٣)، شيخ زاده ،عبد الله الرحمن بن الشيخ محمد بن سليمان المعروف بداماد آفندی ، مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر، دار الطباعة، ۱۹۷۷ (۷٤٩:۱) الحصكفي ،محمدعلاء الدين بن الشيخ على الإمام بجامع بنى أميه، الدر المنتقى فى شرح الملتقى (۷٤٩:۱)، طبع دار السعادة استانبول۔

اسی طرح مسجد کو بھی ایک آزاد شخص کی طرح قرار دے کر فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ اس پر کوئی چیز وقف کی جاسکتی ہے[1]، اسے کوئی چیز ہبہ کی جاسکتی ہے، اگر مسجد کے پڑوس میں کوئی مکان فروخت ہوا تو مسجد کے متولی کو مسجد کی طرف سے شفعہ کا حق بھی حاصل ہوگا۔[2]

خلاصہ یہ کہ وقف میں مندرجہ ذیل چیزیں پائی جاتی ہیں، جنکی وجہ سے اس پر شخصِ قانونی کا اطلاق کیا جاسکتا ہے:

۱:۔ وقف مالک ہوتا ہے، کیونکہ مسجد یا وقف کو کوئی چندہ یا عطیہ دیا جائے تو وہ عطیہ یا چندہ وقف نہیں ہوتا، جب تک ان کے وقف ہونے کی تصریح نہ کر دی جائے، بلکہ وہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں، اور وقف مالک ہوتا ہے۔

۲:۔ وقف دائن ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کی زمین کرائے پر لیتا ہے تو یہ کرایہ وقف کا دین ہے، اور وقف دائن ہے۔

۳:۔ وقف مدیون بھی ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص وقف کا ملازم ہو تو اسکی تنخواہ وقف کے ذمہ دین ہے۔

۴:۔ عدالت میں مقدمہ ہو تو وقف مدعی اور مدعی علیہ بھی ہو سکتا ہے، اور متولی اسکی نمائندگی کرتا ہے۔

مالک ہونا، دائن ہونا، مدیون ہونا، مدعی یا مدعی علیہ ہونا شخصِ حقیقی کے اوصاف میں سے ہے، معلوم ہوا کہ وقف میں شخصِ قانونی کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں، گو فقہاء نے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی۔

۲۔ بیت المال:

شخصِ قانونی کی دوسری نظیر بیت المال ہے کہ بیت المال کے مال سے پوری قوم کا حق تو متعلق ہوتا ہے مگر ہر شخص اس مال میں ملک کا دعوی نہیں کر سکتا، اس مال کا مالک بیت المال ہی ہوتا ہے، بلکہ فقہاء کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے

---

(۱) رملی، محمد بن احمد ٤ـ۱۰۰۵ھ، نہایة المحتاج،بیروت، احیاء التراث العربی (۲:۱۱٦)،(٥:۳۷۰) (٦:٤٦)، طبعة الحلبی۔

(۲) الشافعی، اسنی المطالب علی روض الطالب، للشیخ زکریا الأنصاری (۲:۲٦٥)، منح الجلیل للشیخ علیش مالکی (۳:٥٥٤)۔

کہ بیت المال کی ہر مد ایک مستقل شخص قانونی ہے، بیت المال کے دو الگ الگ شعبے اور حصے ہیں:

۱۔ بیت مال الصدقہ ۲۔ بیت مال الخراج۔

امام زیلعیؒ نے تبیین الحقائق میں لکھا ہے کہ اگر ایک حصہ میں مال نہ ہو تو بوقتِ ضرورت دوسرے حصہ سے قرض لیا جاسکتا ہے، تو اس صورت میں جس حصہ سے قرض لیا گیا وہ دائن اور جس حصہ کے لئے قرضہ لیا گیا وہ مدیون ہوگا، اور دائن یا مدیون دراصل شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ بیت المال کو بھی شخص فرض کر لیا گیا ہے۔[1]

۳۔ ترکہ مستغرقہ بالدین:

شخصِ قانونی کی تیسری نظیر ترکہ مستغرقہ بالدین ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی مقروض انسان اس حالت میں انتقال کر جائے کہ اسکا سارا ترکہ قرض کی رقموں کے برابر ہو، یعنی قرض ادا کرنے کے بعد اس میں کچھ نہ بچے، تو اس صورت میں قرض خواہ کا مدیون نہ میت ہے، (اسلئے کہ مرنے کے بعد کوئی شخص مدیون نہیں ہوتا)، اور نہ ورثاء مدیون ہیں، (کیونکہ انہیں میراث نہیں ملی)، لہذا یہاں مدیون ترکہ ہوگا، حالانکہ دائن یا مدیون تو شخص ہوا کرتا ہے، معلوم ہوا کہ ترکہ کو بھی شخصِ قانونی فرض کر لیا گیا ہے۔[2]

۴۔ خلطۃ الشیوع:

شخصِ قانونی کی چوتھی نظیر خلطۃ الشیوع ہے، یہ نظیر حنفیہ کے مذہب کے مطابق تو صحیح نہیں ہے، البتہ أئمہ ثلاثہ کے مذہب کے مطابق صحیح ہے، خلطۃ الشیوع کا مطلب یہ ہے کہ أئمہ ثلاثہ کے نزدیک اگر قابل زکوۃ مال کئی افراد کی مشترک ملکیت ہو تو زکاۃ ہر شریک پر انفرادی طور سے نہیں بلکہ مجموعی اعتبار سے کل مجموعی مال پر ہوتی ہے، مثلاً سو

---

(۱) زیلعی، عثمان بن علی ۷۴۳ھ، تبیین الحقائق، مکتبہ امدادی ملتان ۷۴۳ھ، کتاب السیر، قبیل باب المرتدین (۲۸۳:۳)۔

(۲) الخفیف، علی، الشرکات (ص:۲۵)، کتاب الأحکام السلطانیہ (ص:۱۱۲، ۱۹۰)۔

ابو یوسف (امام)، یعقوب بن ابراھیم ۱۸۲ھ، کتاب الخراج، القاھرۃ، المطبعۃ السلفیۃ ۱۳۵۲ھ (ص:۲۳، ۵۰)۔

الخیاط، عبد العزیز عزت الشرکات فی الشریعۃ الإسلامیۃ والقانون الوضیعی، دار النھضۃ العربیۃ بیروت ۱۴۰۷ (۲۱۸:۱)۔

بکریاں اگر دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہوں تو زکوۃ ہر شخص کے الگ حصے پر واجب نہیں ہوگی، بلکہ مجموعی سو بکریوں پر واجب ہوگی، چنانچہ صرف ایک بکری زکوۃ میں دی جائیگی، حالانکہ اگر ہر شخص کے الگ حصے پر زکوۃ واجب ہوتی تو پچاس پچاس بکریاں ہر ایک کے حصے میں آنے کی وجہ سے ہر شخص پر ایک ایک بکری علیحدہ واجب ہوتی، معلوم ہوا کہ ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قابل زکوۃ مال کا مجموعہ ایک شخصِ قانونی ہے، خلطۃ الشیوع کے مسئلہ کی مزید تفصیل آگے انشاء اللہ شیئرز پر زکاۃ کے بیان میں ذکر کی جائے گی۔

ان تمام نظائر سے معلوم ہوتا ہے کہ شخصِ قانونی کا تصور بذاتِ خود کوئی ناجائز تصور نہیں ہے، اور نہ ہی فقہِ اسلامی کے لئے کوئی نامانوس تصور ہے، البتہ یہ اصطلاح جدید ضرور ہے۔

۴۔ کمپنی کو مطلقاً ناجائز کہنے والوں کی چوتھی دلیل یہ ذکر کی گئی ہے کہ کمپنی کی ایک خصوصیت محدود ذمہ داری (Limited Liability) ہے، جس کا مطلب ذمہ داری کا محدود ہونا ہے، جسکی تشریح یوں کی گئی ہے، کہ حاملانِ حصص کی ذمہ داری ان کے لگائے ہوئے سرمایہ کی حد تک محدود ہوتی ہے، یعنی اگر کمپنی خسارے میں گئی تو ان کا زیادہ سے زیادہ نقصان یہ ہوگا کہ ان کا لگایا ہوا سرمایہ ڈوب جائے گا، اگر کمپنی پر قرض زیادہ ہوگیا تو حاملین حصص سے ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ کا مطالبہ نہیں ہوگا، محدود ذمہ داری کے اس تصور کی روایتی فقہ اور شرکت میں کوئی نظیر دکھائی نہیں دیتی، یہ بات بھی شرکت کے جواز کے لئے مانع ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حاملین حصص (شیئر ہولڈرز) کی محدود ذمہ داری کی شرعی نقطۂ نظر سے ایک نظیر موجود ہے، وہ یہ کہ فقہ اسلامی میں مضاربت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ جب تک رب المال مضارب کو دوسروں سے قرض لینے کی اجازت نہ دے، رب المال کی ذمہ داری اس کے سرمایہ تک محدود رہتی ہے، لہذا اگر رب المال نے مضارب کو سرمایہ دیا اور مزید سرمایہ قرض لینے کی اجازت نہیں دی، پھر کاروبار کے نتیجہ میں مضارب پر دیون واجب ہوگئے تو اس صورت میں رب المال کا زیادہ سے زیادہ اسکے سرمایہ کی حد تک نقصان ہوگا، اس سے زیادہ کا رب المال سے مطالبہ نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس سے زیادہ کا ذمہ دار مضارب ہوگا، کیونکہ اس نے رب المال کی اجازت کے بغیر دیون (قرضے) واجب کئے ہیں، اس

لئے وہی ان کا ذمہ دار ہے[1]۔ بالکل یہی صورتِ حال کمپنی کے ایسے حاملینِ حصص (شیئرز ہولڈر) کی بھی ہوگی جو خود عملی تجارت میں شریک نہ ہوں، تو ان کی ذمہ داری محدود ہونے کی شرط مضاربت کے اوپر بیان کردہ اصول پر صحیح ہوگی۔

البتہ یہاں ایک شبہ ہو سکتا ہے وہ یہ کہ عموماً کمپنیوں کے پراسپکٹس (Prospectus) میں یہ بات مندرجہ ہوتی ہے کہ کمپنی بوقت ضرورت بینکوں وغیرہ سے قرضے لے گی، اور حاملینِ حصص کو اس بات کا عموماً علم بھی ہوتا ہے، کیونکہ وہ پراسپکٹس کو دیکھ کر کمپنی کے حصہ دار بنتے ہیں لہٰذا انکی طرف سے قرضہ لینے کی ایک طرح سے معنوی اجازت پائی گئی، اور جب رب المال مضارب کو قرضہ کی اجازت دیدے تو اسکی ذمہ داری محدود نہیں رہتی، لہٰذا کمپنی کے حاملینِ حصص کی ذمہ داری بھی محدود نہیں ہونی چاہیے؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ پراسپکٹس میں یہ بات بھی درج ہوتی ہے کہ شیئر ہولڈرز کی ذمہ داری محدود ہوگی، جس کا مطلب یہ ہے کہ حصہ داروں کی طرف سے کمپنی کو قرضہ لینے کی اجازت اس شرط کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہم پر ان قرضوں کی ذمہ داری لگائے ہوئے سرمایے سے زیادہ نہ ہو، لہٰذا اسکی صحیح نظیر یہ ہے کہ رب المال مضارب کو اس شرط کے ساتھ قرضہ لینے کی اجازت دے کہ اسکی ذمہ داری وہ خود برداشت کرے۔

لیکن یہاں شرعی نقطۂ نظر سے ایک اشکال یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ مضارب میں رب المال کی ذمہ داری تو محدود ہوتی ہے، مگر مضارب کی ذمہ داری محدود نہیں ہوتی، لہٰذا دائنین (قرض دہندگان) رب المال کے سرمایے سے زائد دیون مضارب سے وصول کر سکتے ہیں، چنانچہ مضاربت میں دائنین کا ذمہ خراب (خراب الذمہ) نہیں ہوتا، یعنی وہ اپنا سرمایہ اب رب المال کے بجائے مضارب سے لے سکتے ہیں، اس کے برخلاف کمپنی میں ڈائرکٹران (جو مضارب کی مانند

---

(۱) الكاسانی، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع (٦:٩٠): وأما القسم الذی ليس للمضارب أن يعمله إلا بالتنصيص عليه فی المضاربة المطلقة فليس له أن يستدين على مال المضاربة، ولو استدان لم يجز على رب المال، ويكون دينا على المضارب فی ماله إلخ، النووی، (الحافظ أبو زكريا) محی الدين بن شرف النووی، شرح المهذب المسمى بالمجموع، دار الفكر، بيروت۔(٤:٣٧٦)، و مالك، مالك بن انس الأصبحی، رواته الإمام سحنون التنوخی، المدونة الكبرى، دار الكتب العلميه، بيروت۔(٤:٦٤)، والكاسانی، علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتيب الشرائع (٦:٩٢)۔

ہیں) کی ذمہ داری بھی محدود ہے، اور خود کمپنی جو شخصِ قانونی ہے اسکی ذمہ داری بھی محدود ہے، جسکا نتیجہ یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثوں سے زائد دائنین کا جو دین ہوگا، اسکی وصولیابی کی کوئی صورت نہیں ہے، اس وجہ سے دائنین کا ذمہ خراب ہو جائے گا، ذمہ خراب ہونا (خراب الذمہ) فقہاء کرام کی ایک اصطلاح ہے، جسکا مطلب یہ ہے کہ دائنین کا دین ادا ہونے کی کوئی صورت نہ رہے، اُسی اشکال کی بناء پر بعض علماء عصر کی رائے یہ ہے کہ محدود ذمہ داری کا تصور شرعاً صحیح نہیں ہے، اسلئے کہ اس سے لوگوں کے حقوق ضائع ہوتے ہیں، کم از کم ڈائرکٹران کی ذمہ داری غیر محدود ہونی چاہیے۔

لیکن اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس مسئلہ کو دوسرے زاویے سے دیکھا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ کمپنی کی محدود ذمہ داری کے تصور کی بنیاد دراصل شخصِ قانونی کے تصور پر ہے، شخصِ قانونی کو حقیقت ماننے کے بعد محدود ذمہ داری کو ماننا مشکل نہیں رہتا، اگر کوئی حقیقی شخص مفلس (دیوالیہ) ہو جائے تو دائنین صرف اس کے اثاثوں کو وصول کرسکتے ہیں، اگر اس کے تمام اثاثے ختم ہو جائیں اور قرضے ختم نہ ہوں تو اس سے زیادہ کا اس سے مطالبہ نہیں کیا جائے گا، جب تک کہ وہ خوشحال نہ ہو جائے، کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ﴾ (۱)

اور اگر تنگدست ہو تو مہلت دینے کا حکم ہے آسودگی تک۔ (بیان القرآن)۔

اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے ایک صحابی کو مفلس (دیوالیہ) قرار دینے کے بعد دائنین سے فرمایا تھا:

,,خذو ما وجدتم ليس لكم إلا ذلك،، (۲)

یعنی جو کچھ تمہیں مل جائے وہ لے لو، اس سے زائد تمہارا حق نہیں ہے۔

---

(۱) سورة البقرة، الآيه: ۲۸۰۔ (تفسير بيان القرآن ص:۷۱)۔

(۲) عن أبي سعيد الخدريؓ قال: أصيب رجل في عهد رسول الله ﷺ في ثمار ابتاعها، فكثر دينه، فقال رسول الله ﷺ: تصدقوا عليه، فتصدق الناس عليه، فلم يبلغ ذلك وفاء دينه، فقال رسول الله ﷺ: خذوا ما وجدتم ليس لكم إلا ذلك، رواه ابو داؤد في البيوع باب وضع الحاجة رقم: ۳٤٦۹، والترمذي، (أبو عيسىٰ محمد بن عيسى بن سورة الترمذي ۱۱۹۸-۱۲۵۲) جامع السنن، دار الفكر بيروت، في الزكاة، باب ما جاء في من تحل الصدقه من الغارمين وغيرهم۔

البتہ اگر وہ دوبارہ غنی ہو جائے تو پھر اس سے مطالبہ کیا جاسکتا ہے، لیکن اگر مفلس ہونے کی حالت میں اسکی موت واقع ہو جائے تو قرض خواہوں کے دیون ادا ہونے کی کوئی صورت نہیں رہتی[۱]، معلوم ہوا کہ اگر شخص حقیقی مفلس ہو کر مر جائے تو اسکی ذمہ داری اثاثوں تک محدود ہوتی ہے، اور دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے۔ لہذا جب کمپنی کو بھی شخص حکمی مان لیا گیا ہے تو یہ بھی اگر دیوالیہ ہو کر تحلیل ہو جائے تو اسکی ذمہ داری بھی اثاثوں تک محدود ہونی چاہیے، اس لئے کہ کمپنی کی تحلیل ہونا ہی اس شخص کی قانونی موت ہے، لہذا اسکا حکم بھی ایسے شخص حقیقی کی طرح ہونا چاہیے جو مفلس ہو کر مر جائے، خصوصاً جبکہ کمپنی کے ساتھ عقد کرنے والا یہ دیکھ کر معاملہ کرتا ہے کہ یہ کمپنی لمیٹڈ ہے، اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسکا حق صرف اثاثوں کی حد تک محدود ہوگا، یہی وجہ ہے کہ لمیٹڈ کمپنی کے ساتھ لمیٹڈ لکھنا ضروری ہوتا ہے، پھر کمپنی کی بیلنس شیٹ (میزانیہ، Balance Sheet) بھی شائع ہوتی رہتی ہے، قرض دینے والا بیلنس شیٹ کے ذریعے سے کمپنی کا مالی استحکام دیکھ کر قرضہ دیتا ہے، غرض یہ کہ جو شخص بھی کمپنی کے ساتھ دین یا قرض کا کوئی معاملہ کرتا ہے وہ مکمل بصیرت کے ساتھ کرتا ہے، اور اسمیں کسی قسم کا دھوکہ یا فراڈ نہیں ہوتا، لہذا محدود ذمہ داری کے تصور کی وجہ سے شرکت کو فاسد نہیں کہا جاسکتا، یہی موجودہ دور کے بہت سے علماء کرام کی رائے ہے۔

لمیٹڈ کمپنی کی فقہی نظیر:

فقہ اسلامی میں لمیٹڈ کمپنی کی ایک نہایت دلچسپ نظیر موجود ہے، جو لمیٹڈ کمپنی کے کافی قریب ہے، وہ عبد ماذون فی

(۱) ابن قدامة المقدسی (أبو محمد) عبد اللّٰہ بن أحمد بن محمد ،المغنی، مکتبة الریاض السعودیة (٤:٤٩٤و٤٩٥)۔

الشرح الصغیر علی اقرب المسالك (٣:٣٦٠)۔

مجلة الأحکام العدلیه،جماعة العلماء،نور محمد کتب خانه، کراچی(م:٩٩٩)۔

بنوری، محمد یوسف، معارف السنن، مکتبه العربیة الاسلامیه، کراچی۔(٥:٢٦٤)۔

الرملی: محمد بن احمد ١٠٠٤ھ، نهایة المحتاج،بیروت، احیاء التراث العربی (٤:٣١٠)۔

و الشامی ،محمد امین الشهیر بابن عابدین، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ،مطبعة الحلبی مصر ١٣٨٦ھ (٤:٥٦٤،٦:١٥٦)۔

التجارہ ہے، عبد ماذون فی التجارۃ ایسے غلام کو کہتے ہیں جسے آقا کی طرف سے تجارت کرنے کی اجازت دی گئی ہو، یہ غلام آقا کی ملکیت ہوتا ہے، اور آقا کی طرف سے تجارت کرتا ہے، اور یہ جو بھی تجارت کرتا ہے، وہ بھی آقا کی ملکیت ہوتی ہے، اس پر اگر کچھ دیون واجب ہوں تو وہ اس غلام کی قیمت کی حد تک محدود ہوتے ہیں، اس سے زیادہ کا نہ غلام سے مطالبہ ہو سکتا ہے اور نہ آقا سے[1]، یہاں بھی دائنین کا ذمہ خراب ہو گیا، یہ نظیر لمیٹڈ کمپنی سے زیادہ قریب اس لئے ہے کہ جس طرح کمپنی میں شیئر ہولڈرز کے زندہ ہوتے ہوئے ذمہ خراب ہو جاتا ہے، اسی طرح یہاں بھی آقا کے زندہ ہونے کی حالت میں دائنین کا ذمہ خراب ہو جاتا ہے۔

۵۔ کمپنی کو مطلقاً ناجائز کہنے والوں کی پانچویں دلیل یہ ذکر کی گئی ہے کہ روایتی شرکت میں یہ ضروری ہے کہ اگر کوئی شریک مر جائے یا پاگل ہو جائے یا اسے تصرفات قولیہ وفعلیہ سے روک دیا جائے یا کوئی شریک عقد شرکت فسخ کر دے تو پوری شرکت فسخ ہو جاتی ہے، اس کے برعکس کمپنی میں کسی بھی شریک کی طرف سے ان حالات کے پائے جانے کے وقت کمپنی کا کاروبار فسخ یا ختم نہیں ہوتا، بلکہ وہ ہمیشہ کی طرح جاری رہتا ہے یہ بھی شرکت کے روایتی تصور کے خلاف ہے[2]، لیکن ان حضرات کی یہ دلیل بھی بظاہر صحیح نہیں ہے، کیونکہ ہم پیچھے دوسرے باب کے ذیلی عنوان ,,فسخِ شرکت اور اس کے بنیادی اصول،، کے تحت اس پر بحث کر کے یہ کہہ چکے ہیں کہ اگر شرکت میں کئی شرکاء ہوں اور ان میں سے ایک شرکت کو اختیاری طور پر یا جبری طور پر مثلاً موت، پاگل پن، یا مجور ہونے کی وجہ سے فسخ کر دے تو بقیہ شرکاء کی شرکت فسخ نہیں ہوتی، اور ایسے موقعہ پر الگ ہونے والے شریک کے سرمایہ کی واپسی کا طریقہ یہ ہے کہ یا تو بقیہ شرکاء اس

---

(۱) الکاسانی،علاء الدین ابو بکر بن مسعود، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (۷:۲۰۳،۲۰۴)۔

ابن نجیم،(الشیخ) زین الدین، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۷۹۲ ایچ ایم سعید کمپنی ۱۳۸۹ھ (۸:۹٤،۹٥،۹٦)۔

ابن الهمام ،فتح القدیر ۷٦۷ المکتبة الرشیدیة کوئٹه (۸:۲۲۲)۔

و الشامی ،محمد امین الشهیر بابن عابدین، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ،مطبعة الحلبی مصر ۱۳۸٦ھ (٥ـ٤١٦) کتاب القاضی۔

(۲) مجمع الفقه الاسلامی ،مجلة مجمع الفقه الاسلامی ،العدد السادس الجزء الثانی (ص:۱۳٤٤) بحث الدکتور علی احمد السالوس۔

کا حصہ خرید کر اسے رقم دیدیں، یا وہ اپنا حصہ کسی نئے شریک کو فروخت کر دے، اور یہی صورت حال کمپنی میں بھی ہے، لہذا یہی طریقہ کار اس میں بھی جاری ہوگا، اس وجہ سے کمپنی کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا۔

یہانتک کمپنی کے جواز یا عدم جواز سے متعلق اصولی مسائل ذکر کئے گئے، اب ذیل میں دوسری بحث یعنی کمپنی کے جزوی مسائل سے بحث کی جائے گی۔

شیئرز کی شرعی حیثیت اور انکی خرید و فروخت

موجودہ دور میں جوائنٹ اسٹاک کمپنی (joint Stock Company) کے حصص (شیئرز Shares) کی خرید وفروخت کا نیا مسئلہ وجود میں آیا ہے، اور اسکی بنیاد پر دنیا بھر میں اسٹاک مارکیٹیں (Stock Exchenge) میں روزانہ لاکھوں، اربوں روپے کی تجارت ہوتی رہتی ہے، لہذا انکی شرعی حیثیت اور انکی خرید فروخت کا حکم معلوم ہونا بہت ضروری ہے۔

لیکن سب سے پہلے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ شیئرز (Shares) کی حقیقت کیا ہے؟ کمپنی کے شیئرز کو اردو میں "حصص" سے تعبیر کرتے ہیں، اور عربی میں اسکو "سہم" کہتے ہیں، یہ شیئرز در حقیقت کسی کمپنی کے اثاثوں میں شیئر رکھنے والے (Share holders) کی ملکیت کے ایک متناسب حصہ کی نمائندگی کرتا ہے، مثلاً اگر میں کسی کمپنی کا شیئر خرید تا ہوں تو وہ شیئر سرٹیفکیٹ اس کمپنی میں میری ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، لہذا اب میں کمپنی کے اثاثے اور املاک کے متناسب حصے کا ان شیئرز کی خریداری کے نتیجے میں مالک بن گیا۔

بعض معاصر علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ یہ شیئر کمپنی کی اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی نہیں کرتا ہے، بلکہ یہ صرف اس بات کا ایک دستاویزی ثبوت ہے کہ اس شخص نے اتنی رقم کمپنی کو دے رکھی ہے، جیسے دیگر قرضوں کی دستاویزات مثلاً بانڈز اور ڈبینچر ز ہوتے ہیں، بانڈز اور شیئرز میں ان کے نزدیک صرف اتنا فرق ہے کہ بانڈز پر معین شرح سے سود ملتا ہے، جبکہ شیئر پر سود کی شرح متعین نہیں ہوتی، بلکہ کمپنی کو حاصل شدہ نفع کا ایک متناسب حصہ

اسکو دیدیا جاتا ہے، ان حضرات کی دلیل یہ ہے کہ اگر شیئر کمپنی کے اثاثوں میں ملکیت کی نمائندگی کرنے والا ہوتا تو شیئر ہولڈر کے دیوالیہ ہونے کی صورت میں جس طرح اس شخص کے دوسرے اموال اور املاک کی قرقی ہوتی ہے اسی طرح کمپنی میں اسکی متناسب ملکیت کی بھی قرقی ہونی چاہیے، مگر ایسا نہیں ہوتا، لہذا معلوم ہوا کہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈر کی ملکیت نہیں ہوتی۔

اس نقطہ نگاہ سے نہ شیئر لینا جائز ہے اور نہ کم و بیش پر اسکی آگے خرید و فروخت جائز ہے، اور چونکہ شیئر ہولڈر کی اثاثوں میں ملکیت نہیں لہذا انکے نزدیک ان میں زکاۃ بھی واجب نہیں۔

لیکن کمپنی کے ظاہری تصور کے اعتبار سے اور اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں انکی روشنی میں اگر غور کیا جائے تو یہ نقطہ نظر صحیح نہیں بلکہ حقیقت یہی ہے کہ شیئر ہولڈر کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر باہمی قرارداد سے کمپنی تحلیل ہو جائے، تو شیئر ہولڈرز کو صرف انکی لگی ہوئی رقم واپس نہیں ملتی، بلکہ کمپنی کے اثاثوں کا متناسب حصہ ہر شیئر ہولڈر کو دیا جاتا ہے، جبکہ دوسری مالی دستاویزات مثلاً بانڈز وغیرہ پر کمپنی کے تحلیل ہونے کی صورت میں صرف لگی ہوئی رقم بمعہ سود واپس دی جاتی ہے، جس سے معلوم ہوا کہ شیئرز قرضے کی شہادت یا دستاویز نہیں ہیں بلکہ یہ کمپنی کے اثاثوں میں شیئر ہولڈرز کی متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں۔

جہاں تک شیئر ہولڈرز کی متناسب ملکیت کے قائل نہ ہونے والے حضرات کی دلیل کا تعلق ہے، اسکا جواب یہ ہے کہ کمپنی کی تحلیل سے پہلے کمپنی ایک شخصِ قانونی ہے، اس کا الگ وجود ہے، اور حصہ داران کا الگ وجود ہے، لہذا قانون کی رو سے اگر کوئی حامل حصص مقروض ہو اور اسکے اثاثے قُرق کیے جائیں تو جو شیئرز اس کے ہاتھ میں ہیں یا اس کے پاس جو اموال ہیں وہ قُرق ہوں گے، البتہ اسکے شیئرز کے تناسب سے کمپنی کے اثاثوں میں سے اسکا جو حصہ بنتا ہے، وہ قُرق نہیں ہوگا، اس لئے کہ کمپنی کے بنیادی تصور کے مطابق کمپنی کے اثاثے تحلیل سے پہلے قابل تقسیم نہیں ہوتے اس کے بجائے شیئر ہولڈر کو یہ اختیار ہوتا ہے کہ وہ اپنا حصہ کسی دوسرے کو فروخت یا منتقل کردے جو اس کا قائم مقام ہو جائے، لیکن قانون کی رو سے اسکو اس کمپنی کے اثاثوں پر تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

شیئرز کی حقیقت واضح ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ شیئرز اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں ہیں، بلکہ اسکی پشت پر

موجود املاک اور اثاثے اصل چیز ہیں، لہذا شیئرز کی خرید و فروخت دراصل کمپنی کے اثاثوں میں سے متناسب ملکیت کی خرید و فروخت ہے، اور کمپنی کے اثاثے مختلف صورتوں میں ہوتے ہیں، نقد، قابل وصول دیون، جامد اثاثے، سامان تجارت وغیرہ، اور ہر قسم میں شیئر ہولڈرز کا متناسب حصہ ہوتا ہے، لہذا شیئرز کی فروختگی کا مطلب یہ ہے کہ بیچنے والا نقد، دیون، جامد اثاثوں اور اموال تجارت میں سے ہر چیز میں سے اپنی متناسب ملکیت کو فرخت کررہا ہے، شیئرز کی خرید و فروخت کی اس حیثیت کے مطابق یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ شیئرز کی خرید و فروخت کے دو مرحلے ہوتے ہیں، ہر مرحلے کا حکم جدا ہے۔

پہلا مرحلہ شیئرز کے اجراء کے وقت خرید و فروخت:

جب کوئی کمپنی وجود میں آتی ہے تو پہلے وہ اپنا لائحۂ عمل اور خاکہ (Prospectus) شائع کرتی ہے، اور اپنے شیئرز جاری (Float) کرتی ہے، اور شیئرز جاری کرنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کمپنی لوگوں کو اس کمپنی میں حصہ دار بننے کی دعوت دے رہی ہے۔ پھر جو شخص بھی ان شیئرز کو خریدتا ہے، وہ درحقیقت اس کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن رہا ہے، اور اس کمپنی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کررہا ہے، اگرچہ عرفِ عام میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے شیئرز خریدے لیکن شرعی اعتبار سے وہ خرید و فروخت نہیں ہے، بلکہ اس نے جب سرمایہ دے کر وہ شیئرز حاصل (Subscribe) کئے، تو اس کے نتیجہ میں اسے کوئی سامان نہیں مل رہا ہے، اس لئے کہ کمپنی نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا ہے، اور نہ ہی اب تک کمپنی کی املاک اور اثاثے وجود میں آتے ہیں، بلکہ کمپنی تو اب بن رہی ہے، لہذا جس طرح ابتداء سے دو چار افراد مل کر روپے جمع کر کے کاروبار شروع کرتے ہیں، اسی طرح کمپنی ابتداء میں لوگوں کو اس بات کی دعوت دیتی ہے کہ تم اس کاروبار میں ہمارے ساتھ شریک بن جاؤ، لہذا جو شخص اس وقت میں شیئرز حاصل کررہا ہے وہ گویا کہ شرکت کا معاملہ کررہا ہے، اب شرکت کا معاملہ کرنے کے نتیجہ میں اسکو جو شیئرز سرٹیفکیٹس حاصل ہوئے وہ درحقیقت اس شخص کی اس کمپنی میں متناسب (Proportionate) حصہ کی ملکیت کی نمائندگی کرہے ہیں، لہذا جب کسی کمپنی کے شیئرز ابتدا میں جاری (Issue) ہورہے ہوں اس وقت ان شیئرز کو ایک شرط کے ساتھ خریدنا جائز ہے، وہ یہ کہ جس کمپنی کے شیئرز جاری کئے جارہے ہیں وہ کوئی حرام کاروبار شروع

نہ کر رہی ہو، لہذا اگر کسی حرام کاروبار کے لئے وہ کمپنی قائم کی جارہی ہو مثلاً شراب بنانے کی فیکڑی قائم کرنے کے لئے، سودی کاروبار کے لئے یا مروجہ انشورنس کے کاروبار کے لئے کمپنی قائم کی جارہی ہو تو ان کے شیئرز کسی حال میں بھی لینا جائز نہیں ہے، لیکن اگر بنیادی طور پر حرام کاروبار نہ ہو بلکہ کسی حلال کاروبار کے لئے کمپنی قائم کرنے کیلیئے شیئرز جاری (Float) کئے جائیں مثال کے طور پر ٹیکسٹائل کمپنی یا آٹو موبائل کمپنی وغیرہ تو اس صورت میں اس قسم کی کمپنی کے شیئرز خریدنے میں کوئی قباحت نہیں ہے، اور جائز ہے۔

دوسرا مرحلہ شیئرز کے اجراء کے بعد خرید و فروخت:

جب ایک آدمی نے کسی نئی کمپنی کے شیئرز کے اجراء کے وقت ان شیئرز کو خرید لیا، تو اب وہ آدمی اس کمپنی میں حصہ دار بن گیا، لیکن عام طریق کار یہ ہے کہ شیئرز ہولڈر وقتاً فوقتاً اپنے شیئرز اسٹاک مارکیٹ میں خریدتے بیچتے رہتے ہیں، لہذا جب کمپنی قائم ہو گئی، اور ایک مرتبہ اس کمپنی کے تمام شیئرز سبسکرائب (Subscribe) ہو گئے، اس کے بعد جب اس کمپنی کے شیئرز کا اسٹاک مارکیٹ (Stock Markets) میں لین دین ہو گا تو وہ شرعاً حقیقت میں شیئرز کی خرید و فروخت ہے، مثال کے طور پر جب ابتدا میں کمپنی قائم ہوئی، اسوقت زید نے اس کے دس شیئرز حاصل کئے، اب وہ انکو اسٹاک مارکیٹ میں فروخت کرتا ہے، اب جو شخص وہ دس شیئرز اس سے خرید رہا ہے در حقیقت وہ زید کی ملکیت کے اس متناسب حصہ کو خرید رہا ہے، جو اسکا کمپنی کے اندر ہے، لہذا اس خرید و فروخت کے نتیجہ میں وہ شخص زید کی جگہ اس حصے کا مالک بن جائے گا، یہی شیئرز کی خرید و فروخت کی حقیقت ہے، البتہ اس طرح جس شخص کو شیئرز خریدنے ہوں اسے خریداری کے وقت مندرجہ ذیل چار شرائط کا لحاظ رکھنا ضروری ہو گا۔

خریداریٔ حصص (شیئرز) کے جواز کی شرائط

پہلی شرط:

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کمپنی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو، مثلاً وہ سودی بینک نہ ہو یا سود اور قمار پر مبنی انشورنس کمپنی

نہ ہو، شراب بنانے والی کمپنی نہ ہو، یا ان کے علاوہ دوسرے حرام کام کرنے والی کمپنی نہ ہو کیونکہ ایسی کمپنی کے شیئرز لینا کسی حال میں جائز نہیں، نہ ابتداء میں جاری (Float) ہونے کے وقت لینا جائز ہے، اور نہ بعد میں اسٹاک مارکیٹ (Stock Exchange) سے خریدنا جائز ہے۔[1]

دوسری شرط:

شیئرز کو اگر قیمت اسمیہ (Face/ Par Value) پر فروخت کیا جائے، تو اس دوسری شرط کی ضرورت نہیں ہے، البتہ اگر شیئرز کی کم وبیش پر خرید وفروخت کی جائے تو پھر اس کے جواز کے لئے یہ شرط ہے کہ کمپنی کے تمام اثاثے اور املاک سیال اثاثوں (Liquid Assets) یعنی نقد رقم یا دیون کی شکل میں نہ ہوں، بلکہ اس کمپنی نے کچھ جامد اثاثے (Fixed Assets) حاصل کر لئے ہوں، مثلاً اس نے بلڈنگ بنالی ہو، یا زمین خرید لی ہو، لہٰذا اگر اس کمپنی کے کوئی جامد اثاثے (Fixed Assets) وجود میں نہیں آتے، بلکہ تمام اثاثے ابھی سیال (Liquid Assets) یعنی نقد رقم یا دیون کی شکل میں ہوں تو اس صورت میں اس کمپنی کے شیئرز کو قیمت اسمیہ (Face/ Par Value) سے کم وبیش (Above Par or Bleow Par) میں فروخت کرنا جائز نہیں، بلکہ برابر سرابر قیمت پر خرید وفروخت ضروری ہے۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ جتنے لوگوں نے اس کمپنی میں اپنی رقم لگائی (Subscribe) ہے، اس رقم سے ابھی تک کوئی جامد اثاثہ نہیں خریدا گیا، بلکہ ابھی تک وہ تمام روپے نقد شکل میں ہیں، تو اس صورت میں شیئر صرف نقد کی نمائندگی کر رہا ہے، مثلاً دس روپے کا شیئر دس روپے کی نمائندگی کر رہا ہے، اگر اس کو گیارہ یا نو روپے میں فروخت کیا جائے گا تو دس روپے کی فروخت گیارہ یا نو روپے کے ساتھ ہوئی، جو سود ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز ہے۔

لیکن اگر کمپنی کے کچھ اثاثے منجمد (Fixed Assets) شکل میں ہیں مثلاً اس رقم سے کمپنی نے خام مال (Raw Material) خرید لیا، یا کوئی تیار مال (Produced goods) خرید لیا، یا بلڈنگ یا مشینری حاصل کر لی، تو اس صورت میں دس روپے کے شیئر کو کمی یا زیادتی پر فروخت کرنا جائز ہے۔

اس کے جائز ہونے کی وجہ ایک فقہی اصول ہے، جسے فقہی اصطلاح میں مُدّ عَجوہ، منطقہ مفضضہ یا سیفِ محلّٰی کے

(۱) مجمع الفقه الاسلامی جده، قرارات الدورةالسابعة، مجلة الفقه الاسلامی العدد السابع الجزء الاول (ص:۷۱۱)

عنوان سے بھی تعبیر کرتے ہیں، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی چیز مال ربوی اور مال غیر ربوی سے مرکب ہو، اور اسے خالص مال ربوی سے فروخت کیا جائے مثلاً سونے کے ایک ہار میں موتی بھی لگے ہوئے ہیں تو اس میں موتی غیر ربوی اور سونا ربوی چیز ہے، اگر اسکی خرید و فروخت صرف سونے سے کی جائے تو اس کا حکم کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے:

۱۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ جب تک مال مرکب سے خالص سونے کو الگ نہ کیا جائے یہ خرید و فروخت صحیح نہیں ہے۔

۲۔ امام ابو حنیفہؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور امام احمدؒ کی ایک روایت کے مطابق یہ خرید و فروخت جائز ہے، البتہ ایک شرط ہے وہ یہ کہ تنہا مال ربوی مرکب مال ربوی میں شامل ربوی مال سے زیادہ ہونا چاہیے، تاکہ مال ربوی کے مقابلے میں مال ربوی ہو جائے، اور زائد ربوی مال، مال مرکب کے غیر ربوی مال کے بدلے ہو جائے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس ہار میں ایک تولہ سونا ہے، اور کچھ موتی لگے ہوئے ہیں، اب اگر کوئی شخص اس ہار کو خریدنا چاہے تو اسکی صورت یہ ہے کہ اس ہار میں جتنا سونا ہے، اس سے تھوڑا سا زیادہ سونا دے کر خریدے، لہذا اس ہار کو ایک تولہ اور ایک رتی سونے کے عوض خریدے تو اسکی یہ خریداری شرعاً صحیح ہوگی، اس لئے کہ یہ کہا جائے گا کہ ایک تولہ سونا تو ایک تولے سونے کے عوض میں ہو گیا، اور ایک رتی سونا موتیوں کے مقابلہ میں آگیا، اس طرح معاملہ درست ہو گیا۔[1]

۳۔ البتہ موجودہ دور کے بعض شافعی اور حنبلی علماء کرام کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر مال مخلوط یا مرکب میں اکثر مال ربوی ہو تو اسکی خالص مال ربوی سے خرید و فروخت ناجائز ہے، لیکن اگر مخلوط میں غیر ربوی مال زیادہ ہو اور مال ربوی کم ہو تو

---

(۱) المغنی (٦: ٩٣/٩٢) فصل: وإن باع شيئا فيه الربا بعضه ببعض ومعها او مع أحدهما من غير جنسه كمد ودرهم بمد ودرهم، او بمدين او بدرهمين، أو باع شيئا ملحى بجنس حليته، فهذه المسألة تسمى مسألة مدعجوه وُالمذهب انه لا يجوز ذلك، نص على ذلك أحمد فى مواضع كثيره، وذكره قد ماء الأصحاب، وعن أحمد رواية أخرى تدل على أنه يجوز لشرط أن يكون المفرد اكثر من الذى معه غيره، أى يكون مع كل واحد منهما من غير جنسه، وقال حماد بن أبى سليمان وأبو حنيفه: يجوز هذا كله إذا كان المفرد أكثر من الذى معه غيره أو كان مع كل واحد منهما من غير جنسه وقال الحسن: لا بأس ببيع السيف المحلى بالفضه بالدراهم وبه قال الشعبى والنخعى۔

خالص مال ربوی سے فروختگی جائز ہے۔

کمپنی کے شیئرز کو کمی یا زیادتی کے ساتھ فروخت کرنا بالکل مدعجوہ کے اوپر ذکر کردہ مسئلہ کی طرح ہے، کیونکہ اگر کمپنی کے کچھ اثاثے نقد اور دیون کی شکل میں ہوں اور کچھ اثاثے جامد (Fixed) شکل میں ہوں، گویا کہ کمپنی کے تمام اثاثے نقد اور جامد سے مرکب ہیں، اور انہیں خالص مال ربوی یعنی روپیہ سے فروخت کیا جائے تو اس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں مندرجہ بالا اختلاف کے مطابق حکم لگایا جائے گا۔

اب اس بات کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھئے فرض کریں کہ ایک کمپنی نے سو روپے کے شیئرز جاری کئے اور دس آدمیوں نے وہ شیئرز خرید لئے، ایک شیئر دس روپے کا تھا، ہر شخص نے دس دس روپے کمپنی کو دے کر وہ شیئر حاصل کر لئے، اس کے بعد کمپنی نے ابھی تک اس رقم سے کوئی سامان نہیں خریدا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دس شیئرز جو

(گذشتہ سے پیوستہ)

فیروز آبادی، امام علی بن یوسف فیروز آبادی، شیرازی، المهذب فی فقه الامام الشافعی، مطبعه عیسی البابی الحلبی مصر۔ (۲۸۰:۱) وما حرم فیها لربا لا یجوز بیع بعضه ببعض أو مع أحد العوضین جنس آخر یخالفه فی القیمة کبیع ثوب ودراهم أو مد عجوة ودرهم بدرهمین۔

بهوتی، منصور بن یونس البهوتی ۱۰۴٦ھ، منتهی الارادات، دار الفکر، بیروت۔ (۱۹۸:۲) ولا یصح بیع (ربوی جنسه ومعهما) أی العوض (أو) مع أحدهما من غیر جنسهما کمد عجوة ودرهم بمثلهما، أی بمد عجوة ودرهم، ولو أن المدین والدرهمین من نوع واحد (أو) بیع مد عجوة ودرهم (بمدین) من عجوة، (أو بدرهمین) وکبیع محلی بذهب بذهب أو محلی بفضة بفضة وتسمی مسألة مد عجوة لأنه مثلث بذلك، ونص علی عدم جوازها إلخ۔

وفی المبسوط للسرخسی: وإن یعلم أن الفضة فی الحلیة أقل جاز العقد علی أن یجعل المثل بالمثل، والباقی بإزاء الجفن والحمائل عندنا إلخ (۵/۱۴)۔

مراجع إضافیه: مغنی المحتاج (۲۸:۲) مختصر الفتاوی لابن تیمیه (ص:۳۲۹) أسنی المطالب (۲۵:۲) مجموع فتاوی ابن تیمیه (۴۵۷:۹) والاختیارات الفقهیة من فتاوی ابن تیمیه (ص:۱۲۸)۔

سو روپے کے ہیں وہ سو روپے کی نمائندگی کر رہے ہیں، لہٰذا اگر فرض کریں کہ ایک شخص زید کے پاس ایک شیئر ہے، اور وہ اسکو دس کے بجائے گیارہ روپے میں فروخت کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لئے ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے دس روپے دے کر گیارہ روپے لے لئے، کیونکہ کمپنی نے ابھی تک اس رقم سے کوئی چیز نہیں خریدی ہے، بلکہ ابھی تک وہ رقم نقد شکل میں اس کے پاس موجود ہے، لیکن اگر کمپنی نے یہ کیا کہ جب اس کے پاس سو روپے آئے تو مثلاً چالیس روپے کی بلڈنگ خریدلی، بیس روپے کی مشینری، اور بیس روپے کا خام مال خرید لیا، اور دس روپے نقد موجود ہیں اور دس روپے لوگوں کے ذمہ مال فروخت کرنے کی وجہ سے واجب الاداء ہوگئے، اسی بات کو نقشہ سے سمجھ لیں۔

کمپنی کی کل رقم	=	۱۰۰ روپے							
واجب الوصول قرضے	+	بلڈنگ	+	مشینری	+	مال	+	نقد	
۱۰ روپے	+	۴۰ روپے	+	۲۰ روپے	+	۲۰ روپے	+	۱۰ روپے	= ۱۰۰

اب اس صورت میں کمپنی کے اثاثے پانچ حصوں میں تقسیم ہوگئے اب زید کے پاس جو دس روپے کا شیئر ہے وہ اسی تناسب سے تقسیم ہو جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ زید کے پاس جو دس روپے کا شیئر ہے اس میں سے ایک روپیہ واجب الوصول قرضہ کے مقابل ہے، ایک روپیہ نقد کے مقابل ہے، چار روپے بلڈنگ کے اور دو روپے مشنری کے مقابل ہیں، اور دو روپے خام مال کے مقابل ہیں، اب اگر زید دس روپے کا شیئر بارہ روپے میں فروخت کرنا چاہے تو اس کے لئے جائز ہے، اس لئے کہ اسکو فروخت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زید نے ایک روپیہ میں ایک روپے کا قرضہ فروخت کیا، ایک روپیہ نقد ایک روپے کے عوض میں فروخت کیا، اور باقی دس روپے کے عوض دوسری چیزیں فروخت کیں، اس طرح زید کا یہ سودا درست ہوگیا، اس لئے کہ زید جو نفع لے رہا ہے وہ نقد اور قرض کے مقابلہ میں نہیں بلکہ وہ دوسری اشیاء پر نفع لے رہا ہے، اور ان پر نفع لینا جائز ہے۔

لیکن اگر کسی وقت نقد رقم اور واجب الوصول قرضہ دس روپے سے زیادہ ہو جائے تو اس صورت میں زید کے لئے دس روپے کا شیئر دس سے کم یعنی نو روپے میں فروخت کرنا جائز نہیں ہوگا، مثلاً فرض کیجئے کمپنی نے ترقی کی اور واجب الوصول قرضہ سو روپے ہوگیا، اور سو روپے نقد ہوگئے، چالیس روپے کی بلڈنگ پچیس روپے کا مال، بیس روپے کی مشینری، اس طرح کمپنی کے کل اثاثوں کی مالیت = ۲۸۰/ روپے ہوگئی اور ایک شیئر کی بریک اپ ویلیو (Breakup Value)

اب =/۲۸ روپے ہو گئی، مندرجہ ذیل نقشہ سے اسے سمجھیں:

کمپنی کی موجودہ کل مالیت			۲۸۰ روپے	
ایک شیئر کی موجودہ قیمت			۲۸ روپے	
بلڈنگ	مشنری	خام مال	نقد	واجب الوصول قرضے
۴۰ روپے	۲۰ روپے	۲۰ روپے	۱۰۰ روپے	۱۰۰ روپے

اس صورت میں اگر زید اپنا شیئر فروخت کرنا چاہتا ہے تو =/۲۱ روپے سے کم میں اس کے لئے فروخت کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ اب دس روپے ان قرضوں کے مقابلہ میں ہوں گے، جو لوگوں کے ذمہ واجب الاداء ہیں، اور دس روپے نقد، دس روپے کے مقابلہ میں ہوں گے، اور ایک روپیہ دوسرے اثاثوں کے مقابلہ میں ہو جائے گا، اس طرح یہ معاملہ درست ہو جائے گا، لہٰذا اگر زید نے اس شیئر کو =/۲۱ روپے کے بجائے =/۱۹ روپے میں فروخت کیا تو یہ اس کے لئے جائز نہیں، اسلئے کہ یہ تو ۲۰ روپے ۱۹ روپے کے عوض فروخت کرنے کی مانند ہو گیا، جو کہ سود ہے۔

لہٰذا جب تک کمپنی نے اثاثے نہیں خریدے بلکہ تمام رقم ابھی تک نقد شکل میں ہے یا واجب الوصول قرض کی (Recievable) شکل میں ہے، اس وقت تک اس کمپنی کے شیئرز کو کمی یا زیادتی (Above or Par value) کے ساتھ فروخت کرنا جائز نہیں بلکہ قیمت اسمیہ (Face value) پر خرید و فروخت کرنا ضروری ہو گا۔

اسی وجہ سے جس کمپنی کا ابھی تک وجود نہیں ہوا ہے، لیکن اسٹاک مارکیٹ میں اس کے شیئرز کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے، جیسے عارضی مندرج کمپنی (Provisionally Listed Company) ہوتی ہے، اور عام طور پر اس کمپنی کا ابھی تک وجود بھی نہیں ہوتا، ایسی کمپنی کے شیئرز کو بھی کمی زیادتی پر فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔

مذکورہ بالا یہ سارا حکم احناف کے نزدیک ہے، امام شافعیؒ کے قدیم مذہب کے مطابق اگرچہ یہ فروختگی صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان کے نزدیک نقود اور غیر نقود سے مرکب مال کو خالص نقود سے بیچنا جائز نہیں ہے، ان کو الگ الگ کر کے فروخت کرنا ہو گا، البتہ موجودہ دور کے بعض شافعی اور حنبلی فقہاء کرام کا موقف یہ ہے کہ اگر مال مرکب میں اکثر مال ربوی ہو اور مال غیر ربوی کم ہو تو اسکو خالص مال ربوی سے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، لہٰذا ان کے موقف کے مطابق

پہلے کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لینا ہوگا، اگر کمپنی کے جامد اثاثے زیادہ ہیں، اور نقود کم ہیں تو شیئرز کی خرید و فروخت کمی بیشی کے ساتھ بھی جائز ہوگی، موجودہ دور کے علمائے عرب اسی پر فتوی دے رہے ہیں، چنانچہ مسلمان ممالک کی تنظیم آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (O.I.C) کے ذیلی ادارے ,,اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ،، کے علماء کرام نے یہی فتوی دیا ہے، اس کے چوتھے اجلاس کی قراردادوں میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ:

,,إذا صار مال القراض موجودات مختلطة من النقود والديون والاعيان والمنافع فإنه يجوز تداول، صكوك المقارضة وفقا للسعر المتراضى عليه، على أن يكون الغالب نقودا فى هذه الحالة أعيانا ومنافع،،[۱]

جب مضاربہ (یا مشارکہ) کے اثاثے نقود، دیون، اشیاء اور منافع سے مخلوط ہوں تو اگر نقود غالب ہوں تو ان کے سرٹیفکیٹس کی خرید و فروخت جس قیمت پر متعاقدین راضی ہوں جائز ہے۔

اسکی رُو سے ان کے نزدیک شیئرز سرٹیفکیٹس خریدنے سے قبل کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لینا ضروری ہوگا، کہ نقود زیادہ ہیں یا غیر نقود زیادہ ہیں، اگر غیر نقود زیادہ ہیں تو شیئرز کی فروختگی کمی بیشی کے ساتھ بھی جائز ہوگی۔

تیسری شرط:

تیسری شرط سمجھنے سے پہلے اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ آج جتنی کمپنیاں اس وقت قائم ہیں ان میں سے اکثر کمپنیاں ایسی ہیں کہ ان کا بنیادی کاروبار تو حرام نہیں ہے، مثلاً ٹیکسٹائل کمپنیاں یا آٹو موبائل (Automobile) کمپنیاں وغیرہ، لیکن شاید ہی کوئی کمپنی ایسی ہوگی جو کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو، یہ کمپنیاں دو طرح سے سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کیلئے بینک سے سود پر قرض لیتی ہیں اور اس قرض سے اپنا کام چلاتی ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کے پاس جو زائد اور فاضل (Surplus) رقم ہوتی ہے، وہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی

---

(۱) مجمع الفقه الاسلامى جده، القرارات مجمع الفقه الاسلامى العدد الرابع الجزء الثالث (ص:۲۱۶۲)۔

ہیں، اور اس پر وہ بینک سے سود حاصل کرتی ہیں، وہ سود بھی انکی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں ایسی کمپنی کے شیئرز خریدوں جو کسی بھی طریقے سے کسی سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو تو موجودہ دور میں یہ بہت مشکل ہے، اب سوال یہ ہے کہ ایسی کمپنیوں کے شیئرز خریدنا اور بیچنا جائز ہے یا نہیں؟۔

ایسی کمپنیوں کے بارے میں موجودہ دور کے علماء کرام کی رائیں مختلف ہیں، علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ چونکہ کمپنیاں حرام کاموں میں ملوث ہیں اب چاہے تناسب کے لحاظ سے وہ حرام کام تھوڑا ہے لیکن چونکہ حرام کام کر رہی ہیں، لہٰذا ایک مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اس کمپنی کے ساتھ حرام کام میں حصہ دار بنے، اس لئے کہ جب اس نے شیئر خرید لیا تو وہ اس کے کاروبار میں شریک ہو گیا، اور کاروبار کا ایک شریک دوسرے شریک کا وکیل اور ایجنٹ ہے، اب گویا کہ شیئرز ہولڈر انکو اس کام کے لئے ایجنٹ بنا رہا ہے کہ تم سودی قرضے لو، اور سودی آمدنی بھی حاصل کرو، اس لئے ان علماء کے نزدیک کسی کمپنی کے شیئرز اس وقت تک خریدنا جائز نہیں جب تک یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ کمپنی نہ سود لیتی ہے اور نہ سود دیتی ہے، چنانچہ شیخ تقی الدین النبھانی [1]، اور قطر یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر علی احمد السالوس کی یہی رائے ہے۔ [2]

علماء کرام کی دوسری جماعت کی رائے یہ ہے کہ اگرچہ ان کمپنیوں میں یہ خرابی پائی جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے، تو پھر دو شرطوں کے ساتھ اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے، برصغیر ہندوپاک کے علماء میں سے حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی

---

(۱) النبھانی ،الشیخ تقی الدین ، الشرکات فی الفقہ الإسلامی (ص:۱٤۲)، والشریکات فی الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الوضیعی للاستاذ الدکتور عبد العزیز الخیاط (۲:۱۸۸)۔

(۲) مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی العدد السادس الجزء الثانی (ص:۱۳٤٤)، بحث الدکتور علی احمد السالوس فی حکم أعمال البورصہ فی الفقہ الاسلامی، وبحث الدکتور علی القرہ الداغی فی مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی العدد السابع الجزء الأول (ص:۱۰۰)۔ (٤۰)

محمد شفیعؒ اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم وغیرہم کی یہی رائے ہے[۱]، اور علماء عرب میں سے اکثر علماء مثلاً علی الخفیف، ابو زہرة، عبد الوہاب خلاف، عبد الرحمٰن حسن، عبد العزیز الخیاط، وہبۃ الزحیلی، القاضی عبد اللہ سلیمان بن منیع اور الدکتور علی محی الدین قرداغی کا یہی مسلک ہے۔[۲]

البتہ وہ دو شرطیں جن کے ساتھ ان شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہوگی وہ یہ ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ وہ شیئرز ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اٹھائے، اگرچہ اسکی آواز مسترد (Over rule) ہو جائے، اور آواز اٹھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ کمپنی کی سالانہ میٹنگ جسے (Annoual General Meeting) کہا جاتا ہے، اس میں یہ آواز اٹھائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے، سودی لین دین پر راضی نہیں ہیں، اس لئے اس کو بند کیا جائے، اب ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں یہ آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو گی، اور موجودہ حالات میں غالبا یہ آواز مسترد (Over rule) کر دی جائے گی، لیکن جب وہ یہ آواز اٹھائے تو حضرت تھانویؒ کے قول کے مطابق ایسی صورت میں وہ انسان اپنی ذمہ داری پوری ادا کر دیتا ہے۔[۳]

چوتھی شرط:

چوتھی شرط جو درحقیقت تیسری شرط کا ایک حصہ ہے وہ یہ ہے کہ جب منافع (Dividend) تقسیم ہو، تو وہ

---

(۱) عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، فقهی مقالات، میمن اسلامك پبلیکشنز، کراچی۔ (۱:۱۵۰)، الشركات: للشيخ على الخفيف (ص:۹۶و۹۷)، بحث الشيخ أبي زهرة المنشور فی منشورات المؤتمر الثانی لمجمع البحوث الاسلاميه (۲:۱۸٤)الخياط،عبد العزيز عزت الشركات فی الشريعة الإسلامية والقانون الوضيعی ایضا دار النهضة العربية بيروت ۱٤۰۷ (۲:۱۸۷)، وبحث الدكتور وهبة الزحيلی، المقدم لمجمع الفقه الاسلامی فی دورته السادسة، (ص:۵)، والدكتور صالح بن زابن المرجع السابق (ص:۳٤۲)، وبحث القاضی عبد الله بن سليمان المنيع: المرجع السابق۔

(۲) دیکھیے:۔ بحوث مجلة مجمع الفقه العدد السابع، الجزء الأول (ص:۱۰۰)، بحث الدكتور علی القره داغی۔

(۳) تهانوی، مولانا اشرف علی، امداد الفتاوی، مکتبه دارالعلوم کراچی (۳:٤٦٤)۔

شخص انکم اسٹیٹ منٹ (Income Statment) کے ذریعے یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈیپازٹ (Deposit) سے حاصل ہوا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس کمپنی کو کل آمدنی کا پانچ فیصد حصہ سودی ڈیپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے، تو اب وہ شخص اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کر دے۔

لہٰذا کمپنی کا اصل کاروبار اگر حلال ہو، لیکن ساتھ میں وہ کمپنی بینک سے سود قرضے لیتی ہے، یا اپنی زائد رقم سودی اکاؤنٹ میں رکھ کر اس پر سود وصول کرتی ہے تو اس صورت میں اگر ان مذکورہ بالا دو شرطوں پر عمل کر لیا جائے تو پھر ایسی کمپنیوں کے شیئرز کی خرید و فروخت کی گنجائش ہے، اور یہ موقف نہ صرف اسلامی اصولوں کے مطابق ہے بلکہ لوگوں کے لئے سہولت پیدا کرتا ہے۔

علامہ ابن نجیم حنفیؒ فرماتے ہیں:

,,إذا كان غالب مال المهدى حلالا فلا بأس بقبول هديته وأكل ماله ما لم تبين أنه حرام، وإن كان غالب ماله الحرام لا يقبلها، ولا يأكل إلا إذا قال: إنه حلال ورثه أو استقرضه،،[1]

اگر یہ ہدیہ دینے والے کا اکثر مال حلال ہو تو اس کے ہدیہ قبول کرنے یا اس کی دعوت کھانے میں کوئی حرج نہیں جب تک یہ ظاہر نہ ہو کہ وہ حرام ہے، البتہ اگر اس کا اکثر مال حرام ہو تو اسے قبول نہ کرے، اور اسے نہ کھائے، الا یہ کہ جب وہ کہے کہ یہ حلال مال ہے، کیونکہ یہ اسے وراثت میں ملا ہے یا اس نے قرض لیا ہے۔

(۱) ابن نجیم، الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن کراچی (ص:۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴)۔ وشامی، حاشیہ ابن عابدین (۴۔۱۳۰)۔

اسی طرح مشہور حنفی عالم علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

،، کل شيء أفسده الحرام، والغالب على الحلال فلا بأس ببيعه،،[۱]

یعنی ہر وہ چیز جسے حرام ناجائز اور فاسد کر دیتی ہے، اگر اس میں غالب اور اکثریت حلال کی ہو تو اس کی خرید فروخت میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ اوپر کی تفصیل سے یہ معلوم ہو گیا کہ شیئرز کی خرید و فروخت کے جواز کے لئے کل چار شرطیں ہیں:

۱۔ اصل کاروبار حلال ہو۔

۲۔ قیمت اسمیہ (Face Value) سے کم وبیش بیچنے کی صورت میں یہ ضروری ہے کہ اس کمپنی کے کچھ منجمد اثاثے (Fixed Assets) وجود میں آچکے ہوں رقم صرف نقد شکل میں نہ ہو۔

۳۔ اگر کمپنی سودی لین دین بھی کرتی ہو تو اسکی سالانہ میٹنگ میں آواز اٹھائی جائے۔

۴۔ جب منافع تقسیم ہو، اس وقت نفع کا جتنا حصہ سودی ڈیپازٹ (Seposit) سے حاصل ہوا ہو، اسکو صدقہ کردے۔

ان چار شرطوں کے ساتھ شیئرز کی خرید و فروخت جائز ہے۔

شیئرز خریدنے کے دو مقاصد:

۱۔شرکت یا تجارت (Capital gain)

آج کل اسٹاک مارکیٹ (Stock Exchange) میں شیئرز کے سودے دو مقاصد کے تحت ہوتے ہیں، بعض لوگ سرمایہ کاری (Investment) کی غرض سے خریدتے ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم شیئرز خرید کر کسی کمپنی کے حصہ دار بن جائیں، اور پھر گھر بیٹھے اسکا سالانہ یا ماہانہ منافع ملتا رہے، اس کی تفصیل تو پیچھے ذکر کر دی گئی ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے چار شرطوں کے ساتھ شیئرز خریدنا جائز ہے۔

---

(۱) الكاساني،علاء الدين ابو بكر بن مسعود، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع (١٤٤:٦)۔

دوسری طرف بعض لوگ شیئرز کی خرید و فروخت سرمایہ کاری (Investment) کی غرض سے نہیں کرتے، بلکہ ان کا مقصد تجارت (Capital gain) ہوتا ہے، وہ اس بات کا اندازہ لگاتے ہیں کہ کس کمپنی کے شیئرز کی قیمت میں اضافہ ہونے کا امکان ہے، جس کی قیمت میں اضافہ ہونے کا امکان ہوتا ہے، اس کے شیئرز خرید لیتے ہیں، چنانچہ اگر چند روز بعد قیمت بڑھ جائے تو انہیں فروخت کر کے نفع کما لیتے ہیں، یا اسی طرح کسی کمپنی کے شیئرز کی قیمت گھٹ جاتی ہے تو اس کے شیئرز خرید لیتے ہیں، اور بعد میں انہیں فروخت کر دیتے ہیں، اس طرح خرید و فروخت کے ذریعے نفع حاصل کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے، اس کمپنی میں حصہ دار بننا اور اسکا سالانہ منافع حاصل کرنا مقصود نہیں ہوتا، بلکہ خود شیئرز کو ہی سامان تجارت بنا کر اس کا لین دین کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ شرعاً اس طریقہ کار کی کہاں تک گنجائش ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اسمیں بھی دو نقطہائے نظر ہیں، فقہ خصوصاً فقہ المعاملات میں مہارت رکھنے والے عالم اسلام کے معروف عالم شیخ صدیق محمد الأمین الضریر کی رائے یہ ہے کہ اس طریقہ کار کی بنیاد محض تخمینہ اور قیاس آرائیوں پر ہے، جس کو سٹہ (Speculation) کہا جاتا ہے، اس لئے یہ جائز نہیں ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ قیاس آرائیوں کی بنیاد پر خرید و فروخت کی اجازت دینا سٹہ بازی کا راستہ کھولنا ہے[1]، ان کے یہاں شیئرز خریدنا صرف اس صورت میں جائز ہوگا، جب کہ خریدار کمپنی کے نفع و نقصان میں شریک ہو کر سرمایہ کاری کے لئے خرید رہا ہو، انکی یہ رائے خود انہی کی مندرجہ ذیل عبارت سے بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

والمقصود الأصل من الاشتراك فی شركات المساهمه، ومن شراء الأسهم هو اقتناء تلك الأسهم للاستفادة من ريعها، وهو أمر مقبول شرعا، أما المتاجرة فی الأسهم بمعنى اتخاذ الاسهم نفسها سلعة تباع وتشترى ابتغاء الربح فقط من غير قصد إلى اقتناء الأسهم والمشاركة فی الشركة كما هو حادث فی الأسواق المالية فإن الحكم عليه محل الخلاف بين

(۱) مجمع الفقه الاسلامی جده، مجلة ، المناقشات، العدد السادس، الجزء الأول (ص:۵۷۶،۵۷۷)۔

الفقهاء والمعاصرين، وأنا أميل فيه إلى المنع[1]۔

اگر کمپنی کے شیئرز خریدنے کا مقصد اصلی کمپنی میں حصہ دار بنکر اس سے نفع حاصل کرنا ہو تو یہ شرعی طور پر مقبول ہے، لیکن شیئرز کی اس طرح تجارت کرنا کہ انہیں بذات خود سامانِ تجارت کی طرح خرید و فروخت کر کے نفع کمانا، اور شیئرز کے ذریعہ کمپنی کے کاروبار میں حصہ داری اور شرکت مقصود نہ ہونا جیسا کہ عموماً آج کل کی اسٹاک مارکیٹ میں معمول ہے، تو اس کے جواز یا عدم جواز کے بارے میں موجودہ دور کے علماء کے مابین اختلاف ہے، اور میرا رجحان عدم جواز کی طرف ہے۔

اور دوسرا نقطہ نظر موجودہ دور کے اکثر علماءِ عرب وغیر عرب کا ہے، کہ اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ سابقہ ذکر کردہ شرائط پوری طرح پائی جائیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ اصولی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اصل سوال یہ نہیں ہے کہ خریدار کس ارادے اور کس نیت سے خرید رہا ہے؟ بلکہ اصل سوال یہ ہے کہ شیئرز فی نفسہ خرید و فروخت کے قابل ہیں یا نہیں؟ جب یہ بات تسلیم کرلی گئی کہ شیئرز بیع و شراء کے قابل ہیں تو شیئرز کی خرید و فروخت دراصل کمپنی کے اثاثوں میں متناسب حصہ کی بیع ہے، لہذا یہ خرید و فروخت جائز ہوگی، خواہ کسی بھی نیت سے ہو، خواہ شیئرز اپنے پاس رکھ کر سرمایہ کاری کے لئے ہو یا قیمت بڑھنے پر بیچ کر نفع کمانے کے لئے ہو، کسی چیز کو خرید و فروخت کے قابل مان کر محض نیت کی بنیاد پر جواز و عدم جواز کی کوئی فقہی بنیاد نہیں ہے، البتہ بیع و شراء کی شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، اور ان شرائط کی رعایت رکھنے سے سٹہ بازی کا سدباب خود ہی ہو جائے گا[2]، یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ تخمین و قیاس آرائی جسکو Speculation کہا جاتا ہے، بذات خود حرام ہے، یہ بات غلط ہے۔

تخمین یا (Speculation) یہ ہے کہ یہ اندازہ لگایا جائے کہ کس چیز کو خرید کر بیچنے سے نفع حاصل ہونے کی امید

---

(۱) مجمع الفقه الاسلامی ، بحث الدكتور الصديق محمد الامين الضرير، الاستاذ فی كلية القانون خرطوم یونیورسٹی، مجلة مجمع الفقه الاسلامی العدد السابع الجزء الأول (ص: ۲۷۰)۔

(۲) عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، میمن اسلامک پبلیکشنز، کراچی۔ (۲: ۱۵۲)۔

ہے، یہ بات بذاتِ خود ممنوع نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ہر تجارت میں ہوتا ہے،، اسے کوئی بھی ناجائز نہیں کہتا، بلکہ جو بات ممنوع ہے وہ یہ ہے کہ خرید و فروخت کی شرعی شرائط کی رعایت نہ کی جائے، مثلاً ایسی چیز کی بیع کی جائے جو ابھی اپنی ملکیت میں نہیں آئی، یا ابھی اس پر قبضہ حاصل نہیں ہوا، اگر تنہا ایسی شرط کی رعایت کرلی جائے تو حصص کی خرید و فروخت میں مروجہ سٹہ کی خرابیاں پیدا نہیں ہوسکتیں، اسی طرح یہ ضروری ہے کہ حصص کی خرید و فروخت میں قمار کی صورت پیدا نہ ہو، قمار دو باتوں سے مل کر بنتا ہے، ایک یہ کہ ایک طرف سے ادائیگی متعین ہو، اور دوسری طرف سے موہوم ہو، دوسری بات یہ ہے کہ جس طرف سے ادائیگی ہوگئی ہے اس کی رقم دو باتوں میں دائر ہو یا تو یہ رقم خود بھی ڈوب جائے گی، یا اور رقم کو کھینچ کر لائے گی۔

اس تفصیل کی روشنی میں شیئرز کی بیع و شراء کے جزئیات پر غور کیا جائے تو درج ذیل مسائل سامنے آتے ہیں:

۱۔ پہلے یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ بعض کمپنیوں کے وجود میں آنے سے قبل ہی اسٹاک ایکسچینج میں انکی لسٹنگ (Listing) ہوجاتی ہے، ایسی (Provisionally Listed) کمپنیوں کے شیئرز کی بیع و شراء قیمت اسمیہ سے کم و بیش پر جائز نہیں، اس لئے کہ شیئرز کی بیع دراصل کمپنی کے اثاثوں کی بیع ہوتی ہے، اور یہاں ابھی کمپنی کی ملکیت میں اثاثے وجود میں نہیں آئے، لہذا یہ غیر مملوک کی بیع ہوجائے گی، جو جائز نہیں ہے، عملاً ایسے شیئرز کی خرید فروخت اسٹاک ایکسچینج میں ہوتی ہے، چنانچہ ایسی بھی مثالیں موجود ہیں کہ ایک کمپنی کے وجود میں آنے سے پہلے ہی اس کے دس روپے کا شیئرز ۱۶۰ روپے میں فروخت ہوا۔

۲۔ شیئرز کی ایسی بیع و شراء کہ جس میں شیئر لینا دینا مقصود نہ ہو، محض نفع نقصان برابر کر کے نفع کمانا مقصود ہو یہ بھی جائز نہیں ہے، آج کل اسٹاک ایکسچینج میں ایک بہت بڑا کاروبار اسی قسم کا ہوتا ہے، اس میں شیئرز کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا، بلکہ آخر میں جاکر آپس کا فرق (Difference) برابر کر لیا جاتا ہے، اور شیئرز پر نہ تو قبضہ (Delivery) ہوتا ہے، اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے، یہ صورت بالکل حرام ہے، اور شریعت میں اسکی اجازت نہیں ہے۔

غائب سودے جن میں بیع کی اضافت مستقبل کی طرف کی جاتی ہے وہ بھی شرعاً جائز نہیں، اس لئے کہ بیع کی وقتِ

مستقبل کی طرف اضافت یا تعلیق باتفاق فقہاء ناجائز ہے، البتہ مستقبل میں بیع کا وعدہ کیا جاسکتا ہے لیکن وقت آنے پر بیع باقاعدہ کرنی ہوگی۔

۳۔ شیئرز کی ڈلیوری سے پہلے آگے فروخت کرنا:

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایک شخص شیئرز خرید لیتا ہے لیکن ابھی تک ان شیئرز پر قبضہ (Delivery) نہیں ہوا، اس سے پہلے وہ ان شیئرز کو آگے فروخت کردیتا ہے، عام طور پر شیئرز کی خریداری کے بعد حاضر سودوں میں بھی ڈلیوری ملنے میں کم از کم ایک ہفتہ ضرور لگ جاتا ہے، اب سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح قبضہ اور ڈلیوری ملنے سے پہلے ان کو آگے فروخت کرنا جائز ہے یا نہیں؟

اس سلسلے میں اسلامی فقہ کے اس اصول کو ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ کسی چیز کو خریدنے کے بعد اس چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں ہے، لیکن قبضہ کے اندر ہمیشہ حسی قبضہ (Physical Possession) ضروری نہیں ہے، بلکہ حکمی قبضہ (Constructive Possession) بھی اگر ہوجائے، یعنی وہ چیز ہمارے ضمان (Risk) میں آجائے تو اس کے بعد بھی اس چیز کو آگے فروخت کرنا جائز ہے، اب سوال یہ ہے کہ شیئرز میں کس قسم کا قبضہ معتبر ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات پہلے بھی عرض کی جاچکی ہے کہ شیئرز درحقیقت کمپنی کی املاک میں متناسب حصہ داری کا نام ہے، اور شیئر سرٹیفکیٹ درحقیقت اس حصہ داری کا تحریری ثبوت ہے، لہٰذا فروخت شدہ چیز (مبیع) درحقیقت وہ تحریری سرٹیفکیٹ نہیں ہیں بلکہ کمپنی کی املاک کا ایک مشاع حصہ ہے، یہ مشاع حصہ بیع کی تکمیل ہوتے ہی مشتری کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، چونکہ وہ حصہ مشاع ہے اس لئے اس پر حسی قبضہ تو ہو نہیں سکتا، لہٰذا اس میں حکمی قبضہ ہی معتبر ہونا چاہیے، اب دو صورتیں ہیں یا تو یوں کہا جائے کہ حکمی قبضہ اس وقت ہوگا جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، یا پھر یوں کہا جائے کہ حکمی قبضہ اس وقت ہوگا جس وقت وہ مشاع حصہ مشتری کے ضمان میں آجائے یعنی اس حصے کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہوجائیں عام طور سے فقہی قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی شئے کا حسی قبضہ ابھی نہ ملا ہو، لیکن اس شے کے حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کو منتقل ہوچکی ہوں یعنی فقہی اصطلاح کے مطابق وہ چیز مشتری کے ضمان

(Risk) میں آچکی ہو تو اسکو آگے بیچنا جائز ہو جاتا ہے۔

اسٹاک ایکسچینج کے عمومی طریقۂ کار کے مطابق حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز کے تمام حقوق اور ذمہ داریاں خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں، وہ خریدار کے ضمان میں داخل ہو جاتے ہیں، چنانچہ حاضر سودا ہو جانے کے بعد شیئرز پر حسی قبضہ سے پہلے اگر کسی حادثہ کی نتیجہ میں کمپنی بالکل نیست و نابود ہو جائے تو نقصان خریدار (مشتری) کا سمجھا جاتا ہے، اسٹاک ایکسچینج بائع (فروخت کنندہ) کو پیسے دلوائیگا، ایسے ہی قبضہ سے پہلے نفع (Divedend) تقسیم ہو جائے خواہ کمپنی کے ریکارڈ میں ابھی تک فروخت کنندہ (بائع) کا نام ہی درج ہو اور وہ بائع کے نام نفع جاری کرے، لیکن کاروباری ضابطہ کی رو سے وہ اس بات کا پابند ہوگا کہ شیئرز کے ساتھ نفع بھی مشتری کو دے، ان باتوں سے معلوم ہوا کہ حسی قبضہ سے پہلے بھی وہ شیئرز خرید یعنی مشتری کے ضمان میں آچکے ہیں، اب جو بات باقی ہے وہ صرف یہ ہے کہ شیئرز کی ملکیت کا تحریری ثبوت مشتری (خریدار) کے پاس آجائے، اور محض اتنی بات کی بناء پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قبضہ نہیں ہوا، اس کا تقاضا یہ ہے کہ سرٹیفکیٹ کے ہاتھ میں آنے سے پہلے بھی شیئرز کی بیع جائز ہو، لیکن دوسری طرف اگر اس جانب نظر کی جائے کہ ہر چیز کا قبضہ کا طریقہ عرف سے متعین ہوتا ہے، اور عرف میں شیئر کا قبضہ اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب سرٹیفکیٹ ہاتھ میں آجائے، تو پھر عدم جواز کا حکم ہونا چاہیے بالخصوص جبکہ اس طرح سٹہ کے کاروبار کی حوصلہ افزائی بھی ہو سکتی ہے، لہذا ان متعارض جہات کی موجودگی میں احتیاط یہی ہے کہ سرٹیفکیٹ پر قبضہ کئے بغیر آگے بیع نہ کی جائے۔

شیئرز کا اجارہ یا ہبہ:

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیئرز کو کرایہ پر دینے یا ہبہ (Gift) کرنے کا کیا حکم ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ شیئرز کی حیثیت مُشاع (غیر تقسیم شدہ حصہ ء شرکت) کی ہے، اور مشاع کو ہبہ کرنے یا کرایہ پر دینے کی تفصیلی بحث اور حکم پیچھے دوسرے باب میں گذر چکا ہے، لہذا جو حکم مشاع کو ہبہ کرنے یا اسے کرایہ پر دینے کا ہے وہی شیئرز کو ہدیہ میں دینے اور کرایہ پر دینے کا بھی ہے، لہذا اس بحث کیلئے اس حصہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

شیئرز پر زکاۃ:

کمپنی پر بحیثیت کمپنی (جو شخصِ قانونی کی حیثیت رکھتی ہے) زکاۃ واجب نہیں ہے، اس کا مدار خلطۃ الشیوع کے مسئلہ پر ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

اس بارے میں فقہاء کرام کے درمیان کسی قسم کا اختلاف نہیں ہے کہ زکاۃ ادا کرنا ہر ایسے مسلمان پر فرض ہے جس کے پاس نصاب کے برابر قابلِ زکاۃ مال ہو اور اس پر سال گذر جائے، البتہ فقہاء کرام کے درمیان اس مسئلہ

میں اختلاف ہے کہ کچھ افراد کا مال مشترک ہو، اور انمیں سے ہر ایک کا حصہ نصاب زکاۃ تک نہ پہونچتا ہو، البتہ مجموعی لحاظ سے نصاب تک پہونچ جاتا ہو، تو آیا ایسے مال پر زکاۃ فرض ہے یا نہیں؟

اس بارے میں امام مالک اور امام احمدؒ کا مذہب یہ ہے کہ اگر مال مشترک مویشی ہوں تو اگر کل مویشی نصاب تک پہونچ گئے ہوں خواہ انفرادی طور پر نصاب تک نہ بھی پہونچے ہوں تو کل مال پر زکاۃ واجب ہے، البتہ اگر مال مشترک مویشی نہ ہوں بلکہ مثلاً نقود یا اجناس وغیرہ ہوں تو ان حضرات کے نزدیک مشترک مال پر زکاۃ واجب نہیں بلکہ انفرادی طور پر کسی شخص کا مال جب نصاب کے برابر پہونچ جائے تو اس پر زکاۃ واجب ہو جائے گی۔ (۱)

امام شافعیؒ کے نزدیک اگر مجموعی سرمایہ نصاب تک پہونچ گیا ہو تو اس مشترک مال پر زکاۃ فرض ہے، خواہ مال مشترک مویشیوں کے علاوہ ہو، اسکی وجہ یہ ہے کہ امام شافعیؒ کے یہاں تصریح ہے کہ خلطۃ الشیوع کا اعتبار صرف سوائم ہی میں نہیں اموال تجارت میں بھی ہوتا ہے، اس لئے ان کے یہاں کمپنی پر زکاۃ واجب ہوگی، اگرچہ کمپنی ایسا شخص نہیں جو مکلف ہو، کیونکہ شافعیہ کا اصول یہ ہے کہ زکوۃ انسان پر نہیں بلکہ اموال پر واجب ہوتی ہے حالانکہ وہ مکلف نہیں ہیں، لہذا انکے یہاں نابالغ کے مال میں بھی زکاۃ واجب ہوتی ہے، حالانکہ وہ مکلف نہیں، لہذا انکے یہاں کمپنی پر زکاۃ واجب ہے۔ (۲)

عہد حاضر کے بعض علماء کرام کا یہی موقف ہے کہ زکوۃ شرکت یا کمپنی پر واجب ہونی چاہیے، کیونکہ وہ ایک شخصِ قانونی کی شکل اختیار کر چکی ہے، لہذا اس کے لئے انسان کی مانند عاقل و بالغ اور مکلّف ہونے کی کوئی شرط نہیں ہے، یہ رائے ڈاکٹر مصطفیٰ کمال (۳) ڈاکٹر شوقی اسماعیل شحاتہ (۴) اور مولانا ابوالاعلی مودودی کی ہے (۵)۔

---

(۱) ابن قدامۃ المقدسی(أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد المغنی، مکتبۃ الریاض السعودیۃ۔ (۲:۶۰۷،۶۱۹)۔

(۲) فیروز آبادی، تقی الدین ابو بکر الحصنی، کفایۃ الأخیار فی حل غایۃ الاختصار، منشورات العصریہ، بیروت۔ (ص:۱۱۳)۔

(۳) الوجیز فی القانون التجاری (۱۹۲،۱۹۳)۔

(۴) مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی العدد الرابع الجزء الأول،(ص:۷۶۲)، التطبیق المعاصر للزکاۃ (۱۱۹)۔

(۵) فتاوی الزکاۃ للشیخ ابو الأعلی المودودی، (۱۸،۷۵،۸۱) وفقہ الزکاۃ للدکتور القرضاوی (۱:۵۲۸)۔

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ مال مشترک پر زکاۃ فرض نہیں ہوتی ہے بلکہ جو شخص بھی انفرادی طور پر صاحب نصاب ہو گیا اس پر زکاۃ واجب ہے، کیونکہ احناف کے نزدیک خلطۃ الشیوع کا اعتبار نہیں ہے، اور ان کے نزدیک زکاۃ انسان پر واجب ہوتی ہے، اس لئے حنفیہ کے نزدیک کمپنی پر بحیثیت شخصِ قانونی زکاۃ نہیں ہے، شیئر ہولڈرز پر زکاۃ واجب ہوگی، کیونکہ وہی اس کے حقیقی طور پر مالک ہیں، یہی مسلک برصغیر کے علماء کرام اور موجودہ دور کے بہت سے علماء عرب کا ہے، البتہ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ زکاۃ اگرچہ شیئر ہولڈر پر واجب ہوتی ہے لیکن اگر کسی کمپنی کے پراسپکٹس (Prospectus) یا اس کے سالانہ جنرل اجلاس (A.G.M) میں یا اس ملک کے قانون میں یہ بات طے کی گئی ہو کہ کمپنی صاحب نصاب شیئر ہولڈر کے سرمایہ سے زکاۃ ہر سال نکال دے گی، تو کمپنی اس کام کی مجاز ہے، یہ رائے علامہ ڈاکٹر صدیق محمد الامین الضریر اور دوسرے علماء کرام کی ہے، جس کے مطابق کویت کی اللجنۃ العلمیۃ کے زکاۃ کے موضوع پر پہلے اجلاس میں فتویٰ دیا گیا ہے، یہ اجلاس رجب ۱۴۰۴ھ بمطابق اپریل ۱۹۸۴ء کو منعقد کیا گیا تھا اور اس کے بعد مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے چوتھے اجلاس میں اسی پر متفقہ فتویٰ دیا گیا[1]، کمپنی کے زکاۃ ادا کرنے کا یا انفرادی طور پر کسی شریک کے زکاۃ ادا کرنے کا مفصل طریقہ مجمع الفقہ الاسلامی کی قرارداد نمبر (۲۸/۳/۴/) مورخہ ۲۳ جمادی الثانیہ ۱۴۰۸ھ میں ذکر کیا گیا ہے، یہ چونکہ ہمارے مقالے سے بہت زیادہ متعلق نہیں ہے، لہذا یہاں اس قرارداد کا متن ذکر نہیں کیا جارہا، اسے مجمع الفقہ الاسلامی کی قراردادوں کے ص:۸۰ (اردو ایڈیشن) یا مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

کیا شیئرز پر زکوۃ بازاری قیمت کے حساب سے دی جائے گی؟

۲۔ شیئرز پر زکاۃ کس طرح دی جائے گی؟ اس میں دو باتیں قابل غور ہیں، ایک یہ کہ شیئرز کی قیمتیں تین طرح کی ہیں۔

---

(۱) مجمع الفقه الاسلامی، مجلة مجمع الفقه الاسلامی، العددالرابع الجزء الأول (ص:٧٦٢،٧٦٣)۔

۱۔ قیمت اسمیہ (Face Value): سرٹیفکیٹ پر لکھی ہوئی قیمت۔

۲۔ بازاری قیمت (Market Value): وہ قیمت جس پر شیئرز بازار میں فروخت ہوتے ہیں۔

۳۔ بریک اپ ویلیو (Break Value): اگر کمپنی تحلیل ہو جائے تو ہر شیئر کے مقابلے میں کمپنی کے اثاثوں کا جو حصہ آئے گا وہ بریک اپ ویلیو ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا تین طرح کی قیمتوں میں سے کس حساب سے زکاۃ واجب ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی کمپنی کی بریک اپ ویلیو آسانی سے معلوم ہو سکتی ہو تو غالباً زکاۃ کے حساب کی بنیاد بننے کے لئے یہ سب سے زیادہ موزون ہے، لیکن بریک اپ ویلیو کا تعین بہت مشکل ہے، اور عوام الناس کے لئے یہ کام بہت زیادہ مشکل ہے، لہٰذا اس بات پر تمام علماء عصر کا اتفاق ہے کہ بازاری قیمت کا اعتبار ہوگا[1]، اس لئے کہ قیمت اسمیہ اگرچہ ابتداء میں سرمایہ لگاتے وقت تو حقیقت کی نمائندگی کرتی ہے، مگر جب سرمایہ کمپنی کے اثاثوں (Assets) میں بدل جائے گا تو پھر قیمت اسمیہ (Face Value) حقیقت کے زیادہ قریب نہ ہوگی، کیونکہ اثاثوں کی قیمت کم و بیش ہوتی رہتی ہے، بازاری قیمت (Market Value) میں اثاثوں کے علاوہ دوسرے عوامل اثر انداز ہوں تب بھی بازاری قیمت حقیقت کے زیادہ قریب ہے۔[2]

دوسری یہ بات قابل غور ہے کہ شیئر کمپنی کے تمام اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے، اور کمپنی کے بعض اثاثے قابل زکاۃ ہوتے ہیں جیسے نقود اور اموال تجارت وغیرہ، اور بعض قابل زکاۃ نہیں ہوتے جیسے بلڈنگ مشینری وغیرہ، شیئرز کی زکاۃ ادا کرتے ہوئے قابل زکاۃ یا نا قابل زکاۃ میں تفریق کی جائے گی یا نہیں؟

---

(۱) دیکھئے: مجمع الفقه الاسلامی، مجلة مجمع الفقه الاسلامی العدد الرابع الجزء الأول، القرارت (ص:۸۸۲)، وبحث الدكتور وهبة الزحيلي (ص:۷٤): لأنه قال: الخلاصة تجب زكاة الأسهم والسندات، ...... من قيمتها التجارية مع ربحها في نهاية كل عام، ورأى الشيخ عبد الرحمن عيسى (ص:۷۳٤)۔

(۲) عثمانی، مولانا محمد تقی، اسلام اور جدید تجارت و معیشت، ادارۃ المعارف، کراچی (ص:۹۳)۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس بارے میں فقہاء عصر کی آراء مختلف ہیں۔

شیخ عبدالرحمٰن عیسی کی رائے یہ ہے کہ شیئرز دو قسموں کے ہوتے ہیں [1]

۱۔ صنعتی یا سروسز کمپنیوں کے شیئرز (أسہم الشرکات الصناعیہ)۔

۲۔ تجارتی کمپنیوں کے شیئرز (أسہم الشرکات التجاریہ)۔

۱: صنعتی یا سروسز کمپنیاں جن کا مقصد سامان بیچنا نہیں ہوتا انکے شیئرز میں زکاۃ واجب نہیں ہوتی، مثلاً رنگ سازی کی کمپنی، ہوٹلوں کی کمپنی، گاڑیوں کی کمپنی، بری و بحری نقل و حمل کی کمپنی، اور ہوائی جہاز کی کمپنی وغیرہ، ان کمپنیوں کے شیئرز پر زکاۃ واجب نہیں، البتہ ان شیئرز سے جو نفع حاصل ہو اسے شیئرز ہولڈر کے مال میں شامل کر دیا جائے گا، پھر اگر وہ مال نصاب کے برابر پہونچ گیا تو زکاۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، ان کمپنیوں کے شیئرز میں زکاۃ واجب نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی قیمت آلات ادارے، بلڈنگوں وغیرہ کے مقابل ہے، جن میں زکاۃ واجب نہیں ہوتی۔

۲: ایسی تجارتی کمپنیاں جو سازوسامان خرید کر آگے فروخت کرتی ہیں، مثلاً درآمد و برآمد کا کاروبار (Business of Import and Export) کرتی ہیں، ملکی مصنوعات کی خرید و فروخت کی کمپنی، خام مال کے ذریعہ مصنوعات پیدا کر کے فروخت کرنے والی کمپنی وغیرہ، ان کے شیئرز میں زکاۃ واجب ہوتی ہے، کیونکہ وہ تجارتی کام کرتی ہیں، شیئرز کی بازاری قیمت میں سے تعمیرات، آلات اور جامد اثاثوں کو منہا کر کے زکاۃ ادا کی جائے گی۔

۳: ایسی کمپنیاں جو تجارتی اور صنعتی دونوں کام کرتی ہوں مثلاً شکر کی کمپنی پریس کی کمپنی کاروں اور ہوائی جہاز بنا کر فروخت کرنے کی کمپنیاں، ان کا حکم یہ ہے کہ ان کی بازاری قیمت (Market Value) کے مطابق بلڈنگ، سازوسامان

---

(۱) الشیخ عبد الرحمن عیسی ، المعاملات الحدیثه وأحکامها ،بحواله مجلة مجمع الفقه الاسلامی العددالرابع الجزء الأول (ص:۷۳۳)، وفقه الزکاة للقرضاوی (۲۳:۱) الدکتور خلیفه بابکر الحسن، بحوث ودراسات اسلامیه (ص:۱۰۱)۔

اور جامد اثاثوں کی قیمت منہا کر کے بقیہ قیمت پر زکاۃ واجب ہے۔[1]

مصر کے شیخ ابو زہرہ مرحوم کی رائے یہ ہے کہ شیئرز خود عروض تجارت بن چکے ہیں اس لئے انکی پوری بازاری قیمت (Market Value) پر زکاۃ ہوگی، اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ اس کے پیچھے کتنے اثاثے قابل زکاۃ ہیں، اور کتنے نا قابل زکاۃ ہیں؟[2]۔

تیسری رائے اکثر علماء عرب کی ہے اور اس کے مطابق مجمع الفقہ الاسلامی جدہ نے فتوی دیا ہے وہ یہ کہ اگر کمپنی یا حکومت کی طرف سے زکاۃ نکالنے کا کوئی ضابطہ نہ ہو تو ہر شخص انفرادی طور پر زکاۃ اسطرح نکالے گا کہ اگر کسی نے کمپنی کے منافع میں شرکت کے لئے شیئر خریدا ہے اور اس کے لئے کمپنی کے قابل زکاۃ اور نا قابل زکاۃ ہونے کی تحقیق ممکن ہو تو وہ تحقیق کر کے صرف قابل زکاۃ اثاثوں کی حد تک زکاۃ ادا کرے۔

مثلاً شیئرز کی بازاری قیمت سو روپے ہے جسمیں سے ساٹھ روپے بلڈنگ اور مشینری وغیرہ کے مقابلہ میں ہیں، اور چالیس روپے خام مال، تیار مال اور نقد روپے کے مقابلہ میں ہیں، تو اس صورت میں چونکہ ان شیئرز کے چالیس روپے قابل زکاۃ حصوں کے مقابلے میں ہیں، اس لئے چالیس روپے کی زکاۃ ڈھائی فیصد کے حساب سے واجب ہوگی، ساٹھ روپے کی زکاۃ واجب نہ ہوگی، نقشہ سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی۔

شیئرز کی بازاری قیمت		=			=/۱۰۰ روپے
نا قابل زکاۃ ۶۰۔ ۳۰+۳۰		قابل زکاۃ ۴۰۔ ۱۰+۱۵+۱۵			
بلڈنگ	مشینری	تیار مال	خام مال	نقد	کل اثاثے
=/۳۰	=/۳۰	=/۱۵	=/۱۵	=/۱۰	=/۱۰۰

(۱) مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی الدورۃ الرابعہ، العدد الرابع الجزء الأول (ص:۷۳۶)۔

(۲) مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی العدد الرابع الجزء الأول (ص:۷۳۶)، بحث الدکتور وھبۃ الزحیلی، مزید دیکھئے: بحث الدکتور الصدیق محمد الأمین الضریر (ص:۷۵۹) الاستاذ أبی زھرۃ التطبیق المعاصر للزکاۃ (ص:۱۱۲)۔

اور جو شخص مندرجہ بالا تحقیق نہ کر سکتا ہو تو اس کے بارے میں دو رائے ہیں علماء عرب اور مجمع الفقہ الاسلامی کے فتوے کے مطابق ان کا حکم نفع آور جائیداد کے جیسا ہوگا، چنانچہ اسلامی فقہ اکیڈمی کی قرارداد میں مذکور ہے کہ:

,, لیکن اگر حصہ دار کے لئے حسابات کا علم ممکن نہ ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ اگر اس نے کمپنی کے حصص صرف اس لئے حاصل کئے ہیں کہ وہ ان سے سالانہ نفع سے مستفید ہو اور اس کا مقصد ان سے شیئرز کی تجارت نہ ہو، تو اس صورت میں وہ اُن حصص کی زکاۃ نفع آور جائیداد کی زکاۃ کی طرح نکالے گا، اور مجمع الفقہ الاسلامی نے اپنے دوسرے اجلاس میں جائیدادوں اور کرایہ پر چڑھائی ہوئی غیر زرعی زمینوں کی زکاۃ کے بارے میں جو قرارداد طے کی تھی، اس کے مطابق اس حصہ دار (Share holder) پر اپنے اصل حصص پر زکاۃ نہیں ہوگی، بلکہ حصص کی آمدنی یا نفع پر زکاۃ ہوگی، یعنی آمدنی پر قبضہ کرنے کے دن سے ایک سال گذرنے پر چالیسواں حصہ واجب ہوگا بشرطیکہ زکاۃ کی شرائط موجود ہوں، اور موانع موجود نہ ہوں،،۔(۱)

البتہ بعض علماء کرام کی رائے کے مطابق جو شخص قابل زکاۃ اور نا قابل زکاۃ کی تحقیق نہ کر سکتا ہو تو وہ احتیاطاً پوری بازاری قیمت کی زکاۃ دیدے، یہ رائے حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم کی بھی ہے[۲]۔

اور اگر کسی شخص نے شیئرز تجارت کرنے (Capital gain) کے لئے اور آگے فروخت کر کے نفع کمانے کے لئے خریدے ہیں تو یہ عروض تجارت میں شمار ہونگے، اس لئے کہ گویا اس نے کمپنی کے اثاثوں کا ایک متناسب حصہ آگے بیچنے کے لئے خریدا ہے، اس لئے تمام قیمت پر زکاۃ واجب ہوگی، اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ کے متفقہ فتوے میں یہی بات اسطرح مذکور ہے:

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الاسلامی العددالرابع الجزء الأول (ص:۸۸۲)۔

(۲) عثمانی، مولانا محمد تقی، اسلام اور جدید معیشت وتجارت، ادارۃ المعارف، کراچی (ص:۹۳)۔

"اور اگر حصہ دار نے یہ حصص تجارت کی غرض سے حاصل کئے ہیں تو اسکی زکاۃ سامان تجارت کے اصول پر واجب ہوگی، چنانچہ ان حصص کی ملکیت میں رہنے کے دوران جب انکی زکاۃ کا سال آئے گا تو وہ انکی بازاری قیمت کی زکاۃ ادا کرے، اور اگر وہ حصص بازار میں قابل فروخت نہ ہوں تو انکی قیمت تجربہ کار افراد کے اندازے سے مقرر کی جائے، اور اس قیمت اور اگر ان پر کوئی نفع حاصل ہو تو اس نفع کا بھی ڈھائی فیصد نکالا جائے،،[۱]

کیا شیئرز کی زکوٰۃ میں کمپنی کے قرضے منہا کئے جائیں گے؟

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک فقہی اصول یہ ہے کہ کسی پر دیون (Dues) واجب ہوں تو دیون منہا کر کے بقیہ مال پر زکاۃ واجب ہوتی ہے، مگر یہ بات موجودہ دور میں بہت زیادہ قابل غور ہے کیونکہ اکثر بڑے بڑے سرمایہ داروں اور کمپنیوں نے بینکوں یا دیگر مالیاتی اداروں (Financing Corporations) سے قرضے لئے ہوتے ہیں اور انکے قرضے اتنے بھاری مقدار میں ہوتے ہیں کہ عموماً ان کے قرضے ان کے قابل زکاۃ سرمائے سے بڑھ جاتے ہیں، ایسی صورت میں اگر انکے قرضے منہا کئے جائیں گے تو نہ صرف یہ کہ اس اصول کی وجہ سے ان پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ بعض حالات میں وہ خود مستحق زکاۃ قرار پائیں گے، لہٰذا اس مسئلہ کا کیا حل ہے؟ آیا ایسے حضرات زکاۃ سے مستغنی ہیں؟ اور اگر مستغنی نہیں تو اسکی فقہی توجیہ کیا ہوگی؟ اس مسئلہ کے حل کے لئے مختلف حضرات نے مختلف حل تجویز فرمائے ہیں، بعض حضرات یہ تجویز دیتے ہیں کہ ایسی صورت میں مشینری پر زکاۃ واجب قرار دی جائے، لیکن یہ بات قابل تسلیم نہیں ہو

(۱) مجلة مجمع الفقه الاسلامی العددالرابع الجزء الأول (ص:۸۸۲) قرار داد نمبر (۴/۳/۲۸)۔

سکتی، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ مشینری کو مال زکاۃ قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ بات منصوص ہے۔

اس مسئلہ کا صحیح حل یہ ہے کہ زکاۃ سے دیون (Dues) کا مستثنیٰ ہونا فقہاء کے نزدیک متفق علیہ نہیں ہے، کیونکہ احناف اور حنابلہ کے نزدیک تو دیون مستثنیٰ ہوتے ہیں، لیکن شوافع کے نزدیک مستثنیٰ نہیں ہوتے، اور مالکیہ کے نزدیک اموال باطنہ (سونا چاندی) میں تو مستثنیٰ ہوتے ہیں، اموال ظاہرہ (کھیتی، مویشی، معدنیات) میں نہیں ہوتے[1]۔

حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی رائے اس مسئلہ کے حل میں یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ جو قرضہ لیا گیا ہے وہ کہاں صرف کیا گیا، اگر ان قرضوں سے ایسی چیزیں خریدی گئیں جو خود زکاۃ کے قابل ہیں تو یہ قرضے زکاۃ سے مستثنیٰ ہوں گے، اور اگر ان قرضوں سے ایسی چیزیں خریدی گئی ہیں جو زکاۃ کے قابل نہیں ہیں تو یہ قرضے زکاۃ سے مستثنیٰ نہ ہوں گے، آپ مندرجہ بالا رائے اپنی کتاب "اسلام اور جدید معیشت و تجارت" میں لکھتے ہوئے یہ تحریر فرماتے ہیں:[2]

> "یہ رائے قائم کرنے کے بعد حافظ ماردینیؒ کی کتاب الجوہر النقی میں نظر سے گذرا کہ امام مالکؒ کا قول بھی اس کے قریب قریب ہے[3]، وہ فرماتے ہیں:
>
> إن كان عنده عروض تفى بدينه عليه زكاة العين۔

---

(۱) مجلة مجمع الفقه الاسلامى العددالرابع الجزء الأول (ص:۸۸۲)قرار داد نمبر (۴/۳/۲۸)۔

(۱) حصكفى ،محمدعلاء الدين الحصكفى بن الشيخ على الإمام بجامع بنى أميه، الدر المختار شرح تنوير البصار مع رد المحتار (۲:۶)،وما بعدها ، الدردير: احمد بن محمد الدرديرى ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغير على اقرب المسالك (۶۴۷:۱، ۶۴۹)، القوانين الفقهية (ص:۹۹)، فيروز آبادى، امام على بن يوسف فيروز آبادى، شيرازى، المهذب فى فقه الامام الشافعى، مطبعه عيسى البابى الحلبى مصر۔(۱۴۲:۱)، النووى، (الحافظ أبو زكريا) محى الدين بن شرف النووى ،شرح المهذب المسمى بالمجموع ، دار الفكر، بيروت (۳۱۲:۵)، وما بعدها،زحيلى، الدكتور وهبه، الفقه الاسلامى وادلته ، بيروت، دارالقلم (۷۴۷:۲)، جزائرى: عبد الرحمن ،كتاب الفقه على المذاهب الاربعه، لاهور، محكمه اوقاف ۱۹۷۱ء(۶۰۲:۱،۶۰۵)۔

۲) عثمانى ، مولانا محمد تقى ،اسلام اور جديد تجارت و معيشت ، ادارة المعارف، كراچى(ص:۹۴)۔

۳) الجوهر النقى حاشية بيهقى (ص:۱۴۹)، باب الدين مع الصدقة۔

مشارکۃ متناقصہ اور اس کا شرعی حکم

ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن (.H.B.F.C) پاکستان کا وہ ادارہ ہے جو ہاؤس فنانسنگ یعنی گھر بنانے یا خریدنے کے لئے سرمایہ فراہم کرتا ہے، مغربی روایتی ادارے تو اس مقصد کے لئے سود پر قرضے دیتے ہیں اور مکان کو رہن رکھ لیتے ہیں، پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے ہاؤس فنانسنگ کے لئے جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک نئی قسم کا معاہدہ تھا جس کو شرکت متناقصہ (Decreasing Partnership) کہتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ تمویلی ادارے اور عمیل (Client) یعنی مکان کے خواہشمند شخص کے مشترک سرمایہ سے مکان خریدا یا بنایا جائیگا، دونوں کے درمیان اپنے اپنے سرمایہ کے تناسب سے مکان میں شرکت ملک ہوگی، مثلاً مکان کا ۲۵ فیصد حصہ عمیل کا، اور تین چوتھائی حصے ادارے کے ہوں گے، مکان بننے کے بعد عمیل کارپوریشن کے حصے میں کرایہ دار ہونے کی حیثیت سے رہے گا، اور کارپوریشن کو کرایہ ادا کریگا، اس کے ساتھ ساتھ مختلف وقفوں میں کارپوریشن کے حصے کو تھوڑا تھوڑا کر کے خریدتا بھی رہے گا، اس مقصد کے لئے کارپوریشن کے حصے کے متعدد یونٹ بنالئے جاتے ہیں، مثلاً کارپوریشن کا حصہ دس یونٹوں میں خریدا جائے گا، جوں جوں خریدنے کے نتیجہ میں کارپوریشن کا حصہ کم ہوتا جائے گا، اسی تناسب سے کرایہ بھی کم ہوتا جائے گا، جب عمیل کارپوریشن کے سارے حصے کو خرید لے گا تو کارپوریشن کی ملکیت ختم ہو جائے گی، اور عمیل سارے مکان کا مالک بن جائے گا، اب کرایہ دینے کا سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ شرکتِ متناقصہ کے مجوزہ طریقے میں مندرجہ ذیل خصوصیات پائی جاتی ہیں:

۱۔ تمویلی ادارہ اور عمیل (Client) ملکر شرکت ملک کی بنیاد پر ایک مکان خریدتے ہیں، اور پھر وہ مکان ان کے

درمیان اس سرمایہ کے تناسب سے جو دونوں نے ملکر دیا ہے مشترک بن جاتا ہے، لہذا اگر دونوں نے نصف نصف سرمایہ فراہم کیا تو وہ مکان نصف نصف کے تناسب سے مشترک ہو جائے گا، اور اگر کسی ایک نے ایک تہائی اور دوسرے نے دو تہائی پیسے دیئے تو وہ گھر اسی تناسب سے ان کے درمیان مشترک ہو جائے گا۔

۲۔ پھر تمویلی ادارہ اس گھر میں اپنا حصہ عمیل کو ماہانہ یا سالانہ متعین کرایہ پر دیدے گا۔

۳۔ اس گھر میں جو حصہ تمویلی ادارہ کا ہے اس کے اجزاء یا یونٹ بنادیئے جائیں گے، مثال کے طور پر دس حصے بنادیے جائیں۔

۴۔ یہ بھی طے کیا جائے گا کہ کچھ معین وقفوں سے (مثلاً ہر چھ ماہ بعد) عمیل ان یونٹوں میں سے ایک یونٹ کو خریدے گا، اور جس تناسب سے اس ایک یونٹ کا تمام یونٹوں میں حصہ ہے اسی تناسب سے وہ تمام یونٹوں کی قیمت میں سے یک یونٹ کی قیمت دے گا، مثلاً اگر تمام دس یونٹوں کی قیمت ایک لاکھ روپے ہو تو ایک یونٹ کی قیمت دس ہزار روپے ہوگی، تو وہ ہر یونٹ خریدتے وقت دس ہزار روپے قیمت ادا کرے گا۔

۵۔ عمیل جب بھی کوئی یونٹ خریدے گا، تو تمویلی ادارہ کی ملکیت کا ایک یونٹ کم ہو جائے گا، اور عمیل کی ملکیت میں ایک یونٹ کا اضافہ ہو جائے گا، لہذا اب عمیل اس ایک یونٹ کا کرایہ دینا بند کر دے گا، جو اس نے تمویلی ادارہ سے ابھی خریدا ہے، کیونکہ اب وہ یونٹ تمویلی ادارے کی ملکیت میں نہیں رہا۔

۶۔ یہاں تک کہ جب عمیل سارے یونٹ خرید لے گا، تو وہ مکان پورا عمیل کی ملکیت میں آجائے گا، اور اب اجارہ داری اور شرکت الملک کا معاملہ بھی ختم ہو جائے گا۔

ہاؤس فنانسنگ کا یہ طریقہ اگر شرعی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو تین عقود پر مشتمل ہے۔

۱: دونوں کا مکان خرید کر شرکت الملک قائم کرنا۔

۲: تمویلی ادارہ کا عمیل کو اپنا حصہ کرایہ پر دینا۔

۳: تمویلی ادارہ کا اپنے یونٹ عمیل کو فروخت کرنا۔

اب ہم مذکورہ بالا تینوں باتوں پر علیحدہ علیحدہ غور کرتے ہیں۔

سب سے پہلا مرحلہ دونوں کا مکان خرید کر شرکت الملک قائم کرلینا ہے، اس میں شرعاً کوئی مانع یا ناجائز بات نہیں ہے، کیونکہ شرکت الملک کی فقہاء کرام نے مندرجہ ذیل تعریف کی ہے:

شركة الملك هى أن يملك متعدد عينا او دينا بإرث أو بيع أو غيرها۔[1]

شرکت الملک یہ ہے کہ متعدد اشخاص کسی سامان یا دین کے وراثت، بیع یا اس کے علاوہ کسی اور سبب سے مالک بن جائیں۔

چونکہ یہ شرکت دونوں کے خریدنے سے قائم ہوئی ہے، لہٰذا اس کے جواز میں کوئی اشکال نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تمویلی ادارے نے عمیل کو اپنے یونٹ کرایہ پر دے دیئے ہیں، یہ کرایہ داری کا معاملہ بھی جائز ہے، کیونکہ کسی مشترک چیز کو اگر ایک شریک دوسرے شریک کو کرایہ پر دے تو جائز ہے، علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

ولا تجوز إجارة المشاع لغير الشريك إلا أن يؤجر الشريكان معا، وهذا قول أبى حنيفةؒ وزفرؒ، لأنه لا يقدر على تسليمه فلم تصح اجارته، واختار ابو حفص العكبرى جواز ذلك وقد أومأ إليه أحمد وهو قول مالك والشافعى وأبى يوسف ومحمدؒ، لأنه معلوم يجوز بيعه فجازت إجارته كالمفرز، ولأنه عقد فى ملكه يجوز مع شريكه فجاز مع غيره۔(۲)

غیر شریک کو مشاع (مشترک) چیز کرائے پر دینا جائز نہیں ہے، اِلا یہ کہ اگر دونوں شرکاء اکٹھے ملکر کسی اجنبی کو کرایہ پر دیں (تو جائز ہے)، یہ قول امام ابو حنیفہ

---

(۱) تنوير الأبصار مع رد المحتار، للشامى، محمد امين الشهير بابن عابدين، مطبعة الحلبى مصر ۱۳۸٦ھ (۳:۳٦٤،۳٦٥)۔

(۲) ابن قدامة (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسى)، المغنى، مكتبة الرياض السعودية۔ (٦:۱۳۷)۔

اور امام زفرؒ کا ہے، اس لئے کہ غیر منقسم حصہ کرایہ دار کو سپرد کرنا ممکن نہیں ہے، لہذا اسکو کرایہ پر دینا صحیح نہ ہوا، البتہ ابو حفص العکبری نے اس کے جواز کو اختیار کیا ہے، اسی طرف امام احمد نے عندیہ دیا ہے، اور یہی قول امام مالک امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کا ہے، اس لئے کہ وہ ایک معلوم چیز ہے، اور اسکی بیع بھی جائز ہے، لہذا اس کو کرایہ پر دینا بھی جائز ہوا، جس طرح الگ اور غیر مشترک شیئ کا حکم ہے، اور اس لئے بھی کہ وہ اپنی ملکیت میں عقد کر رہے ہیں، جب اپنے شریک کے ساتھ جائز ہے، تو اجنبی کے ساتھ بھی جائز ہوگا۔

مندرجہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہوئی کہ:

الف: اگر ایک شریک اپنا کل یا بعض حصہ کسی دوسرے شریک کو کرایہ پر دے تو بالاتفاق تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔

ب: اگر ایک شریک کسی اجنبی (غیر شریک) کو اپنا حصہ کرایہ پر دے تو امام ابو حنیفہ اور امام زفرؒ کے نزدیک ناجائز ہے، البتہ بقیہ ائمہ کرام کے نزدیک جائز ہے۔(۱)

شرکت متناقصہ میں تمویلی ادارہ اپنے یونٹ اپنے شریک کو کرایہ پر دے رہا ہے، نہ کہ غیر شریک کو، لہذا تمام فقہاء کرام کے نزدیک جائز ہوا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ تمویلی ادارہ اپنے یونٹ عمیل کو فروخت بھی کر رہا ہے، اور یہ عمیل اس کے ساتھ شریک بھی ہے، آیا کوئی شریک مشاع شیئ میں اپنا حصہ فروخت کر سکتا ہے، یا نہیں؟ تو اس کا حکم ذیل میں تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

الف: اگر کوئی ایک شریک مشاع شیئ میں سے اپنا حصہ فروخت کر رہا ہے تو اگر اس کا فروخت ہونے والا حصہ زمین اور تعمیراتی حصہ دونوں پر مشتمل ہے تو بالاتفاق جائز ہے۔

---

(۱) اجارۃ المشاع کے بارے میں مکمل تفصیل پیچھے ص ۱۶۰ پر گذر چکی ہے۔

ب: لیکن اگر وہ فروخت کردہ حصہ صرف تعمیرات پر مشتمل ہے تو اگر وہ اپنے دوسرے شریک کو فروخت کر رہا ہے، تو بھی بالاتفاق جائز ہے۔

ج: اور اگر وہ فروخت ہونے والا حصہ جو صرف تعمیرات پر مشتمل ہے، کسی اجنبی آدمی کو فروخت کیا جائے تو اس میں اختلاف ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ ردالمحتار میں فرماتے ہیں:

ولو باع أحد الشريكين في البناء حصته لأجنبي لا يجوز ولشريكه جاز۔[1]

اگر دو شریکوں میں سے ایک شریک کسی عمارت میں اپنا حصہ اجنبی (غیر شریک)
کو فروخت کرے تو ناجائز ہے، البتہ اگر اپنے شریک کو فروخت کرے تو جائز ہے۔

چونکہ یہاں پر تمویلی ادارہ اپنے حصے اپنے شریک کو فروخت کر رہا ہے، اور اگر مشاع شئے اپنے شریک کو فروخت کی جائے تو یہ فروخت صحیح ہوتی ہے، لہذا تمویلی ادارہ کا اپنے یونٹ عمیل کو فروخت کرنا بالاتفاق صحیح ہے۔

مذکورہ بالا تمام تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ تینوں عقود (یعنی شرکت الملک کا عقد، اجارہ کا عقد، اور بیع کا عقد) فی نفسہ جائز ہیں، لہذا اگر یہ عقود اس طرح کئے جائیں کہ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کے ساتھ مشروط نہ ہو بلکہ ہر ایک عقد مستقل اور علیحدہ کیا جائے تو اس کے جواز میں کوئی اشکال نہیں۔

البتہ اگر فریقین ان تینوں عقود کو پہلے ہی سے اکٹھے طے کرلیں تو یہ صورتحال فقہی لحاظ سے قابل غور ہے، اسلئے کہ اس میں ایک عقد دوسرے عقد میں داخل ہو رہا ہے، جسے اصطلاحاً ,,صفقة في صفقة،، کہا جاتا ہے، اور یہ ناجائز ہے، یہاںتک کہ حنابلہ جو بیع میں بعض شرائط کو جائز قرار دیتے ہیں ان کا بھی مذہب یہ ہے علامہ ابن قدامہ فرماتے ہیں:

الثاني (أي النوع الثاني من الشرط) فاسد، وهو ثلاثة أنواع أحدها: أن

يشترط على صاحبه عقدا آخر كسلف أو قرض، أو بيع، أو اجارة، أو

(۱) و الشامي ،محمد امين الشهير بابن عابدين، رد المحتار ،مطبعة الحلبي مصر ۱۳۸٦ھ (۳:۳٦۵/الشركه)۔

صرف الثمن أو غيره، فهذا يبطل البيع، ويحتمل أن يبطل الشرط وحده، المشهور في المذهب أن هذا الشرط فاسد يبطل به البيع، لأن النبي ﷺ قال: لا يحل بيع وسلف، ولا شرطان في بيع۔ قال الترمذي: هذا حديث صحيح، ولأن النبي ﷺ نهى عن بيعتين في بيعة، حديث صحيح، هذا منه۔ قال أحمد: وكذلك كل ما في معنى ذلك مثل أن يقول: علىٰ أن تزوجني بابنتك، أو على أن أزوجك ابنتي،فهذا كله لا يصح۔

قال ابن مسعودؓ: صفقتان في صفقة ربا، وهذا قول ابي حنيفة والشافعیؒ وجمهور العلماء، وجوزه مالكؒ، وجعل العوض المذكور في الشرط فاسدا۔[1]

شرط فاسد کی دوسری قسم کی تین قسمیں ہیں، ایک یہ کہ متعاقدین میں سے ایک اپنے ساتھی پر کسی دوسرے عقد کی شرط لگائے، جیسے قرض، ادھار، بیع، کرایہ پر دینے وغیرہ کی شرط لگائے، تو یہ بیع کو باطل کر دیتی ہے، اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ صرف شرط باطل ہو، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ بیع اور قرض حلال نہیں، اور نہ ہی ایک بیع میں دو شرطیں حلال ہیں، امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے، اور اس لئے کہ حضور ﷺ نے ایک بیع کے اندر دو بیعوں سے منع فرمایاہے، یہ حدیث صحیح ہے، اور یہ حکم اسی حدیث کی وجہ سے ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یہی حکم ہر اس عقد کا ہوگا جو اس قسم میں داخل ہو مثلاً کوئی شخص کہے کہ میں یہ عقد اس شرط پر کرتا ہوں کہ تم اپنی بیٹی سے میرا نکاح کراؤ، یا میں اپنی بیٹی کی شادی تم سے کراؤں تو یہ سب صحیح نہیں ہے۔

(۱) ابن قدامه: عبد الرحمن بن محمد شمس الدين بن قدامه المقدسی ۶۸۲ھ الشرح الكبير على المغنی، بيروت، دار الكتاب العربي (٤:٥٣)، وبمثله ذكر الموفق ابن قدامه في المغني (٤:٢٩٠)۔

اور ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک سودے میں دو سودے کرنا سود ہے، اور یہ قول امام ابو حنیفہ امام شافعی اور جمہور علماء کا ہے، اور امام مالک عقد کو صحیح مانتے ہیں، لیکن شرط میں جو معاوضہ مقرر کیا گیا ہے اسکو فاسد قرار دیتے ہیں۔

لیکن یہ ممانعت اس وقت ہے جب ایک عقد کی صلب میں دوسرے عقد کو طے کیا جائے، لیکن اگر ایک عقد دوسرے عقد کے ساتھ مشروط نہ ہو بلکہ صرف دوسرے عقد کا وعدہ کیا جائے کہ دونوں فریق یہ وعدہ کریں کہ فلاں وقت میں اجارہ کریں گے، اور فلاں تاریخ کو بیع کی جائی گی، اور ہر عقد اپنے وقت مقررہ پر بغیر کسی شرط کے مطلقاً منعقد کیا جائے تو اس صورت میں صفقہ فی صفقہ، یا بیع و شرط یعنی ایک سودا دوسرے سودے کے ساتھ مشروط ہونا لازم نہیں آئیگا، اور اس قسم کے بعض مسائل میں فقہاء کرام نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے، جیسے بیع الوفاء، بعض فقہاء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ اگر وفاء کی شرط صلب بیع میں ہو تو ناجائز ہے، اور اگر بیع مطلق عن الشرط ہو، اور وفاء کا معاہدہ بیع الگ سے کیا گیا ہو تو یہ جائز ہے، اور وعدہ کو وفا قضاءً بھی لازم ہو جائے گا، وعدہ بیع کے بعد کیا گیا ہو تو وفاء کا جواز بہت سے فقہاء نے لکھا ہے، لیکن اگر وہ وعدہ بیع سے پہلے کیا گیا ہو تب بھی وفاء کے وعدہ کا نفاذ بھی جامع الفصولین میں مصرح ہے۔[1]

فتاوی خانیہ میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ:

وإن ذكر البيع من غير شرط، ثم ذكر الشرط على وجه المواعدة جاز البيع، ويلزمه الوفاء بالوعد، لأن المواعده قد تكون لازمة فتجعل لازمة لحاجة الناس۔[2]

اور اگر بیع کسی شرط کے بغیر مذکور ہو، پھر شرط کو بطور وعدہ کیا جائے تو بیع جائز ہے، اور اس وعدہ کا ایفاء ضروری ہوگا، اسلئے کہ وعدہ بھی بعض اوقات لازم ہو جاتا ہے، لہذا یہ بھی لوگوں کی حاجت کی وجہ سے لازم ہوگا۔

(۱) ابن قاضی، بدر الدین، جامع الفصولین، اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ (۱:۲۳۶)، الفصل الثامن عشر۔

(۲) عثمانی، محمد تقی، بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، دار القلم دمشق، (ص: ۲۵۲)۔

اسی طرح علماء مالکیہ نے بھی بیع الوفاء میں جسے انکے نزدیک بیع الثنایا کہا جاتا ہے یہ حکم ذکر کیا ہے کہ اصلاً تو یہ ناجائز ہے، لیکن علامہ حطاب فرماتے ہیں:

لا یجوز بیع الثنایا، وھو أن یقول: أبیعك ھذا الملك أوھذہ السلعة علی أن آتیك بالثمن إلی مدة کذا، أو متی آتیك به فالبیع مصروف عنی۔[1]

بیع الثنایا ناجائز ہے، اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ یہ اپنی چیز یا یہ کپڑا میں تم کو اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ فلاں تاریخ کو میں اس قیمت پر اس کو لے لوں گا، یا میں جب بھی اسی کی قیمت لایا تو یہ بیع میری طرف سےختم ہو جائیگی۔

لیکن اگر بیع بغیر کسی شرط کے مطلقاً کی جائے پھر مشتری بائع سے وعدہ کرے کہ جب وہ قیمت لائے گا مشتری اسے واپس فروخت کردے گا، تو یہ وعدہ صحیح ہے، اور بائع پر لازم ہے۔

علامہ حطابؒ فرماتے ہیں:

قال فی معین الحکام: ویجوز للمشتری أن یتطوع للبائع بعد العقد بأنه إن جاء بالثمن إلی أجل کذا فالمبیع له، ویلزم المشتری متی جاء ہ بالثمن فی خلال الأجل أو عند انقضاء ہ، أو بعدہ علی ا لقرب منه، ولا یکون للمشتری تفویت فی خلال الأجل أو عند انقضاء ہ، أو بعدہ علی القرب منه،ولا یکون للمشتری تفویت فی خلال الأجل، فإن فعل ببیع أو ھبة، او شبه ذلك نقض إن أرادہ البائع، ورد إلیه۔[2]

---

(۱) حطاب،ابو عبداللہ محمد بن محمد، ۹۵٤ھ، تحریر الکلام فی مسائل الالتزام،دار العرب الاسلامی، بیروت (ص:۲۳۳)۔

(۲) حطاب،ابو عبداللہ محمد بن محمد ، ۹۵٤ھ، تحریر الکلام فی مسائل الالتزام،دار العرب الاسلامی،بیروت (ص:۲۳۹)۔

اور مشتری کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ بائع سے عقد کے بعد وعدہ کرے کہ اگر وہ فلاں تاریخ کو قیمت لائے گا تو مبیع اس کی ہو جائیگی، اور اگر وہ قیمت مدت کے دوران یا مدت کے ختم ہونے کے بعد یا اسکے قریب زمانہ میں لایا تو مشتری پر اسے فروخت کرنا لازم ہوگا، اور مشتری کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس مدت کے دوران اس حق کو کسی طرح مثلاً بیع، ہبہ وغیرہ کے ذریعہ ختم کرے، کیونکہ اگر اس نے ایسا کیا تو اس نے وعدہ توڑ دیا، لہذا بائع اس سے مطالبہ کر سکتا ہے۔

یہ حکم اس وقت تھا جب بیع مطلقاً بغیر کسی شرط کے ہوئی ہو، اور یہ وعدہ بیع کے انعقاد کے بعد ہوا ہو لیکن بہت سے فقہاء کرام نے یہ تصریح فرمائی ہے کہ یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جب یہ وعدہ بیع کے انعقاد سے پہلے کیا جائے، اور اس کے بعد بیع مطلق عن الشرط کی جائے۔

قاضی ابن سماوہ الحنفیؒ فرماتے ہیں:

شرط شرطا فاسدا ثم عقدا لم يبطل العقد ويبطل لو تقارنا۔

اگر کوئی فاسد شرط عقد سے پہلے لگائی گئی، اس کے بعد عقد کر لیا گیا تو عقد باطل نہ ہوگا، اور عقد اس صورت میں باطل ہوگا جب دونوں کو ملا دیا۔[1]

اور بیع الوفاء کے مسئلہ کے بیان میں فرماتے ہیں:

وكذا لو تواضعا الوفاء قبل البيع، ثم عقدا بلا شرط الوفاء فالعقد جائز، ولا عبرة بالمواضعة السابقة۔[2]

اگر دونوں نے وفاء کا بیع سے پہلے طے کیا، اور پھر بغیر کسی شرط کے عقد کیا تو عقد جائز ہے، اور پہلے طے کردہ بات عقد میں معتبر نہ ہوگی۔

---

(۱) ابن قاضی، بدر الدین، جامع الفصولین، اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔ (۲:۷ ۲۳)۔

(۲) حوالہ بالا (۲:۷ ۲۳)۔

اسی بات کو علامہ ابن عابدین شامیؒ نے ردالمحتار میں ذکر کیا ہے اور اس پر یہ اعتراض کیا ہے:

قال فی جامع الفصولین ایضا: لو شرط شرطا فاسدا قبل العقد ثم عقدا،لم یبطل العقد، اھ، قلت: وینبغی الفساد لو اتفقا علی بناء العقد علیه کما صرحوا به فی بیع الهزل، کما سیأتی آخر البیوع۔[1]

جامع الفصولین میں یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی شرط فاسد عقد سے قبل لگائی، پھر دونوں نے عقد کیا تو عقد باطل نہ ہوگا، میرا یہ خیال ہے کہ یہاں پر اس وقت فساد عقد مناسب معلوم ہوتا ہے جب اسی شرط فاسد کے مطابق عقد کرلیں، جس طرح بیع الہزل کے معاملہ میں فقہاء کرام نے صراحت کی ہے، جو بیوع کے آخر میں آئیگی۔

لیکن اس بارے میں علامہ محمد خالد الأتاسیؒ نے فرمایا:

أقول: هذا بحث مصادم للمنقول (أی ما هو منقول فی جامع الفصولین) کما علمت، وقیاسه علی بیع الهزل قیاس مع الفارق، فإن الهزل کما فی المنار: هو أن یراد بالشیء ما لم یوضع له، ولا ما یصلح له اللفظ استعارة، ونظیره بیع التلجئة، وهو کما فی الدر المختار أن یظهر عقدا وهما لا یریدانه،وهو لیس ببیع فی الحقیقة ، فإذا اتفقا علی بناء العقد علیه، فقد اعترفا بأنهما لم یریدا انشاء بیع أصلا، وأین هذا من مسئلتنا؟ وعلی کل حال فاتباع المنقول أولی۔[2]

---

(۱) و الشامی، محمد امین الشهیر بابن عابدین، رد المحتار ایچ ایم سعید کمپنی ،مطبعة الحلبی مصر ۱۳۸٦ھ (۱۳۵:٤)۔

(۲) الاتاسی، محمد خالد، شرح مجلة الأحکام: مکتبه اسلامیه ،کوئٹه۱٤۰۳ھ(۲:۶۱)۔

میرا یہ خیال ہے کہ یہ بحث جامع الفصولین میں منقول عبارت سے متصادم ہے، اور بیع الہزل پر اس مسئلہ کو قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ منار کی تشریح کے مطابق ہزل یہ ہے کہ کسی شئے سے ایسی بات مراد لیناجو اس کے لئے وضع نہ ہو، اور نہ ہی لفظ بطور استعارہ اسکی صلاحیت رکھیں، اور اسکی نظیر بیع التلجئہ ہے، اور بیع التلجئہ کی تعریف در مختار میں یوں کی گئی ہے کہ وہ در حقیقت بیع نہیں ہوتی، کیونکہ جب وہ کسی بات پر عقد پر متفق ہونگے تو وہ یہ اعتراف کریں گے کہ وہ دراصل بیع قائم کرنا نہیں چاہتے، اور ہمارا یہ مسئلہ اس کے مطابق کہاں ہے؟ بہر حال جامع الفصولین میں منقول مسئلہ کی اتباع اولی ہے۔

اسی وجہ سے متأخرین احناف کی ایک جماعت نے یہ فتوی دیا ہے کہ ایسا مواعدہ (طرفین کا آپس میں وعدہ) جو عقد بیع سے الگ ہو خواہ عقد سے پہلے کیا جائے یا بعد میں، اصل عقد کے ساتھ لاحق نہیں ہوگا، اور اس سے بیع بالشرط یا صفقہ فی صفقہ لازم نہیں آئے گا، لہذا اب عقد کے جواز میں کوئی مانع نہ ہوگا۔[1]

یہاں پر ایک اشکال واقع ہو سکتا ہے کہ وعدہ اگرچہ عقد سے پہلے کیا گیا ہے لیکن بوقت عقد دونوں فریقوں کے نزدیک ملحوظ ہوگا، چاہے اب وہ الفاظ سے دوبارہ اس وعدہ کی صراحۃً ادائیگی نہ کریں، لیکن عقد مطلق بھی سابقہ وعدہ پر مبنی ہے، لہذا پھر اس عقد میں جس میں پہلے صرف وعدہ کیا گیا اور پھر اسکی بنیاد پر عقد کیا گیا، اور اس عقد میں جس میں دوسرے عقد کی شرط لگائی گئی کوئی خاص فرق نہ ہوا، صرف صورۃً تھوڑا سا فرق ہے ورنہ معاملہ کی حقیقت ایک ہی ہے، لہذا مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ مواعدہ بھی بیع کے اندر شرط کے حکم میں ہو کر نا جائز ہو۔

اس اشکال کا جواب حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم نے اپنی کتاب بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرۃ میں یہ دیا ہے کہ دونوں مسئلوں کے درمیان فرق صرف صورۃً نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ایک دقیق فرق ہے، وہ یہ ہے کہ وہ عقد جس میں دوسرا عقد مشروط ہو جسے "صفقۃ فی صفقۃ" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، وہ عقد دراصل قطعی نہیں ہوتا، بلکہ دوسرے عقد پر موقوف رہتا ہے یعنی جب تک وہ دوسرا عقد مکمل نہ ہو جائے یہ بھی مکمل نہیں ہوتا، لہذا یہ عقد ایک

(۱) لکھنوی، علامہ فتح محمد، عطر الہدایہ۔

طرح کا عقدِ معلق یا عقدِ موقوف ہوتا ہے، چنانچہ اگر بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں تم کو اپنا یہ مکان اس شرط پر فروخت کرتا ہوں کہ تم اپنا فلاں مکان مجھے اتنے روپے میں کرایہ پر دیدوگے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ بیع مشتری کے کرایہ پر دینے کے ساتھ موقوف ہے، اور جب کوئی عقد موقوف ہوتا ہے تو وہ قطعیت سے نکل کر معلق بن جاتا ہے، اور عقود معاوضہ میں تعلیق جائز نہیں، کیونکہ اگر ہم بالفرض اس معلق بیع کے مطابق معاملہ کرلیں، اور پھر اپنا مکان کرایہ پر نہ دے، تو یہ لازم آتا ہے کہ مکان کی بیع والا معاملہ خود بخود ختم ہو جائے، کیونکہ وہ اجارہ کے ساتھ مشروط تھا، اور شرط کے فوت ہونے سے مشروط بھی ختم ہو جاتا ہے، اسکا مطلب یہ ہوا کہ جب ایک عقد کو دوسرے عقد سے مشروط کیا جائے تو پہلا عقد بھی اس وقت تک معلق رہے گا جب تک دوسرا عقد وجود میں نہ آجائے، اور یہ صورت بالکل ناجائز ہے۔

اسکے برخلاف اگر یہی اجارہ پر دینے کا معاملہ بطور وعدہ ذکر کیا گیا پھر دونوں نے ملکر بغیر کسی شرط کے عقد کرلیا، تو بیع بغیر کسی شرط کی تعلیق کے قطعی طور پر نافذ العمل ہوگی، اور اس بیع کی تکمیل اجارہ کے عقد پر موقوف نہیں ہوگی، لہذا اگر مشتری اپنے وعدہ سے پھر جائے، اور کرایہ پر دینے سے رک جائے تو یہ بات اس بیع پر بالکل بھی اثرانداز نہیں ہوگی، اور بیع اسی طرح صحیح اور مکمل باقی رہے گی، البتہ زیادہ سے زیادہ یہ بات ہو سکتی ہے کہ لزومِ وعدہ والے قول پر عمل کرتے ہوئے مشتری پر وعدہ کے ایفاء پر جبر کیا جائے، اور اس سے یہ کہا جائے کہ بائع نے یہ عقد بیع دراصل اسی وعدہ کی بنیاد پر کیا تھا، لہذا اس وعدہ کو پورا کرنا مالکیہ کے مذہب میں قضاءً بھی مطلوب ہے، البتہ یہ وعدہ کا معالہ اس بیع کے مکمل ہونے پر کوئی اثرانداز نہ ہوگا، اور وہ بیع بغیر کسی شرط کے تام رہے گی، اگرچہ مشتری وعدہ پورا نہ کرے۔

مذکورہ بالا تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کوئی ایسی بیع کی جائے جس میں دوسرا عقد بھی مشروط ہو تو وہ بیع موقوف اور ناتمام رہتی ہے، پوری بھی ہو سکتی ہے، ختم بھی ہو سکتی ہے، اور اس تردد اور معلق ہونے کی وجہ سے بیع میں فساد آجاتا ہے، بخلاف اس بیع کے جو مطلقاً کی جائے البتہ اس سے پہلے کسی قسم کا کوئی وعدہ کرلیا جائے تو اس سے بیع ناتمام یا موقوف نہیں رہتی، البتہ اس وعدہ کو قضاءً لازم قرار دیا جا سکتا ہے۔

شرکتِ متناقصہ کا جائز طریقہ:

لہذا شرکت متناقصہ کا جائز طریقہ جس میں شرعاً کوئی غبار نظر نہیں آتا وہ یہ ہے کہ تین مختلف زمانوں میں الگ الگ

عقد کئے جائیں، اور ہر عقد دوسرے عقد سے جدا ہو، ایک دوسرے میں مشروط نہ ہو، البتہ دونوں فریق باہمی اتفاق رائے سے ان تینوں عقود کا وعدہ کرلیں، کہ فلاں مکان کو ہم اپنے مشترک مال سے خرید رہے ہیں، پھر ایک شریک یعنی تمویلی ادارہ اپنا حصہ عمیل (Client) کو ایک مقررہ کرایہ پر دے گا، پھر عمیل (Client) تمویلی ادارے کا حصہ متعدد اقساط میں خریدتا جائے گا، یہاں تک کہ وہ اس کے تمام حصص خرید کر پورے مکان کا مالک بن جائے گا۔

لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ ان قراردادوں کی حیثیت وعدہ سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے، اور ان تینوں عقود یعنی شرکت بیع اور کرایہ داری اپنے اپنے وقت پر الگ اور مستقل ہونے چاہییں، اور ان کے لئے ایجاب اور قبول مستقل ہو، اور وہ بغیر کسی شرط کے کئے جائیں، مثلاً بیع کے اندر کرایہ داری یا کرایہ داری میں بیع کی شرط نہ لگائی جائے۔

چوتھا باب
مالیاتی اداروں میں مشارکہ کا استعمال

چوتھا باب: مالیاتی اداروں میں مشارکہ کا استعمال

گذشتہ ابواب میں عصر حاضر میں مشارکہ کی ضرورت، شرکت کا روایتی تصور اور شرکت سے متعلق قابل تحقیق عصری مسائل بیان کئے جاچکے ہیں، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ واضح کیا جائے کہ مالیاتی اداروں میں مشارکہ کسطرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟۔ موجودہ دور میں بہت سے مالیاتی ادارے سود پر سرمایہ فراہم کرتے ہیں، انمیں سے سب سے اہم اور بڑا ادارہ بینک ہے، اس ادارے کو مشارکہ کی بنیاد پر ڈھالنے کے لئے پہلے اسکا موجودہ نظام سمجھنا ضروری ہے، لہذا پہلے مختصراً بینکاری کے موجودہ نظام کا خاکہ اور اسکا شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے، جس میں بینک سے متعلق درج ذیل امور ذکر کیے جائیں گے:

ا: بینک کی تعریف اور اسکی ضرورت اور اہمیت۔

ب: بینک ڈیپازٹس کیا ہیں؟ بینک ڈیپازٹس کی اقسام اور ان کا حکم۔

ج: روایتی بینکوں میں جمع شدہ رقوم۔

د: بینک ڈیپازٹس میں مشارکہ

ہ: بینک میں سرمایہ جمع کرانے والوں کے نفع کے حساب کا طریقہ۔

و: یومیہ پیداوار کی بنیاد پر حساب کا طریقہ۔

ز: قصیر المیعاد اور طویل المیعاد سرمائے کی ضرورت۔

ح: اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مشارکہ کا کردار۔

ط: تمویل (Financing) کے مختلف شعبوں میں مشارکہ کا استعمال

ی: اسلامی بینکوں کی بیلنس شیٹ کیسی ہوگی۔

بینک کی تعریف

بینک ایک ایسے تجارتی ادارے کا نام ہے جو لوگوں کی رقمیں اپنے پاس جمع کر کے تاجروں، صنعت کار اور دیگر ضرورت مند افراد کو قرض فراہم کرتا ہے، آج کل روایتی بینک ان قرضوں پر سود وصول کرتے ہیں، اور اپنے امانت دار کو کم شرحِ سود پر سود دیتے ہیں، اور سود کا یہ درمیانی فرق بینکوں کا نفع ہوتا ہے[۱]۔

بینک کی اقسام

فائنانسنگ (تمویل) کے اعتبار سے بینک کی چھ قسمیں ہیں کیونکہ بعض بینک خاص شعبوں میں فائنانسنگ کرتے ہیں، اور بعض عمومی تمویل کرتے ہیں، اس طرح بینک کی اقسام یہ ہیں:

۱۔ زرعی بینک: اسے عربی میں المصرف الزراعی، اور انگریزی میں (Agricultural Bank) کہا جاتا ہے، یہ بینک زراعت کے شعبہ میں قرض فراہم کرتا ہے۔

۲۔ صنعتی بینک: اسے عربی میں المصرف الصناعی اور انگریزی میں (Industrial Bank) کہتے ہیں، اس کا کام صنعتی ترقی کے لئے قرضے فراہم کرنا ہے۔

۳۔ ترقیاتی بینک: اسے عربی میں بنك التنمية اور انگریزی میں (Development Bank) کہتے ہیں، یہ بینک کسی بھی شعبے میں ترقیاتی کاموں کے لئے قرضے دیتے ہیں۔

---

(۱) عثمانی، حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مد ظلہم، اسلام اور جدید تجارت و معیشت، اور مزید تفصیل کیلئے دیکھئے دیگر مراجع:

1-Oxford Dictionary of Business. P 60.-2- Dictionary of Banking. P 15.

3. Fundamentals of Financial Management , by Ramesh K. S. Rao. Published at Macmillan Publishing Company,NY.and Collier Macmillan Publishers, London.

۴۔ کوآپریٹو بینک: اسے عربی میں المصرف التعاونی اور انگریزی میں (Co opretive Bank) کہتے ہیں، یہ بینک امداد باہمی کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے اسکا دائرۂ کار ممبران تک محدود ہوتا ہے، جو لوگ اس کے ممبر ہوتے ہیں انہی کے ڈیپازٹ ہوتے ہیں اور انہی کو قرضہ دیا جاتا ہے۔

۵۔ انوسمنٹ بینک: (Investment Bank) اسے عربی میں بنك الاستثمار کہتے ہیں اس سے مراد ایسا بینک ہوتا ہے جسمیں ڈیپازٹ متعینہ مدت کے لئے ہوتے ہیں، عام کرنٹ اکاؤنٹ یا سیونگ اکاؤنٹ اسمیں نہیں ہوتے، صرف فکسڈ ڈیپازٹ ہوتے ہیں، اور قرضے بھی محدود مدت کے لئے جاری کئے جاتے ہیں، اس سے کم مدت کے لئے قرضے نہیں دئے جاتے[1]۔

۶۔ تجارتی بینک: اسے عربی میں البنك التجاری اور انگریزی میں کمرشل بینک (Commercial Bank) کہتے ہیں، یہ بینک عمومی تمویل کا کام کرتے ہیں، کسی شعبے کے ساتھ مخصوص نہیں۔

تجارتی بینک کسی مخصوص کھاتے یا مخصوص تمویل کے لئے مقرر نہیں ہے، بلکہ بقیہ اقسام کے برعکس یہ ایک عام قسم ہے، لہٰذا اس کے فرائض و وظائف ذکر کرنے سے اس مقالے سے متعلق تقریباً تمام اقسام کے فرائض و وظائف کا احاطہ ہو جاتا ہے، چنانچہ صرف تجارتی بینک کے فرائض و وظائف ذکر کرنے پر اکتفا کر لیا گیا ہے۔

تجارتی بینک کے فرائض: (Functians of commercial Bank)

تجارتی بینک کے فرائض و مشاغل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱: ابتدائی مشاغل و فرائض (Primary Functions)

۲۔ ثانوی مشاغل و فرائض (Secondary Functions)

1. Fundamentals of Financial Management , by Ramesh K. S. Rao. Page: 126. Published at Macmillan Publishing Company,NY.and Collier Macmillan Publishers, London.

ابتدائی مشاغل کو بھی دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

ا۔ امانتوں کی وصولی۔اسے بینک کے مطلوبات(Liabilities) کہا جاتا ہے۔

۲۔ قرضوں کی فراہمی۔اسے بینک کے موجودات یا اثاثے(Assets) کہا جاتا ہے۔

ا۔امانتوں کی وصولی: (Receiving Deposits)

امانتوں کی وصولی بینک کے ابتدائی یا بنیادی فرائض میں سے ایک ہے،ان امانتوں کی وصولی دراصل سرمایہ کی تشکیل کی ایک صورت ہے، عام لوگ اپنی چھوٹی موٹی بچتیں جمع کراتے ہیں اور اس پر سود حاصل کرتے ہیں،اسی طرح تاجر حضرات بھی اپنے کاروباری لین دین کے لئے رقوم جمع کراتے ہیں تجارتی بینک میں سرمایہ تین قسم کے کھاتوں (Accounts) میں جمع کرایا جاسکتا ہے:

ا۔ کرنٹ اکاؤنٹ

۲۔ فکسڈ ڈپازٹ (جامد کھاتہ)

۳۔ سیونگ اکاؤنٹ (بچت کھاتہ)

۲۔ قرضوں کی فراہمی(Financing/Advancing Loans)۔

بینک کا سب سے اہم کام لوگوں کو انکی ذاتی ضروریات یا خاص طور پر تجارتی ضروریات کے لئے قرضوں کی فراہمی یعنی Advancing Loans ہے۔

یہ قرضے مندرجہ ذیل قسم کے ہوتے ہیں:

بینک کبھی طویل المیعاد قرضے جاری کرتا ہے،ایسے قرضوں کو عربی میں ,,ائتمان طویل الأجل،،اور انگریزی میں (Long Term credit) کہتے ہیں۔

بینک کبھی قصیر المیعاد قرضے جاری کرتا ہے جو عموماً ایک سال سے کم مدت کے ہوتے ہیں، ان کو عربی میں

,,ائتمان قصیر الأجل،، اور انگریزی میں(Short Term credit) کہا جاتا ہے۔

بینک سے لوگ تین قسم کے قرضے لیتے ہیں:

ا۔ روزمرہ کی تجارتی ضروریات کے لئے قرض لیا جاتا ہے، مثلا بلوں کی ادائیگی یا تنخواہوں کی ادائیگی کے لئے قرض لیا جاتا ہے، اس قسم کو(Over Head Expenses) کہتے ہیں۔

۲۔ کاروبار کے رواں اخراجات مثلا سامانِ تجارت کی خریداری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے قرضے حاصل کئے جاتے ہیں، ان کو عربی میں ,تمویل رأس المال العامل، اور انگریزی میں (Financing Working capital) کہتے ہیں۔

۳۔ بڑے بڑے منصوبوں کے لئے قرض لیا جاتا ہے، اسے عربی میں تمویل المشاریع اور انگریزی میں (Project Financing) کہا جاتا ہے۔

ثانوی مشاغل

ان سے مراد بینکوں کی ثانوی درجہ کے مشاغل یعنی بالمعاوضہ خدمات ہیں کیونکہ تجارتی بینک امانتوں کی وصولی اور قرضوں کی فراہمی کے علاوہ مندرجہ ذیل مفاد عامہ کی خدمات بھی انجام دیتا ہے، اور ان پر معاوضہ یا فیس وصول کرتا ہے۔

ا: امانتیں رکھنا اور انکی حفاظت کا اہتمام کرنا بینک اپنے یہاں مقفل باکس(Lockers) رکھتا ہے، جن میں زیورات، اہم کاغذات ، دستاویزات، رسیدیں اور دوسری قیمتی اشیاء رکھی جاسکتی ہیں۔

ب: رقموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا سفری چیک (Trevellers check) بینک ڈرافٹ، پے آرڈر، خطوط اعتماد(Letters of credit) اور مختلف قسم کی مالی سندات کے ذریعے بینک چھوٹی بڑی رقموں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی خدمات سرانجام دیتے ہیں، اور اس کا معاوضہ فی صد کمیشن یا فیس کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔

ج: بحری اور ہوائی جہازوں، ریل یا موٹر وہیکلز وغیرہ کے ذریعے منگوائے جانے والے تجارتی وغیر تجارتی سامانوں

کو اپنے گاہکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے چھڑانے، گاہک کی طرف سے اسکی ہدایت کے مطابق انکی قیمتیں ادا کرنے اور مال کو گاہک تک پہونچانے کی خدمات انجام دے کر بھی بینک معاوضہ حاصل کرتے ہیں۔

د: اپنے گاہکوں کی نمائندگی کرتے ہوئے غیر منقولہ جائیداد کی خرید و فروخت کا معاملہ کرنا، اور اس سلسلے میں قانونی کارروائیوں کی تکمیل کرانا بھی ان بالمعاوضہ خدمات میں سے ہے، جو بینک انجام دے سکتے ہیں۔

ھ: بعض معاصر بینک کاروباری اداروں یا افراد کو نیا کاروبار شروع کرنے یا موجودہ کاروبار کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں ماہرانہ مشورے دیتے ہیں، اور مشینری خام مال اور دیگر اشیاء کی خریداری وغیرہ میں ان کی معاونت کرتے اور مشورے دیتے ہیں۔

و: بینک اپنے کھاتہ داروں اور گاہکوں کو مالی امور میں مشورے دینے کے علاوہ انکی طرف سے تجارتی حصص کی خرید و فروخت یا ان کے سرمایہ کو مختلف کاروباری اداروں میں لگانے کی خدمت بھی انجام دیتے ہیں۔

بینک کی مذکورہ بالا تمام خدمات بالمعاوضہ ہوتی ہیں۔

خلاصہ یہ کہ بینک کے تمام مشاغل اور وظائف کو دیکھتے ہوئے اسکی ضرورت اور اہمیت میں اضافہ ہو جاتا ہے، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان وظائف کے شرعی حکم کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ آیا یہ جائز ہیں یا ناجائز؟

اب ہم ان تمام باتوں کے جواب کے لئے ترتیب سے بینک کے وظائف اور ان کے شرعی حکم کا جائزہ لیتے ہیں، سب سے پہلے بینک ڈیپازٹس یعنی بینک کی امانتوں کی وصولی اور اس پر سود کی ادائیگی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔

بینک ڈیپازٹس کی حقیقت

بینک ڈیپازٹس (Bank Deposites) جنہیں عربی زبان میں الودائع المصرفیہ کہا جاتا ہے، اس سے مراد وہ رقم ہے جو کوئی شخص کسی بینک میں بطور امانت رکھوائے، چاہے وہ کسی معین وقت کے لئے رکھوائے یا یہ معاہدہ ہو کہ مالک اپنا

پورا یا تھوڑا سرمایہ جب چاہے نکلوا سکتا ہے۔

موجودہ بینکوں میں طریق کار یہ ہے کہ جو شخص بھی بینک میں رقم رکھواتا ہے وہ اسی حالت میں بینک میں نہیں رہتی بلکہ دوسری رقموں کے ساتھ مخلوط ہو جاتی ہے، اور پھر وہ بینک اس رقم کو بطور تمویل (Financing) اپنے گاہکوں (Clients) کے حوالے کرتا ہے، اور اس پر ان سے سود یا نفع کا مطالبہ کرتا ہے، یہ رقم بینک کے ضمان (گارنٹی) میں ہوتی ہے، چنانچہ معاہدے کے مطابق بینک کے اوپر انکی واپسی لازم ہوتی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ اس سرمایہ کے لئے عموماً امانت یا ودیعت کا جو لفظ مستعمل ہوتا ہے، اس سے مراد فقہِ اسلامی کی امانت یا ودیعت نہیں ہوتی، کیونکہ فقہ میں امانت یا ودیعت اسے کہا جاتا ہے کہ جو چیز بعینہ اپنی اصلی شکل میں امانتدار کے پاس محفوظ رہے، اور مال امانت پر فقہ اسلامی کے قاعدے کے مطابق اس وقت تک کوئی ضمان یا تاوان عائد نہیں ہوتا جب تک کہ امانتدار کی طرف سے کوئی زیادتی یا تعدی (جان بوجھ کر نقصان پہونچانے) کی کوئی صورت سامنے نہ آجائے، اس کے برعکس بینکوں میں سرمایہ دوسرے سرمایوں سے مخلوط بھی ہو جاتا ہے، اور اس شکل میں برقرار بھی نہیں رہتا، اسی طرح بینک اس رقم کی ادائیگی کا ضامن ہوتا ہے، خواہ اس سے بے قصور تلف ہو جائے، لہٰذا بینکوں میں جمع شدہ سرمایے کے لئے امانت یا ودیعت کے لفظ کا استعمال لغت کے لحاظ سے ہے نہ کہ فقہ کی اصطلاح کے لحاظ سے۔

بینک ڈپازٹس کی اقسام

موجودہ دور کے بینکاری نظام میں بینک ڈیپازٹس (Bank Deposits) کی چار قسمیں ہیں:

۱۔ رواں کھاتہ:

اسے عربی میں الحساب الجاری اور انگریزی میں کرنٹ اکاؤنٹ (Current Account) کہا جاتا ہے، اس کھاتے میں سرمایہ جمع کرانے والے کھاتہ دار (Account Holder) کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ جب چاہے اور جتنی چاہے اپنی رقم بینک سے نکلوالے، اور بینک اس کا پابند ہوتا ہے کہ وہ اسکے مطالبہ پر فی الفور رقم واپس کردے، اسمیں اکاؤنٹ ہولڈر کے

ذمہ یہ لازم نہیں ہوتا کہ وہ رقم نکلوانے سے قبل بینک کو پیشگی اطلاع دے، اس قسم کے اکاؤنٹ ہولڈر کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا، بلکہ بعض ممالک میں تو یہ طریقہ رائج ہے کہ بینک اکاؤنٹ ہولڈر سے یہ اکاؤنٹ کھولنے کی خدمت کی فیس وصول کرتا ہے۔

اس اکاؤنٹ میں داخل کردہ رقم کو علیحدہ نہیں رکھا جاتا بلکہ اسے دوسری رقموں کے ساتھ مخلوط کردیا جاتا ہے، اور بینک کو یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ اس رقم کو اپنے ضروری امور میں استعمال کرسکتا ہے، اگرچہ بینکوں کا یہ معمول بھی ہے کہ اس اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم کا ایک متناسب حصہ اپنے پاس محفوظ (Reserve) رکھتے ہیں تاکہ اکاؤنٹ ہولڈر جب بھی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے تو اسے ادا کی جاسکے۔

۲۔ جامد کھاتہ:

اسے عربی زبان میں الودائع الثابتہ اور انگریزی میں فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed Depasits) کہا جاتا ہے، یہ وہ رقم ہوتی ہے جو کسی متعین اور مخصوص مدت تک کے لئے بینک میں رکھوائی جاتی ہے، اور رقم رکھوانے والے (Account holder) کو اس مدت سے پہلے رقم نکلوانے کا اختیار نہیں ہوتا، اور عام حالات میں یہ مدت پندرہ دن سے ایک سال تک کے درمیان ہوتی ہے، بینک اس رقم کو تمویل (Financing) میں استعمال کرکے اکاؤنٹ ہولڈر کو بازاری نرخ کے حساب سے سود یا نفع (Intrest) ادا کرتا ہے۔

۳۔ بچت کھاتہ:

اسے عربی زبان میں ,,ودائع التوفیر،، اور انگریزی زبان میں سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) کہتے ہیں، اس اکاؤنٹ میں جو رقم رکھوائی جاتی ہے اسکی کوئی مدت متعین یا مخصوص نہیں ہوتی، تاہم اسمیں کھاتہ دار (اکاؤنٹ ہولڈر) ساری رقم ایک ہی مرتبہ میں نکال بھی نہیں سکتا، بلکہ اس مقصد کے لئے بینک ایک یومیہ مقدار مقرر کرتا ہے کہ ایک دن میں زیادہ سے زیادہ اس مقدار تک روپیہ نکالا جاسکتا ہے، اور بعض اوقات بینک کی طرف سے رقم نکلوانے کے لئے اسے پیشگی اطلاع کی شرط بھی عائد کی جاتی ہے۔

اس اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم ایک لحاظ سے کرنٹ اکاؤنٹ کے مشابہ ہیں کہ اکاؤنٹ ہولڈر کسی مدتِ معینہ کے انتظار کے بغیر جب چاہے اپنی رقم نکلوالے، اور دوسرے لحاظ سے یہ فکسڈ ڈیپازٹ کی مانند ہے کیونکہ اسکی طرح اسمیں بھی تمام رقوم ایک مرتبہ میں نہیں نکالی جاسکتیں، اور بینک اس میں جمع شدہ رقوم پر سود (Interest) بھی ادا کرتا ہے، البتہ فکسڈ ڈیپازٹ کے مقابلے میں اسکا سود (Interest) یا نفع کم ہوتا ہے۔

۴۔ لاکرز:

اسے عربی زبان میں الصناديق المقفولة اور انگریزی میں لاکرز (Lockers) کہتے ہیں، اس میں ایک شخص بینک میں موجود لاکرز یعنی متعین تجوری کرائے پر لے لیتا ہے، اور اس تجوری میں وہ اپنا مال رکھتا ہے، اس مال سے بینک کا کوئی تعلق نہیں ہوتا، بلکہ بینک کے ملازمین کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ اس نے تجوری کے اندر کیا رکھا ہے، عموماً لوگ اس میں سونا، چاندی، جواہرات رقوم اور قیمتی دستاویزات واشیاء رکھتے ہیں۔

بینک ڈیپازٹس کا حکم

بینک ڈیپازٹس کی مندرجہ بالا چار اقسام کا حکم شرعی جاننے سے قبل ان کی فقہی حیثیت جاننی ضروری ہے، تاکہ ان کی بنیاد پر ان کا شرعی حکم معلوم ہو سکے۔

مندرجہ بالا چار اقسام میں سے چوتھی قسم یعنی لاکرز کی فقہی حیثیت یہ ہے کہ جو شخص لاکرز میں سامان یا پیسے رکھواتا ہے وہ پہلے بینک سے لاکر کرایہ پر حاصل کرتا ہے، اور دونوں کے درمیان کرایہ داری کا معاملہ طے ہوتا ہے، اور کرایہ داری کے معاہدے کے بعد وہ لاکرز بینک کے پاس ہی بطور امانت موجود رہتا ہے، لہٰذا اس پر امانت کے احکام جاری ہوں گے۔

جہاں تک بینک ڈیپازٹس کی ابتدائی تین قسموں کا تعلق ہے، چونکہ عام روایتی بینکوں (Conventional

(Bank میں انکی حیثیت اسلامی بینکوں میں انکی حیثیت سے مختلف ہے، لہذا دونوں قسم کے بینکوں کے بارے میں علیحدہ علیحدہ بیان کرنا مناسب ہوگا، سب سے پہلے ہم روایتی بینکوں میں جمع شدہ رقوم کا جائزہ لیں گے، اس کے بعد اسلامی بینکوں میں جمع شدہ رقوم کا جائزہ لیا جائیگا۔

روایتی بینکوں (Conventional Banks) میں جمع شدہ رقوم:

موجودہ دور کے اکثر علماء کرام کی رائے یہ ہے کہ روایتی بینکوں میں جمع شدہ رقوم کی حیثیت قرض کی ہوتی ہے، گویا کہ رقم اکاؤنٹ ہولڈر نے بینک کو قرض دی ہے، اگر چہ اسے عام زبان میں امانت کہا جاتا ہے، لیکن در حقیقت وہ امانت نہیں ہوتی، کیونکہ عقود اور معاملات میں اعتبار الفاظ کا نہیں ہوتا بلکہ اسکی حقیقت کا ہوتا ہے، اور یہ حیثیت اسکی تینوں قسم کے کھاتوں (Accounts) یعنی کرنٹ اکاؤنٹ، فکسڈ ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں ہے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ ان تینوں کھاتوں (Accounts) میں جو رقوم رکھی جاتی ہیں وہ بینک کے ضمان میں ہوتی ہیں یعنی بینک انکی واپسی کا ہر حال میں ذمہ دار ہے، خواہ وہ بے قصور تلف ہوئی ہوں، یہ بات ان رقوم کو امانت کے حکم سے نکال دیتی ہے، کیونکہ امانت ہر حال میں مضمون نہیں ہوتی، کیونکہ اگر امانت بلا تعدی (بے قصور) تلف ہو جاے تو اسکا تاوان امانتدار پر نہیں آتا۔

بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈیپازٹ تو قرض کے حکم میں ہیں البتہ کرنٹ اکاؤنٹ امانت کے حکم میں ہیں۔

لیکن یہ موقف صحیح نہیں کیونکہ کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم بھی بینک کی ذمہ داری میں ہوتی ہے، جسے فقہ کی اصطلاح میں ,,مضمون،، کہا جاتا ہے، جسکی وجہ سے وہ بھی قرض کے حکم میں ہے، اگر چہ ظاہر یاالفاظ کے لحاظ سے انہیں امانت سے تعبیر کیا جاتا ہو، لیکن حکم کے اعتبار سے وہ قرض ہے، اسلئے کہ رقم جمع کرانے والے عوام کو امانت یا قرض کی اصطلاحات سے کوئی غرض نہیں ہوتی، عوام کو تو صرف اس کھاتے سے حاصل ہونے والے عملی نتائج سے دلچسپی ہوتی ہے، چنانچہ اگر کوئی بینک ان اموال کی واپسی کی ضمانت نہ دے تو عام حالات میں ڈیپازیٹرز (جمع کنندگان) اس بینک میں رقوم جمع کرانے پر رضامند نہ ہوں گے، لہذا اگر عام ڈیپازیٹرز سے یہ کہا جائے کہ آپکی رقوم کی حیثیت فقہ کی اصطلاحی

امانت کی مانند ہوگی، اور بلا تعدی (بے قصور) تلف ہونے کی صورت میں وہ رقم آپ کو واپس نہیں ملے گی، تو اس صورت میں شاید کوئی شخص بینک میں سرمایہ جمع نہ کرائے، اسی وجہ سے عموماً بینک کی طرف سے یہ اعلان ہوتا ہے، کہ بینک ان جمع کردہ سرمائے یا رقوم کا ضامن ہوگا، یہ باتیں اس کی دلیل ہیں کہ خود رقم جمع کرانے والے (ڈیپازیٹرز) یہ چاہتے ہیں کہ انکی رقم مضمون (ضمانت شدہ) رہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈیپازیٹرز کا مقصد اصلی امانت رکھوانا نہیں ہے، بلکہ قرض دینا ہے تاکہ بینک کو ضامن بنا کر اس رقم کو مزید تحفظ دیا جاسکے، اگرچہ اس کے لئے الفاظ امانت کے بھی استعمال کئے گئے ہوں، تاہم یہ بات ضرور ہے کہ رقم جمع کرانے والے (ڈیپازیٹرز) کی رقم جمع کرانے کا حکم اگرچہ قرض کا ہے لیکن اس نے یہ رقم بینک کے تعاون یا مدد کرنے کے لئے جمع نہیں کرائی بلکہ حفاظت کی خاطر کرائی ہے، لیکن صرف اتنی بات اسے اس رقم کو قرض کے حکم سے نہیں نکالتی اسلئے کہ عقدِ قرض میں درج ذیل دو باتوں کا پایا جانا ضروری ہے:

پہلی بات یہ کہ مال کسی کو دیتے وقت اس بات کی اجازت بھی دی جائے کہ وہ اسے اپنے مصالح میں خرچ کر سکتا ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ دینے والا جب واپس طلب کرے تو اسے اسکے مثل اتنا ہی مال واپس دیا جائے۔

دوسری بات یہ کہ جو مال مقروض کو دیا جائے وہ اس کی واپسی کی ضمانت دے، بالفاظ دیگر وہ مال مضمون ہو۔

مذکورہ بالا دونوں باتیں بینک ڈیپازٹس میں پائی جاتی ہیں، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرضہ میں قرض دینے والے کا مقصود مقروض کی مدد ہونا چاہیے یہ شرط صحیح نہیں ہے کیونکہ قرض میں دونوں باتیں ممکن ہیں، بعض اوقات مقروض کی مدد مقصود ہوتی ہے اور بعض اوقات مدد مقصود نہیں ہوتی، لہذا قرض کی بنیاد میں یہ بات داخل نہیں ہے۔

چنانچہ روایات میں حضرت زبیر بن العوامؓ کا وقعہ لکھا ہے کہ لوگ ان کے پاس اپنی رقمیں بطور امانت رکھوانے آتے تھے، اور رقم رکھوانے سے ان مقصود حضرت زبیرؓ کی مدد یا تعاون نہیں ہوتا تھا، بلکہ ان کا مقصود اپنی رقوم کی حفاظت ہوتی تھی، لیکن حضرت زبیرؓ کا یہ معمول تھا کہ جب آپ کے پاس کوئی شخص رقم لے کر اس مقصد کے لئے آتا تو آپ اس سے وہ رقم صرف اس صورت میں لیتے جب وہ آپ کو اس مال میں تصرف کرنے کی اس قید کے ساتھ اجازت دیتا کہ وہ آپ پر مضمون ہوگا، لہذا جب آنے والا شخص امانت کے نام سے آپ کو وہ مال یا رقم پیش کرتا تو آپ فرماتے: ,,لا ولکن

ھو سلف،، یعنی یہ رقم امانت نہیں بلکہ یہ میرے ذمہ قرض ہے، حضرت زبیرؓ نے اس معاملہ کو عقد قرض فرمایا حالانکہ قرض دینے والوں کا مقصد اس قرضے کے ذریعہ حضرت زبیرؓ کا تعاون مقصود نہیں تھا بلکہ حفاظت مقصود تھی[1]۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر مقصود صرف مال کی حفاظت ہو تب بھی وہ عقد قرض کے منافی نہیں ہے عقد قرض اگرچہ بظاہر عقد تبرع یا احسان نظر آتا ہے، کیونکہ اس میں قرض دینے والا اپنی رقم سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا، لیکن اگر عمیق نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا مالی عقد نظر آئیگا جس میں جانبین کی مصلحت پوشیدہ ہے، وہ یہ کہ اگر اس نے واقعۃً مدد یا تعاون کی غرض سے اسے مال قرض دیا ہے تو اس میں قرض دینے والے کی مصلحت اور فائدہ یہ ہے کہ اسے آخرت کا اجر ملے گا، اور اگر اس نے تعاون کی غرض سے مال نہیں دیا تو اسکی مصلحت یا فائدہ یہ ہے کہ وہ مال مقروض کے ذمہ مضمون ہونے کی وجہ سے محفوظ ہو جائے گا، لہذا اس صورت میں حفاظت کی غرض اور مصلحت پوشیدہ ہے، یہی مصلحت لوگوں کو اپنا مال بینکوں میں رکھوانے پر مجبور کرتی ہے، کیونکہ اگر یہ مصلحت نہ ہوتی تو لوگ بینکوں کی طرف رجوع نہ کرتے، اس سے یہ پتہ چلا کہ لوگوں کا مقصدِ اصلی قرض دیکر اس مال کو مضمون اور محفوظ بنانا ہے، تاہم یہ بات ضرور ہے کہ لوگوں کو اپنے اس مقصد کے بارے میں یہ علم نہیں ہے کہ اسے فقہی اصطلاح میں قرض کہا جاتا ہے، لہذا اسے وہ قرض کے بجائے امانت کا نام دیتے ہیں۔

پیچھے یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع شدہ رقوم امانت کے حکم میں ہیں، اور یہ ایک ایسی امانت ہے کہ جس میں رقم رکھوانے والوں نے اس مالِ امانت کو اپنے مال کے ساتھ مخلوط کرنے کی اجازت دیدی ہے، لہذا بینک کا کرنٹ اکاؤنٹ کی رقم دوسری رقموں کے ساتھ مخلوط کرنا جائز ہے، اور اسکی وجہ سے یہ امانت کے حکم سے نہیں نکلتا، لیکن فقہی قواعد کی رو سے اگر غور کیا جائے تو یہ بات صحیح نہیں ہے، کیونکہ فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق رقم کا مالک جب اپنے مال کو امانت دار کے اموال کے ساتھ مخلوط کرنے کی اجازت دیدے تو اس وقت یہ عقد امانت سے خارج ہو کر شرکت الملک میں تبدیل ہو جاتا ہے، اور وہ مالِ مخلوط دونوں کے درمیان مال مشترک بن

(۱) بخاری، (أبو عبد الله محمد بن اسماعيل) صحيح البخاری المسمى بالجامع الصحيح، كتاب الجهاد، باب بركة الغازی فی ماله مع فتح الباری (۱۷۵:٦)۔

جاتا ہے[1]، اور یہ بات بھی فقہ میں مصرح ہے کہ مالِ مشترک میں ایک شریک کا دوسرے شریک کے مال پر قبضہ یا اختیار "قبضہ امانت" ہوتا ہے، لہذا اگر وہ بلا تعدی (بے قصور) تلف ہو جائے تو قبضہ رکھنے والے شریک پر تاوان نہیں آتا، لہذا کرنٹ اکاؤنٹ کو فقہی اعتبار سے امانت قرار دیا جائے تو خواہ امانت رکھنے والے اسے مخلوط کرنے کی اجازت دیدی ہو تب بھی بینک کو اس رقم کا ضامن نہ ہونا چاہیے، اس کے بر خلاف جو لوگ بینک میں رقمیں جمع کراتے ہیں وہ یہ کبھی نہیں چاہتے کہ انکی رقموں پر بینک کا قبضہ قبضہ امانت ہو بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ رقم بینک کے ذمہ مضمون (ضمانت شدہ) ہو، اس سے بھی یہی ظاہر ہوا کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے والے بھی امانت کا معاملہ کرنا نہیں چاہتے بلکہ دراصل قرض کا معاملہ کرنا چاہتے ہیں۔

مندرجہ بالا تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ بینک ڈیپازٹس کی تینوں اقسام میں جمع شدہ رقوم قرض کے حکم میں ہیں، لہذا ان پر قرض کے احکام جاری ہونے کی وجہ سے کھاتہ دار (Account holder) صرف اتنی ہی رقم کا حقدار ہوگا جتنی اس نے جمع کرائی تھی، اس سے زیادہ وصول کرنا سود ہوگا، اور یہ بات ہم تفصیل سے تجارتی سود کے بیان میں ذکر کر چکے ہیں کہ اگر قرض دینے والے کا مقصود مالی معاونت نہ ہو بلکہ تجارت یا حفاظت ہو تب بھی اس سے زائد وصول کرنا سود ہوتا ہے، اور وہ بھی صرفی سود کی طرح ناجائز ہے۔

مذکورہ بالا تمام دلائل کی بناء پر علماء کرام نے بینکوں کے دونوں کھاتوں یعنی فکسڈ ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں رقم جمع کرانے کو ناجائز کہا ہے، کیونکہ ان کھاتوں (Account) میں بینک کھاتہ داروں کو انکے اصل سرمایہ سے زیادہ لوٹاتا ہے جو سود ہے، "اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ" نے اپنے دوسرے اجلاس کی قرارداد نمبر (۱۰، ۱۰، ۲)[2] میں بینکوں کے ان دونوں کھاتوں میں رقم جمع کرانے کو سودی معاملہ قرار دیا ہے، لہذا اب مسلمانوں کے لئے ان کھاتوں میں رقم رکھوانا کسی طور جائز نہیں ہے۔

---

(۱) محمدعلاء الدين الحصكفي بن الشيخ علي الإمام بحامع بني أميه، الدر المختار شرح تنوير الابصار مع رد المحتار (محمد امين الشهير بابن عابدين الشامي) مصر، (٢: ٦٦٩)۔

(٢) مجمع الفقه الاسلامي جده، قرارات مجمع الفقه الاسلامي اردو اڈیشن، (٣٢)۔

البتہ جہاں تک بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے کا تعلق ہے، تو یہ بات پیچھے ذکر کی جاچکی ہے کہ اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے والے کو بینک کوئی نفع یا سود نہیں دیتا ہے، لہذا اس اکاؤنٹ میں رقم رکھوانے سے سودی قرض کے معاہدے میں داخل نہیں سمجھا جائے گا، لہذا کرنٹ اکاؤنٹ میں رقم رکھوانا جائز ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ کرنٹ اکاؤنٹ کے علاوہ بینک کے تینوں قسم کے کھاتوں (Accounts) پر ملنے والا نفع سود اور حرام ہے، البتہ اگر بینکوں کا نظام اسلامی اصولوں کی بنیاد پر قائم کیا جائے تو مشارکہ اس میں نہایت اہم کردار ادا کر سکتا ہے، لہذا اب ہم اس پہلو سے بحث کرینگے کہ مشارکہ کی بنیاد پر بینک کس طرح چلائے جاسکتے ہیں۔

جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا، بینک کے کاروبار کے دو حصے ہوتے ہیں ایک یہ کہ وہ لوگوں سے رقمیں بطور ڈپازٹ وصول کرتا ہے، دوسرا یہ کہ وہ کاروباری افراد کو رقمیں فراہم کرتا ہے، جس کے لئے ہم آئندہ تمویل (Financing) کا لفظ استعمال کریں گے، یہ دونوں قسم کے کام مشارکہ کی بنیاد پر انجام پاسکتے ہیں۔ جہاں تک ڈیپازٹس کا تعلق ہے ان میں تو مشارکہ ہی وہ واحد بنیاد ہے جس پر لوگوں سے رقمیں وصول کی جاسکتی ہیں، یعنی ہر ڈیپازیٹر بینک کے کام میں اپنے رکھوائے ہوئے روپیہ کے ذریعہ شریک ہوگا، البتہ تمویل (Financing) کے لئے مشارکہ کے علاوہ بھی مختلف طریقے ہوسکتے ہیں، لیکن چونکہ وہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں، اس لئے ہم صرف مشارکہ کے طریقۂ کار پر بحث کریں گے۔ سب سے پہلے ہم بینک ڈیپازٹس میں مشارکہ کے طریق کار اور اس سے متعلق احکام ذکر کرتے ہیں، اسکے بعد تمویل (Financin) کے شعبوں میں مشارکہ کے طریقۂ کار پر بحث کریں گے۔

بینک ڈیپازٹس میں مشارکہ

اسلامی بینکوں کے فکسڈ ڈیپازٹس اور سیونگ اکاؤنٹس میں جمع کردہ رقوم کا طریق کار روایتی بینکوں کے ان کھاتوں سے مختلف ہوگا، کیونکہ اسلامی بینکوں کا قیام مشارکہ (یعنی شرکت اور مضاربہ کا مجموعہ) کی بنیاد پر ہوگا، اس میں بھی روایتی

بینکوں کی طرح لوگ دو طریقے سے سرمایہ لگائیں گے، کچھ لوگ تو ابتداء میں مشترک سرمایے سے کمپنی کی طرح بینک قائم کرنے کیلئے سرمایہ لگائیں گے، یہ بینک کے حصہ دار (Share holders) کہلائیں گے، ان کے درمیان آپس میں شرکت کا عقد ہوگا، کیونکہ انہوں نے اپنا سرمایہ اور عمل دونوں بینک میں لگادیے، پھر بعض لوگ کھاتے کھلوا کر بینک کے فکسڈ ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں پیسے جمع کروائیں گے، جنہیں کھاتہ دار یا اکاؤنٹ ہولڈر کہا جاتا ہے، یہ لوگ بینک کے اصل شیئر ہولڈرز یا شریک تو نہیں ہوں گے، البتہ یہ صرف نفع میں شریک ہونگے، گویا کہ ان کے ساتھ بینک کا عقدِ مضاربت ہوگا، اور انکی حیثیت رب المال کی اور بینک (یعنی بینک کے اصل حصہ داروں) کی حیثیت ان کے مضارب کی ہوگی، اور یہ عقد شرکت اور مضاربت کا مجموعہ بن جائے گا، جسے ہم مشارکہ سے تعبیر کرتے رہے ہیں، کیونکہ اصل حصہ داروں کا آپس میں شرکت کا عقد پایا جاتا ہے، اور وہ باہم شرکاء ہیں، اور ڈیپازیٹرز کے ساتھ ان کا مضاربت کا عقد پایا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ڈیپازیٹرز کے نفع کا تناسب اصل حصہ داروں کے مقابلے میں کم بھی رکھا جاسکتا ہے، اور ڈیپازیٹرز کو بینک کے معاملات میں حق رائے دہی (Voting) یا کسی تصرف کا استحقاق نہیں ہوگا، کیونکہ یہ صرف سرمایہ لگاتے ہیں، عمل میں شریک نہیں ہوتے، اور اسلامی فقہ میں اسطرح کے دو قسم کے تعلقات کوئی غیر مانوس نہیں ہیں، چنانچہ فقہائے کرام نے لکھا ہے کہ اگر مضارب مال مضاربت کے ساتھ اپنا مال مخلوط کردے تو یہ جائز ہے اور اس صورت میں یہ نصف مال میں مضارب اور نصف مال میں مالک متصور ہوگا[1]، اسکی مزید تفصیل ہم دوسرے باب میں مشارکہ یعنی شرکت اور مضاربہ کے مجموعہ کے عنوان کے تحت ذکر کرچکے ہیں۔

اسلامی بینک میں سرمایہ جمع کرانے والوں کے نفع کے حساب کا طریقۂ کار

یہ بات گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہے کہ روایتی بینکنگ کی اصطلاح کے مطابق بینک میں جو رقمیں رکھوائی جاتی ہیں انہیں امانت (Deposit) کہا جاتا ہے، لیکن فقہی اعتبار سے حقیقت میں وہ قرض ہوتا ہے، لہذا اس پر اضافہ سود کہلاتا ہے، اگر بینک کو اسلامی طریقہ سے چلایا جائے گا تو امانت داروں (Depositors) کے ساتھ بینک شرکت یا مضاربہ

(۱) دیکھئے: السرخسی، محمد بن أحمد بن أبی سهل شمس الأئمة أبو بكر، المبسوط (۱۳۳:۲۲) إدارة القرآن كراچی۔

کا معاملہ کرے گا، اس لحاظ سے وہ رقم قرض نہیں ہوگی، بلکہ اب صورت حال یہ ہوگی کہ بینک کی ابتداء سے سرمایہ لگا کر بینک قائم کرنے والے آپس میں شریک ہوں گے، اور کھاتہ داروں (Depositors) کی حیثیت سے مختلف کھاتوں (Accounts) میں سرمایہ رکھوانے والے رب المال (Invester) ہوں گے، اور بینک ان کا مضارب ہوگا، اور لگایا ہوا سرمایہ رأس المال (Capital) ہوگا اور فکسڈ ڈیپازٹ اور سیونگ اکاؤنٹ مضاربت کے کھاتوں میں تبدیل ہو جائیں گے، جس پر بینک کسی مخصوص شرح سے نفع دینے کا پابند نہیں ہوگا، بلکہ جو کچھ نفع حاصل ہوگا وہ ایک طے شدہ تناسب کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

اس طرح اب بینک کا مکمل کاروبار شرکت اور مضاربت کا مجموعہ یعنی اصطلاحِ جدید کے مطابق مشارکہ ہوگا، کیونکہ بینک کے اصل شیئر ہولڈرز کا آپس میں کمپنی کی مانند شرکت کا معاہدہ ہے، اور وہ سرمایہ کاری اور کاروبار (محنت) دونوں میں شریک ہیں، اور کھاتہ داروں یعنی ڈیپازیٹرز کا بینک کے ساتھ صرف مضاربت کا تعلق ہے، کیونکہ انہوں نے صرف سرمایہ لگایا ہے، اور وہ کاروبار میں شریک نہیں ہیں، لہٰذا بینک کا مکمل کاروبار شرکت اور مضاربہ کا مجموعہ یعنی اصطلاحِ جدید کے مطابق مشارکہ ہوگا۔

لہٰذا اب نفع کی تقسیم کے لئے مشارکہ کے اصولوں پر عمل کیا جائے گا، جس کا خلاصہ ذکر کرنے سے پیشتر یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ (Current account) یا الحساب الجاری میں روایتی بینک (Traditional Bank) آج بھی کھاتہ داروں (Depositors) کو کوئی سود نہیں دیتے، لہٰذا اسلامی طریقۂ کار میں اس کو بھی کسی اسلامی طریقۂ تمویل سے بدلنے کی ضرورت نہیں ہے اسلئے اس کھاتہ پر کوئی نفع نہیں دیا جائے گا، البتہ بقیہ تمام شرکاء اور کھاتہ داروں کو نفع مشارکہ کے نفع کے اصولوں کے مطابق دیا جائے گا، جسکی تفصیل درج ذیل ہے:

مشارکہ میں نفع کی حتمی تقسیم کے لئے تمام اثاثوں کا نقد ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ ان ثاثوں کی قیمت لگا کر اسکی بنیاد پر نفع نقصان کا حساب کیا جاسکتا ہے، اگر نقصان ہو تو ہر ایک کے لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے ہر ایک شریک پر ڈالا جائے، اور نفع ہو تو طے شدہ شرح سے منافع آپس میں تقسیم کر دیا جائے[1]، اور مشارکہ میں نفع کی شرح طے کرتے

(۱) اسکی مزید تفصیل ودلائل کے لئے ملاحظہ فرمائیں، سرمایہ کو نقد بنائے بغیر نفع کی تقسیم، باب سوم۔

وقت یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ مضارب کے لئے جو حصہ بحیثیت مضارب مقرر کیا جائے اسمیں تو دونوں فریق آزاد ہیں، جتنا فی صد چاہیں حصہ مقرر کرلیں، چنانچہ باہمی رضامندی سے یہ بات طے کی جاسکتی ہے کہ رب المال کا حصہ زیادہ اور مضارب کا حصہ کم ہوگا، لیکن مضارب کا جو حصہ بحیثیت شریک مقرر کیا جائے اسمیں ان تمام احکام کی رعایت ضروری ہوگی، جو شرکت کے منافع کی تقسیم کے ذیل میں ذکر کئے گئے ہیں، لہذا چونکہ یہ بات طے ہے کہ شرکت والے حصہ میں بھی صرف مضارب ہی محنت کریگا رب المال محنت نہیں کریگا، اسلئے شریک کی حیثیت میں مضارب کا حصہ نفع اس کے لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے کم مقرر نہیں کیا جاسکتا، یہی بات بالکل اسلامی بینکوں کے مشارکہ کی بنیاد پر کاروبار میں بھی ہوگی کہ اصل شیئر ہولڈرز کے نفع کی شرح ڈیپازیٹرز کے نفع کی شرح سے زائد ہوگی، کیونکہ اصل شیئر ہولڈرز کو نفع کاروبار میں شریک ہونے اور ڈیپازیٹرز کے مضارب ہونے کی حیثیت میں ملے گا، جبکہ ڈیپازیٹرز کو صرف رب المال ہونے کی حیثیت سے ملے گا، اور اصل شیئر ہولڈرز چونکہ مضارب ہونے کے علاوہ شریک بھی ہیں اسلئے ان کے نفع کی شرح ان کے لگائے ہوئے سرمایہ سے کم نہیں ہوسکتی، البتہ اصل شیئر ہولڈرز کے مضارب کی حیثیت سے نفع کی شرح جو چاہیں طے کرسکتے ہیں۔

مندرجہ بالا اصولوں کی تشریح درج ذیل مثال سے ہوسکتی ہے، فرض کیجئے کہ بینک کا کل سرمایہ ڈیڑھ کروڑ روپے ہے، جس میں سے ڈیپازیٹرز نے ایک کروڑ روپے بطور مضاربت لگائے، اور مضارب یعنی شیئر ہولڈرز نے اپنے پاس سے اس سرمایہ میں آدھا کروڑ روپے لگائے جس کا مطلب یہ ہوا کہ کاروبار کے کل سرمایہ میں ایک تہائی حصہ شیئر ہولڈرز کا ہے اور دو تہائی حصہ ڈیپازیٹرز کا ہے، ڈیپازیٹرز کے دو تہائی حصوں (ایک کروڑ) میں شیئر ہولڈرز مضارب ہیں، لہذا مضارب ہونے کی حیثیت سے وہ اپنے لئے نفع کا کوئی بھی تناسب باہمی رضامندی سے طے کرسکتے ہیں، لیکن جو ایک تہائی سرمایہ (آدھا کروڑ) شیئر ہولڈرز نے خود لگایا ہے اس میں ان (شیئر ہولڈرز) کے نفع کا تناسب ایک تہائی سے کم نہیں ہوسکتا، کیونکہ اگر اسکا حصہ ایک تہائی سے کم مقرر کیا گیا تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ ڈیپازیٹرز کا حصہ دو تہائی سے بڑھ گیا ہے، حالانکہ یہ بات طے شدہ ہے کہ وہ کاروبار میں کام نہیں کرے گا، اور شرعاً نفع میں اسکا حصہ اسکے لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے زیادہ مقرر نہیں کیا جاسکتا، جیسا کہ مشارکہ کے احکام میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، اب اگر مذکورہ مثال میں

یہ طے کیا گیا کہ شیئر ہولڈرز کو شریک کی حیثیت میں نفع کا ایک تہائی ملے گا اور باقی دو تہائی مضاربت کی وجہ سے ڈیپازیٹرز اور شیئر ہولڈرز کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کیا جائیگا تو اگر نفع کو بالفرض ڈیڑھ لاکھ روپے فرض کیا جائے تو اسکے ایک تہائی یعنی پچاس ہزار روپے شیئر ہولڈرز کو شریک کی حیثیت میں ملیں گے، اور باقی دو تہائی (یعنی ایک لاکھ کا نصف حصہ یعنی پچاس ہزار شیئر ہولڈرز کو مضارب کی حیثیت میں ملیں گے، اور باقی پچاس ہزار ڈیپازیٹرز کو رب المال کی حیثیت میں دیئے جائیں گے۔ اس بات کو درج ذیل نقشہ کی مدد سے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

ٹوٹل سرمایہ		ڈیپازیٹرز		شیئر ہولڈرز	
150,00000	=	100,00000	+	50,00000	
(ڈیڑھ کروڑ)		(ایک کروڑ)		(پچاس لاکھ)	
		رب المال		رب المال	مضارب
ٹوٹل نفع	=	نفع	+	نفع	+ نفع
1,50,000		50,000		50,000	50,000

خلاصہ یہ کہ بینک کے کل کاروبار کو مشارکہ کے اصولوں پر سرانجام دینے کے لئے مذکورہ بالا طریقوں پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

مشارکہ کا رواں اکاؤنٹ (Musharkah Running Account)

البتہ بینک کے کاروبار کا مشارکہ (شرکت و مضاربت کے مجموعہ) سے بدلنے کی صورت میں ایک عملی دشواری یہ پیدا ہوتی ہے کہ شرکت اور مضاربت کا عام قاعدہ یہ ہے کہ تمام کھاتہ داروں کی رقم ایک ساتھ مشترک کھاتے میں آئے [1]، اور ایک ہی وقت میں نفع و نقصان کا حساب کر کے تمام شرکاء میں نفع نقصان تقسیم کیا جائے [2]، لیکن بینک میں

---

(۱) ابن قدامہ، المغنی مع الشرح الکبیر ٣٣٤، موفق الدین ٣٣٤ھ وشمس الدين بن قدامه المقدسی ٦٨٢ھ، بیروت، دار الکتب العلمیہ، (٥:١٢٤،١٢٥)، لو دفع إليه قراضا ثم ألفا وقال: ضمه إلى الأول، لم يجز القراض في الثاني ولا الخلط، لأن الأول استقر حكمه بالتصرف ربحا وخسرانا وربح كل مال وخسرانه يختص به۔

(۲) اس کے بارے میں تفصیلی بحث "کیا مشارکہ کسی میعاد کا پابند ہو سکتا ہے"، اور "شرکت کے اثاثوں کا تصفیہ" کے زیر عنوان ملاحظہ فرمائیں۔

یہ بات قابلِ عمل نہیں ہو سکتی کیونکہ یہاں لوگوں کی رقم رکھوانے اور نکلوانے کا سلسلہ مستقل طور پر جاری رہتا ہے، فکسڈ ڈیپازٹ میں اگرچہ نکلوانے کی مدت تو مقرر ہوتی ہے لیکن رکھوانے کا وقت مقرر نہیں ہوتا، ہر شخص ہر روز فکسڈ ڈیپازٹ کا کھاتہ کھول سکتا ہے، اور سیونگ اکاؤنٹ میں نہ نکلوانے کی تاریخ مقرر ہوتی ہے نہ رکھوانے کی، اس عملی دشواری کا حل کیا ہونا چاہیئے؟

اس عملی دشواری کا ایک حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ نظام تبدیل کیا جائے اور لوگوں کو پابند کیا جائے کہ وہ ایک خاص تاریخ میں رقم جمع کرائیں، اور ایک خاص تاریخ میں ہی نکالیں، اور شرکت کی مدت سہ ماہی، ماہانہ یا سالانہ مقرر کی جائے، اور ہر مدت کے اختتام پر نفع و نقصان کا حساب کر کے اسکی تقسیم عمل میں آئے، لیکن اس صورت میں تو لوگوں کے لئے بینک میں رقم رکھوانے میں مشکلات پیش آئیں گی، ایک ہی تاریخ میں رکھوانے اور ایک ہی تاریخ میں نکلوانے سے بینکوں پر پریشر بھی بڑھے گا، اور اسکے نتیجہ میں بہت سی بچتیں کام میں لگنے سے رہ جائیں گی۔

لہذا اس دشواری کا حل یہ ہے کہ جو شخص بینک سے اپنا کھاتہ بند کر کے نکلنا چاہتا ہے اس کا مطلب مشارکہ میں یہ ہوگا کہ وہ اپنا حصہ کسی دوسرے شریک کو فروخت کرنا چاہتا ہے، تو بینک اس کے حصہ کی بریک اپ ویلیو (Break up value) کے حساب سے قیمت لگا کر اس کا سرمایہ واپس کر دے گا، اور اگر کوئی شخص کسی کھاتہ میں پیسے رکھوانا چاہتا ہے تو اگرچہ روایتی شرکت اور مضاربت میں عام قاعدہ یہ ہے کہ تمام حصہ داروں کی رقم ایک ساتھ مشترک کھاتے میں آئے، لیکن چونکہ بینک میں یہ بات ناممکن ہے، اور بہت سی عملی پیچیدگیوں کا باعث ہے اسلئے ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ مشارکہ کی بنیاد پر اسلامی بینک کا کاروبار شرکت اور مضاربت کی ایسی نئی قسم ہے جس پر روایتی شرکت اور مضاربت کی قسموں کے تمام احکام مکمل طور پر منطبق کرنا مشکل ہے، اور چونکہ یہ شرکت اور مضاربت کے کسی بنیادی حکم یا شریعت کی کسی صریح نص کی متعارض بھی نہیں ہے، لہذا ضرورت عامہ کے پیش نظر اسے جائز قرار دینا چاہیے، البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس صورت میں کوئی شخص درمیان مدت میں کھاتہ کھولنا یا اپنے کھاتے میں مزید رقم رکھوانا چاہتا ہے اور کوئی شخص بینک سے اپنا کھاتہ بند کروائے بغیر کچھ رقم نکالنا چاہتا ہے، تو اس صورت میں نفع کے حساب کتاب اور تقسیم میں عملی دشواری ہوگی، لہذا شرعی لحاظ سے اسکا کیا حل ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ مشارکہ کے تحت اسلامی بینکوں کے کاروبار میں نفع کی تقسیم کا ایک طریقہ کار بعض حلقوں کی طرف سے تجویز کیا گیا ہے، جس کو اکاؤنٹنگ کی اصطلاح میں ,, حساب النمر،، یا روزانہ پیداوار پر مبنی حساب (Daily Pruduct Basis) کہا جاتا ہے جسکی تفصیل حسب ذیل ہے:

روزانہ پیداورار کی بنیاد

(Daily Product Basis) پر منافع کا حساب

اور اسکی شرعی حیثیت

اس تجویز کا حاصل یہ ہے کہ مشارکہ کے اوپر ذکر کردہ طریقوں اور تناسب کے مطابق پہلے سال کے آخر میں نفع کی حتمی تقسیم کے لئے اثاثوں کو حقیقۃً نقد بنائے بغیر انکی قیمت لگا کر نفع متعین کیا جائے (کیونکہ یہ بات پیچھے تیسرے باب میں ذکر کی جاچکی ہے، کہ مشارکہ میں نفع کی حتمی تقسیم کے لئے اثاثوں کو حقیقۃً نقد بنانا ضروری نہیں ہے) اس کام کیلئے سال بھر تک موجود بینک کے اوسطاً کل سرمایہ کا نفع شمار کرلیا جائے اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ تمام ڈیپازیٹرز کو جو نفع کا حصہ ملنا ہے اسمیں فی روپیہ فی یوم نفع کا اوسط کیا رہا، پھر یہ دیکھا جائے کہ اس مدت میں کسی شخص کی کتنی رقم کتنے دن تک بینک میں رہی، پھر اس شخص کے جتنے روپے جتنے دن تک بینک میں رہے اس کے حساب سے نفع تقسیم کردیا جائے، اسکی مثال یہ ہے کہ اگر روزانہ پیداوار کے حساب نے یہ بتایا کہ ایک روپیہ نے ہر روز ایک پیسہ کا نفع دیا ہے، تو سو دنوں تک لگائے ہوئے ایک روپیہ سے سو پیسے کا فائدہ ہوگا، خواہ وہ ایام متواتر ہوں یا غیر متواتر، لہذا جس شخص کا صرف ایک روپیہ اکاؤنٹ میں رہ گیا ہو وہ سو دن کے بعد سو پیسے کے نفع کا مستحق ہوگا، اور جس شخص کا ایک روپیہ دو سو دن تک اس اکاؤنٹ میں مشغول رہا یا دو روپے سو دن مشغول رہے تو ان میں سے ہر ایک دو سو پیسوں کا مستحق ہوگا[1]۔

---

(۱) روزانہ پیداوار کی بنیاد (Daily Ptoduct Basis) پر نفع کے حساب کتاب کا ذکر کردہ یہ طریقہ صرف بینکوں میں ہی نہیں بلکہ مشترکہ سرمائے کی کمپنیوں (Joint Stock Company) اور مختلف مالیاتی اداروں (Financial Institutions) میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

پیچھے نقشہ کے ساتھ جو مثال دی گئی تھی، اسے صرف نفع کے تناسب کے بیان کردہ اصولوں کی وضاحت کے لئے ذکر کیا گیا تھا، ورنہ اس کے علاوہ کوئی دوسری رقم یا سرمایہ طے کر کے ان اصولوں کی روشنی میں نفع نکالا جاسکتا ہے، اس مثال کی رو سے بینک کے اوسطاً ڈیڑھ کروڑ روپے کے کاروبار سے نفع ڈیڑھ لاکھ روپے ہوا جسمیں سے تمام ڈیپازیٹرز کا حصہ نفع پچاس ہزار روپے ہے، اسمیں ڈیپازیٹرز کو انفرادی طور پر نفع دینے کے لئے مذکورہ بالا روزانہ پیداوار کی بنیاد پر نفع کی تقسیم کا طریقہ استعمال کیا جائے گا، اس کے لئے دو باتیں معلوم ہونا ضروری ہیں:

۱۔ ڈیپازیٹرز کو بینک کے اوسطاً کل سرمایہ سے فی روپیہ فی یوم کیا نفع حاصل ہوا؟

۲۔ کسی ایک کھاتہ دار کو فی دن فی روپیہ کتنا نفع حاصل ہوا؟ اور پھر اسکی روشنی میں کتنے سرمایہ یا روپے سے کتنے دن میں کتنا نفع دیا جائے گا؟

سب سے پہلی بات معلوم کرنے کے لئے درج ذیل فارمولا ہوگا:۔

کل ڈیپازیٹرز کا فی یوم فی روپیہ نفع = (نفع ÷ بینک کا مجموعی سرمایہ) ÷ مجموعی ایام

مثال:۔ 365 ÷ (1,5,000, 000 ÷ 50,000) = 0.000009132

دوسری بات معلوم کرنے کے لئے درج ذیل فارمولا ہوگا:

کھاتہ دار کا نفع = کل ڈیپازیٹرز کا فی یوم فی روپیہ نفع × کھاتہ دار کا مجموعی اوسط سرمایہ × مجموعی ایام

90 × 1000 × 0.000009132 = 0.8218

شرعی نقطہ نظر سے اس پر یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ اس طریقے سے نفع کی تقسیم تقریبی ہوتی ہے، اس بات کا اندیشہ ہے کہ کسی کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ دوسرے کے پاس چلا جائے، مثلاً چھ ماہ کے بعد نفع تقسیم ہوا، ان چھ ماہ میں سے پہلے تین ماہ میں نفع زیادہ حاصل ہوا۔ اور آخری تین ماہ میں نفع کم ہوا، ان چھ ماہ کے دوران زید کی رقم تو چھ ماہ بینک میں رہی، اور عمر کی رقم آخری تین ماہ رہی، اور نفع فی یوم برابر ملے گا، تو اس صورت میں زید کے حقیقی نفع کا کچھ حصہ عمر کے پاس آجائے

گا،اس میں شک نہیں کہ نفع کی تقسیم کی مذکورہ صورت میں یہ اشکال موجود ہے، لیکن اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ شرکت میں شرکاء کے اموال مشاع طور پر مخلوط ہو جاتے ہیں، لہذا نفع تقسیم کرتے ہوئے یہ نہیں دیکھا جاتا کہ ہر ایک کے سرمایہ سے حقیقی نفع کیا ہوا؟ بلکہ تمام مجموعی سرمائے سے جو مجموعی نفع ہوا ہو وہ تقسیم ہوتا ہے، حالانکہ یہ احتمال موجود ہے کہ ایک کے سرمایے سے نفع حاصل ہوا ہو اور دوسرے کے سرمایہ سے بالکل نفع حاصل نہ ہوا ہو، معلوم ہوا کہ نفع کی حقیقی تقسیم شرکت میں مطلوب نہیں، تقریبی تقسیم بھی کافی ہے، بشرطیکہ تمام شرکاء اس پر راضی ہوں۔

فقہ میں اسکی اور بھی نظیریں موجود ہیں، مثلاً شرکت الأعمال میں یہ ہوتا ہے کہ دو یا زیادہ شرکاء کسی کام کے انجام دہی کی ذمہ داری قبول کرتے ہیں اور یہ طے کرتے ہیں کہ جو بھی اجرت حاصل ہوگی اسے طے کردہ تناسب سے باہم تقسیم کیا جائے گا، فقہائے کرام کی تصریح کے مطابق یہ جائز ہے، خواہ ان شرکاء میں سے بعض کے کام میں کمی بیشی ہو، لہذا اگر بالفرض یہ طے کیا گیا کہ حاصل شدہ نفع ہمارے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا، تو نفع کے دونوں نصف نصف ہی حقدار ہوں گے، خواہ کسی ایک شریک کا کام نصف سے بھی کم ہو، کیونکہ اس شرکت کا مقصد ذمہ داری میں شرکت ہے، اور ذمہ داری میں دونوں برابر ہیں،

اسکی دوسری نظیر یہ ہے کہ احناف کے نزدیک شرکت صحیح ہونے کے لئے مال کو مخلوط کرنا ضروری نہیں ہے[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر زید بکر کے ساتھ مشارکہ کے عقد میں شریک ہوا، لیکن اس نے ابھی تک اپنی رقم مجموعی سرمایہ میں شامل نہیں کی، پھر بھی وہ صرف مشارکہ کے عقد کے ذریعہ ہی نفع کا مستحق ہو جائے گا، خواہ نفع کا حصول صرف بکر کے روپیہ سے کمائی کے نتیجہ میں ہوا ہو[2]، نفع میں اس کے حصے کا استحقاق اسکی رقم کی ادائیگی کی ذمہ داری کی وجہ سے ہوا ہے، باوجودیکہ اس عقد میں نفع اسکی رقم کی وجہ سے نہیں ہوا، کیونکہ وہ رقم جو اس کی طرف سے بعد میں ادا کی گئی ہے اسے کسی دوسرے معاملے میں استعمال کیا جائے گا۔

---

(۱) اس بارے میں تفصیل بحث تیسرے باب میں "کیا سرمایہ کا مخلوط ہونا ضروری ہے" کے عنوان کے تحت گذر چکی ہے۔

(۲) الكاساني ،علاء الدين ابو بكر بن مسعود ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربي ۱٤۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی: (٦:٤٥،٦٠)۔

ایک مثال فرض کیجئے کہ زید اور بکر کسی عقد میں شریک ہوئے تاکہ ایک لاکھ روپے سے کوئی کاروبار چلائیں، اور یہ طے کیا کہ ان میں سے ہر ایک پچاس ہزار روپے لگائے گا، اور نفع میں نصف نصف شریک ہوں گے، بکر نے اپنا سرمایہ کاروبار میں لگادیا، لیکن زید نے ابھی تک سرمایہ ادا نہ کیا، زید کو کوئی نفع بخش معاملہ نظر آیا، چنانچہ اس نے پچاس ہزار روپے کے دو ایر کنڈیشنر خرید کر دس ہزار روپے کے نفع سے ساٹھ ہزار روپے میں آگے فروخت کر دیئے، اسکے بعد زید نے اپنے پچاس ہزار روپے ادا کر دیئے، دونوں شرکاء نے اس پچاس ہزار سے دو ریفری جریٹر خریدے، لیکن انہیں وہ نفع سے فروخت نہ کر سکے، بلکہ انہیں اڑتالیس ہزار روپے میں فروخت کر دیا، گویا کہ انہیں اس عقد میں دو ہزار روپے کا نقصان ہوا، اور بکر کی رقم سے دس ہزار کا فائدہ ہوا، جس میں زید کے سرمایے کو قطعاً کوئی دخل نہ تھا، اس کے باوجود زید پہلے عقد کے نفع میں شریک ہوگا، لہٰذا دوسرے عقد کے دو ہزار روپے کا نقصان پہلے عقد کے دس ہزار روپے سے منہا کر کے کل آٹھ ہزار روپے دونوں شرکاء کے درمیان نصف نصف تقسیم ہوگا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ زید کو چار ہزار روپے ملیں گے اگرچہ اسکی رقم سے نقصان ہوا تھا، اسکی وجہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ شرکاء کے درمیان شرکت کا عقد وقوع پذیر ہو گیا تو معاملات کے تمام نتائج مشارکہ کے مجموعی سرمایے سے متعلق ہو جاتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ کس کی رقم انفرادی طور پر کس معاملہ میں استعمال کی گئی ہے۔

زیر بحث مسئلہ میں ایک اعتراض یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مذکورہ مثال میں زید نے پچاس ہزار روپے کی ادائیگی کا وعدہ کر لیا تھا، اور یہ بات پیشگی طور پر معلوم تھی کہ وہ متعین رقم مشارکہ میں لگائے گا، اس کے برخلاف مشارکہ کے رواں اکاؤنٹ (Running account) میں شرکاء ہر روز آتے اور جاتے رہتے ہیں، کوئی شریک بھی کسی متعین رقم کے لگانے کی ذمہ داری نہیں لیتا، اس لئے ہر شریک کی لگائی ہوئی رقم مشارکہ کا عقد کرتے وقت نہ معلوم ہوتی ہے، جسکی وجہ سے مشارکہ کا عقد فاسد ہو جانا چاہیے؟

اس اعتراض کا جواب ہماری طرف سے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلامی فقہ کے قدیم علماء کرام اس بارے میں مختلف نقطہائے نظر رکھتے ہیں کہ آیا عقد مشارکہ کے جواز کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ سرمایہ شرکاء کو پہلے سے معلوم ہو؟ حنفی فقہاء کرام اس بارے میں متفق ہیں کہ سرمایہ کا پہلے سے معلوم ہونا مشارکہ کے منعقد ہونے کے جواز کے لئے کوئی

شرط نہیں ہے۔

مشہور حنفی فقیہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

,,وأما العلم بمقدار رأس المال وقت العقد، فليس بشرط لجواز الشركة بالأموال عندنا، وعند الشافعيؒ شرط، ولنا: أن الجهالة لاتمنع جواز العقد لعينها، بل لافضائها إلى المنازعة، وجهالة رأس المال وقت العقد لا تفضى إلى المنازعة، لأنه يعلم مقداره ظاهرا، أو غالبا،لأن الدراهم والدنانير توزنان وقت الشراء، فيعلم مقدارها، فلا يؤدى إلى جهالة مقدار الربح وقت القسمة،،(۱)

مشارکہ کے انعقاد کے لئے سرمایہ کا معلوم ہونا کوئی شرط نہیں ہے البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک یہ شرط ہے، ہماری دلیل یہ ہے کہ جہالت بذات خود مانع نہیں ہے، اِلا یہ کہ وہ نزاع پیدا کرنے کا سبب ہو، اور مشارکہ کے عقد کے وقت سرمایہ کی لاعلمی جھگڑا پیدا نہیں کرتی، کیونکہ اشیاء کی خریداری کے وقت سرمایہ کا علم ہو جاتا ہے، لہذا نفع کی تقسیم کے وقت نفع نامعلوم نہیں ہوتا ہے۔

مذکورہ بالا عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بوقت عقد سرمایہ اگر چہ معلوم نہ ہو تب بھی شرکت کا عقد منعقد ہو جاتا ہے، البتہ صرف اتنی شرط ہے کہ نفع کی تقسیم کے وقت سرمایہ کی تعداد معلوم ہونی چاہیے تاکہ نفع کی تقسیم میں کسی قسم کا نزاع پیدا نہ ہو، یومیہ پیداوار کی بنیاد (Daily Product Basis) پر اگر نفع تقسیم کیا جائے تو اس میں یہ شرط پائی جاتی ہے، یہ بات اگر چہ صحیح ہے کہ رواں مشارکہ (Running Musharakah) میں ہر وقت کچھ شرکاء رقمیں نکالتے اور ڈالتے رہتے ہیں، اور نفع یومیہ پیداوار کی بنیاد (Daily Product Basis) پر تقسیم کیا جاتا ہے، اور یہ تصور

(۱) الكاسانى ،علاء الدين ابو بكر بن مسعود ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع، بيروت ،موسسة التاريخ العربى ۱٤۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی: (٦٣:٦)۔

روایتی فقہ کی کتابوں میں کہیں نظر نہیں آتا، لیکن صرف یہ سبب کہ فقہ کی مروجہ کتابوں میں اس تصور کا موجود نہیں ہے، اس نئے طریقۂ تجارت کے ناجائز ہونے کا سبب نہیں بن سکتا، جب تک کہ یہ مشارکہ کے کسی بنیادی اصول سے متصادم نہ ہو، مجوزہ نظام میں تمام شرکاء مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس میں ہر شریک کی رقم جتنی مدت مجموعی سرمایہ (مثلاً بینک) میں رہی اتنے دن شمار کر کے اس کے نفع کا حساب کیا جاتا ہے، کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مجموعی سرمایہ کو جو کل نفع حاصل ہوا ہے اس کا سبب در حقیقت مختلف مدات میں شرکاء کی جانب سے مختلف وقتوں میں لگائے ہوئے سرمایے کا مشترکہ استعمال ہے، اس لئے اگر تمام شرکاء متفقہ طور پر رضامندی سے یہ طے کرلیں کہ نفع کو یومیہ پیداوار کی بنیاد (Daily Product Basis) پر تقسیم کریں گے، تو شریعت کا کوئی اصول اسے ناجائز نہیں کہتا، بلکہ حضور ﷺ کی مذکورہ ذیل حدیث کی روشنی میں اس کے جواز کی دلیل نکالی جاسکتی ہے۔

,,المسلمون علی شروطهم إلا شرطا حرّم حلالا أو أحل حراما،،[1]

مسلمان اپنی باہمی شرطوں اور معاہدوں کے پابند ہیں، الا یہ کہ کوئی ایسی شرط لگائی جائے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنادے۔

اگر یومیہ پیداوار کی بنیاد (Daily Product Basis) پر نفع کی تقسیم کو جائز تسلیم نہ کیا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کوئی بھی شریک درمیان مدت میں کوئی رقم مجموعی سرمایے سے نہ نکال سکتا ہے، اور نہ ہی ڈال سکتا ہے، یا کسی شخص کو مجموعی سرمایہ میں اپنا حصہ ڈالنے کے لئے اگلی مدت کی کسی تاریخ کا انتظار کرنا پڑے گا، اس طرح یہ بینکوں اور تمویلی اداروں (Financing Institutions) کے ڈپازٹ سائڈ (Deposit Sides) کے لئے بالکل ناقابل عمل ہوگا، جہاں دن میں کئی مرتبہ کھاتہ داروں کے اکاؤنٹ کھلتے اور بند ہوتے رہتے ہیں، اور اگر یومیہ پیداوار (Daily Product) کے مذکورہ طریقے کو مسترد کردیا جائے تو کھاتہ داروں کو کسی قابل نفع کھاتہ میں رقم رکھوانے کے لئے مہینوں انتظار کرنا پڑے گا، اس طرح انکی معاشی سرگرمیاں کچھ عرصے کے لئے ماند پڑجائیں گی، لہذا اس مسئلہ کا یومیہ پیداوار کی بنیاد (Daily Product Basis) پر نفع کی تقسیم کے سوا کوئی حل نہیں ہے، اور چونکہ شریعت کا کوئی اصول اس سے متصادم بھی نہیں

(۱) بخاری (الإجارة) و الترمذی، جامع السنن (حدیث: ۱۲۷۲/الأحکام)

ہے، لہذا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اسے رد کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا ساری تفصیل اس وقت ہے، جبکہ کوئی شخص مدت کے درمیان میں بینک میں داخل ہوتا ہے یا درمیان میں رقم نکلواتا اور رکھتا رہتا ہے، اگر کوئی شخص درمیان مدت میں بینک سے بالکل ہی نکل رہا ہو، تو اس صورت میں یہ مسائل نہ ہوں گے، اس صورت میں تو بہتر توجیہ وہی ہوگی، جو ہم نے پیچھے سرمایہ کو حکما نقد بنانے کے بیان میں ذکر کی تھی کہ اب بینک اسکو نفع تقسیم نہیں کر رہا ہے، بلکہ یہ شخص کاروبار میں اپنے حصہ کو بیچ رہا ہے، اور بینک اس کو خرید رہا ہے، اور حصہ خریدنے کے لئے بینک نے نفع نقصان کی صورتِ حال کو دیکھ کر اس کے حصے کی قیمت طے کی ہے۔

آخر میں ایک بات ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے وہ یہ کے روایتی بینکوں (Traditional Banks) میں جس طرح شیئر ہولڈرز اور کھاتہ داروں (Depositors) میں نفع کا تناسب میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح کھاتہ داروں میں بھی مختلف قسم کے کھاتہ داروں کے نفع کے تناسب مختلف ہوتا ہے مثلاً فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed Deposit) میں نفع کا تناسب سیونگ اکاؤنٹ (Saving Account) سے زیادہ ہوتا ہے، اس تناسب کو مختلف نسبتوں سے ظاہر کرتے ہیں اور اس کو اصطلاح میں وزن (Weightage) کہا جاتا ہے، مثلا موجودہ دور میں اسٹیٹ بینک کے قوانین کے مطابق شیئر ہولڈرز (Share / Equity holders) کا وزن صفر سے لے کر ۵ تک ہے، فکسڈ ڈیپازٹ (Fixed / Term Deposit) کا وزن چھ ماہ تک پیسے رکھوانے والوں کے لئے 1.05 ہے اور چھ ماہ سے زائد رکھنے والس کیلئے وزن پہلے چھ ماہ میں 1.3 ہے، اور اس کے بعد 2.08 ہے، اور سیونگ اکاؤنٹ کا وزن 1.00 ہے [1]، منافع تقسیم کرتے وقت یہی نسبتیں ملحوظ ہوتی ہیں، شرعی طور پر اس کا کیا حکم ہے؟

اسکا جواب یہ ہے کہ شیئر ہولڈرز اور ڈیپازیٹرز کے درمیان نفع کے تناسب میں جو فرق پایا جاتا ہے اس کے جواز کی وجہ اور اصول پیچھے تفصیل کے ساتھ گذر چکے ہیں، جسکا حاصل یہ کہ شیئر ہولڈرز رب المال اور کاروباری شریک (Active Partner) دونوں ہوتے ہیں، جبکہ ڈیپازیٹرز (Depositors) صرف رب المال ہوتے ہیں، اس وجہ سے

1. Circular of State Bank of Pakistan No.34/1984- P167.

شیئر ہولڈرز کو نفع کا تناسب ڈیپازیٹرز (Depositors) سے زائد ہونا چاہیے، اسی طرح پھر ڈیپازیٹرز کے مابین مختلف کھاتوں (Accounts) میں تناسب مختلف ہوتا ہے، سب کا مساوی نہیں ہوتا، یہ بھی شرعاً جائز ہے، کیونکہ مشارکین (شرکاء) باہمی رضامندی سے مختلف نسبتیں منافع کی طے کر سکتے ہیں، اسکی تفصیل دوسرے باب میں نفع کی تقسیم کے ذیل میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل بینکوں کے ڈیپازٹس سے متعلق تھی، اب یہ دیکھنا ہے کہ جمع شدہ رقوم سے بینک اپنے گاہکوں کو جو سرمایہ یا قرضے فراہم کرتا ہے، (جسے ہم آئندہ تمویل (Financing) کے نام سے یاد کریں گے) اسمیں مشارکہ کس طرح روبعمل آئے گا، البتہ بطور تمہید بینکوں کی طرف سے قصیر المیعاد اور طویل المیعاد سرمایہ کی فراہمی کی وجوہات اور اسکا طریقہ ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ اسکی روشنی میں مشارکہ کے تحت تمویل کا طریقہ سمجھنا آسان ہو جائے۔

قصیر المیعاد اور طویل المیعاد سرمائے کی ضرورت:

بینک کا سب سے اہم کام سرکاری اداروں، حکومت یا پرائیویٹ افراد یا اداروں کو انکی ضروریات خصوصاً تجارتی، ترقیاتی اور پیداواری ضروریات کے لئے قرضے فراہم کرنا ہے، یہ قرضے کبھی طویل مدت کیلئے ہوتے ہیں، اور کبھی مختصر مدت کیلئے، طویل المیعاد قرضوں کو عربی میں ,,الئتمان طویل الأجل،، اور انگریزی میں (Long Term Credit) کہتے ہیں اور قصیر المیعاد جنکی مدت عموماً تین ماہ یا چھ ماہ تک ہوتی ہے ان کو عربی میں ,,ائتمان قصير الأجل،، اور انگریزی میں (Short Term Credit) کہتے ہیں۔

قرض دینے کا طریقۂ کار:

بینکوں کو عموماً قرضے دینے کا غیر محدود اختیار نہیں ہوتا کہ جسے چاہیں اور جتنی مقدار میں چاہیں قرضے فراہم کریں، بلکہ مرکزی بینک (Central Bank) کی طرف سے ایک حد مقرر ہوتی ہے، اسکے پابند رہتے ہوئے بینک قرضے فراہم کر سکتے ہیں، اس حد کو عربی میں ,,سقف الاعتماد،، اور انگریزی زبان میں (Credit ceiling) کہتے ہیں، مثلاً

موجودہ دور میں مرکزی بینک کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ بینک اپنی تمام امانتوں کا چالیس فیصد (40%) مرکزی بینک کے پاس ریزرو رکھوائے، جسے عربی میں ,,احتیاط السیولة،، اور انگریزی میں (Liquidity Reserve) کہتے ہیں اور پانچ فیصد (5%) بینک اپنے پاس نقد (Cash) کی شکل میں رکھے، اور تیس فیصد (30%) کی حد تک پرائیویٹ افراد یا اداروں کو قرض فراہم کر سکتا ہے، اور باقی پچیس فیصد (25%) حکومت کو یا سرکاری اداروں مثلاً پی آئی اے، واپڈا اور اسٹیل ملز وغیرہ کو قرض فراہم کرے یا حکومتی بانڈز یا تمسکات خریدے۔

سقف الاعتماد یعنی (Credit ceiling) مقرر کرنے میں کئی عوامل کا دخل ہوتا ہے مثلاً کبھی کسی خاص شعبے مثلاً زراعت یا صنعت وغیرہ میں زیادہ تمویل مطلوب ہوتی ہے، تو بینکوں کا رخ اس طرف کر دیا جاتا ہے، کبھی افراط زر کو قابو کرنے کیلئے یہ حد مقرر کی جاتی ہے، کیونکہ اگر بینک قرضے زیادہ جاری کریں تو افراطِ زر میں اضافہ ہو جاتا ہے، جس پر قابو پانے کے لئے حد مقرر کی جاتی ہے، بعض اوقات مروجہ ٹیکسوں سے حکومت کے اخراجات پورے نہیں ہوتے اور مزید ٹیکس لگانا بھی مشکل ہوتا ہے، تو مرکزی بینک کا ریزرو (Reserve) بڑھا کر اور بینکوں کو سرکاری تمسکات خریدنے کا پابند کر کے عوام کے سرمایہ کا ایک بڑا حصہ حکومت قرض لے لیتی ہے۔

سقف الاعتماد یعنی (Credit ceiling) کے تحت روایتی بینکوں کے قرضے دینے کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے بینک یہ جائزہ لیتا ہے کہ جو شخص قرض لینا چاہتا ہے وہ مدت مقررہ پر قرضہ واپس بھی کر دے گا یا نہیں؟ اس میں وہ قرض لینے والے کی جائیدادوں سرمایوں اور اثاثوں وغیرہ کا جائزہ لیتا ہے، اگر وہ جائزہ میں کامیاب اترے تو بینک ایک حد مقرر کر دیتا ہے کہ اتنی مدت میں ہم اتنا قرض دینے کے لئے تیار ہیں، جو حسب ضرورت وقتاً فوقتاً لیا جا سکے گا، قرض کی حد مقرر کرنے کو عربی میں ,,تحدید السقف،، اور انگریزی میں (Sanction of Limit) کہتے ہیں، اس تحدید کے بعد اس شخص کے لئے بینک میں اکاؤنٹ کھولدیا جاتا ہے، اس اکاؤنٹ سے وہ جب چاہے اس حد کے اندر رہتے ہوئے جتنا چاہے قرض لے سکتا ہے اس اکاؤنٹ کھولنے پر بہت خفیف شرح سے بینک سود بھی لیتا ہے، مثلاً 5% یا 1% وغیرہ، اور جب قرضہ لے لیتا ہے تو پھر باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے، اس مدت کے دوران عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک رقم بینک سے لے کر اس میں سے جو بچ جائے وہ دوبارہ بینک میں واپس کر دی جاتی ہے، اس طرح رقم لینے اور واپس کرنے کا سلسلہ چلتا

رہتا ہے، مدت کے اختتام پر بینک حساب کرتا ہے کہ کتنی رقم کتنے روز اس کے پاس رہی، اس حساب سے اس سے سود وصول کیا جاتا ہے۔

حکومت کو بھی بعض اوقات قصیر المیعاد اور طویل المیعاد قرضوں پر سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، حکومت جو قصیر المیعاد قرضے لیتی ہے اس کی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہوتی ہے، قصیر المیعاد قرضے کے حصول کے لئے حکومت یا تو بینک سے براہِ راست قرض لیتی ہے یا خزانے کی ہنڈیاں (Treasury Bills) جاری کر کے عوام الناس اور بینکوں کو انہیں خریدنے کی دعوت دیتی ہے۔

قلیل مدت کے قرضوں کے فوائد:

قصیر المیعاد یعنی قلیل مدت کا قرضہ حسبِ ذیل فوائد کا مالک ہوتا ہے:

۱۔ اگر کسی وقت حکومت کے اخراجات آمدنی سے بڑھ جائیں تو اس کے لئے قلیل مدت کے قرضہ کی مدد سے خسارے کو فوری طور پر پورا کرنا آسان ہوتا ہے۔

۲۔ تجارتی بینک حکومت کو قلیل مدت کا قرضہ مہیا کر کے کافی فائدے میں رہتے ہیں کیونکہ حکومت ایسے قرضہ سرکاری ھنڈیوں کی فروخت کی مدد سے حاصل کرتی ہے، تجارتی بینک ان کو خرید لیتے ہیں، اسطرح ان کا سرمایہ ایک تو محفوظ رہتا ہے، دوسرے انہیں مقابلۃً زیادہ منافع ملتا ہے۔

۳۔ اگر بازار میں شرح سود زیادہ ہو اور حکومت کو اپنے مختلف منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کیلئے کثیر مقدار میں سرمایئے کی ضرورت پڑ جائے، تو وہ قلیل المیعاد قرضے کی بدولت پورا کر سکتی ہے۔

طویل المیعاد سرمایہ سے مراد یہ ہے کہ جب حکومت کو کثیر مدت میں سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، اور قلیل مدت کے قرضے مطلوبہ مقاصد پورا نہیں کر پاتے تو پھر طویل مدت کے قرضے حاصل کرتی ہے، ان کیلئے وہ تمسکات اور کفالتیں جاری کرتی ہے۔

طویل مدت کے قرضوں کے فوائد:

طویل مدت کے قرضے حسبِ ذیل فوائد کے مالک ہوتے ہیں:

۱۔ طویل مدت کے قرضے جنگ جیسی اہم ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کیلئے ناگزیر ہوتے ہیں۔

۲۔ ایسے قرضے حکومت کو اپنے اہم اور بڑے بڑے منصوبوں مثلاً ڈیموں، بیراجوں کی تعمیر، نہروں کی کھدائی، ریلوے اور بجلی گھروں کی تعمیر، ذرائع رسل ورسائل کی تنصیب اور ہسپتالوں وغیرہ کے قیام میں بڑی مدد دے سکتے ہیں، چونکہ ایسے قرضے کی واپسی کے لئے معقول مدت مقرر ہوتی ہے اس لئے ان قرضوں کو پیداواری مقاصد کے استعمال میں لاکر قرضے کی اہمیت کے تقاضوں سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔

۳۔ حکومت کے لئے طویل مدت کے قرضوں کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ جب یہ دیکھتی ہے کہ اسے طویل مدت کا نیا قرضہ کم شرح سود پر مل سکتا ہے، تو وہ نیا قرضہ حاصل کر کے قلیل مدت کا زیادہ شرح والا قرضہ یا طویل مدت کا پرانا زیادہ شرح والا قرضہ ادا کر کے اپنے بوجھ کو ہلکا کر سکتی ہے۔

۴۔ تجارتی بینکوں، عام افراد اور انشورنس کمپنیوں کے لئے طویل مدت کے قرضوں میں سرمایہ کاری کرنا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔

۵۔ اگر طویل مدت کا قرضہ کم شرح پر حاصل ہو رہا ہو تو حکومت کم شرح پر تعمیرات عامہ کا کام خود سرانجام دے کر ضروری بچت کر سکتی ہے۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مشارکہ کا کردار

ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قصیر المیعاد اور طویل المیعاد سرمائے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے مشارکہ کا طریقہ روبعمل لایا جاسکتا ہے یا نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قصیر المیعاد قرضوں میں خواہ وہ حکومتی قرضے ہوں یا عوامی قرضے اگر نفع آور کام کے لئے

ہوں تو ورکنگ کیپٹل فائنانسنگ(Working Capital Financing) میں مشارکہ کا طریق اپنایا جاسکتا ہے، جسکی مکمل تفصیل اسی باب میں اسی عنوان سے ذکر کی گئی ہے، البتہ غیر نفع بخش یا غیر پیداواری کام کے لئے قرضہ ہو مثلاً اخراجات اور بلوں کی ادائیگی وغیرہ(Over head expenses) جن کا براہِ راست پیداوار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، یا وہ انتہائی کم مدت کے لئے قرضے لئے جاتے ہوں کہ انہیں شرکت اور مضاربت کے اصول پر حاصل کرنا عملی پیچیدگیوں کا باعث بنے گا، تو اس قسم کے قرضے غیر سودی بینکاری میں بلا سود جاری کئے جائیں گے، البتہ ان کے حساب کتاب کے اخراجات کی تکمیل اس طرح کی جاسکتی ہے کہ ہر قرض کی درخواست کیلئے ایک فارم ہوگا جو قرض مانگنے والوں کو قیمتاً فراہم کیا جائیگا، جسمیں انتظامی کاموں کی اجرت بھی شامل ہوگی، اور قیمت میں قرض کی مقدار کی کمی زیادتی سے کوئی فرق نہیں رکھا جائیگا، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ بینک انتظامی کاموں کی فیس اجرت مثل سے زیادہ مقرر نہ کرے، اسکی نظیر یہ مسئلہ ہے کہ فتوے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، مگر کتابت فتوٰی کی اجرت لینا جائز ہے، فقہائے کرامؒ نے لکھا ہے کہ کتابت کی اجرت اجرت مثل سے تجاوز نہیں کرنی چاہیے۔

یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ بینک کے لئے غیر سودی قرض دینے کا محرک کیا ہوگا؟ اور وہ کس بنیاد پر یہ رقم ایک قطعی غیر نفع بخش کام میں لگائے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ غیر سودی نظام بینکاری میں ہر بینک کو اسکی امانتوں کا اکثر حصہ غیر سودی قرض کی صورت میں حاصل ہوتا ہے، اسلئے کہ جدید بینکوں کا تجربہ یہ ہے کہ کرنٹ اکاؤنٹ میں جمع کی جانے والی رقمیں بحیثیت مجموعی فکسڈ ڈیپازٹ کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہیں، عموماً اول الذکر رقمیں کل امانتوں کا ساٹھ فیصد (60%) اور مؤخر الذکر کل امانتوں کا چالیس فیصد (40%) ہوتی ہیں، ان ساٹھ فیصد رقوم کا ایک حصہ مد محفوظ (Reserve) میں رکھ کر باقی تمام سرمائے کو بینک کے نفع بخش کام میں لگایا جاسکتا ہے، مرکزی بینک عام بینکوں کو اس عظیم سہولت سے فائدہ اٹھانے کی اجازت صرف اس صورت میں دے گا، جب وہ خود اس قسم کے قصیر المیعاد قرضے بلا سود جاری کرنے پر رضامند ہوں۔

طویل المیعاد قرضوں میں خواہ وہ حکومتی قرضے ہوں یا عوامی قرضے اگر وہ نفع آور مقاصد کے لئے طلب کئے گئے ہوں تو پروجیکٹ فائنانسنگ(Project financing) میں مشارکہ کا طریقہ استعمال کیا جاسکتا ہے، جسکی تفصیل آگے

اسی باب میں ذکر کی گئی ہے، البتہ اگر غیر پیداواری کام کے لئے قرضہ لیا جارہا ہے مثلاً ایٹمی توانائی، اسلحہ اور سامانِ جنگ بنانے والے کارخانے، آب پاشی کے بڑے بڑے بند اور ان سے متعلق پانی سے بجلی تیار کرنے والے کارخانے، نیز نقل وحمل اور رسل ورسائل (Transportation and Highways) سے متعلق بیشتر اسکیموں میں قرض لینے والوں کے ساتھ شرکت کے اصول پر تو سرمایہ فراہم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ انکی پیداوار یا تو فروخت نہیں ہوتی یا ایک ضروری سماجی خدمت کے طور پر ایسے معاوضوں کے بدلے فراہم کی جاتی ہے، جنکی تعیین میں نفع نقصان کے بجائے دوسری مصالح کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے، لہذا اس کے بجائے انکی ضرورت کی تکمیل کیلئے ایک دوسرا طریقہ تجویز کیا گیا ہے، جسے مشارکہ سرٹیفکیٹ کا استعمال کہا جاتا ہے، یہ طریقہ تفصیل کے ساتھ پانچویں باب میں دو عنوانوں یعنی "حکومتی قرضوں میں مشارکہ سرٹیفکیٹ کا استعمال" اور "کن کن سرکاری شعبوں میں مشارکہ سرٹیفکیٹ استعمال ہوتا ہے" میں ذکر کیا گیا ہے، لہذا اس قسم کے قرضوں کے لئے وہی طریقہ استعمال کیا جائیگا۔

تمویل (یعنی Financing) کے مختلف شعبوں میں مشارکہ کا استعمال

تمویل (یعنی Financing) کے جن مختلف شعبوں میں مشارکہ کا استعمال کیا جاسکتا ہے وہ درج ذیل ہیں:

الف: محدود مقصد کا مشارکہ۔

ب: عامل سرمایہ کی تمویل (Working Capital Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

ج: منصوبوں کی تمویل (Project Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

د: درآمد کی تمویل (Inport Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

ہ: برآمد کی تمویل (Export Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

ز: روزانہ پیداوار کی بنیاد (Daily Product Basis) پر منافع کا حساب اور اسکی شرعی حیثیت۔

ح: ہاؤس فائنانسنگ (House Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

ط: آٹو موبائل فائنانسنگ (Auto Mobile Financing) میں مشارکہ کا استعمال۔

محدود مقصد کا مشارکہ

محدود مقصد کے مشارکہ کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص یا ادارے کو بعض اوقات اپنے کاروبار کے اندر کسی مخصوص مقصد کے لئے سرمایہ کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً تاجر گندم خرید کر فروخت کرنا چاہے تو کسی مالیاتی ادارے یا بینک سے سرمایہ قرض لینا پڑتا ہے، تو اس قسم کے محدود مقاصد کے لئے سرمایہ فراہم کرنے کے لئے سودی قرضے کے بجائے مشارکہ یا مضاربہ کا طریقہ اپنایا جاسکتا ہے، محدود مقصد کے کاروبار میں روزمرہ کی چھوٹی موٹی تجارتیں اور درآمد و برآمد بھی شامل ہیں، درآمد اور برآمد میں مشارکہ اور مضاربہ کے ذریعہ تمویل کا ذکر انشاءاللہ آگے کیا جائے گا، اس سے قبل محدود مقصد کے مشارکہ کی مختلف شکلیں مختصر طور پر ذکر کی جاتی ہیں۔

محدود یا مخصوص مقصد کے کاروبار میں مشارکہ سے ہماری مراد مخصوص معاملات کی حد تک مشارکہ اور مضاربہ کا استعمال ہے، مثلاً اگر کوئی تمویلی ادارہ یا بینک اس مقصد کے لئے زید کو سرمایہ فراہم کرے کہ وہ اس سے روئی خرید کر آگے فروخت کرے گا، اور جو نفع حاصل ہوگا اسمیں دونوں شریک ہوں گے، یہ مضاربت کی صورت ہے، یا مثلاً زید اور بینک سرمایہ اکٹھا کریں اور زید اس سرمایہ سے روئی خرید کر آگے فروخت کرے، اور جو نفع حاصل ہو اسے باہم تقسیم کریں تو یہ صورت شرکت کی ہوگی، اسی طرح اگر بینک سرمایہ فراہم کرے تاکہ زید اس سے کسی صنعت کا خام مال خرید کر اس سے کوئی چیز بنا کر فروخت کرے، اور جو نفع حاصل ہو اس میں بینک بھی شریک ہو، اور اسے باہم تقسیم کیا جائے، تو یہ بھی مشارکہ کی ایک شکل ہے، اس طرح کی تمام صورتیں جائز ہیں، بشرطیکہ ان میں کوئی ایسی بات نہ پائی جائے جو گذشتہ صفحات میں ذکر کردہ مشارکہ اور مضاربہ کے بنیادی اصولوں کے منافی ہو۔

عامل سرمایہ کی تمویل(Working Capital Financing)

عام طور سے تجارتی ادارے عامل سرمائے کی تمویل کے لئے بینک سے جو قرض لیتے ہیں اسکا مطلب یہ ہے کہ تجارتی ادارے بعض اوقات کاروبار کے رواں اخراجات، مثلاً سامان تجارت کی خریداری اور خام مال وغیرہ خریدنے کے لئے قرضے حاصل کرتے ہیں، اس کو عربی میں رأس المال العامل، اور انگریزی میں (Working Capital) کہا جاتا ہے۔ جب عامل سرمایہ کی تمویل(Working Capital Financing) کی ضرورت ہو تو اس وقت بھی مشارکہ کی سہولت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، اور اس کا طریقہ کار یوں ہوگا:

جاری کاروبار کی قیمت کا اندازہ دونوں فریق باہمی رضامندی سے کریں گے، روایتی مشارکہ کو بیان کرتے ہوئے یہ بات گذر چکی ہے، کہ امام مالکؒ کے مذہب میں شرکت کے سرمایہ کا نقد ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ جامد اثاثے بھی قیمت لگا کے سرمایۂ شرکت بن سکتے ہیں[1]، اس صورت میں ان کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے کاروبار کی مالیت سرمایہ کار کی سرمایہ کاری متصور ہوگی، اور نیا سرمایہ کار جو سرمایہ فراہم کرے گا وہ بھی اسی سرمایہ کا ایک حصہ سمجھا جائے گا، اس طرح ایک عقد شرکت ایک متعین مدت کے لئے (مثلاً چھ ماہ یا ایک سال وغیرہ کے لئے) وجود میں آجائے گا، اور اس میں یہ طے کیا جائے گا کہ سرمایہ کار کو نفع اس حساب سے دیا جائے کہ وہ اسکے لگائے ہوئے سرمایہ کی شرح سے زائد نہ ہو، کیونکہ وہ خود کاروبار میں کام بھی نہیں کر رہا ہے، لہذا نفع کی شرح اس کے لگائے ہوئے سرمایہ سے زیادہ طے نہیں کی جاسکتی، مدت کے اختتام پر کاروبار کے تمام جامد اور غیر جامد اثاثوں کی دوبارہ قیمت لگائی جائے گی، پھر قیمت لگانے کے نتیجہ میں جو نفع ظاہر ہوگا، اسے باہم طے کردہ شرح سے تقسیم کرلیا جائے گا۔

---

(۱) اس بارے میں مکمل تفصیلی بحث تیسرے باب کے عنوان "کیا سرمائے کا نقد ہونا ضروری ہے" کے تحت گذر چکی ہے، لہذا اس سے متعلق دلائل اسی جگہ ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔

اگرچہ روایتی تصور کے مطابق نفع اسوقت تک تقسیم نہیں کیا جاسکتا جب تک تمام اثاثے نقد نہ بنالئے گئے ہوں، لیکن یہ بات تیسرے باب میں ,, سرمایہ کو نقد بنائے بغیر نفع کی تقسیم،، کے ذیل میں گذر چکی ہے، کہ مشارکہ میں تو نفع کی تقسیم کے لئے سرمایہ کو نقد بنانا لازمی نہیں ہے، البتہ مضاربت میں نفع کی تقسیم سے قبل سرمایہ نقد بنانا ضروری ہے، اثاثوں کو نقد بنانے کے لئے حکمی طور پر نقد بنانے کا طریقہ بھی استعمال کیا جاسکتا ہے، یعنی اثاثوں کی قیمت لگا کر سرمایہ اور نفع کی تعیین کی جاسکتی ہے، کیونکہ اس طریقۂ کار پر عمل کرنے سے شریعت اور فقہ کے کسی بھی اصول کی صریح خلاف ورزی لازم نہیں آتی، اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاروباری شریک (Working Partner) سرمایہ کار کا کاروبار میں لگایا ہوا حصہ (Share) خرید چکا ہے، اور ان کے حصہ (Share) کی قیمت کی تعیین حساب کتاب اور تقویم کے جدید طریقوں (Valuation) کے ذریعہ ہوگی، اور پھر اسی حساب سے دونوں پر نفع بھی تقسیم ہوگا۔

مثال کے طور پر زید کے کاروبار (یا کمپنی) کی مجموعی مالیت ۳۰ ملین ڈالر ہے، اور کوئی بینک (یا مالیاتی ادارہ) اس میں بیس ملین کی فائنانسنگ (تمویل) کرتا ہے، گویا کہ اب کاروبار کی کل مالیت ۵۰ ملین بن جاتی ہے، بالفاظ دیگر زید کے کاروبار کی مجموعی مالیت ۳۰ یونٹ ہے، بینک اسمیں مزید ۲۰ یونٹ لگا دیتا ہے، اس طرح تمام یونٹوں کی مالیت ۵۰ یونٹ ہو جاتی ہے، گویا کہ چالیس فیصد بکر نے اور ساٹھ فیصد زید نے لگایا، اور یہ طے کر لیا کہ مدت کے اختتام پر خالص منافع کا بیس فیصد بینک لے گا، اور ۸۰ فیصد زید لے گا، مدت کے اختتام پر کاروبار کی مجموعی مالیت سو یونٹ ہو گئی، اب اگر زید کاروبار جاری رکھنا چاہتا ہے، جبکہ بینک علیحدہ ہونا چاہتا ہے، تو زید بینک کا حصہ خرید لے تو اسے اب ۴۰ یونٹ بینک سے خریدنے چاہئیں، کیونکہ بینک کل کاروبار کے چالیس فیصد کا مالک تھا، اور اب جبکہ کاروبار کے ۱۰۰ یونٹ ہو چکے ہیں، لہذا اس کا چالیس فیصد یعنی چالیس یونٹ زید کو خریدنے چاہئیں، اس میں بیس یونٹ تو اس کے اصل اثاثے ہو گئے، اور بیس یونٹ نفع کے ہو گئے، کیونکہ کل پچاس یونٹ نفع ہوا، جس کا ۴۰ فیصد بیس یونٹ ہوئے، اس صورت میں نفع ان کے سرمایہ کے تناسب سے ہوا، لیکن در حقیقت طے یہ کیا گیا تھا، کہ نفع کا تناسب ۲۰ اور ۸۰ ہوگا، یعنی کل نفع کا بیس فیصد بینک لے گا، لہذا یہ ضروری ہے کہ اصل اثاثوں کی مقدار پر جو بھی اضافہ ہوگا اسے باہمی طے کردہ تناسب سے تقسیم کیا جائے، لہذا مذکورہ صورت میں ۵۰ یونٹ کا اضافہ ہوا جو کہ نفع متصور ہوگا، اس لئے اس کا بیس فیصد یعنی ۱۰ یونٹ بینک کو بطور نفع ملیں گے، اس طرح اب بینک کو حاصل ہونے والے تمام یونٹوں کی تعداد ۳۰ یونٹ ہو جائے گی، جن میں سے ۲۰ یونٹ اس کے اصل اثاثے ۱۰ یونٹ اور اس پر نفع ہوا۔

پیچھے ذکر کردہ مثال کو درج ذیل نقشے کی مدد سے بھی سمجھا جاسکتا ہے:

The Map of Working Capital Financing

عامل سرمایہ کی تمویل میں مشارکہ کا نقشہ

1

زید کی کمپنی کی مالیت (فائنانسنگ سے قبل)
30 ملین ڈالر

←

2

بینک کی فائنانسنگ
20 ملین ڈالر

←

3

طے کردہ شرح نفع
زید کے لئے: 80٪
بینک کے لئے: 20٪

4

زید کی کمپنی کی کل مالیت (فائنانسنگ کے بعد)
50 ملین ڈالر

←

5

کاروبار کی انتہاء	
حاصل شدہ نفع:	50 ملین
سابقہ سرمایہ:	50 ملین
ٹوٹل مالیت:	100 ملین ڈالر

←

6

اثاثوں اور نفع کی تقسیم		
بینک کا حصہ	از نفع	20 ملین
	از سرمایہ	10 ملین (یعنی کل نفع کا 20٪)
زید کا حصہ	از نفع	40 ملین ڈالر
	از سرمایہ	30 ملین (یعنی نفع کا 80٪)

یہی مثال درج ذیل گراف میں بھی ملاحظہ فرمائیں:
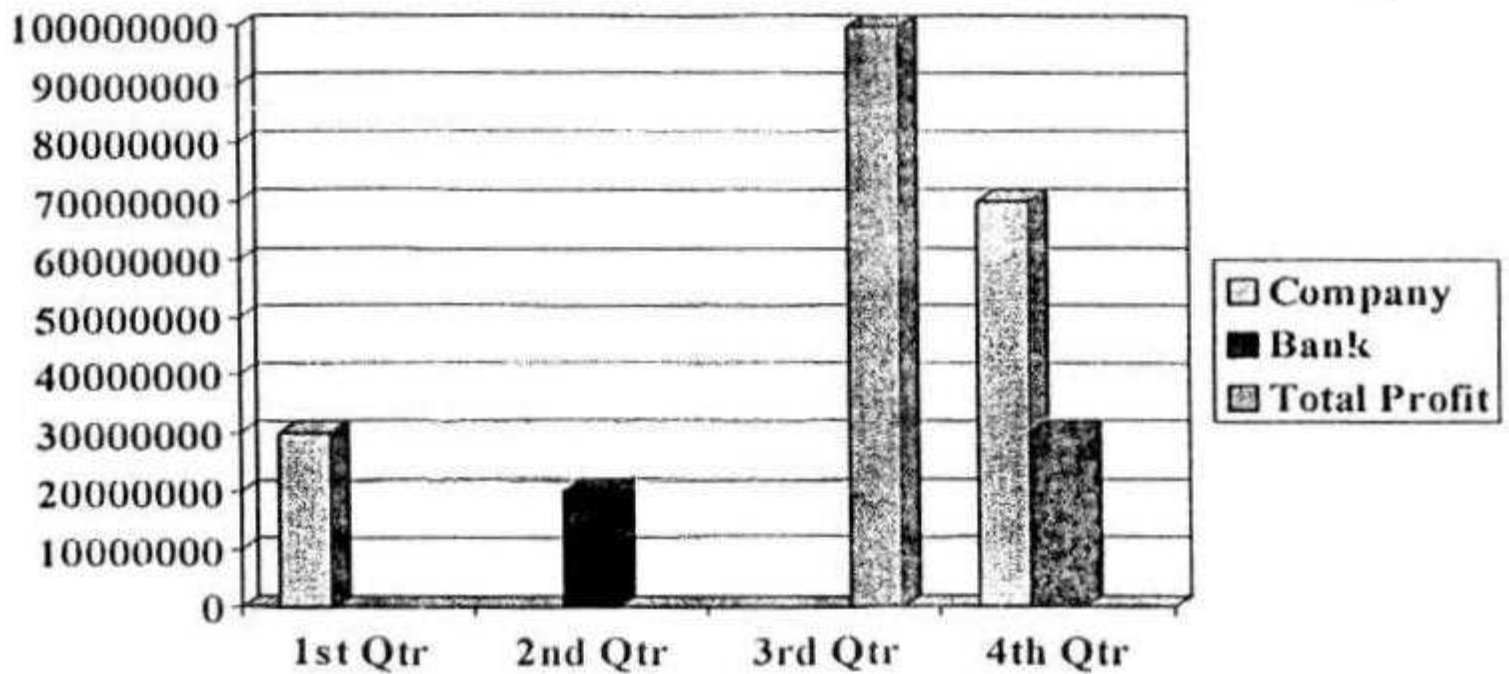
تاہم نقصان کی صورت میں مجموعی اثاثے ان کے لگائے ہوئے سرمایے کے تناسب سے ہی تقسیم ہوں گے، مثلاً سرمایہ کاری کا تناسب مذکورہ مثال میں ۴۰ اور ۶۰ فیصد تھا، اور مجموعی سرمایہ ۵۰ یونٹ تھا، جن میں سے ۱۰ یونٹ کا نقصان ہوگیا، تو دس یونٹوں کا ۴۰ فیصد یعنی ۴ یونٹ بینک برداشت کریگا، اور ۶۰ فیصد یعنی ۶ یونٹ زید برداشت کریگا، گویا کہ اب کل یونٹوں میں سے ۱۶ یونٹ بینک کو اور ۲۴ یونٹ زید کو ملیں گے، اور اگر زید بینک کے یونٹ خریدنا چاہتا ہے تو اسے ۱۶ یونٹ کی قیمت دے کر بینک کے یونٹ حاصل کرنے ہوں گے۔

منصوبوں کی تمویل (Project Financing) میں مشارکہ کا استعمال

بڑے بڑے منصوبوں کیلئے جو قرضے لئے جاتے ہیں، ان کو عربی میں "تمویل المشاریع"، اور انگریزی میں پروجیکٹ فائنانسنگ (Project Financing) کہا جاتا ہے، پروجیکٹ فائنانسنگ میں روایتی مشارکہ کا طریقہ آسانی سے اپنایا جاسکتا ہے، اگر ایک سرمایہ کار پورے پروجیکٹ یا پورے منصوبے میں اپنی سرمایہ کاری کرنا چاہتا ہو تو مضاربہ کا طریقہ روبعمل لایا جائے گا، اور اگر کئی سرمایہ کار مل کر اس پروجیکٹ میں سرمایہ کاری کرنا چاہیں تو مشارکہ کے طریقے پر عمل کیا جائے گا، اگر کاروباری محنت صرف ایک شریک برداشت کرے البتہ سرمایہ دونوں شریک لگائیں تو مشارکہ اور مضاربہ کے مجموعے کے سابقہ بیان کردہ اصولوں پر عمل کیا جائے گا۔

چونکہ پروجیکٹ فائنانسنگ میں مشارکہ یا مضاربہ کا عقد پروجیکٹ کی بالکل ابتداء ہی سے کرلیا جائیگا اس لئے سرمایہ اور اثاثوں کی تعیین اور تخمینہ لگانے میں کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئیگی، (کیونکہ ہر شریک کے لگائے ہوئے سرمایہ کی تناسب سے اثاثے ہوں گے)، البتہ جب کوئی سرمایہ کار مشارکہ سے علیحدہ ہونا چاہے، جبکہ دوسرا کاروبار جاری رکھنے کا مطالبہ کرے تو دوسرا شخص پہلے شخص سے اس کا حصہ (Share) باہمی رضامندی سے قیمت طے کرکے خرید سکتا ہے، اس طرح سرمایہ کار وہ رقم وصول کرلے گا، جس کی اس نے سرمایہ کاری کی تھی، اگر کاروبار میں نفع بھی ہوا ہو تو اسکو اس میں سے اس کا حصہ بھی مل جائے گا، (اس بارے میں مکمل فقہی بحث پیچھے تیسرے باب کے عنوان "سرمایہ کو نقد بنائے بغیر نفع کی تقسیم کے تحت تنضیض حکمی"، کے مسئلے میں گذر چکی ہے۔

حصہ (Share) کی قیمت متعین کرنے کے بنیادی طریقے کے بارے میں بحث تفصیل کے ساتھ عامل سرمایہ کی تمویل (Working Capital Financing) کے بیان میں گذر چکی ہے۔

ایک طریقہ کاروبار جاری رکھنے کا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کاروباری فریق اپنے دوسرے (علیحدہ ہونے والے) شریک کا حصہ کسی تیسرے شخص کو فروخت کر کے کاروبار جاری رکھے، اور اگر اس مشارکہ کے عقد میں باقاعدہ مشارکہ سرٹیفکیٹ بھی جاری کئے گئے ہوں تو انہیں ثانوی بازار (Secondry Market) میں فروخت کر کے بھی کوئی شریک شرکت سے علیحدہ ہو سکتا ہے، اس صورت میں مشارکہ سرٹیفکیٹ خریدنے والا شریک علیحدہ ہونے والے شریک کا قائم مقام بن جائے گا، مشارکہ سرٹیفکیٹ کی تفصیلات آگے انشاء اللہ پانچویں باب میں ذکر کی جائیں گی۔

در آمد کی تمویل (Import Financing)

در آمد کی تمویل میں بھی مشارکہ کا طریقہ استعمال کیا جا سکتا ہے، موجودہ دور میں در آمد (Import) اور بر آمد (Export) بین الاقوامی تجارت کا سب سے اہم ذریعہ ہیں، اور اس تجارت میں بینک کا کردار کسی سے مخفی نہیں ہے، کیونکہ بینک کی وکالت اور معرفت کے بغیر در آمد اور بر آمد بہت مشکل ہے اس سے پہلے کہ آپ کے سامنے مشارکہ کے تحت در آمد اور بر آمد کی تمویل کا طریقہ کیا جائے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصراً در آمد اور بر آمد کا طریقہ اور اس میں بینکوں کا کردار بیان کر دیا جائے، تاکہ اسکی روشنی میں در آمد اور بر آمد کی تمویل میں مشارکہ کے طریق کار کا جائزہ لیا جا سکے۔

جب کوئی شخص دوسرے ملک سے کوئی چیز در آمد (Import) کرنا چاہتا ہے، تو دوسرے ملک کا تاجر اس بات کا اطمینان چاہتا ہے کہ جب میں مطلوبہ سامان خریدار کو بھیجوں گا، تو وہ واقعتاً قیمت کی ادائیگی کر دے گا، لہذا در آمد کنندہ (Importer) بر آمد کنندہ (Exporter) کو اعتماد دلانے کے لئے بینک سے ایک ضمانت نامہ حاصل کرتا ہے، جس میں بینک بیچنے والے کو اس بات کی ضمانت دیتا ہے، کہ یہ چیز فلاں شخص کو فروخت کر دی جائے، تو ادائیگی کا ذمہ دار میں ہوں گا،

اسکو عربی میں ,, خطاب الاعتماد،، کہتے ہیں، اور انگریزی میں (Letter of Cradit) کہتے ہیں، آسانی کے لئے ایل سی (L. C) کہدیا جاتا ہے، یہ ضمانت نامہ حاصل کرنے کو اردو میں ایل سی کھلوانا اور عربی میں فتح الاعتماد کہتے ہیں، بینک ایل سی کھول کر بر آمد کنندہ کے بینک کو بھیج دیتا ہے، بر آمد کنندہ کے بینک کو (Negotiating Bank) کہتے ہیں، ایل سی پہونچنے کے بعد وہاں سے مال جہاز میں بک کرادیا جاتا ہے، اور جہاز راں کمپنی مال بک ہونے کی رسید جاری کرتی ہے، اس رسید کو عربی میں ,, بولیصة الشحن،، اور انگریزی میں (Bill of Lading) کہتے ہیں، بر آمد کنندہ کا بینک یہ بل آف لیڈینگ بمعہ متعلقہ کاغذات کے ایل سی کھولنے والے بینک کو بھیجتا ہے، در آمد کنندہ اپنے بینک سے یہ کاغذات وصول کر کے ایل سی سے اسکی مطابقت کرتا ہے، ان کاغذات میں مال کی جو تفصیل لکھی گئی ہے وہ آرڈر کے خلاف ہو تو کاغذات واپس کر دیئے جاتے ہیں، اگر کاغذات کی تفصیل ایل سی کے موافق ہو تو یہ کاغذات دکھا کر بندرگاہ سے مال وصول کیا جاتا ہے، اور بینک عموماً یہ کاغذات در آمد کنندہ کو اس وقت دیتا ہے جب وہ قیمت کی ادائیگی کر دے، ادائیگی کے لئے بھی بینک اور در آمد کنندہ کے درمیان مختلف معاہدے ہوتے ہیں، کبھی در آمد کنندہ ایل سی کھلواتے وقت ہی پوری رقم کی ادائیگی کر دیتا ہے، اس صورت کو اصطلاح میں فل مارجن (Full Margin) پر ایل سی کھلوانا کہتے ہیں، عربی میں اس کو ,, فتح الاعتماد بغطاء کامل،، کہا جاتا ہے، کبھی ساری ادائیگی بینک سے کاغذات چھڑوانے کے وقت ہوتی ہے، اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ زیرو مارجن پر ایل سی کھلوائی گئی، کبھی ایل سی کھولنے کے وقت تھوڑی ادائیگی کی جاتی ہے، اس صورت میں کل رقم کا جتنا فیصد ادا کیا گیا ہے، اسے اتنے ہی فیصد مارجن پر ایل سی کھلوانا کہتے ہیں، مثلاً کل قیمت کا ۲۵ فی صد کھلواتے وقت بینک میں جمع کرادیا گیا تو کہا جائے گا کہ یہ ایل سی پچیس فیصد مارجن پر کھلوائی گئی ہے۔

کبھی یہ معاہدہ بھی ہوتا ہے کہ کاغذات آنے پر بینک اپنے پاس سے ادائیگی کر دے گا، اور در آمد کنندہ ایک معین مدت کے بعد ادائیگی کرے گا، اس صورت میں بینک کا قرض در اٗمد کنندہ کے ذمہ ہو جاتا ہے، جس پر عموماً وہ سود لیتا ہے۔

ایل سی پر فیس

بینک کو ایل سی کھولنے میں جو خدمات ادا کرنی پڑتی ہیں ان پر بینک معاوضہ لیتا ہے، در آمد کنندہ کے بینک کی تین خدمات ہوتی ہیں:

۱:۔ وکالت (Agency) یعنی بینک در آمد کنندہ کا وکیل بن کر بر آمد کنندہ سے معاملات کرتا ہے، خریدار کے کاغذات بر آمد کنندہ کو بھیجتا ہے، اور بر آمد کنندہ کے بھیجے ہوئے کاغذات وغیرہ در آمد کنندہ کو سپرد کرتا ہے، ان خدمات پر بینک اجرت لیتا ہے۔

۲:۔ ضمانت (Guarantee) یعنی اس بات کی ضمانت لیتا ہے کہ اگر خریدار نے رقم ادا نہ کی تو وہ رقم ادا کرے گا، اس پر بھی اجرت لیتا ہے۔

۳:۔ قرض (Credit) یعنی جب تاجر قیمت کی ادائیگی فوراً نہ کرے اور بینک اسکی طرف سے ادائیگی کر دے تو یہ رقم در آمد کنندہ کے ذمہ اس کا قرض ہو جاتی ہے، جس پر وہ در آمد کنندہ سے سود وصول کرتا ہے۔

قرضہ دو نوعیت کا ہو سکتا ہے، کبھی تو باقاعدہ قرضہ لیا جاتا ہے، جبکہ یہ معاہدہ ہو کہ بروقت ادائیگی بینک کریگا، اور در آمد کنندہ اس کے کچھ عرصہ بعد بینک کو ادائیگی کرے گا، یہ ایک الگ معاہدہ ہوتا ہے، ایل سی کی فیس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اس پر الگ سے باقاعدہ شرح سے سود لیا جاتا ہے۔

کبھی باقاعدہ تو قرضہ نہیں لیا جاتا لیکن خود بخود معاملات کے درمیان میں بینک کا ایل سی کھلوانے والے (در آمد کنندہ) کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے، یہ اس طرح ہوتا ہے کہ کبھی ایل سی کھلواتے وقت در آمد کنندہ بالکل ادائیگی نہیں کرتا یا تھوڑی بہت مثلاً کل رقم کا ۲۵ فیصد ادا کر دیا جاتا ہے، اس صورت میں جب ادائیگی کے بغیر یا کچھ ادائیگی کے ساتھ ایل سی کھولی جائے، تو کاغذات آتے ہی بینک ادائیگی کر دے گا، بشرطیکہ سامان کے کاغذات ایل سی کی شرائط کے مطابق ہوں اور کوئی عدم مخالفت (discrlosny) نہ پائی گئی ہو، مگر در آمد کنندہ کی طرف سے کسی وجہ سے ادائیگی میں چند دن تاخیر ہو جاتی ہے، ایسی صورت میں اتنے دن کا قرضہ خو بخود ہو جاتا ہے، اس قرضہ پر بھی سود لیا جاتا ہے۔

دوسری طرف بر آمد کنندہ کا بینک ضمانت کسی چیز کی نہیں دیتا یہاں بینک کے دو ہی کام ہوتے ہیں، جن پر بینک معاوضہ لیتا ہے:

۱۔ وکالت ۲۔ قرض۔ وکالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ بر آمد کنندہ (Exporter) کا وکیل ہے، اور یہاں قرض

اس طرح ہوتا ہے کہ ایل سی میں کبھی تو معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات آتے ہی خریدار کی طرف سے قیمت کی ادائیگی ضروری ہوگی، اس کو (L.C. at sight) کہتے ہیں، اس صورت میں بر آمد کنندہ کے بینک کو کوئی قرض نہیں دینا پڑتا، کبھی معاہدہ یہ ہوتا ہے کہ کاغذات پہونچنے کے اتنے دن بعد خریدار کی طرف سے ادائیگی ہوگی، تو ایسی صورت میں اگر بر آمد کنندہ کا بینک بر آمد کنندہ تاجر کو فوراً قیمت کی ادائیگی کردے تو یہ بینک کا بر آمد کنندہ کے ذمہ قرض ہو جائے گا۔

خلاصہ یہ کہ در آمد کنندہ کے پاس بعض اوقات در آمد کے لئے رقم نہیں ہوتی، یا رقم تو ہوتی ہے مگر وہ اس رقم کو در آمد پر لگا کر منجمد نہیں کرنا چاہتا، تو وہ بینک سے قرض لے کر در آمد کرتا ہے، (یعنی کم مارجن یا زیرو مارجن پر ایل سی کھلواتا ہے، جسکی وجہ سے قیمت کی ادائیگی بینک کر دیتا ہے اور اس طرح یہ قیمت در آمد کنندہ کے ذمہ بینک کا قرضہ بن جاتی ہے)، در آمد کے لئے بینک جو ایسا قرضہ دیتا ہے اسے عربی زبان میں ,,تمویل الواردات،، اور انگریزی میں (Import Financing) کہا جاتا ہے، ایسے ہی بر آمد کے لئے بھی بینک سے جو قرضہ لیا جاتا ہے، یعنی کسی تاجر کے پاس باہر کے کسی ملک سے اشیاء کی خریداری کا آرڈر ہوتا ہے، لیکن وہ اشیاء تیار یا مہیا کرنے کے لئے اسے رقم کی ضرورت ہوتی ہے، جو وہ بینک سے قرض لیتا ہے، اور قرض لے کر مطلوبہ اشیاء فراہم کر کے بر آمد کرتا ہے، اس صورت میں بینک بر آمد کنندہ کو جو قرض دیتا ہے، اسکو ,,تمویل الصادرات،، اور انگریزی میں (ExportFinancing) کہتے ہیں۔

در آمد کی تمویل (Import Financing) میں مشارکہ کا کردار

پہلے یہ ذکر کیا جاچکا ہے کہ موجودہ نظام میں بینک کا در آمد اور بر آمد میں بھی بڑا کردار ہوتا ہے، اور در آمد (Import) کی صورت میں بینک ایل سی کھولتا ہے، اس پر اپنی خدمت کی اجرت اور قرض ہو تو اس پر بھی سود لیتا ہے، شرعی نقطۂ نظر سے قرض پر سود لینا جائز نہیں ہے، بینک ایل سی کھولنے کے ذریعہ وکالت کی جو خدمات انجام دیتا ہے ان پر شرعاً اجرت وصول کر سکتا ہے البتہ اس کو سود کے عنصر اور حرام ہونے سے بچانے کے لئے شرعی طور پر دو طریقۂ تمویل اختیار کئے جاسکتے ہیں: ۱۔ مرابحہ ۲۔ مشارکہ

ان دونوں طریقوں کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

ا۔ مرابحہ : موجودہ اسلامی بینکوں میں عام طور پر ایل سی کے معاملات مرابحہ کے طور پر انجام پاتے ہیں، وہ اس طرح کہ جس چیز کو درآمد کرنا مطلوب ہے بینک اس میں وکیل بننے کے بجائے خود اس کو خرید کر درآمد کرتا ہے، اور بطور مرابحہ اس شخص کو بیچ دیتا ہے جو درآمد کرنا چاہتا تھا، مرابحہ کی شرائط ملحوظ رکھی جائیں تو اصولی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، تاہم عملاً یہ طریقہ پسندیدہ معلوم نہیں ہوتا، اسکی کئی وجوہ ہیں :

ایک یہ کہ اس طریقہ میں بہت سے مراحل پر مرابحہ کی شرائط پوری کرنا مشکل ہوتا ہے، اور بسا اوقات عملاً بہت سی شرائط پوری بھی نہیں ہوتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں بینک کا اس چیز کو خرید کر مرابحہ کرنا محض ایک مصنوعی کاروائی ہے، اسلئے کہ درآمد کنندہ پہلے بائع سے پورا معاملہ طے کر چکا ہوتا ہے، صرف منگوانے کے وقت بینک بیچ میں آجاتا ہے، سرکاری کاغذات میں اور قانونی اعتبار سے درآمد کنندہ (Importer) بینک کو نہیں سمجھا جاتا، بلکہ اصل مشتری کو ہی سمجھا جاتا ہے، دوسرے ملک سے جو بائع مال بھیجتا ہے وہ بھی بینک کو خریدار نہیں سمجھتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ مرابحہ کے جواز کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ چیز جو درآمد کی جارہی ہے پہلے بینک کے ضمان میں آئے، جبکہ بسا اوقات ایسا نہیں ہوتا ہے۔

ان وجوہ کی بناء پر ایل سی کا معاملہ مرابحہ کے طور پر کرنا پسندیدہ نہیں، تاہم اگر مرابحہ کی شرائط کا لحاظ صحیح شرعی طریقے سے ہو تو معاملہ جائز ہے۔ (مرابحہ کا تفصیلی بیان اس مقالہ کے آخر میں ضمیمہ Appendix,1 میں ملاحظہ فرمائیں)۔

ایل سی کا صحیح متبادل یہ ہے کہ درآمد کنندہ ایل سی کھلواتے وقت مشارکہ یا مضاربہ کا عقد کرلیں، بایں طور کہ اگر ایل سی زیرو مارجن پر ہو تو مضاربہ کا عقد کیا جائے، اور بینک رب المال اور درآمد کنندہ (Importer) مضارب بن جائے، اور درآمد کردہ مال رب المال (بینک) کی ملکیت میں رہے گا، اور فروخت کرنے کے بعد جو نفع حاصل ہوگا وہ باہم طے کردہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے گا، اور اگر ایل سی کھلوانے والا بھی کچھ رقم لگا رہا ہے تو شرکت اور مضاربت کا

مجموعہ (مشارکہ) ہوگا، اور اسکی صورت یہ ہوگی کہ بینک درآمد کنندہ سے یہ کہے گا کہ مال کی بقیہ قیمت ہم ادا کردیتے ہیں، اور اب جو مال درآمد کیا جائے گا اس میں ہم دونوں اپنے اپنے سرمایہ کے حساب سے شریک ہوں گے، اور مال کو فروخت کر کے جو نفع حاصل ہوگا وہ طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے گا۔

شرکت اور مضاربت کی ذکر کردہ ان صورتوں میں یہ شرط بھی جائز ہوسکتی ہے کہ بینک ایک مخصوص مدت کے لئے مضاربہ یا مشارکہ کرے، اس وقت تک اگر سامان فروخت ہوکر نقد رقم مل گئی تو نفع طے شدہ تناسب سے تقسیم کرلیا جائے، اور اگر سامان بازار میں فروخت نہیں ہوا تو درآمد کنندہ (Importer) بینک کا حصہ بازاری قیمت پر خرید کر اسے ادائیگی کردے۔

برآمد کی تمویل (Export Financing) میں مشارکہ کا کردار

برآمد کے سلسلے میں بھی بینک کے دو اہم کردار ہوتے ہیں، ایک یہ کہ وہ برآمد کنندہ (Exporter) کا بینک (Negotiating Bank) ہونے کی حیثیت سے کئی خدمات انجام دیتا ہے، مثلاً مال روانہ کرنے کے کاغذات (Bill of Lading) بھیجتا ہے، امپورٹر سے رقم وصول کرتا ہے، اور ان خدمات کی اجرت وصول کرتا ہے وغیرہ، اس میں تو شرعاً کوئی اشکال نہیں، اس لئے کہ یہ تمام افعال ایسے ہیں جنکی اجرت لینا جائز ہے، بینک کا دوسرا کردار یہ ہے کہ برآمد کنندہ (Exporter) کو مال خریدنے یا تیار کرانے کے لئے سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ سرمایہ بینک فراہم کرتے ہیں، جس کو تمویل الصادرات (Export Financing) کہا جاتا ہے، تمویل الصادرات یعنی برآمد کی تمویل کی دو قسمیں ہیں، ان دونوں کو سمجھ کر دونوں کا شرعی طریق کار الگ الگ سمجھنا چاہیے۔

تمویل کی ایک قسم یہ ہے کہ کسی شخص کے پاس باہر سے آرڈر ہے، مگر مال خریدنے اور تیار کرنے کے لئے اسے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، اس مقصد کے لئے بینک تمویل (Financing) کرتا ہے، اسے عربی میں ,,تمویل قبل الشحن،، (Pre Shipmant Financing) کہتے ہیں، دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ برآمد کنندہ (Exporter) نے

مال خرید کر تیار کر کے بھیج دیا، مگر رقم آنے میں کچھ عرصہ لگے گا، اتنی مدت کے لئے وہ چاہتا ہے کہ بینک سے اتنی رقم مل جائے، اس کیلئے جو رقم بینک فراہم کرتا ہے اسے تمویل بعد الشحن(Post Shipmant Financing) کہا جاتا ہے۔

سودی نظام میں ان دونوں قسم کے قرضوں پر سود دیا جاتا ہے لیکن دونوں قسم کی تمویل کا سود سے پاک شرعی طریقہ کیا ہوگا، یہاں اس بارے میں بحث مطلوب ہے۔

پہلی قسم یعنی,,تمویل قبل الشحن،،(Pre Shipmant Financing) کے متبادل دو طریقے ہو سکتے ہیں:

ا۔ مرابحہ ۲۔ مشارکہ

ا۔ مرابحہ:

بہت سے اسلامی بینکوں میں مرابحہ کی صورت پر عمل ہو رہا ہے یعنی کہ بینک برآمد کنندہ(Exporter) سے مال اس قیمت سے کم قیمت پر خرید لیتا ہے، جو قیمت برآمد کنندہ(Exporter) اور درآمد کنندہ(Importer) کے درمیان طے ہو گئی تھی، چنانچہ بینک برآمد کنندہ اتنی قیمت ادا کر کے وہ مال اپنی طرف سے درآمد کنندہ(Importer) کو زیادہ قیمت پر فروخت کر کے روانہ کر دیتا ہے، جو قیمت اصل میں درآمد کنندہ اور برآمد کنندہ کے درمیان طے ہوئی تھی، جس سے بینک کو نفع حاصل ہوا تھا، مگر اس طریقہ کار میں چند خرابیاں ہیں۔

اس طریقہ کار میں بیع کے شرعی طریقہ پورے نہیں ہوتے مثلاً اب برآمد کنندہ(Exporter) بینک کو قرار دینا چاہیے، مگر بینک کے اس مال کو خریدنے کے بعد بھی عمیل (جو شخص بینک سے سرمایہ لینے آیا تھا) کو ہی برآمد کنندہ (Exporter) سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ایکسپورٹ کی وجہ سے سرکاری مراعات بھی اس کو ملتی ہیں، بلکہ درآمد کنندہ (Importer) بھی بینک کو فروخت کرنے والا (یعنی بائع) نہیں سمجھتا، عمیل ہی کو سمجھتا ہے، حتی کہ مال میں عیب وغیرہ کا دعویٰ بھی عمیل پر ہوتا ہے، بینک پر نہیں ہوتا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف ایک مصنوعی کاروائی ہے۔

۲۔ مشارکہ :

اس تمویل کی بہتر صورت یہ ہے کہ بینک اور عمیل (بینک سے سرمایہ لینے والا) کے درمیان شرکت یا مضاربت کا معاہدہ ہو، اگر عمیل بھی کچھ سرمایہ لگا رہا ہو تو شرکت ہوگی، اور اگر وہ اپنا سرمایہ نہ لگائے، بلکہ صرف بینک سرمایہ لگائے تو مضاربہ کا عقد ہوگا، عمیل بینک سے سرمایہ لے کر مال خریدے گا یا تیار کرے گا، پھر اسے باہر بھیجے گا، اور جو نفع ہوگا وہ دونوں کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم ہوگا، اس صورت میں مشارکہ یا مضاربہ آسان بھی ہے، اس لئے کہ عمیل کا دوسرے ملک کے خریدار یعنی امپورٹر سے معاہدہ ہو چکا ہے اور قیمت بھی طے ہو چکی ہے، ادھر مال کی تیاری پر لاگت کا بھی اندازہ ہے، اور اس بات کا بسہولت اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس معاملے کے نتیجہ میں کتنا نفع ہوگا؟ البتہ اس میں ایک مشکل ہو سکتی ہے، کہ عمیل نے مال مطلوبہ صفات کے خلاف بھیج دیا تو دوسری طرف مال وصول نہیں کیا جائے گا، اور اسمیں بینک کا بھی نقصان ہوگا، اس کا حل یہ ہو سکتا ہے کہ مشارکہ یا مضاربہ کے معاہدے میں بینک یہ شرط لگا دے کہ عمیل مال مطلوبہ صفات کے مطابق بھیجے گا، اب بھی اگر اس نے مطلوبہ صفات کے خلاف مال بھیج دیا تو اس کا ذمہ دار وہ عمیل ہوگا، بینک اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا، اس لئے کہ شرط کی مخالفت کی وجہ سے یہ عمیل کی زیادتی (تعدی) ہے، اور تعدی کی صورت میں شریک یا مضارب کو ضامن بنایا جا سکتا ہے۔

تمویل بعد الشحن (Post Shipmant Financing) اس کا وہی طریق ہوتا ہے جو بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ کا ہوتا ہے، یعنی ایکسپورٹر مال روانہ کر چکا ہے، اب اس کے پاس اس مال کا بل ہے، اس بل کو وہ بینک کے حوالے کر دیتا ہے، اور بینک اسکی پختگی (Maturity) کو سامنے رکھ کر اس میں کٹوتی (Discounting) کر کے باقی رقم ایکسپورٹر کو دیدیتا ہے، اور پختگی (Maturity) کی تاریخ آنے پر بینک یہ رقم امپورٹر سے وصول کر لیتا ہے، اسے عربی میں ,,خصم الکمبیالہ،، اردو میں ہُنڈی اور انگریزی میں بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ (Discounting Bill of Exenange) کہا جاتا ہے۔

یہاں پہلے خصم الکمبیالہ (یعنی بل آف ایکسچینج کی ڈسکاؤنٹنگ) کے شرعی حکم پر بحث کی جاتی ہے۔

ڈسکاؤنٹنگ کی دو فقہی حیثیتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ دائن یعنی جس کے ہاتھ میں بل ہے وہ دین (قرض) کا بٹہ

لگانے والے بینک (Discounter) کو اپنا دین فروخت کر دیتا ہے، تا کہ وہ اصل دین سے کم رقم نقد دیکر مدیون سے اصل رقم حاصل کر سکے، اسے فقہی اصطلاح میں ,,بيع الدين من غير من عليه الدين،، (دین کو ایسے شخص کے ہاتھ فروخت کرنا جس پر وہ دین نہیں ہے) کہلاتا ہے اور فقہ اسلامی میں یہ عقد ناجائز ہوتا ہے، اور پھر یہ کہ اس میں ربا الفضل بھی ہے، کیونکہ اس میں روپے کا روپے کے ذریعہ تبادلہ کمی بیشی اور ادھار کے ساتھ ہو رہا ہے، اس لئے بھی یہ جائز نہیں ہے۔

اسکی دوسری فقہی حیثیت یہ ہے کہ یہ بیع الدین یعنی دین کی فروخت نہیں ہے بلکہ یہ حوالہ ہے، یعنی دائن جس کے ہاتھ میں بل ہے وہ دین کا بٹہ لگانے والے بینک (Discounting Bank) کی طرف اپنا دین حوالہ کر دیتا ہے، اور یہ حوالہ بانقص من الدین، یعنی اصل دین سے کم قیمت کے عوض ہے، اس لئے یہ ربا الفضل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔ ڈسکاؤنٹنگ کی یہی دوسری حیثیت پہلی حیثیت کے مقابلہ میں زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ ڈسکاؤنٹنگ کے اس معاملے کو بیع الدین یعنی دین کی فروخت نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ دین کا حوالہ ہے، اسلئے کہ بیع اور حوالہ میں یہ فرق ہے کہ بیع کے بعد دائن بری الذمہ ہو جاتا ہے، اور دین کے تمام حقوق اس شخص کی طرف راجع ہو جاتے ہیں، جس سے دین کو خریدنا ہوتا ہے، اور حوالہ میں محیل (اصل دائن) ہی دائن رہتا ہے، وہ بری الذمہ نہیں ہوتا، اگر محتال (مدیون) کو دین نہ ملے تو وہ محیل (اصل دائن) کی طرف رجوع کا حقدار ہوتا ہے، اور آج کل ڈسکاؤنٹنگ میں یہی صورتِ حال ہوتی ہے کہ اگر بٹہ لگانے والے (Discounter) کو بل وصول نہ ہو تو وہ اصل دائن سے رجوع کرتا ہے، لہذا یہ بيع الدين من غير من عليه الدين نہیں بلکہ حوالة الدين بأنقص من الدين (اصل دین سے کم قیمت کے عوض دین حوالہ کرنا) ہے، لہذا یہ جائز نہیں ہے۔

البتہ اس معاملہ کا شرعی حل یہ ہے کہ اس کا طریقہ کار تبدیل کر دیا جائے، اور وہ یہ کہ برآمد کنندہ جس کے پاس بل ہو اور وہ خریدار امپورٹر سے اپنے دین (قرضہ) کی وصولی کا بینک کو وکیل بنادے، اور بینک کو اس وکالت کی اجرت دیدے، پھر بل کے برابر رقم بینک سے قرض لے لے، اور پھر وہ بینک کو اس بات کا مجاز بنادے کہ بل کی جو رقم پختگی (Maturity) کے بعد وہ (بینک) حاصل کرے گا، اس کو اپنے قرضہ کے طور پر رکھ لے۔ اس صورت دو میں معاملے الگ الگ ہو گئے ہیں۔

ایک ایکسپورٹر کا دین کی وصولی کے لئے بینک کو وکیل بنانا، اور دوسرے بینک سے قرض لینا اور اس بات کا اختیار دینا کہ جو رقم وہ امپورٹر سے دین کی حاصل کریگا اسے اپنے دیئے ہوئے قرضہ کے عوض رکھ لے گا، تو یہ دونوں عقد صحیح ہوں گے، پہلا عقد اس لئے جائز ہے کہ وکالت کی اجرت لینا جائز ہے، یہاں بھی بینک کو اجرت پر وکیل بنایا گیا ہے لہذا یہ عقد جائز ہوگا، اور دوسرے یہ کہ بغیر زیادتی کی شرط کے قرضہ لینا جائز ہے، اور یہاں پر بھی بغیر زیادتی کی شرط کے قرضہ لیا گیا ہے لہذا یہ جائز ہوگا۔

ہاؤس فائنانسنگ میں مشارکہ کا استعمال

گھر انسان کی اہم ترین بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ہے، اس کے بغیر انسان کے لئے زندگی بسر کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالے کا ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا﴾[1]

اللہ تعالے نے تمہارے لئے تمہارے گھر رہنے کی جگہ بنائی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,ثلاث من السعادة، المرأة الصالحة، والمسكن الواسع، والمركب الهنيئ،،[2]

تین چیزیں انسان کی نیک بختی کی علامت ہیں نیک بیوی، کشادہ مکان خوشگوار سواری۔

(۱) سورة النحل آیت: ۸۰۔

(۲) الهيثمي، (حافظ) نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، كشف الاستار عن زوائد البزار، موؤسسة الرسالة بيروت۔ (۲:۱۵۶/ نمبر ۱۴۱۲)۔

موجودہ دور میں ایک اچھے اور مناسب مکان کا حصول اچھا خاصا مشکل کام بن چکا ہے، خصوصاً گنجان آبادی والے شہروں میں آباد میں اضافہ کی وجہ سے مکانات کی قیمتوں میں مستقل اضافہ ہوتا جاتا ہے، جس کی وجہ سے ایک عام آدمی کے لئے مکان بنوانا بہت مشکل ہو چکا ہے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے موجودہ دور میں بہت سے بڑے بڑے شہروں میں ہاؤس فائنانسنگ کے ادارے قائم ہو چکے ہیں، جو لوگوں کے لئے مکان خریدنے یا بنوانے کی خدمات سر انجام دیتے ہیں، لیکن ان میں سے اکثر ادارے سودی نظام کے تحت ہی کام کرتے ہیں، چنانچہ یہ ادارے ان مقاصد کے لئے اپنے گاہکوں کو قرضے طے شدہ شرح سود پر فراہم کرتے ہیں، چونکہ یہ معاملہ سود کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، اور سود کا معاملہ شریعت اسلامیہ میں ان بڑے محرمات میں داخل ہے، جن کو اللہ تعالی نے منع فرمایا ہے، اس لئے کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ ایسا کوئی بھی معاملہ کرے جو سودی ہو، البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہاؤس فائنانسنگ کے لئے کوئی ایسا طریقہ تجویز کیا جائے، جو شریعت اسلامیہ کے مطابق ہو، اور وہ طریقہ سودی نظام پر مشتمل طریقے کا متبادل بھی بن سکے، اس مقصد کے لئے ہم اس مضمون میں ہاؤس فائنانسنگ کے چند شرعی طریقوں میں سے ایک اہم طریقہ شرکت متناقصہ بیان کریں گے، البتہ اس سے قبل کہ وہ طریقہ ذکر کیا جائے یہ بات جانی چاہیے کہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری میں اصلاً یہ بات بھی داخل ہے کہ وہ عوام سے کسی سود کا مطالبہ کئے بغیر انکی بنیادی ضروریات پوری کرے، اور انکو وہ ضروریات فراہم کرے، چونکہ مکان بھی ہر انسان کی بنیادی ضرورتوں میں داخل ہے، اسلئے ہر انسان کا یہ حق ہے کہ وہ اپنے مالی وسائل کی حدود میں رہتے ہوئے اس بنیادی ضرورت کو حاصل کرے، اور جس شخص کے مالی وسائل تنگ ہوں جسکی وجہ سے نہ تو وہ مکان خرید سکتا ہو، اور نہ ہی اپنے خرچہ پر تعمیر کرانے کی استطاعت رکھتا ہو، تو اس صورت میں حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل تین طریقوں میں سے کسی ایک سے اسکی یہ ضرورت پوری کرے۔

۱۔ اگر وہ شخص مستحق زکاۃ ہے تو پھر زکاۃ فنڈ سے اسکی مدد کر کے اسکی ضرورت پوری کرے۔

۲۔ اسکو قرض حسنہ پر رقم فراہم کرے اور اس پر اس سے کسی نفع یا سود کا مطالبہ نہ کرے۔

۳۔ لاگت پر مکانات مہیا کرے۔

ہاؤس فائنانسنگ میں یہی تین طریقے اصل اسلامی روح اور اسلامی معاشرے کے مزاج کے موافق ہیں، کیونکہ اسلامی معاشرے کی اصل بنیاد باہمی ہمدردی اور غمخواری پر ہے، لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مندرجہ بالا تین طریقوں پر عمل صرف اس حکومت کے لئے ممکن ہے جس کے پاس ذرائع آمدنی اور وسائل بہت بڑی تعداد میں موجود ہوں، اس لئے کہ ان میں سے ہر صورت بہت بھاری رقم چاہتی ہے۔

لہٰذا ان حالات میں ایسے طریقے اختیار کرنا ضروری ہے جس میں حکومت کو رہائش فراہم کرنے پر بھاری اخراجات برداشت نہ کرنے پڑیں، اور وہ طریقے سود اور دوسرے ممنوعات شرعیہ سے بھی پاک ہوں، لہٰذا اس مقصد کے لئے علماء کرام نے متعدد طریقے بیان فرمائے ہیں، ان میں سے ایک طریقہ "مشارکہ متناقصہ" بھی ہے، چونکہ یہ طریقہ ہمارے موضوع سے متعلق ہے لہٰذا اسے یہاں ذکر کیا جاتا ہے، البتہ بقیہ طریقے جن میں سے بعض مرابحہ موجلہ، یا اجارہ (اجارہ منتہی بالتملیک Hire purchase/Finacial Lease)، یا استصناع سے متعلق ہیں، ہمارے مقالے کے موضوع سے متعلق نہ ہونے کی وجہ سے انہیں یہاں ذکر نہیں کیا گیا۔

ہاؤس فائنانسنگ کا یہ طریق مشارکہ متناقصہ پر مبنی ہے، جو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل ہوگا:

۱۔ سب سے پہلے گاہک اور کمپنی شرکت ملک کی بنیاد پر مشترکہ طور سے مکان خریدیں گے، جس کے بعد وہ مکان مشترک ہو جائے گا، اور جس فریق نے اسکی خریداری میں جس تناسب سے رقم لگائی ہوگی اس تناسب سے وہ اس مکان کا مالک ہوگا، لہٰذا اگر دونوں فریقوں نے نصف نصف لگائی ہوگی تو وہ مکان دونوں کے درمیان آدھا آدھا ہوگا، اور اگر ایک فریق نے ایک تہائی رقم لگائی اور دوسرے فریق نے دو تہائی رقم لگائی تو وہ مکان اسی تناسب سے دونوں کے درمیان مشترک ہو جائے گا۔

۲۔ پھر کمپنی ماہانہ یا سالانہ کرایہ طے کر کے اپنا حصہ اس گاہک کو کرایہ پر دیدے گی۔

۳۔ پھر اس مکان میں کمپنی کا جتنا حصہ ہے اسکو چند متعین حصوں میں مثلاً دس ہزار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۴۔ پھر گاہک تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد کمپنی کی کل ملکیت کے ایک حصہ کو اس کی قیمت ادا کر کے خرید لے گا، مثلاً اس مکان میں کمپنی کا جو حصہ ہے اسکی قیمت دو لاکھ روپے ہے، پھر جب اسکو دس یونٹوں میں تقسیم کر دیا تو ہر ایک یونٹ کی قیمت بیس ہزار روپے ہو گی، لہذا گاہک ہر چھ ماہ بعد کمپنی کو بیس ہزار روپے ادا کر کے اس کے ایک ایک حصہ کا مالک بنتا رہے گا۔

۵۔ گاہک جس قدر حصے (یونٹ) خریدتا رہے گا، اسی حساب سے اسکی ملکیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور کمپنی کی ملکیت اس مکان میں کم ہوتی چلی جائے گی۔

۶۔ چونکہ گاہک نے کمپنی کا حصہ کرایہ پر لیا ہوا تھا، اس لئے جس قدر وہ کمپنی کے حصے (یونٹ) خریدتا رہے گا، اسی حساب سے کرایہ بھی کم ہوتا چلا جائے گا، مثلاً اگر کمپنی کے حصہ کا کرایہ ایک ہزار روپے طے ہوا تھا تو گاہک جس قدر حصے خریدے گا، ہر حصہ کی خریداری کے بعد ایک سو روپے کرایہ کم ہو جائے گا، لہذا ایک حصے کی خریداری کے بعد کرایہ نو سو روپے ہو جائے گا، اور دو حصوں کی خریداری کے بعد کرایہ آٹھ سو روپے ہو جائے گا۔

۷۔ یہاں تک کہ جب گاہک کمپنی کے دس کے دس حصے خرید لے گا تو وہ پورا مکان گاہک کی ملکیت ہو جائے گا، اور اس طرح یہ شرکت اور کرایہ داری کے دونوں معاملے بیک وقت اپنی انتہاء کو پہونچ جائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ مشارکہ متناقصہ کی بنیاد پر ہاؤس فائنانسنگ کا یہ طریقۂ کار تین معاملات پر مشتمل ہے، ایک فریقین کے درمیان شرکت ملک کا قیام، دوسرا کمپنی کے حصوں کو گاہک کا کرایہ پر لینا، تیسرا کمپنی کے حصے کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے گاہک کے ہاتھ ایک ایک کر کے فروخت کر دینا۔

مشارکہ متناقصہ کا مندرجہ بالا طریقِ کار صرف ہاؤس فائنانسنگ کے لئے ہی مخصوص نہیں بلکہ آٹو موبائل فائنانسنگ اور مختلف قسم کی فائنانسنگ کے لئے بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، چونکہ مشارکہ متناقصہ کا تصور اس عنوان سے فقہ کی روایتی شرکت میں نہیں ملتا، لیکن پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل اور مجمع الفقہ الاسلامی[1] کے بعض اراکین نے فائنانسنگ

---

(۱) مجمع الفقه الاسلامی جده، مجله مجمع الفقه الاسلامی: المناقشه العدد السادس الجزء الأول (۱٤٠)۔

کے مختلف شعبوں میں مشارکہ متناقصہ کا طریقہ تجویز کیا تھا، لہٰذا اس کے شرعی لحاظ سے جائزہ کی ضرورت تھی، اس مقصد کے پیش نظر اس مقالے کے دوسرے باب میں الگ سے مشارکہ متناقصہ اور اس کا شرعی حکم کے عنوان سے اس مسئلہ پر غور کیا جاچکا ہے، لہٰذا ہاؤس فائنانسنگ میں مشارکہ متناقصہ کے مندرجہ بالا طریقۂ کار کی فقہی توجیہ اور دلائل تفصیل کے ساتھ دوسرے باب میں مذکورہ عنوان کے تحت ملاحظہ فرمایا جائے۔

آٹو موبائل فائنانسنگ میں مشارکہ کا کردار

موجودہ دور میں گاڑی (آٹو موبائل) انسان کی اہم ضروریات میں داخل ہوچکی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

,,ثلاث من السعادة، المرأة الصالحة، والمسكن الواسع، والمركب الهنيئ،،(۱)

تین چیزیں انسان کی نیک بختی کی علامت ہیں نیک بیوی، کشادہ مکان، خوشگوار سواری۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خوش قسمتی کی تین چیزوں میں سے ایک اچھی سواری بھی ہے، اور موجودہ زمانہ کی معیشت ور تیز رفتار کاروبار زندگی میں اچھی سواری یا اچھی گاڑی کی ضرورت اور زیادہ ہے، لیکن ساتھ ہی مہنگائی نے ہر شخص کے لئے سواری کا حصول بہت مشکل بنادیا ہے، ان حالات کو دیکھتے ہوئے موجودہ زمانہ میں کار یا آٹو موبائل فائنانسنگ کے بہت سے ادارے قائم ہوچکے ہیں، لیکن انمیں سے اکثر ادارے سودی نظام کے تحت کام کرتے ہیں، اور سودی قرضے دیتے ہیں بلکہ شرعی لحاظ سے سود اور سودی قرضے کا معاملہ کسی طور بھی جائز نہیں ہے، اسی لئے پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے

---

۱) الهيثمي، (حافظ) نور الدين علي بن أبي بكر الهيثمي، كشف الاستار عن زوائد البزار، موسسة الرسالة بيروت۔(۲:۱۵٦/ نمبر۱٤۱۲)۔

اور آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرس (او آئی سی) کے ذیلی ادارہ اسلامی فقہ اکیڈمی کے جید علماء کرام[1] اور اقتصادی ماہرین نے مل کر کار فائنانسنگ کے بعض جائز طریقے وضع کیے ہیں، اور یہ طریقے بعض اسلامی مالیاتی اداروں اور اسلامی بینکوں میں دنیا کے مختلف ممالک میں کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں، ان میں سے بعض طریقے یہ ہیں:

مرابحہ مؤجلہ: اجارہ منتہی بالتملیک (Hire purchase)، مشارکہ متناقصہ قسطوں پر خریداری وغیرہ۔

کار فائنانسنگ کے لئے مشارکہ متناقصہ کا طریقہ چونکہ ہمارے مقالے سے متعلق ہے لہذا اسے بھی یہاں ذکر کیا جاتا ہے، مشارکہ متناقصہ کی بنیاد پر یہ طریقہ درج ذیل نکات پر مشتمل ہے۔

۱۔ سب سے پہلے گاہک اور کمپنی شرکت ملک کی بنیاد پر کار خریدیں گے، جس کے بعد وہ کار مشترک ہو جائیگی، اور جس فریق نے اسکی خریداری میں جس تناسب سے رقم لگائی ہو گی اس تناسب سے وہ اس کار کا مالک ہو گا۔

لہذا اگر دونوں فریقوں نے نصف نصف رقم لگائی ہو گی تو اس کار میں دونوں کی ملکیت آدھی آدھی ہو گی، اور اگر ایک فریق نے ایک تہائی رقم لگائی اور دوسرے فریق نے دو تہائی رقم لگائی تو وہ کار اسی تناسب سے دونوں کے درمیان مشترک ہو جائے گی۔

۲۔ پھر کمپنی ماہانہ یا سالانہ کرایہ طے کر کے اپنا حصہ اس گاہک کو کرایہ پر دیدے گی۔

۳۔ پھر اس کار میں کمپنی کا جتنا حصہ ہے اسکو چند متعین یونٹوں میں مثلاً دس برابر حصوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

۴۔ پھر فریقین آپس میں ایک متعین عرصہ یا مدت طے کر لیں، مثلاً چھ ماہ یا ایک سال کی مدت، پھر گاہک ہر ایک مدت (Period) میں کمپنی کی کل ملکیت کے ایک حصہ کو اسکی قیمت ادا کر کے خرید لے گا، مثلاً اس کار میں کمپنی کا جو حصہ ہے اسکی قیمت دو لاکھ روپے ہے، پھر جب اسکو دس یونٹوں میں تقسیم کر دیا تو ہر ایک یونٹ کی قیمت بیس ہزار روپے ہو گی؛ لہذا گاہک ہر چھ ماہ بعد کمپنی کو بیس ہزار روپے ادا کر کے اس کے ایک حصہ کا مالک بنتا رہے گا۔

(۱) مجمع الفقه الاسلامی، مجله، المناقشه، العدد السادس، الجزء الأول (ص:۱٤۰)۔

۵۔ گاہک جس قدر حصے (یونٹ) خرید تا رہے گا، اسی حساب سے اسکی ملکیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اور کمپنی کی ملکیت اس کار میں کم ہوتی چلی جائے گی۔

۶۔ چونکہ گاہک نے کمپنی کا حصہ کرایہ پر لیا ہوا تھا، اس لئے جس قدر وہ کمپنی کے حصے (یونٹ) خرید تا رہے گا، اسی حساب سے کرایہ بھی کم ہوتا چلا جائے گا، مثلاً اگر کمپنی کے حصہ کا کرایہ ایک ہزار روپے طے ہوا تھا تو گاہک جس قدر حصے خریدے گا ہر حصہ کی خریداری کے بعد ایک سو روپے کرایہ کم ہو جائے گا، لہذا ایک حصے کی خریداری کے بعد کرایہ نو سو روپے ہو جائے گا، اور دو حصوں کی خریداری کے بعد کرایہ آٹھ سو روپے ہو جائے گا۔

۷۔ یہاں تک کہ جب گاہک کمپنی کے دس کے دس حصے خرید لے گا تو وہ پوری کار گاہک کی ملکیت ہو جائے گی، اور اس طرح یہ شرکت اور کرایہ داری کے دونوں معاملے بیک وقت اپنی انتہاء کو پہونچ جائیں گے۔

خلاصہ یہ کہ مشارکہ متناقصہ کی بنیاد پر آٹو موبائل فائنانسنگ کا یہ طریقہ تین معاملات پر مشتمل ہے، ایک فریقین کے درمیان شرکت ملک کا قیام، دوسرا کمپنی کے حصوں کو گاہک کا کرایہ پر لینا، تیسرا کمپنی کے حصے کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے گاہک کے ہاتھ ایک ایک کر کے فروخت کر دینا۔

اسلامی بینکوں کی بیلنس شیٹ (Balance sheet) کیسی ہو گی؟

آج کل روایتی بینکوں میں یہ رواج ہے کہ وہ بینک کے موجودات (Assets) اور مطلوبات (Liabilities) کا یک میزانیہ (Balance sheet) تیار کرتے ہیں، موجودات سے مراد وہ اموال ہوتے ہیں جو یا تو بینک کے قبضہ میں ہوتے ہیں یا مستقبل میں جنکی وصولی متوقع ہوتی ہے، مثلاً گاہکوں (Clients) کو قرضوں پر دی گئی رقمیں بمعہ سود متوقع ہوتی ہیں۔

اور مطلوبات (Liabilities) سے مراد وہ اموال ہوتے ہیں جو بینک کے اوپر دوسرے (Investers) کے اجب الاداء ہوتے ہیں، روایتی بینکوں (Conventional Banks) کا رواج ہے کہ بینک کے تمام ڈیپازٹس مطلوبات

میں رکھتے ہیں، کیونکہ ان کو کرنٹ اکاؤنٹ اور سیونگ اکاؤنٹ میں عند الطلب اور فکسڈ ڈیپازٹس میں وقتِ مقررہ کی آمد پر واپس لوٹانا بینک کی ذمہ داری ہے، اور وہ تمویل (Financeng) جو بینک اپنے صارفین (Clients) کو کرتا ہے، اسے موجودات کے تحت درج کیا جاتا ہے، کیونکہ انکی واپسی متوقع ہوتی ہے۔

اسلامی بینکوں کے کرنٹ اکاؤنٹ بھی چونکہ قرض کے حکم میں ہیں اسلیئے ان کو اگرچہ روایتی بینکوں کی طرح مطلوبات (Debits) کے خانے میں درج کیا جاسکتا ہے لیکن اسلامی بینکوں کے فکسڈ ڈیپازٹس اور سیونگ اکاؤنٹ میں حساب کتاب کا (یعنی بیلنس شیٹ کا مذکورہ بالا) طریقہ نہیں چل سکتا، کیونکہ اسلامی بینکوں کے سیونگ اکاؤنٹ اور فکسڈ ڈیپازٹ بینک کے اوپر قرض نہیں ہیں بلکہ وہ مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر حاصل کردہ ایسے اموال ہیں جو دوسرے اموال کے ساتھ مخلوط ہوگئے ہیں، اور یہ اموال بینک پر مضمون (ضمانت شدہ) بھی نہیں ہیں لہذا اسے حقیقۃً مطلوبات کے خانہ میں درج نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر بینک کی طرف سے جو تمویل (Financing) کی گئی ہیں انہیں بھی موجودات کے خانہ میں مندرج نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ مشارکہ یا مضاربہ کی بنیاد پر تمویل بھی غیر مضمون (غیر ضمانت شدہ) ہے، کیونکہ صارف اسکی اصل کی ضمانت نہیں دے سکتا، چہ جائیکہ اسکے نفع کی ضمانت دے، ہاں البتہ مرابحہ کی قیمتیں اور کرایہ داری پر فراہم کردہ اشیاء کے کرایے بینک کے مطلوبات کے خانہ میں لکھ سکتے ہیں۔

اس بنیاد پر اسلامی بینکوں کی بیلنس شیٹ روایتی بینکوں کی بیلنس شیٹ کے ہر لحاظ سے مشابہ نہیں ہوسکتی، کیونکہ عام بینکوں کی بیلنس شیٹوں کی مانند اس طرح بنانا کہ اسکے مطلوبات اور موجودات کی رقموں کے اندراجات برابر سرابر ہو جائیں، یہ بات ممکن نہیں ہے، بلکہ مناسب یہ ہوگا کہ بینک کی بیلنس شیٹ تجارتی کمپنیوں کی بیلنس شیٹ کی طرح بنائی جائے، اور یہی اسلامی بینک کے مقتضیٰ کے عین موافق ہے، کیونکہ اسلامی بینک صرف قرض کے لین دین کرنے والا ادارہ نہیں ہے، بلکہ وہ تو ایک تجارتی ادارہ ہے، جو ملکی تجارت کے نفع نقصان میں برابر کا شریک ہوتا ہے۔

لہذا اگر اسلامی بینک بھی اپنی بیلنس شیٹ روایتی بینکوں کی طرح بنائے کہ سرمایہ کاری (Investment) کے حسابات کو مطلوبات اور تمویل (Financing) کے حسابات موجودات میں لکھے تو یہ بیلنس شیٹ حقیقت کی غمازی نہیں کرے گا، بلکہ اس کے حسابات تقریبی اور تخمینی ہوں گے۔

غیر سودی بینکاری میں بینکوں کے دیگر وظائف

امانتیں رکھنے اور سرمایہ بطور تمویل (Financing) صارفین کو دینے کے علاوہ بینکوں کے جو وظائف ابتدائی صفحات میں ذکر کیے گئے تھے، جنہیں بینک اجرت پر انجام دیتے ہیں مثلاً مقفل صندوق (Lockers) رکھنا، سفری چیک (Travellers checke) بینک ڈرافٹ، لیٹر آف کریڈٹ (L.C) جاری کرنا تجارتی اموال کو بلٹی کے ذریعہ منگوانا، خرید و فروخت کی دلالی کرنا، اور کاروباری مشورے دینا وغیرہ، ان تمام خدمات کو بدستور جاری رکھ کر غیر سودی بینکاری میں بھی ان پر اجرت وصول کی جاسکے گی۔

پانچواں باب
مشارکہ کی مالی دستاویز، ایک نیا تصور

پانچواں باب: مشارکہ کی مالی دستاویز، ایک نیا تصور

مشارکہ سرٹیفکیٹ کا پس منظر

یہ بات شیئرز اور کمپنی کے تعارف میں گذر چکی ہے کہ کمپنی کے قیام کے وقت کثیر مقدار میں سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں کسی ایک شخص کا سرمایہ نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے شرکاء کا سرمایہ لگا ہوتا ہے، اور پھر تمام شرکاء ایک ہی وقت میں سرمایہ نہیں لگاتے، بلکہ وقتاً فوقتاً مزید حصص جاری کر کے سرمایہ میں اضافہ کیا جاتا ہے، بعض اوقات مزید سرمایہ کے حصول کے لئے مزید حصص جاری کرنے میں بعض مشکلات یا قباحتیں ہوتی ہیں، جنکی وجہ سے مزید حصص جاری کرنے کے بجائے دوسرے طریقوں سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے، ذیل میں سرمایہ کے حصول کے مختلف مراحل کو قدرے تفصیل سے ذکر کیا جاتا ہے۔

کمپنی میں ابتداءً کچھ سرمایہ اسپانسرز (Sponsors) یعنی کمپنی بنانے والوں کی طرف سے ہوتا ہے، سرمایے کا بہت سا حصہ اجراء حصص کے ذریعہ عوام سے حاصل کیا جاتا ہے، مگر عموماً یہ سرمایہ کمپنی کے لئے کافی نہیں ہوتا، کیونکہ بعض اوقات کمپنی کو اپنے منصوبوں کی تکمیل یا توسیع کے لئے شیئرز کے اجراء کے بعد مزید سرمایہ کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے، لہٰذا وہ کبھی مزید سرمایہ کے حصول کے لئے کمپنی کے مزید حصص جاری کرتی ہے، جبکہ منظور شدہ (Authorised) سرمایہ میں اسکی گنجائش ہو، یا دوبارہ اجازت لی جائے، ان جدید حصص کے اجراء کے وقت قدیم حصہ داران (Share holders) کا ترجیحی حق ہوتا ہے کہ اگر وہ نئے حصص لینا چاہیں تو لے لیں، جن نئے حصص میں قدیم حصہ داران کا ترجیحی حق ہوتا ہے، انہیں ,,سہام الاولویة،، (Right shares) کہا جاتا ہے، شفعہ کی مانند اس حق سے قدیم شرکاء کو دو فائدے ہوتے ہیں:

الف: ایک یہ کہ قدیم حصہ داران کو یہ حصص قیمت اسمیہ (Face Value) پر ہی مل جاتے ہیں، خواہ انکی بازاری

قیمت(Market Value)زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔

ب: دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مزید سرمایہ کے حصص جاری کرنے سے سابقہ حصہ داران کی نسبت میں جو کمی آجاتی ہے، اس حق کے ذریعہ انہیں اپنی سابقہ نسبت بحال کرنے کا اختیار مل جاتا ہے، مثلاً پہلے کمپنی میں ایک لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا، جس میں سے زید نے دو ہزار روپے کے شیئرز خرید لئے تھے، تو زید کی کل سرمایہ میں نسبت دو فیصد ہے، اب اگر کمپنی ایک لاکھ کے مزید حصص جاری کرے تو اب کمپنی کا کل سرمایہ دو لاکھ ہو گیا، اس لحاظ سے زید کے سرمایہ کی نسبت اب کم ہو کر ایک فیصد رہ گئی ہے، اس لئے اسکو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ مزید دو ہزار کے شیئرز خرید کر اپنی سابقہ نسبت یعنی دو فیصد بحال کرلے، البتہ مزید حصص جاری کرنے میں کچھ مشکلات بھی ہوتی ہیں، مثلاً سرمایہ کی منظوری کی کچھ حدود و قیود ہوتی ہیں، حصہ داران کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے، جسکی وجہ سے قدیم حصہ داران کے سرمایہ اور نفع کے تناسب میں کمی واقع ہو جاتی ہے، ان جیسی مشکلات کی وجہ سے بہت سی کمپنیاں مزید حصص جاری کرنے کا طریقہ پسند نہیں کرتیں، بلکہ مزید سرمایہ حاصل کرنے کے لئے قرض لیتی ہیں، قرض لینے کی دو صورتیں ہوتی ہیں:

الف: بینک یا کسی مالیاتی ادارے سے سود پر قرض لیتی ہیں۔

ب: عوام کو شیئرز خریدنے کے بجائے ایک مخصوص مدت کے لئے قرضہ دینے کی دعوت دی جاتی ہے، اس مقصد سے کمپنی بانڈز(Bonds)یا ڈبینچرز (Debentures) جاری کرتی ہے، جو ان کے قرضوں کے دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں، ان کا حامل مدت پوری ہونے سے قبل انہیں ثانوی بازار (Secondry Market) میں فروخت بھی کر سکتا ہے۔

مندرجہ بالا دونوں طریقوں پر غور کیا جائے تو عوامی افادیت کے لحاظ سے دوسرا طریقہ یعنی بانڈز اور ڈبینچرز زیادہ نفع بخش ہے، کیونکہ اس طریقہ سے عوام کا سرمایہ ایک نفع بخش کام یا منصوبے میں لگ جاتا ہے، اور اسکی واپسی بھی مشکل نہیں ہوتی کہ یا تو مدت سے قبل ثانوی بازار میں فروخت کر کے یا مدت کے اختتام پر کمپنی سے سرمایہ واپس لے سکتے ہیں اور کمپنی کے قدیم حصہ داران کا کمپنی کے سرمایے میں سابقہ تناسب بھی برقرار رہتا ہے، البتہ اگر شرعی نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو دونوں طریقے سودی قرضے کے ہیں۔ لہذا انہیں کسی طور بھی جائز نہیں کہا جا سکتا، البتہ بانڈز اور ڈبینچرز کی افادیت

کے پیش نظر علماء کرام اور مسلمان معاشی ماہرین نے ان کے شرعی متبادل طریقے تلاش کئے، جن میں سے ایک طریقہ مشارکہ سرٹیفکیٹ کا بھی ہے، جس کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ کا اجراء

مشارکہ یا شرکت اسلامی فقہ میں مشہور عقد ہے، جسکی تفصیل دوسرے باب میں "شرکت کے روایتی تصور" کے ذیل میں گذر چکی ہے، اسکی ایک قسم شرکت الأموال ہے، جس میں دو یا زیادہ شرکاء اپنا سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار کرتے ہیں، اور اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے، وہ باہمی طے کردہ شرح سے انکے درمیان تقسیم ہوتا ہے، مشارکہ سرٹیفکیٹ بھی اسی قسم کا ایک عقد ہے کہ اس میں کمپنی سرمایہ داروں سے شرکت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کر کے اس سے کاروبار کرتی ہے، اور جو نفع ہوتا ہے اسے متعین شرح سے تقسیم کیا جاتا ہے، اس عقد مشارکہ کی دستاویزات (Certificates) جاری کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان دستاویزات کے حامل افراد اور دستاویزات جاری کرنے والی کمپنی یا ادارے کے درمیان مشارکہ کا عقد ہو جائے، چنانچہ یہ دستاویزات اس عقد کے دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں، بانڈز کی طرح ان کے حامل افراد بھی انہیں ثانوی بازار (Secondry Markat) میں فروخت کر کے اپنا سرمایہ واپس لے سکتے ہیں، شیئرز سرٹیفکیٹ کی طرح مشارکہ سرٹیفکیٹ بھی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن مشارکہ سرٹیفکیٹ حقیقت میں نہ تو بانڈز اور نہ ہی شیئرز سرٹیفکیٹ ہیں، بلکہ یہ دونوں سے مختلف ہیں، البتہ یہ بعض باتوں میں بانڈز کے اور بعض میں شیئرز کے مشابہ ہیں، ذیل میں دونوں کے فرق بیان کئے جائیں گے جنکی ترتیب یوں ہوگی:

الف: مشارکہ سرٹیفکیٹ اور بانڈ کا فرق۔

ب: مشارکہ سرٹیفکیٹ اور شیئرز سرٹیفکیٹ کا فرق۔

مشارکہ سرٹیفیکیٹ اور بانڈز کا فرق

سب سے پہلے مشارکہ سرٹیفیکیٹ اور بانڈز کا فرق ذکر کیا جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ مشارکہ سرٹیفیکیٹ اس عقد شرکت کی دستاویزات ہیں جو کمپنی اور حاملین سرٹیفیکیٹ کے درمیان قائم ہوتا ہے، البتہ بانڈز در حقیقت اس قرضہ کی دستاویز ہے جو عوام یا بینک، کمپنی کو سود پر فراہم کرتے ہیں، اور بانڈز کا شرکت یا کسی اور اسلامی طریقہائے تمویل سے کوئی تعلق نہیں ہے، اسی وجہ سے بانڈز کا اجراء اور انکی خرید و فروخت ناجائز ہے، البتہ بانڈز اور مشارکہ سرٹیفیکیٹ میں بعض باتوں میں یکسانیت بھی پائی جاتی ہے، اور وہ یہ کہ جس طرح بانڈز ایک متعین مدت کے لئے ہوتے ہیں اسی طرح مشارکہ سرٹیفیکیٹ بھی ایک متعین مدت کے لئے جاری کئے جاتے ہیں، اور جس طرح حاملین بانڈز کو کمپنی کے سالانہ اجلاس (A.G.M.) میں ووٹنگ کا اختیار نہیں ہے اسی طرح مشارکہ سرٹیفیکیٹ کے حاملین کو بھی سالانہ اجلاس (A.G.M) میں ووٹنگ کا اختیار نہیں ہوگا۔

بانڈز یا ڈبنچرز کے ذریعہ بسا اوقات کمپنی کے کسی مخصوص پروجیکٹ یا منصوبہ کی تکمیل یا توسیع کے لئے قرضہ لیا جاتا ہے، اسی طرح مشارکہ سرٹیفیکیٹ میں حاملین سرٹیفیکیٹ جو سرمایہ فراہم کرینگے وہ سرمایہ کمپنی کے کل سرمایے کے بجائے کمپنی کے کسی مخصوص پروجیکٹ یا کمپنی کے کسی مخصوص حصہ میں صرف ہو سکتا ہے، اس صورت میں مشارکہ سرٹیفیکیٹ کے حاملین کو کمپنی کی طرف سے جو نفع دیا جائے گا اسکی شرح شیئرز سرٹیفیکیٹ کے حاملین کو کمپنی کی جانب سے دیئے جانے والے نفع سے مختلف ہو سکتی ہے۔

ڈبنچرز میں بعض اوقات حاصل کئے گئے قرضہ پر کمپنی کے کسی جامد اثاثے کو رہن بنا دیا جاتا ہے، کہ اگر کمپنی نے وہ قرضہ ادا نہ کیا تو اس مرہونہ اثاثے کو حاملین بانڈز میں تقسیم کردیا جائیگا، اسی طرح مشارکہ سرٹیفیکیٹ میں بھی یہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر کمپنی کے کسی جامد اثاثے کو اس لئے بطور وثیقہ حاملین سرٹیفیکیٹ کو دیدیا جائے تاکہ کمپنی کی طرف سے غفلت یا کوتاہی کی نتیجہ میں ہونے والے نقصان کی تلافی کی جاسکے، اس موضوع پر مفصل بحث پیچھے گذر چکی ہے۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ اور شیئر سرٹیفکیٹ کے درمیان فرق

مشارکہ سرٹیفکیٹ بھی شیئر سرٹیفکیٹ کی طرح ایک شرکت کی دستاویز ہے، یعنی دونوں قسم کے حاملین سرٹیفکیٹ کا کمپنی کے ساتھ شرکت کا عقد ہوتا ہے، البتہ بعض باتوں میں مشارکہ سرٹیفکیٹ اور شیئر سرٹیفکیٹ میں فرق پایا جاتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

ا۔ شیئر سرٹیفکیٹ میں حامل کو سالانہ اجلاس (A.G.M) میں حق رائے دہی (Voting) ہوتا ہے، جبکہ مشارکہ میں صرف نفع میں شرکت ہوتی ہے، آواز اٹھانے یا ووٹنگ کا اختیار نہیں ہوتا[1]۔

۲۔ شیئر سرٹیفکیٹ کی مدت متعین کرنا ضروری نہیں ہے، جبکہ مشارکہ سرٹیفکیٹ عموماً کسی خاص مدت کے لئے ہوتا ہے۔

۳۔ مشارکہ سرٹیفکیٹ میں شیئر سرٹیفکیٹ سے مختلف نفع کا تناسب طے کیا جاسکتا ہے، مثلاً اگر مشارکہ سرٹیفکیٹ کی تمویل کمپنی کے کل سرمایے کی ٪۳۰ ہے تو انکی ذمہ داری (Liability) ٪۳۰ تک رہے گی، اور ٪۳۰ تمویل جو نفع ہوگا، اس کا مثلاً ٪۳۰ حاملین سرٹیفکیٹ کو دیا جائے، اور شیئر سرٹیفکیٹ کے حاملین سے مختلف نفع کا تناسب بھی طے کیا جاسکتا ہے، البتہ چونکہ مشارکہ سرٹیفکیٹ کے حاملین کو ووٹنگ کا حق نہیں ہوتا جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرم یا کمپنی کے لئے کوئی کام نہ کرنے کی شرط لگاتے ہیں، اسلئے ان کا حصہ نفع ان کی سرمایہ کاری کی نسبت سے زیادہ طے نہیں کیا جاسکتا[2]، مثلاً کسی کمپنی نے مجموعی کاروبار کا ٪۳۰ حصہ اگر مشارکہ سرٹیفکیٹ سے حاصل کیا ہو تو وہ مشارکہ سرٹیفکیٹ کے حاملین سے مجموعی نفع کے ٪۳۰ سے زیادہ نفع کی شرح طے نہیں کرسکتے، خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ مثال میں

---

(١) الدكتور فيصل محمد الأخوة ،اسهم المشاركه، مجلة المجمع الفقه الاسلامى الجزء الثانى العدد السادس (ص:١٥٠٣)۔

(٢) الدكتور نبيل نصيف، شهادة المشاركة لأجل، مجلة مجمع الفقه الاسلامى، الجزء الثانى العدد السادس (ص:١٤٨١)۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ کے حاملین کے لئے نفع کا ٪۳۰ یا اس سے کم کوئی نسبت طے کی جاسکتی ہے لیکن ٪۳۰ سے زائد نہیں۔

۴۔ حاملین سرٹیفکیٹ کی سرمایہ کاری (Investment) میں حاملین اس غرض سے کمپنی کے کسی جامد اثاثے کو رہن رکھنے کا مطالبہ کرسکتے ہیں تاکہ اگر کمپنی کی جانب سے کوئی غفلت یا خیانت کا ارتکاب ہو تو اسکی تلافی ہوسکے۔

۵۔ مشارکہ سرٹیفکیٹ کے ذریعہ تمویل کمپنی کے کسی مخصوص پروجیکٹ یا منصوبہ میں بھی ہوسکتی ہے، جبکہ شیئر سرٹیفکیٹ میں عموماً کل کمپنی کے حصص میں شرکت ہوتی ہے[1]۔

مشارکہ سرٹیفکیٹ کا ثانوی بازار (Secondry Market) اور اسکی خرید و فروخت کے اصول

مشارکہ سرٹیفکیٹ کی یہ حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد یہ واضح ہوتا ہے کہ مشارکہ سرٹیفکیٹ درحقیقت اس عقد شرکت کا دستاویزی ثبوت ہے جو کمپنی اور سرمایہ داروں کے درمیان ہوتا ہے، اور اسمیں کمپنی سرمایہ داروں سے شرکت کی بنیاد پر سرمایہ حاصل کرکے اس سے کاروبار کرتی ہے، اور جو نفع ہوتا ہے اسے متعین شرح سے تقسیم کیا جاتا ہے، اور عقد مشارکہ کی دستاویزات (Certificates) جاری کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کے حامل افراد اور کمپنی کے مابین عقد بھی ہوجائے اور ان کے حامل افراد انہیں ثانوی بازار (Secondry Market) میں فروخت کرکے اپنا سرمایہ بھی واپس لے سکتے ہیں، اور یہ مشارکہ سرٹیفکیٹ بھی شیئر سرٹیفکیٹ کی طرح کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت کی نمائندگی کرتے ہیں، گویا کہ مشارکہ سرٹیفکیٹ اپنی ذات میں کوئی چیز نہیں ہیں، بلکہ اسکی پشت پر جو املاک اور اثاثے ہیں وہ اصل چیز ہیں، لہٰذا ان دستاویزات (Certificate) کی خرید و فروخت کا مطلب دراصل کمپنی کے اثاثوں میں سے متناسب ملکیت کی خرید و فروخت ہے، اور کمپنی کے اثاثے مختلف صورتوں میں ہوتے ہیں، نقد، قابل وصول

(۱) الدکتور فیصل محمد الأخوة، أسهم المشاركه، مجلة المجمع الفقه الاسلامی، الجزء الثانی العدد السادس (ص:۱۵۰۳)۔

دیون (Pay ables or dues) جامد اثاثے سامان تجارت وغیرہ، اور ہر قسم میں شیئر ہولڈرز کا متناسب حصہ ہوتا ہے، لہذا مشارکہ سرٹیفکیٹ کی فروختگی کا مطلب یہ ہے کہ اسکا حامل نقد دیون، جامد اثاثوں اور اموال تجارت میں سے ہر ایک میں اپنی متناسب ملکیت کو فروخت کررہاہے، ان سرٹیفکیٹ کی خرید وفروخت کی اس حیثیت کے مطابق انکی خرید وفروخت کی شرائط یا اصول حسب ذیل ہیں:

ا۔ان سرٹیفکیٹ کو اگر قیمت اسمیہ (Face or par Value) پر فروخت کیا جائے تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ بقیہ ساری شرائط پوری کی جائیں۔

البتہ اگر ان سرٹیفکیٹ کی کم وبیش پر خرید وفروخت کی جائے تو اس کے جواز کی ایک شرط یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثے صرف نقد اور دیون کی شکل میں نہ ہوں، اگر کمپنی نے ابھی تک کسی قسم کے جامد اثاثے (مثلاً بلڈنگ، مشینری وغیرہ) یا سامان تجارت نہیں خریدے، بلکہ اس کے پاس صرف نقود ہیں یا کسی کے ذمہ دیون ہیں تو اس صورت میں شیئر صرف نقد کی نمائندگی کررہاہے، مثلاً دس روپے کا سرٹیفکیٹ صرف دس روپے کی نمائندگی کررہاہے، اگر اس کو گیارہ روپے میں فروخت کیا جائے گا تو دس روپے کی فروخت گیارہ روپے کے ساتھ ہوئی، جو کہ سود ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے۔

لیکن جب نقد کے علاوہ کمپنی کے دیگر اثاثے بھی وجود میں آجائیں تو اب اسکے اثاثے مخلوط ہوگئے، اس میں نقود اور غیر نقود دونوں شامل ہیں، اب سرٹیفکیٹ کی فروخت کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی کے اثاثوں میں ہر ایک کے متناسب حصہ کی فروخت ہورہی ہے، اس مسئلہ کا مدار اب مدعجوہ کے مسئلہ پر ہوگا، مدعجوہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ کے درمیان ایک اختلافی مسئلہ کا عنوان ہے، جس کو سیف محلی، اور منطقہ مفضضہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، اس مسئلہ کی مکمل تفصیل شیئر سرٹیفکیٹ کی خرید وفروخت کی شرائط میں آچکی ہے، اس مسئلہ کا حاصل یہ ہے کہ ایسا مال جو مال ربوی اور غیر ربوی سے مخلوط ہو اگر اسے خالص مال ربوی سے بیچا جائے، جیسے تلوار پر سونا لگا ہوا ہو تو تلوار غیر ربوی اور سونا ربوی ہے، اسکی خرید وفروخت دیناروں (خالص سونے) سے کی جائے، تو اس کا کیا حکم ہے؟ امام شافعیؒ کی نزدیک مخلوط کو خالص مال ربوی سے بیچنا جائز نہیں ہے، جب تک کہ مخلوط سے مال ربوی کو الگ نہ کیا جائے۔ امام ابو حنیفہؒ، علامہ ابن تیمیہؒ اور امام احمدؒ کی

ایک روایت کے مطابق ان کے نزدیک اس طرح سے خرید و فروخت جائز ہے، بشرطیکہ خالص مال ربوی غیر ربوی سے زیاد ہو، مال ربوی کے مقابلے میں مال ربوی ہوگا، اور زائد خالص مال ربوی غیر ربوی کے مقابلے میں ہوگا[(۱)]۔

(۱) ابن قدامه، موفق الدین(أبو محمد) عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی٦٢٠ ه ،المغنی، مکتبة الریاض السعودیة ١٤٠٢ه: (٩٢:٦/٩٣) فصل: وإن باع شيئا فيه الربا بعضه ببعض ومعهما أو مع أحدهما من غير جنسه كمد ودرهم بمد ودرهم أو بمدين أو بدرهمين، أو باع شيئا ملحى بجنس حليته، فهذه المسألة تسمى مسألة (مد عجوه) والمذهب أنه لا يجوز ذلك، نص على ذلك أحمد فى مواضع كثيرة،وذكره قدماء الأصحاب، وعن أحمد رواية أخرى تدل على أنه يجوز بشرط أن يكون المفرد أكثر من الذى معه غيره،أى يكون مع كل واحد منهما من غير جنسه، وقال حماد بن أبى سليمان وأبو حنيفه يجوز هذا كله إذا كان المفرد أكثر من الذى معه غيره، أو كان مع كل واحد منهما من غير جنسه۔ وقال الحسن لا بأس ببيع السيف المحلى بالفضه بالدراهم، وبه قال الشعبى والنخعى۔

و المهذب: (٢٨٠:١): وما حرم فيه الربا لا يجوز بيع بعضه ببعض أو مع أحد العوضين جنس آخر يخالفه فى القيمة كبيع ثوب ودرهم أو مد عجوة ودرهم بدرهمين۔

بهوتى، منصور بن يونس البهوتى ١٠٤٦ه، منتهى الارادات، دار الفكر، بيروت۔ (١٩٨:٢): ولا يصح بيع (ربوى جنسه ومعها) أى العوض (أو) مع أحدهما من غير جنسهما كمد عجوة ودرهم بمثلهما أى بمد عجوة ودرهم، ولو أن المدين والدرهمين من نوع واحد (أو) بيع مدعجوة ودرهم (بمدين) من عجوة (أو بدرهمين) وكبيع محلى بذهب بذهب، أو محلى بفضه بفضة، وتسمى مسألة مد عجوة لأنها مثلث بذلك ونص على عدم جوازها لحديث فضالة بن عبيد أتى النبى ﷺ بقلادة فيها ذهب وخرز ابتاعها رجل بتسعة دنانير أو سبعة دنانير، فقال النبى ﷺ: لا حتى تميز بينهما، قال: فرده حتى ميز بينهما، رواه ابو داؤد، ولمسلم أنه ﷺ أمر بالذهب الذى فى القلادة فنزع وحده، لأنه قد يتخذ حيلة على الربا الصريح۔

و السرخسى ،محمد بن أحمد بن أبى سهل شمس الأئمه الإمام الكبير أبو بكر، المبسوط للسرخسى ١٩٤-٢٥٦ إدارة القرآن كراچى (١٤:٥): أما بيع السيف المحلى بالفضه بالفضة فعلى أربعة أوجه، إن كان يعلم أن فضة الحليه أكثر فهو فاسد، وكذلك إن كانت الحلية مثل النقد فى الوزن، الجفن والحمائل فضل خال عن العروض، فإن مقابلة الفضة بالفضة فى البيع تكون بالأجزاء وإن يعلم أن الفضة فى الحلية أقل جاز العقد على أن يجعل المثل بالمثل والباقى بأزاء الجفن والحمائل عندنا، خلافا للشافعیؒ، وإن كان لا يدرى أيهما أقل فالبيع فاسد عندنا لعدم العلم بالمساواة عند العقد وتوهم الفضل وعند زفر هذا يجوز، فإن الأصل الجواز والمفسد هو الفضل الخالى عن العوض مما لم يعلم به يكون العقد محكوما بجوازه۔

مراجع اضافيہ:الشربينى المطيب (من أعيان علماء الشافعيين) مغنى المحتاج إلى معرفة معانى ألفاظ المنهاج للنورى ١٠ـ٩ (٢٨:٢)، مختصر الفتاوى لابن تيميه (ص:٣٢٩)، الانصارى :الشيخ زكريا ،اسنى المطالب عن روض الطالب، (٢٥:٢) مجموع فتاوى بن تيميه (٤٥٧:٩)۔ والاختيارات الفقهيه من فتاوى ابن تيميه (ص:١٢٨): وتجوز مسألة مد عجوة وهو رواية عن احمد ومذهب أبى حنيفةؒ۔

البتہ موجودہ دور کے بعض شافعی اور حنبلی فقہاء کرامؒ کا موقف یہ ہے کہ اگر مال مخلوط میں اکثر مال ربوی ہو تو خالص مال ربوی سے بیع ناجائز ہے، اور اگر مخلوط میں غیر ربوی مال زیادہ ہو اور مال ربوی کم ہو تو خالص مال ربوی سے بیع جائز ہے۔

بالکل یہی صورت حال یہاں ہے کہ نقود و غیر نقود کی بیع (فروختگی) صرف نقود سے ہو رہی ہے، لہذا امام شافعیؒ کی رائے کے مطابق ایسی حالت میں سرٹیفکیٹس کی فروخت جائز نہیں، اور بعض شافعیہ اور حنابلہ کے موقف کے مطابق اگر کمپنی کے اثاثے زیادہ ہیں اور نقود کم ہیں تو سرٹیفکیٹس کی فروخت جائز ہوگی، اور آج کل علمائے عرب اسی پر فتوی دے رہے ہیں، چنانچہ مسلمان ممالک کی تنظیم آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (O.I.C) کے ذیلی ادارہ اسلامک فقہ اکیڈمی جدہ کے علماء کرام نے یہی فتوی دیا ہے، اسکے چوتھے اجلاس کی قراردادوں میں مذکور ہے:

إذا صار مال القراض موجودات مختلطة من النقود والديون والأعيان والمنافع، فإنه يجوز تداول صكوك المقارضه وفقًا للسعر المتراضى عليه، على أن يكون الغالب نقودا فى هذه الحالة أعيانا ومنافع۔

جب مضاربہ (مشارکہ) کے اثاثے نقود، دیون، اشیاء اور منافع سے مخلوط ہوں تو اگر نقود غالب ہوں تو ان کے سرٹیفکیٹس کی خرید و فروخت جس قیمت پر متعاقدین راضی ہوں جائز ہے[1]۔

اسکی رو سے سرٹیفکیٹ خریدنے سے پہلے کمپنی کے اثاثوں کا جائزہ لینا ضروری ہوگا کہ نقود زیادہ ہیں یا غیر نقود زیادہ ہیں۔

لیکن حنفیہ کے نزدیک اس تحقیق کی ضرورت نہیں ہے، جب یہ تحقیق ہو جائے کہ کمپنی کے کچھ اثاثے غیر نقد بھی ہیں، تو پھر لکھی ہوئی قیمت (Face Value) سے زیادہ پر خرید و فروخت جائز ہوگی، البتہ ہر سرٹیفکیٹ کے حصہ میں کمپنی کے نقود اور دیون کی جتنی مقدار آئی ہے، اگر سرٹیفکیٹ کی قیمت اس کے برابر یا اس سے کم ہو تو خرید فروخت جائز نہ

(۱) مجمع الفقه الاسلامى جده، القرارات، مجلة مجمع الفقه الاسلامى العدد الرابع، الجزء الثالث (ص:۲۱۶۲)۔

ہو گی، مثلاً دس روپے کے سرٹیفکیٹ کے حصہ میں اگر آٹھ روپے نقود و دیون کے مقابل ہیں اور دو روپے جامد اثاثوں کے مقابل ہیں تو سرٹیفکیٹ کی فروختگی آٹھ روپے یا اس سے کم میں جائز نہیں ہو گی، البتہ نو روپے یا اس سے زائد میں جائز ہو گی۔

۲۔ سرٹیفکیٹس کی خرید و فروخت کے جواز کی دوسری شرط یہ ہے کہ کمپنی حلال کام کرتی ہو، اگر کمپنی کا اصل کاروبار ہی حرام ہے تو اس کے سرٹیفکیٹس خریدنا جائز نہیں، مثلاً کوئی کمپنی شراب کا کاروبار کرتی ہو، یا کمپنی کا اصل کاروبار ہی سود ہو جیسے بینک وغیرہ۔

۳۔ تیسری شرط سمجھنے سے پہلے اس بات کو جاننا ضروری ہے کہ آج جتنی کمپنیاں قائم ہیں ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ ان کا بنیادی کاروبار اگرچہ حرام نہیں ہے، مثلاً ٹیکسٹائل کمپنیاں یا آٹو موبائل (Automobile) کمپنیاں وغیرہ لیکن شاید ہی ان میں سے کوئی کمپنی ایسی ہو گی، جو کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو، یہ کمپنیاں دو طرح سے سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں جو یہ ہیں:

پہلا طریقہ یہ ہے کہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کے لئے بینک سے سود پر قرضے لیتی ہیں۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ کمپنیوں کے پاس جو زائد اور فاضل (Surplus) رقم ہوتی ہے اسے سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہیں، اور اسپر وہ بینک سے سود حاصل کرتی ہیں، وہ سود بھی انکی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں ایسی کمپنی کے سرٹیفکیٹس خریدوں جو کسی بھی طریقے سے کسی سودی کاروبار میں ملوث نہ ہو تو موجودہ دور میں بہت مشکل ہے، اسی لئے اکثر علماء کرام نے کمپنیوں کے سرٹیفکیٹس یا شیئرز خریدنے کے لئے اس ایک شرط کا اضافہ کیا، وہ شرط یہ ہے کہ شیئرز خریدنے کے بعد شیئرز ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اٹھائے، اگرچہ اسکی آواز مسترد (Over rule) ہو جائے، اور آواز اٹھانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کے کمپنی کی سالانہ میٹنگ جسے .A.G.M یعنی (Annual General Meeting) کہا جاتا ہے اس میں یہ آواز اٹھائے کہ ہم سودی لین دین کو درست نہیں سمجھتے، سودی لین دین پر راضی نہیں ہیں، اسلئے اسکو بند کیا جائے، اب ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں اس آواز کا مؤثر ہونا مشکل ہے، لیکن وہ پھر بھی اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائے گا، یہ رائے حضرت حکیم الامت مولانا

اشرف علی تھانویؒ اور مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مد ظلہم، اور علماء عرب میں سے استاذ علی الخفیف، ابوزہرہ عبدالوہاب خلاف، عبدالعزیز خیاط، وہبہ زحیلی، عبداللہ المنیع وغیرہم کی ہے، اس کے بارے میں پوری تفصیل پچھے شیئرز کی خرید وفروخت کی شرائط میں گذر چکی ہے۔

۴۔ چوتھی شرط در حقیقت تیسری شرط سے متعلق ہے، وہ یہ ہے کہ تیسری شرط میں یہ بات ذکر کی گئی تھی کہ موجودہ دور کی اکثر کمپنیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک حد تک سودی کاروبار میں شریک ہو جاتی ہیں، لہذا شیئر ہولڈر کو چاہیے کہ وہ اس کے خلاف کمپنی کی سالانہ میٹنگ (A.G.M) میں آواز ضرور اٹھائے، تا کہ کمپنی کے سودی کاروبار میں رضامند نہ سمجھا جائے، اور پھر جب منافع (Dividend) تقسیم ہو تو وہ شخص نفع کے اسٹیٹ منٹ (Income statement) کے ذریعہ معلوم کر کے کہ آمدنی کا کتنا فیصد حصہ سودی ڈیپازٹ (Deposit) سے حاصل ہوا ہے، مثلاً فرض کیجئے کہ اس کمپنی کو کل آمدنی کا پانچ فیصد حصہ سودی ڈیپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے، تو اب وہ شخص اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کر دے۔

خلاصہ یہ کہ کسی کمپنی کے سرٹیفکیٹ کی خرید وفروخت کی چار شرائط ہیں۔

۱۔ کمپنی کا اصل کاروبار حلال ہو۔

۲۔ قیمت اسمیہ (Face Value) سے کم وبیش پر بیچنے کے لئے یہ ضروری ہے، کمپنی کے اثاثے صرف نقد شکل میں نہ ہوں۔

۳۔ سود کے خلاف سالانہ اجلاس (A.G.M) میں آواز اٹھائے۔

۴۔ کمپنی کی آمدنی میں سود شامل ہو تو نفع کی اتنی مقدار صدقہ کر دے۔

کیا مشارکہ سر ٹیفکیٹ بیئرر ہو سکتا ہے؟

مشارکہ سر ٹیفکیٹ کے بارے میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس طرح شیئرز بیئرر ہوتے ہیں کیا مشارکہ سر ٹیفکیٹ بیئرر ہو سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب جاننے سے قبل یہ جاننا چاہیے کہ مشارکہ سر ٹیفکیٹ کا شرعی لحاظ سے تقریباً وہی حکم ہے جو شیئر سر ٹیفکیٹ کا ہے، کیونکہ مشارکہ سر ٹیفکیٹ بھی کمپنی کے اثاثوں کی اسی قسم کی نمائندگی کرتے ہیں، جس طرح شیئرز سر ٹیفکیٹ نمائندگی کرتے ہیں، لہذا مشارکہ سر ٹیفکیٹ کے تعارف اور اس کے احکام میں اکثر وہی باتیں ذکر کی گئی تھیں جو شیئر سر ٹیفکیٹ میں ذکر کی گئی تھیں، اسی طرح مشارکہ سر ٹیفکیٹ کی انواع واقسام کا بھی وہی حکم ہوگا جو شیئر سر ٹیفکیٹ کی انواع کا حکم ہے۔

شیئر سر ٹیفکیٹ کی ایک قسم بیئرر (Bearer) شیئر ہے جسے عربی زبان میں ,,السہم لحاملہ،، کہا جاتا ہے، یہ شیئر کی وہ قسم ہے جس پر اس کے مالک کا نام درج نہیں ہوتا، اور اس پر یہ لکھا ہوتا ہے کہ یہ شیئر حامل ہذا (Bearer) کی ملکیت ہے، جس شخص کے ہاتھ میں بھی یہ شیئر ہوتا ہے وہ اس کمپنی کا شریک یا شیئر ہولڈر سمجھا جاتا ہے، اور اسکا قبضہ اسکی ملکیت کی علامت سمجھا جاتا ہے، یہ بیئرر شیئر کہلاتا ہے، یہی حال بالکل مشارکہ سر ٹیفکیٹ کا بھی ہے، کہ اسکا حامل (Bearer) بھی اس کا مالک اور اس کمپنی کا شریک سمجھا جاتا ہے، اور اس پر اسکا نام درج نہیں ہوتا، تعریف کی رو سے جب بیئرر شیئر اور بیئرر مشارکہ سر ٹیفکیٹ یکساں ہیں تو ان کے جائز یا ناجائز ہونے کے احکام بھی یکساں ہوں گے، بیئرر سر ٹیفکیٹ کے بارے میں علماء کرام کی آراء اور اقوال مختلف نظر آتے ہیں جن پر غور کرنے کے بعد ہمیں جو حکم بیئرر شیئر کا صحیح اور راجح معلوم ہوگا وہی حکم مشارکہ بیئرر سر ٹیفکیٹ میں بھی جاری کر دیا جائے گا، لہذا سب سے پہلے ہم بیئرر شیئرز کے حکم پر غور کرتے ہیں۔

بیئرر شیئرز کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارے میں علماء کرام کے دو فریق ہیں۔

ایک فریق یہ کہتا ہے کہ بَیرر شیئر یا السہم لحاملہ کا اجراء اور خرید و فروخت جائز نہیں ہے، یہ رائے ڈاکٹر عبد العزیز خیاط، ڈاکٹر صالح مرزوقی، ڈاکٹر علی القرہ داغی وغیرہ علماء کرام کی ہے[1]۔

انکی دلیل یہ ہے کہ ان پر نام درج نہ ہونے کی وجہ سے ان کا حامل شریک (شیئر ہولڈر) نامعلوم ہو گیا، (جیسے فقہ اسلامی میں مجہول ہونے سے تعبیر کرتے ہیں) جس کے نتیجہ میں نزاع یا جھگڑا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے، نیز کوئی شخص اسکا جس طرح چاہے خواہ چوری، غصب وغیرہ کر کے مالک بنے قانوناً وہی اس کمپنی کا شریک سمجھا جاتا ہے، اور شریعت میں ہر وہ چیز جو ضرر اور نزاع کا سبب بن سکتی ہو ممنوع ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شیئر ہولڈر کا نام معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آیا یہ شیئر ہولڈر شریک بننے کی اہلیت بھی رکھتا ہے یا نہیں، کیونکہ شرکت کی شرائط میں سے یہ ہے کہ شریک تصرفات کے قابل ہو، یعنی ناسمجھ بچہ، پاگل، یا غلام نہ ہو، اہلیت نامعلوم ہونے کی وجہ سے اس بات کا امکان ہے کہ شریک نااہل ہو۔

ان حضرات کی رائے کے مطابق انہی وجوہ سے بعض ممالک مثلاً مصر، شام اور کویت میں اس قسم کے بَیرر شیئر قانوناً ممنوع ہیں[2]۔

---

(۱) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: الخیاط،عبد العزیز عزت الشرکات فی الشریعة الإسلامیة والقانون الوضیعی،دار النهضة العربیة بیروت ١٤٠٧ه (٢٢٠:٢)، مرزوقی،صالح بن زابن، شرکة المساهمة فی النظام السعودی من علماء القرن الخامس عشر جامعه ام القری مکة المکرمة(ص:٣٥٤)، مجلة مجمع الفقه الاسلامی بحث الدکتور علی القره داغی العدد السابع (١١٩:١)،الدکتور ابوزید رضوان، الشرکات التجاریه فی القانون المقارن طبعة دار الفکر العربی۔

(۲) تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: الخیاط،عبد العزیز عزت الشرکات فی الشریعة الإسلامیة والقانون الوضیعی دار النهضة العربیة بیروت ١٤٠٧ه(٢٢٠:٢)، مرزوقی،صالح بن زابن، شرکة المساهمة فی النظام السعودی من علماء القرن الخامس عشر جامعه ام القری مکة المکرمة (ص:٣٥٤) مجمع الفقه الاسلامی جده، مجلة مجمع الفقه الاسلامی بحث الدکتور علی القره داغی العدد السابع (١١٩:١)، ڈاکٹر ابوزید رضوان طبعة دار الفکر العربی، الشرکات التجاریه فی القانون المقارن۔

دوسرے فریق کی رائے یہ ہے کہ بیئرر شیئرز سرٹیفکیٹ کا اجراء اور خرید و فروخت جائز ہونے چاہیں، یہ رائے اکثر علمائے عصر کی ہے، جن میں مجمع الفقہ الاسلامی اور البنک الاسلامی للتنمیہ (Islamic Develepmant Bank) کے شریعہ بورڈ کے علماء شامل ہیں۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ ایسے سرٹیفکیٹ کے ذریعہ عام رجسٹرڈ شیئر سرٹیفکیٹ کی طرح فروخت کی جانے والی چیز اس بیئرر سرٹیفکیٹ کے بجائے در حقیقت اسکی پشت پر کمپنی کے اثاثوں میں موجود مشاع حصہ ہے، اور مشاع کی خرید و فروخت جائز ہے، اور یہ سرٹیفکیٹ اس کے مالک یا مستحق ہونے کا صرف ایک ثبوت ہے، لہذا ان کا حکم بھی عام رجسٹرڈ شیئرز کی طرح جواز کا ہوگا۔

البتہ اس پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ عام شیئرز اور بیئرر شیئرز میں یہ فرق ہے کہ عام شیئرز کا مالک معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس پر اسکا نام درج ہوتا ہے، جبکہ بیئرر شیئر پر نام درج نہ ہونے کی وجہ سے اسکا مالک معلوم نہیں ہوتا، اور مالک معلوم نہ ہونے کی وجہ سے کمپنی کا یہ شریک نامعلوم اور مجہول ہو جاتا ہے، اور جہالت یا لاعلمی کی وجہ سے فقہ اسلامی میں بعض عقود فاسد ہو جاتے ہیں، لہذا یہ شرکت بھی فاسد ہو جائے گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو فقہ کی کتابوں میں شرکت صحیح ہونے کی شرائط میں شریک کے معلوم ہونے کی شرط ذکر نہیں کی گئی ہے، جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شرکت میں شریک معلوم ہونا ضروری نہیں ہے، اور پھر یہ کہ فقہ اسلامی میں یہ قاعدہ ہے کہ جہالت یا لاعلمی اس وقت عقد فاسد کرتی ہے، جب اس جہالت کی وجہ سے نزاع اور جھگڑے کا امکان ہو، اس لحاظ سے اگر بیئرر شیئرز کے بارے میں غور کیا جائے تو اگر شیئر ہولڈر اسکی کل قیمت ادا کر چکا ہے تو پھر اس کے مالک کے مجہول یا نامعلوم ہونے سے کوئی نزاع پیدا نہیں ہوتا۔

ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ بیئرر شیئر کا حامل قانونی طور پر اس کا مالک یا کمپنی کا شریک سمجھا جاتا ہے، خواہ اس نے غصب کر کے، چوری یا ڈاکہ زنی کر کے اس پر قبضہ کیا ہو، اس سے قطع نظر صرف ظاہری قبضہ دیکھ کر اسکو قانوناً مالک قرار دیا جاتا ہے، جس سے لوگوں کے ضرر کا اندیشہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ شیئر سر ٹیفکیٹ در حقیقت کمپنی کے اس مشاع حصہ کی ملکیت کا ثبوت ہے، لہذا اسکی ملکیت یا فروختگی کا مطلب اسکی پشت پر موجود اثاثوں کی ملکیت یا خرید و فروخت ہے، اور اثاثوں کی ملکیت یا خرید و فروخت عام سامان کی طرح ہے کہ اسکی خرید و فروخت کے لئے ان پر مالک کا نام درج ہونا ضروری نہیں ہے، اگر کوئی شخص کوئی سامان فروخت کرہا ہے تو اس پر اس کا نام درج ہونا ضروری نہیں ہے، حالانکہ اس میں بھی پتہ نہیں ہوتا کہ یہ سامان غصب چوری یا ڈاکہ زنی سے حاصل ہوا یا نہیں۔

فریق اول یعنی وہ لوگ جو بیئرر سر ٹیفکیٹ کو ناجائز قرار دیتے ہیں ان کی ایک دلیل یہ بھی تھی کہ شرکت کی شرائط میں شریک کے تصرفات کا مالک یا اہل ہونا ضروری ہے، اور جب شریک نامعلوم ہوگا تو اس کے متصرف یا اہل ہونے کا پتہ نہیں چلے گا، لہذا شریک کا معلوم ہونا ضروری ہے، اور بیئرر شیئر میں شریک کے نامعلوم ہونے کی وجہ سے اسکی اہلیت بھی نامعلوم ہوگی، جس کی وجہ سے یہ بھی جائز نہیں ہیں۔

اسکا جواب یہ ہے کہ شریک کے تصرفات کا مالک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ وکالت کی اہلیت رکھے، اس شرط سے ناسمجھ بچہ اور پاگل نکل جاتے ہیں، البتہ ہر سمجھ دار بچہ یا عاقل بالغ شخص وکیل اور شریک بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ناسمجھ بچہ اور پاگل شخص کو کون بیئرر سر ٹیفکیٹ جاری یا فروخت کرے گا، اور جو بیئرر سر ٹیفکیٹ خریدے گا وہ سمجھ دار ہی ہوگا، لہذا بیئرر ہونے سے اس بارے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

البتہ ان اعتراضات کی بناء پر اولیٰ یہ ہے کہ بیئرر سر ٹیفکیٹ کے اجراء یا خرید و فروخت سے پرہیز کرنا چاہیے، یہی رائے مجمع الفقہ الاسلامی کے ارکان اور البنک الاسلامی للتنمیہ (I.D.B) کے شریعہ بورڈ کے ارکان کی قرار دادوں سے بھی معلوم ہوتی ہے، جسے ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

بما أن المبيع في (السهم لحامله) هو حصة شائعة في موجودات الشركة وأن شهادة السهم هي وثيقة لإثبات هذا الاستحقاق في الحصة فلا مانع شرعا من إصدار أسهم في الشركة بهذه الطريقة وتداولها، ويمكن أن يستفاد من هذاالنوع من الأسهم في صكوك المقارضة۔ والأولى عدم

إصدار أسهم لحاملها، حفظا لحقوق المساهمين[1]۔

ان بیرر شیئرز کے ذریعے فروخت ہونے والی چیز بیرر شیئرز کے بجائے در حقیقت اسکی پشت پر کمپنی کے اثاثوں میں موجود مشاع حصہ ہے، (اور مشاع کی خرید و فروخت جائز ہے) اور یہ سرٹیفکیٹ اس کے مالک یا مستحق ہونے کا صرف ایک ثبوت ہے، لہذا ان کا حکم یہ ہے کہ کمپنی کے ایسے شیئرز کے اجراء اور خرید و فروخت میں شرعا کوئی مانع نہیں ہے، اور مضاربہ (یا مشارکہ) سرٹیفکیٹس میں بھی اس قسم کے شیئرز سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ شرکاء کے حقوق کی حفاظت کے لئے بیرر شیئر جاری نہ کرنا اولی ہے۔

کیا مشارکہ سرٹیفکیٹ اوپن اینڈ ہو سکتا ہے؟

مندرجہ بالا سوال کا جواب دینے سے قبل یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اوپن اینڈ شیئرز اور اوپن اینڈ کمپنی کا اصطلاحی مفہوم اور حکم ذکر کیا جائے تاکہ انکی روشنی میں اوپن اینڈ مشارکہ سرٹیفکیٹ کا حکم بھی واضح ہو جائے۔

اوپن اینڈ شیئرز کا مفہوم:

کسی کمپنی کے ایسے حصص جن کے بارے میں کمپنی کی جانب سے اس بات پر رضامندی ہو کہ ان حصص کو کمپنی حاملان حصص کے مطالبہ پر دوبارہ خرید لے گی، یہ حصص اوپن اینڈ شیئرز کہلاتے ہیں۔

اوپن اینڈ انویسٹمنٹ کمپنی کا مفہوم:

کوئی تجارتی کمپنی اپنے حصص جاری کرتے وقت اس بات پر رضامندی ظاہر کرے کہ وہ انہیں عند الطلب دوبارہ

(۱) مجمع الفقه الاسلامی جده، مجله مجمع الفقه الاسلامی العدد السابع الجزء الأول (ص:۵۴۲)، الوثيقه (رقم:٤)، البيان الختامی والتوصيات للندوه الثانية للأسواق الماليه المنعقدة بدولة بحرين، وقرارات مجمع الفقه الاسلامی (ص:۲۱۲)۔

خود خرید لے گی، ایسی کمپنی اوپن اینڈ انویسٹمنٹ کمپنی کہلاتی ہے، چنانچہ ایسی کمپنی کی تعریف یوں کی گئی ہے:

An Investment Company which continously issues its shares and agrees to repurchase them from share holders on demanand.(1)

سرمایہ کاری کی ایسی کمپنی جو مسلسل اپنے شیئر جاری کرے اور انہیں عند الطلب شیئر ہولڈرز سے دوبارہ خریدنے پر راضی ہو۔

اوپن اینڈ مشارکہ سرٹیفکیٹ کا مفہوم:

اوپن اینڈ مشارکہ سرٹیفکیٹ اور اوپن اینڈ شیئرز کا مفہوم یکساں ہے، کیونکہ جس طرح شیئرز سرٹیفکیٹ کمپنی کے اندر موجود شرکاء کے اثاثوں کے دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں اور انکی خرید و فروخت کا مطلب انکی پشت پر موجود اثاثوں کی خرید و فروخت ہے، اسی طرح مشارکہ سرٹیفکیٹ کمپنی کے اندر موجود شرکاء کے اثاثوں کے دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں، اور انکی خرید و فروخت کا مطلب بھی انکی پشت پر موجود اثاثوں کی خرید و فروخت ہے، لہذا جو حکم اوپن اینڈ شیئرز کا ہوگا وہی حکم اوپن اینڈ مشارکہ سرٹیفکیٹ کا بھی ہوگا۔

اوپن اینڈ شیئرز اور مشارکہ سرٹیفکیٹ کا حکم

کسی کمپنی کے ایسے حصص جن کے بارے میں کمپنی کی جانب سے اس بات پر رضامندی ہو کہ ان حصص کو کمپنی حاملان حصص کے مطالبہ پر دوبارہ خرید لے گی، یہ مفہوم اوپن اینڈ مشارکہ یا شیئر سرٹیفکیٹ کا ہے، کمپنی کا کسی شیئر ہولڈر کو سرمایہ دے کر حصص خریدنے کا مطلب یہ ہے کہ کمپنی جو شرکاء کی وکیل اور ایجنٹ ہے، وہ شرکاء کی طرف سے ایک شریک کا حصہ خرید رہی ہے، اب فقہی لحاظ سے اس مسئلے کا جائزہ لینا ضروری ہوگا، کہ کیا کوئی شریک دوسرے شریک کا کوئی حصہ خرید سکتا ہے؟ شرعی لحاظ سے اس بارے میں کسی کے نزدیک کوئی قباحت نہیں ہے کیونکہ اس کا مطلب یہی

---

1. Popular Oxford Dictionary of Business, p. 393.

ہے کہ وہ دوسرے کی ملکیت کو خرید رہا ہے۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

وإن اشترى أحد الشريكين حصة شريكه منه جاز لأنه يشترى ملك غيره[1]۔

اور اگر کسی ایک شریک نے دوسرے شریک کا حصہ خرید لیا تو جائز ہے کیونکہ اس نے دوسرے کی ملکیت خریدی ہے۔

مشارکہ سرٹیفیکیٹ کی قیمت کا تعین

یہاں پر دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان سرٹیفیکیٹس کی خرید و فروخت بازاری قیمت (Market Value) پر ہوگی، یا بریک اپ ویلیو، (Break up Value) پر ہوگی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سرٹیفیکیٹ شیئرز کی مانند ان اثاثوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو ان کی پشت پر ہیں، اور انکی فروختگی کا مطلب ان اثاثوں کی فروختگی ہے، لہذا شیئرز کی مانند مشارکہ سرٹیفیکیٹس کی قیمتوں کی بھی تین قسمیں ہونگی، اب ہم ذیل میں شیئرز کی ان تینوں اقسام کا جائزہ لیتے ہیں تاکہ اسکی روشنی میں مشارکہ سرٹیفیکیٹ کی قیمت متعین کرنے میں آسانی رہے۔

۱:۔ قیمتِ اسمیہ (Face / Par Value) شیئرز سرٹیفیکیٹس جاری کرتے وقت جو قیمت ان پر درج کی جاتی ہے، اسے قیمتِ اسمیہ (Face / Par Value) کہا جاتا ہے۔

۲:۔ بازاری قیمت (Market Value)، بازارِ حصص یعنی اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، اس میں کمپنی کے اثاثوں کو بھی دخل ہوتا ہے، اثاثے بڑھنے سے قیمت بڑھتی ہے، لیکن اثاثوں کے علاوہ

(۱) ابن قدامه: المغنى (۵:۵۸)۔

بعض دوسرے خارجی عوامل بھی قیمتوں کے بڑھنے یا گرنے میں اثرانداز ہوتے ہیں، مثلاً منافع کے امکانات، طلب ورسد کا رجحان، سیاسی حالات، غیر مادی عوامل، جیسے بعض افواہوں یا تخمینوں (Speculations) سے بھی قیمتوں میں کمی بیشی ہوتی ہے۔

چونکہ قیمتوں کے اتار چڑھاؤ میں خارجی عوامل بھی اثرانداز ہوتے ہیں، اس لئے شیئرز کی بازاری قیمت سے کمپنی کے اثاثوں کی صحیح نمائندگی نہیں ہوتی ہے۔

۳:۔ بریک اپ ویلیو، (Break up Value) اگر کمپنی تحلیل ہو تو ہر شیئرز کے مقابلے میں کمپنی کے اثاثوں کا جو حصہ آئے گا اسے بریک اپ ویلیو کہتے ہیں، بریک اپ ویلیو سے اثاثوں کی قیمتوں کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔

اب ہم مندرجہ بالا تینوں اقسام میں غور کرتے ہیں کہ کمپنی اوپن اینڈ مشارکہ سرٹیفکیٹ کو جب واپس خریدے گی توان میں سے کونسی قیمت اس کے ذمہ واجب الاداء ہوگی؟

جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اوپن اینڈ مشارکہ سرٹیفکیٹ میں بریک اپ ویلیو، (Break up Value) معتبر ہونی چاہیے، کیونکہ بریک اپ ویلیو ہی اثاثوں کی قیمتوں کی صحیح ترین عکاسی کرتی ہے، اور اس غرض کے لئے ہفتہ وار یا ماہانہ کل اثاثوں کی مالیت کا ماہرین کے ذریعہ تعین (Net asset Value) میں اکثر یونٹ ٹرسٹ اور میوچل فنڈز میں کرایا جاتا ہے، یہی طریقہ یہاں بھی اختیار کیا جاسکتا ہے، البتہ اگر بریک اپ ویلیو نکالنا بہت مشکل یا ناممکن ہو تو بازاری قیمت کا بھی اعتبار کیا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا حکم اس وقت تھا جب کمپنی کے ہاتھ خرید وفروخت کی جارہی ہو، لیکن اگر کسی تیسرے آدمی کے ہاتھ خرید وفروخت ہورہی ہو تو پھر انکی قیمت باہمی رضامندی سے متعین ہوسکتی ہے۔

حکومتی قرضوں میں مشارکہ سرٹیفیکیٹ کا استعمال

کیا حکومتی قرضوں میں مشارکہ سرٹیفیکیٹ استعمال کیا جاسکتا ہے؟

حکومت اور عوام کے قصیر المیعاد اور طویل المیعاد قرضوں کی ضرورت، اقسام طریقۂ کار اور احکام کے بارے میں تفصیل باب اول کے آخر میں گذر چکی ہے، لیکن وہاں پر مذکورہ بالا سوال کا جواب تفصیل سے ذکر نہیں کیا گیا تھا، لہذا اس جواب کو مشارکہ کی دستاویز (Certificate) سے متعلق ہونے کی وجہ سے یہاں ذکر کیا جارہا ہے، البتہ اسکی تمہید کے طور پر یہ بات جاننی چاہیے کہ حکومت کو بعض اوقات جو قصیر المیعاد قرضوں کی ضرورت پڑتی ہے اسکی زیادہ سے زیادہ مدت ایک سال ہوتی ہے، قصیر المیعاد قرضوں کے حصول کے لئے حکومت یا تو بینک سے براہ راست قرض لیتی ہے یا خزانے کی ھنڈیاں (Treasury Bills) جاری کر کے عوام الناس اور بینکوں کو انہیں خریدنے کی دعوت دیتی ہے، اور حکومت کو جب کثیر مقدار میں سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور قلیل مدت کے قرضے مطلوبہ مقاصد پورا نہیں کرپاتے تو پھر وہ طویل مدت کے قرضے حاصل کرتی ہے، جسے طویل المیعاد قرضے کہا جاتا ہے، اس مقصد کے لئے وہ تمسکات (Bonds) اور کفالتیں (Securities) جاری کرتی ہے، اب مسئلہ یہ ہے کہ غیر سودی بینکاری میں ان ضرورتوں کو کیسے پورا کیا جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ حکومتی قصیر المیعاد قرضوں میں اگر وہ نفع آور مقاصد کے لئے طلب کئے گئے ہوں، تو ورکنگ کیپٹل فائنانسنگ میں مشارکہ کا طریقہ اپنایا جاسکتا ہے، جس کا تفصیلی طریقہ کار چوتھے باب میں گذر چکا ہے، البتہ اگر حکومتی قصیر المیعاد قرضے غیر نفع بخش، یا غیر پیداواری کام کے لئے ہوں، اور ان کا براہ راست پیداواری کاموں سے کوئی تعلق نہ ہو، مثلاً بلوں کی ادائیگی، مزدوریاں، بالائی اخراجات، (Over head expenses) وغیرہ، یا وہ انتہائی کم مدت کے لئے قرضے لئے گئے ہوں تو اس قسم کے قرضے غیر سودی بینکاری میں بلا سود دئے جائیں گے، البتہ قرضے دینے پر جو انتظامی

اخراجات آئیں گے انکی اجرتِ مثل بینک قرض لینے والوں سے لے سکتے ہیں۔

حکومتی طویل المیعاد قرضے اگر نفع آور مقاصد کے لئے طلب کئے گئے ہوں تو پروجیکٹ فائنانسنگ (Project Financing) میں مشارکہ کا طریقہ استعمال کیا جاسکتا ہے، جس کی تفصیل اسی مقالے کے چوتھے باب میں ذکر کی جاچکی ہے، البتہ اگر غیر پیداواری کام کے لئے قرضہ لیا جارہا ہے مثلاً ایٹمی توانائی، اسلحہ اور سامانِ جنگ بنانے والے کارخانے آب پاشی کے بڑے بڑے بند اور ان سے متعلق بجلی گھر، ہسپتال کی تعمیر وترقی نیز نقل وحمل، اور رسل ورسائل (Transportation and Highways) سے متعلق منصوبوں میں قرض لینے والوں کے ساتھ شرکت کے اصول پر تو سرمایہ فراہم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ انکی پیداوار یا تو فروخت نہیں ہوتی، یا ایک ضروری سماجی خدمت کے طور پر ایسے معاوضوں کے بدلے فراہم کی جاتی ہے، جنکی تعیین میں نفع نقصان کے بجائے دوسرے مصالح کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے، اس کے بجائے اس قسم کی ضرورت کی تکمیل کے لئے ایک دوسرا طریقہ تجویز کیا جاتا ہے، جس میں مشارکہ سرٹیفکیٹ استعمال کیا جائے گا، اس طریقے کی کچھ تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

جس بینک سے اوپر ذکر کردہ مقاصد کے لئے سرمایہ طلب کیا جارہا ہے وہ ان مقاصد کے لئے مشارکہ سرٹیفکیٹ جاری کر کے عوام الناس کو انہیں خریدنے کی دعوت دے [(۱)]، پھر اس سے جو سرمایہ حاصل ہو اسکے ذریعے ایک مشارکہ فنڈ قائم کیا جائے اور اسے حکومت کے مطلوبہ جامد اثاثے یا سامان کی خریداری میں استعمال کیا جائے، ان سامان کے حصول کے بعد یہ مشارکہ فنڈ جامد اثاثے اجارہ پر اور سامان مرابحۂ مؤجلہ پر حکومت کو دیدے، اجارہ پر دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسے کرایہ داری (Financial Lease) پر دیدے، اجارہ اور مرابحہ کا مکمل طریقۂ کار زیر نظر مقالہ کے آخر میں بطور ضمیمہ (Appendix) شامل کردیا گیا ہے، اور مرابحۂ مؤجلہ پر دینے کا مطلب یہ ہے کہ حکومت نے وہ سامان جتنی نقد قیمت دے کر خریدا تھا اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس سے زیادہ قیمت پر حکومت کو ادھار فروخت کردے [(۲)]، مثلاً کوئی مشین

---

(۱): اس مقصد کیلئے یہ بھی کیا جاسکتا ہے کہ ایک مالیاتی ادارہ بنایا جائے، خواہ وہ کلی یا جزوی طور پر حکومت کا ہو یا پرائیویٹ ہو، یا پھر موجودہ مالیاتی اداروں مثلاً ٹریڈنگ کارپوریشن آف پاکستان (TCP) کو بھی اس مقصد کیلئے استعمال کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کا مالیاتی ادارہ مشارکہ سرٹیفکیٹ جاری کرے اور عوام الناس کو انہیں خریدنے کی دعوت دے۔

(۲): اس صورت میں نفع بطور مساومہ کوئی بھی طے کرسکتے ہیں، اور اگر نفع کی ایک شرح طے کرلی جائے تاکہ نظام میں یکسانیت رہے اور تمام لوگوں سے نفع ایک شرح سے وصول ہو، یہ صورت بھی جائز ہے، اسے مارک اپ (Mark Up) بھی کہا جاتا ہے۔

ایک لاکھ روپے نقد دیکر کسی سے خریدے پھر اس پر قبضہ کرنے کے بعد مثلاً ڈیڑھ لاکھ روپے کی قسطوں پر حکومت کو فروخت کردے[1]، اس بات کی تحقیق کے لئے کہ آیا جامد اثاثے یا سامان جو فنڈ خرید رہا ہے حکومت کے مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں؟ حکومت کا کوئی ذیلی ادارہ اس سامان کی خریداری کے لئے فنڈ کا وکیل بن سکتا ہے، چنانچہ جب حکومت کا یہ شعبہ فنڈ کے وکیل کے طور پر مذکورہ سامان پر مکمل قبضہ کرلے تو بینک اس سامان کی فروختگی یا کرایہ داری کی ضروری کاروائی مکمل کر کے اسے حکومت کو مرابحہ مؤجلہ پر یا اجارہ (کرایہ داری) پر دیدے گا۔

البتہ تمام عوامی نوعیت کے کام مثلاً سڑکوں، شاہراہوں، عمارتوں اور ہسپتالوں وغیرہ کی تعمیر اور مرمت کا کام استصناع کے طریقے پر کیا جائے گا، استصناع کے معنی آرڈر پر کوئی چیز تیار کروانا ہے، فقہی اصطلاح کے مطابق اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے سے یہ کہے کہ تم مجھے فلاں چیز اتنے روپے کے عوض بنا کردو، جو چیز تم بنا کردو گے میں اسے تم سے آج خرید رہا ہوں، یہ عقد محض کوئی وعدہ نہیں ہوتا، بلکہ بیع تام ہوتی ہے، اگر بنانے والا طے شدہ صفات کے مطابق چیز بنادے تو خریدار لینے پر مجبور ہے، انکار نہیں کر سکتا، البتہ بنوائی کی فیس یا اجرت نقد یا قسطوں میں دونوں طرح جائز ہے۔

استصناع کے تحت تمویل (Financing) کا طریقہ یہ ہوگا کہ حکومت اس مشارکہ فنڈ کے ساتھ ایک استصناع کا عقد کرے گی، اور حکومت اس سامان کی خریدار اور فنڈ صانع (بنانے والا) بن جائے گا، دوسری طرف فنڈ بنانے والے اصل ٹھیکہ داروں کے ساتھ دوسرا عقد استصناع کریگا، تینوں فریقوں (پارٹیوں) یعنی حکومت، ادارہ، اور ٹھیکہ داروں کے حقوق و منافع کے تحفظ کے لئے معاہدات کی مدت متعین اور معلوم ہوگی، جن میں سے ایک معاہدہ حکومت اور فنڈ کے درمیان ہوگا، اور دوسرا معاہدہ فنڈ اور ٹھیکہ داروں (Contractors) کے درمیان ہوگا، پہلے معاہدے یعنی حکومت اور فنڈ کے درمیان عقد استصناع کی قیمت دوسرے معاہدے یعنی فنڈ اور ٹھیکہ داوروں کے درمیان استصناع کی طے شدہ قیمت سے زیادہ ہوگی، حکومت کے فنڈ کے ساتھ عقد استصناع کی قیمت یا اجرت استصناع کے کام مکمل ہونے پر اکٹھی (Lumpsum) یا مدت استصناع کے دوران بالاقساط دونوں طرح مقرر کی جاسکتی ہے، اسی طرح دوسرے معاہدے

(۱): تفصیل کے لئے دیکھئے: ضمیمہ (۱) مرابحہ موجلہ۔

میں بھی مدت کے دوران بالاقساط قیمت کی ادائیگی یا مدت کی ابتداء یا انتہاء پر اکٹھی (Lumpsum) مقرر کی جاسکتی ہے، ٹھیکہ داروں اور فنڈ کے درمیان استصناع کی اجرت باہمی رضامندی سے مقرر کی جائے گی، اور فنڈ حکومت کو یا اسکے کسی متعلقہ شعبہ کو کام ٹھیک ٹھیک سرانجام دینے کے لئے اپنے وکیل کے طور پر اس کام پر نگران (Super visor) مقرر کر سکتا ہے، کام مکمل ہونے پر یہ نگران ادارہ کام کی درستگی کی شہادت (Certificate) جاری کرے گا، اس کے بعد فنڈ اس چیز کو ٹھیکہ داروں سے وصول کر کے حکومت کو سپرد کر دے گا۔

مذکورہ بالا تینوں طریقہائے تمویل یعنی مرابحہ مؤجلہ، کرایہ داری، اور عقد استصناع کے ذریعہ بینک یا مالیاتی ادارے کو جو نفع ہوگا، اسے مشارکہ کے نفع کی تقسیم کے اصول پر بینک اور مشارکہ سرٹیفکیٹ ہولڈرز (حاملین) کے درمیان تقسیم کر دیا جائے گا، یہ مشارکہ سرٹیفکیٹ چونکہ بذاتِ خود کوئی چیز نہیں ہیں، بلکہ یہ اپنی پشت پر موجود جامد اثاثوں کی بھی نمائندگی کرتے ہیں، اس لئے انہیں ثانوی بازار (Secondary Market) میں فروخت بھی کیا جاسکتا ہے، اور انکی خرید و فروخت کے وہی اصول ہوں گے، جو مشارکہ سرٹیفکیٹ کے بیان میں گذر چکے ہیں۔

کن کن سرکاری شعبوں میں مشارکہ سرٹیفکیٹ استعمال ہو سکتا ہے؟

پیچھے ذکر کردہ تفصیل کے مطابق سرکاری قصیر المیعاد قرضوں میں ورکنگ کیپٹل فائنانسنگ (Working Capital Financing) میں مشارکہ کے طریقے پر عمل کیا جائے گا، اور سرکاری طویل المیعاد قرضوں میں پروجیکٹ فائنانسنگ (Project Financing) میں مشارکہ کے طریقہ پر عمل کیا جائے گا، ان دونوں قسموں کی فائنانسنگ کے لئے اگر کوئی بینک چاہے تو علیحدہ سے مشارکہ سرٹیفکیٹ جاری کر سکتا ہے، تاکہ انہیں ثانوی بازار میں فروخت کیا جاسکے، اور ان کے ذریعہ سے سرمایہ کا حصول ممکن اور آسان ہو، اور فائنانسنگ سے حاصل شدہ نفع مشارکہ سرٹیفکیٹ ہولڈرز اور بینک کے درمیان تقسیم کیا جائے، اور اگر بینک چاہے تو مشارکہ سرٹیفکیٹ بنائے بغیر بینک کے مجموعی سرمایہ سے دونوں قسموں کی فائنانسنگ کرے اور اس کا نفع اپنے شیئر ہولڈرز اور ڈیپازیٹرز میں ان اصولوں کے مطابق تقسیم کر دے جو باب

اول میں بینکوں کے نفع کے حساب کے طریقوں کے بیان میں گذرا ہے۔

اور اگر حکومتی طویل المیعاد قرضے غیر پیداواری اور نفع آور کام مثلاً ایٹمی توانائی، اسلحہ سازی، سامان جنگ کی خریداری، آب پاشی کے بڑے بڑے بند اور بجلی گھر، ہسپتالوں کی تعمیر و ترقی، نقل و حمل اور رسل رسائل اور مواصلات سے متعلق بعض منصوبے، شاہراہوں اور سڑکوں کی تعمیر و مرمت وغیرہ کے لئے حاصل کئے جا رہے ہوں تو ان مقاصد کے لئے بھی مشارکہ سرٹیفکیٹ استعمال کیا جا سکتا ہے، جس کے لئے ایک مشارکہ فنڈ قائم کرنا ہوگا اور اس کا تفصیلی طریقہ گذشتہ صفحات میں گذر چکا ہے۔

چھٹا باب
مشارکہ کے عصری تجربے

چھٹا باب: مشارکہ کے عصری تجربے

گذشتہ صفحات میں مالیاتی اداروں میں مشارکہ کے ذریعہ تمویل کے ایسے مختلف طریقے بیان کئے گئے تھے، کہ اگر انہیں صحیح طرح استعمال کیا جائے تو وہ موجودہ سودی طریقہائے تمویل(Intrest Based Modes Of Financing) کے بہترین شرعی متبادل بن سکتے ہیں۔

موجودہ دور میں کئی ملکی اور بین الاقوامی پرائیویٹ مالیاتی اداروں، کمپنیوں اور بینکوں نے ان میں سے بعض طریقے کامیابی کے ساتھ استعمال بھی کئے ہیں، اسی طرح بعض اسلامی ممالک نے بھی حکومتی سطح پر ان میں سے بعض طریقے نافذ کئے، چنانچہ حکومت پاکستان نے پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفیکیٹ، ٹرم فائنانس سرٹیفیکیٹ اور مضاربہ سرٹیفیکیٹ کی اسکیمیں جاری کیں، اور حکومت اردن نے بھی مقارضہ (مضاربہ) سرٹیفیکیٹ کی اسکیم جاری کی۔

آئندہ صفحات میں یہ جائزہ لینا پیش نظر ہے کہ آیا حکومتی سطح پر جاری شدہ یہ اسکیمیں شرکۃ اور مضاربت کے شرعی اصولوں پر پوری اترتی ہیں یا نہیں؟ لہذا اب ہم ذیل میں ان تمام سرٹیفکیٹوں اور سندات کا جائزہ لیتے ہیں جو بعض ممالک کی حکومتوں نے جاری کئے۔

۱۔ پاکستان میں جاری کردہ پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفیکیٹ یعنی پی ٹی سی (Participation term certificate)

۲۔ پاکستان میں ٹرم فائنانس سرٹیفیکیٹ یعنی ٹی ایف سی (Term finance certificate)

۳۔ پاکستان میں مضاربہ سرٹیفیکیٹ اور مضاربہ کمپنیاں (Mudarabah certificate)

۴۔ حکومتِ اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ۔

پاکستان میں پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ

(Participation term certificate)

پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل نے سود کے متبادل نظام کے لئے جو بارہ طریقہائے تمویل تجویز کئے تھے، ان میں سے ایک طریقہ پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ یعنی پی ٹی سی (مشارکہ کی میعادی دستاویزات) بھی تھا، جسے سودی ڈبینچر (Intrest bearing Debentures) کے شرعی بدل کے طور پر پیش کیا گیا تھا، جسے حکومت پاکستان نے مالیاتی اداروں میں نافذ تو کیا، البتہ بعینہ اس طریقے پر رائج نہیں کیا جو اسلامی نظریاتی کونسل کا تجویز کردہ طریقہ تھا، اس سے پہلے کہ ہم اوپر ذکر کردہ عنوان یعنی پاکستان میں رائج کردہ پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ کا جائزہ لیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سودی قرضوں کے ڈبینچرز کی حقیقت اور شرعی حکم ذکر کیا جائے تاکہ اس کے متبادل طریقہ تمویل کے بارے میں اسلامی نظریاتی کونسل کی مندرجہ بالا تجویز پر بھی شرعی لحاظ سے غور کرنے میں آسانی ہو۔

بانڈز اور ڈبینچرز اور ان کا باہمی فرق

بانڈز اور ڈبینچرز میں بعض باتیں مشترک طور پر پائی جاتی ہیں اور بعض باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے، بانڈز اور ڈبینچرز میں اتنی بات قدر مشترک ہے کہ ان دونوں کا حامل کمپنی میں حصہ دار نہیں ہوتا بلکہ دائن (قرضہ دینے والا) ہوتا ہے، جسے کمپنی کی جانب سے سالانہ سود دیا جاتا ہے، اور مقررہ وقت پر رقم واپس کردی جاتی ہے، اور ان دونوں میں فرق دو طرح سے ہے۔

ایک یہ کہ بانڈز صرف قرضے کی دستاویز ہیں اب بعض اوقات قرضوں کے بانڈز کو تحفظ (Security) دینے کے لئے ایک دستاویز کر دی جاتی ہے، جس میں ان بانڈز کو کمپنی کی کسی ایک یا بہت سی جائیدادوں کے ساتھ متعلق کر دیا جاتا ہے، کہ اگر قرضے ادا نہ ہوئے تو ان جائیدادوں سے ادا کر دئے جائیں گے، اس کو ڈیبنچرز (Debentures) کہا جاتا ہے، گویا کہ بانڈز قرضہ کی دستاویز ہیں اور ڈیبنچرز ایسے قرض کی دستاویز ہے جس کے ساتھ رہن بھی وابستہ ہے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ اگر کمپنی دیوالیہ ہو جائے تو اثاثوں سے جن لوگوں کا حق متعلق ہوتا ہے، انکی حقوق کی ادائیگی کی ایک قانونی ترتیب ہوتی ہے، اس ترتیب میں ڈیبنچر اس جائیداد کی حد تک مقدم ہوتا ہے، جسکو رہن بنایا گیا تھا بانڈز کی ادائیگی اس کے بعد ہوتی ہے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی تجویز

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ڈیبنچرز بھی بانڈز کی طرح سودی قرضوں کی دستاویز ہے، جسکی شریعت کسی طور اجازت نہیں دیتی، اسی لئے اسلامی نظریاتی کونسل (پاکستان) نے اس کے متبادل ایک شرعی طریقہ کار تجویز کیا ہے، جس کا نام پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفیکیٹ وضع کیا گیا ہے، کونسل کی رپورٹ میں موجود اس سرٹیفیکیٹ کی تجویز کی مکمل تفصیلات ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

> ڈیبنچرز کے ذریعہ تمویل رواں صنعت کے توازن، تنظیم جدید، اور ترقی دینے کے لئے ایک اہم رائج الوقت طریقہ ہے، اسے ایک نئے ادارہ جاتی (Corporative) تمسک (Security) سے بدلا جا سکتا ہے، جس کا نام حصہ داری کے میعادی سرٹیفیکیٹ (Participation term Certificate) ہوگا، اس کے حاملین اس کے نفع کے حقدار ہوں گے، نہ کہ متعین سود کے، اسکی کچھ مزید خصوصیات درج ذیل ہونگی۔
>
> ا۔ ایک خاص حد سے زائد مقدار میں حصہ داری کے میعادی سرٹیفیکیٹ کے اجراء

کے لئے اجرائے سرمایہ کے نگران سے پیشگی اجازت لینی ہوگی۔
۲۔ پی ٹی سی کے اجراء کی شرائط میں کسی قسم کی تبدیلی بشمول قبل از وقت ادائیگی کی شرط فریقین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہوگی۔
۳۔ سرٹیفیکیٹ کے خریداروں کو تحفظ دینے کیلئے یہ ضروری ہوگا کہ اس کام کے لئے ایک ایسا ٹرسٹی مقرر کیا جائے جس کا نام کنٹرولر آف کیپٹل ایشوز (Controller of Capital issues) کی لسٹ میں موجود ہو، اور اس ٹرسٹی کا یہ فرض ہوگا کہ وہ منصوبے اور اسکی دستاویزات کا جائزہ لے، اور کام کی تکمیل تک اسکی نگرانی کرے، اس سلسلہ میں کنٹرولر آف کیپٹل ایشوز ٹرسٹیوں کی ایک فہرست تیار کرے گا، اور اس فہرست میں سرٹیفیکیٹ جاری کرنے والے ادارے کے افراد یا سرمایہ کاروں کے نام شامل نہیں کئے جائیں گے۔
۴۔ چونکہ اس سرٹیفیکیٹ کے ذریعہ تمویل ایک متعین مدت تک ادائیگی کے لئے ہوگی، لہذا اس کے عوض کمپنی کے موجود جامد اثاثے گروی رکھنا ہوں گے، اور مزید یہ کہ ان اثاثوں کا وجوب دوسرے قرضخواہوں کے ہم پلہ سمجھا جائے گا، اس کے علاوہ بھی کمپنی کے رواں اثاثوں پر (Floating charge) کی حقیقت ثابت کی جاسکتی ہے۔
۵۔ کمپنی کو ان سرٹیفیکیٹ کی رقم منصوبے پر ہی لگانی ہوگی، اور یہ بھی یقین دلانا ہوگا، کہ وہ اپنا کاروبار دانشمندی، مستعدی اور فنی مہارت سے انجام دیگی، اور وہ اپنے صفائی معاملات کی خاطر تمام اکاؤنٹس اور ریکارڈز کو محفوظ کیا کرے گی، تاکہ کمپنی کی مالیاتی پوزیشن کی صحیح اور سچی عکاسی ہوسکے، اور جدید حسابات کی روشنی میں کمپنی کے کاروبار کا صحیح نتیجہ اخذ کیا جاسکے۔
۶۔ ٹرسٹی کو یہ حق ہوگا کہ وہ مالکان سرٹیفیکیٹ کی جانب سے کمپنی سے معلومات طلب کرسکے، مشینوں اور کارخانوں کا معائنہ کرسکے، اور ریکارڈ تک دسترس رکھ سکے۔

۷۔ جب تک کمپنی پر یہ سرٹیفکیٹ واجب الاداء ہوں گے اس وقت تک کمپنی بینکوں سے قلیل المیعاد سرمائے کا حصول صرف ان قواعد کے تابع رہ کر کریگی جو فریقین کے درمیان باہمی اتفاق سے طے پائے۔

۸۔ نقصان واقع ہونے کی صورت میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس سے اسکی تصدیق کرائی جائے گی، اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ (Charterd Accountant) کی تقرری میں ٹرسٹی کا بھی دخل ہوگا۔

۹۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس کے قانونی فرائض میں بھی اضافہ کرنا ہوگا۔

۱۰۔ تنازع واقع ہونے کی صورت میں نفع و نقصان کا تعین ثالثی کے ذریعہ ہوگا، اس مقصد کے لئے ثالثوں کا ایک پینل قائم کیا جائے گا، جسے کنٹرول آف کیپٹل ایشوز (Controller of Capital issues) یعنی اجرائے سرمایہ کا نگران مقرر کرے گا[1]۔

۱۱۔ نقصان کی صورت میں تمام نقصان حاملین سرٹیفکیٹ کو ان کے سرمایے کے تناسب سے برداشت کرنا ہوگا[2]۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی تجویز کا شرعی لحاظ سے جائزہ

اسلامی نظریاتی کونسل کی پی ٹی سی کے اجراء کے سلسلہ میں مذکورہ بالا تجویز اور طریقۂ کار کی تمام شقیں بظاہر درست ہیں، البتہ اسکی چوتھی شق میں جو یہ کہا گیا ہے کہ چونکہ اس سرٹیفکیٹ کے ذریعہ تمویل ایک متعینہ مدت

1. Government of Pakistan, Report of the council of Islamic Ideology on the Elimination of Intrest from the Economy. 1980 P.36, 37.

2. Profit and loss sharing, by Shahrukh Khan p.150. Published from Oxford University Press first adition. 1987.P.137.

تک ادائیگی کے لئے ہوگی، لہذا اس کے عوض کمپنی کے موجود جامد اثاثے گروی رکھنا ہوں گے، یہ شرط بظاہر عقد شرکت کے منافی نظر آتی ہے، کیونکہ اسلامی فقہ کا یہ اصول ہے کہ سرمایہ کار یا رب المال شرکت یا مضاربت میں اپنے لگائے ہوئے سرمایہ کے عوض کاروباری شرکاء یا مضارب سے کوئی رہن (گروی) کا مطالبہ نہیں کر سکتے، اور اسکی وجہ یہ ہے کہ سرمایۂ شرکت و مضاربت، شریک یا مضارب کے ہاتھ میں امانت ہوتا ہے، اور امانت کا حکم یہ ہے کہ امانتدار کے ہاتھ میں اگر کوئی شے تلف ہو جائے تو اس وقت تک امانتدار پر اس امانت کا کوئی تاوان نہیں آتا جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ اس مال امانت کی تلفی میں امانتدار کا جان بوجھ کر قصور ہے [1]، لہذا اگر امانتدار کا ایسا کوئی قصور ثابت نہ ہوا تو اس پر کوئی بھی تاوان نہیں آئے گا، لہذا جب عام حالات میں اس پر مال امانت کے سلسلہ میں کسی قسم کے تاوان کا مطالبہ نہیں ہے تو اس سے مال امانت کے عوض رہن کا مطالبہ بھی نہیں کیا جائے گا، چونکہ سرمایہ شرکت و مضاربت بھی شریک اور مضارب کے ہاتھ میں امانت ہے اسی لئے فقہائے کرامؒ نے یہ فرمایا ہے کہ سرمایہ شرکت اور مضاربت کے بدلہ شریک یا مضارب سے کسی قسم کے رہن کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔

زیر نظر مسئلہ میں پی ٹی سی بھی ایک شرکت کا عقد ہے، اور پی ٹی سی ہولڈرز سرمایہ کار کی حیثیت رکھتے ہیں، لہذا انہیں کمپنی (جو کہ شریک یا مضارب کی حیثیت رکھتی ہے) کے جامد اثاثے گروی میں لینے کا استحقاق حاصل نہیں ہوگا۔

لیکن اگر اس سے یہ مراد ہو کہ یہ اثاثے اس وجہ سے گروی رکھوائے جائیں گے تاکہ اگر کاروباری کمپنی جان بوجھ کر اس سرمایہ کو نقصان پہونچائے یا تلف کر دے تو سرمایہ کاران مرہونہ اثاثوں (گروی رکھے ہوئے) پر قبضہ کر لیں گے، تو اس صورت کی گنجائش ہے، کیونکہ اس صورت میں رہن کا مقصود اصلی تعدی، یعنی جان بوجھکر نقصان پہونچانے کے خطرے سے بچانا ہے، اور جان بوجھکر نقصان پہونچانے کی صورت میں مضارب یا شریک پر تاوان آتا ہے، لہذا اس تاوان کی وصولی کے لئے یہ اثاثے رہن رکھوائے جارہے ہیں، لیکن اس صورت میں باہمی معاہدے کی شرائط میں واضح طور پر یہ لکھنا ضروری ہے کہ یہ اثاثے اس مقصد کے لئے رہن رکھے جارہے ہیں، اور سرٹیفکیٹ ہولڈر اسی صورت میں دوسرے

(۱) الدر المختار: ولا بالأمانات كوديعة وأمانة (وفي رد المحتار تحته): وكذا مال المضاربة وشركة كما في الهداية (٦: ٤٩٢/ الرهن)۔

قرض خواہوں کے ہم پلہ (Pari Passu) ہوگا، جب سرٹیفیکیٹ جاری کرنے والے کی طرف سے کوئی بدعنوانی (Mis conduct) یا غفلت (Negligence) پائی جائے۔

پی ٹی سی اسکیم کا نفاذ

حکومت پاکستان نے ۱۹۸۰ء میں شرکت کے میعادی سرٹیفیکیٹ یعنی پی ٹی سی یا پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفیکیٹ کو جس طرح نافذ کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس کسی کاروباری ادارے کو بینک یا عوام سے تجارتی مقاصد کیلئے سرمایہ لینے کی ضرورت ہو وہ ایک معینہ مدت کے لئے ایک تجارتی پروگرام وضع کر کے بینک یا عوام کو اس پروگرام میں سرمایہ لگا کر شرکت کی دعوت دے گا، بینک یا عوام اس تجارتی کمپنی کے پروگرام سے اگر مطمئن ہوے تو ایک متعینہ مدت تک کے لئے (جو زیادہ سے زیادہ دس سال ہوگی) اسے سرمایہ فراہم کردیں گے، کاروباری کمپنی اس سرمایے کے دستاویزی ثبوت کے طور پر ایسے سرٹیفیکیٹ جاری کردے گی، پھر کمپنی اس سرمایے سے کاروبار کرے گی، اگر اسے نفع حاصل ہوا تو نصف سال پر فریقین کے درمیان نفع کے طے شدہ تناسب سے عبوری اور عارضی طور پر نفع تقسیم ہو جائے گا، اور مالیاتی سال کے آخر میں کاروبار کے حساب کتاب کے ذریعہ تصفیہ کے بعد حتمی طور پر نفع تقسیم کرلیا جائے گا، اور اس کے بعد نئے مالیاتی سال سے دوبارہ اس کاروبار کو شروع کیا جائے گا، اور سابقہ طریقے پر نفع کی تقسیم ہوگی، اسی طرح سرٹیفیکیٹ کی مدت تک کیا جاتا رہے گا۔

اور اگر بالفرض نقصان ہوا تو پہلے نقصان کی زد کاروباری ادارے پر پڑے گی، یعنی کاروباری کمپنی کی مد محفوظ (Reserves) سے نقصان کی تلافی کی جائے گی، اس کے بعد بھی اگر نقصان باقی رہے تو بینک کے نقصان کی تلافی اس طرح کی جائے گی کہ جتنی رقم کا نقصان ہوا ہے بینک اس کاروباری ادارے کے اتنی رقم کے حصص کا خود بخود مالک بن جائے گا[1]۔

1. Encyclopaedia of Islamic Banking and Insurance ,P.240 ,Institute of Islamic Banking and Insurance (IIBI).

اس طریقۂ کار میں نفع کی تقسیم کا طریقۂ کار تو بظاہر درست ہے، لیکن نقصان کی صورت میں جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے، وہ واضح طور پر شریعت کے خلاف اور سود کی بدترین شکل ہے۔

حکومت پاکستان کی طرف سے ۱۹۸۰ء میں پی ٹی سی کے مذکورہ بالا قانون کے اجراء کو علماء کرام نے سود کے خلاف اور اسلامی معیشت کی طرف ایک اہم پیش رفت سمجھ کر اسکی حمایت اور حوصلہ افزائی تو کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اسکی نقصان کے سلسلہ میں ذکر کردہ شق کی اصلاح کا مطالبہ بھی کیا، کیونکہ یہ شق شرکت اور مضاربت کے صریح اصولوں کے خلاف ہے، چنانچہ مدیر البلاغ صفر ۱۴۰۵ھ کے اداریہ میں اسکی جو وجہ تحریر فرماتے ہیں اسکا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

> نقصان کی صورت میں جو طریقہ وضع کیا گیا ہے وہ واضح طور پر شریعت کے خلاف اور سود کی ایک شکل ہے، کیونکہ اول تو یہ اصول بالکل غلط ہے کہ نقصان کی پہلی زد اس کاروباری ادارے کی مد محفوظ پر پڑے گی، ظاہر ہے کہ اس ادارے کا مد محفوظ بینک کی شرکت میں ہونے والے کاروبار کا جزو نہیں ہے، بلکہ اس ادارے کے سابقہ کاروبار کی بچت ہے، لہذا اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے الف ب کے ساتھ شرکت کا معاہدہ کرتے ہوئے یہ شرط عائد کرے کہ اگر مشترک کاروبار میں نقصان ہوا تو پہلے ب اسے اپنی ذاتی تجوری میں رکھی ہوئی رقم سے پورا کرے گا، اس شرط کے ظالمانہ ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں ہو سکتا۔

دوسرے بینک کے نقصان کی تلافی کا طریقہ اس اسکیم میں یہ طے کیا گیا ہے، کہ وہ نقصان کی رقم کے بقدر اس ادارے کے حصص کا مالک بن جائے گا، سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعۃً مشارکہ ہے تو ایک فریق کے نقصان کی ذمہ داری دوسرے فریق پر عائد کرنے کا کیا مطلب ہے؟ سود اور شرکت کے درمیان بنیادی فرق یہی ہے کہ سود میں ایک فریق کے متعین نفع کی ضمانت ہوتی ہے، اور دوسرے فریق کا نفع موہوم ہوتا ہے، جبکہ شرکت میں دونوں فریق نفع و نقصان کا خطرہ بیک وقت برداشت کرتے ہیں، بلکہ زیر نظر اسکیم کا یہ حصہ سود کے مروجہ طریقہ کار سے زیادہ ظالمانہ اور استحصال پر مشتمل ہے، اسلئے کہ مروجہ طریقہ کار میں تو بینک سود کا روپیہ لیکر فارغ ہو جاتا ہے، لیکن زیر نظر اسکیم میں وہ زبردستی اس

کاروباری ادارے کا مستقل حصہ دار بن کر اس کے آئندہ ہونے والے تمام منافع میں ہمیشہ کے لئے دعوے دار بن جائے گا۔

مذکورہ بالا دلائل کی بنیاد پر علماء کرام نے پی ٹی سی اسکیم کی اس شق کی تبدیلی کا مطالبہ کیا، چنانچہ اسوقت کے وزیر خزانہ جناب غلام اسحاق خان صاحب نے جولائی ۱۹۸۴ء کی بجٹ تقریر میں اس شق کی تبدیلی کا اعلان کیا، چنانچہ وہ مشارکہ اور پی ٹی سی اسکیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> تمویل کے یہ طریقے خاص خاص مواقع پر پہلے بھی اختیار کئے جاتے رہے ہیں، لیکن اب ان کا استعمال وسیع تر دائرے میں پھیلا دیا جائے گا، لیکن اسوقت مشارکہ اور پی ٹی سی (پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) کے معاہدات میں جو شق موجود ہے، کہ مالیاتی ادارے (بینک وغیرہ) کے حصہ میں جو نقصان آئے گا، اسے کاروباری ادارے کے حصص کے اجراء سے پورا کیا جائے گا، چونکہ اس شق پر بعض حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ شق غیر اسلامی ہے، اسلئے آئندہ مشارکہ کے معاہدے میں یہ شق باقی نہیں رہے گی۔ (بجٹ تقریر ص:۲۶)

محترم وزیر خزانہ کی بجٹ تقریر اور اسٹیٹ بینک کے سرکلر نمبر ۱۳ کے ضمیمہ نمبر ایک میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:

> اس طریقۂ کار کے تحت بینک کو حاصل ہونے والی کم سے کم اور زیادہ سے زیادہ شرح منافع کا تعین وقتاً فوقتاً اسٹیٹ بینک کرے گا، البتہ اگر کوئی نقصان ہو تو وہ سرمایہ کاری کرنے والے تمام افراد کے درمیان اپنے سرمائے کے تناسب سے تقسیم ہوگا۔

اسمیں نقصان کی صورت میں جو طریقہ تجویز کیا گیا ہے، وہ شریعت کے عین مطابق ہے، لیکن نفع کی شرح (Rate) کا تعین اسٹیٹ بینک کی طرف سے ہوگا، اگر مراد یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک مجموعی منافع کے تناسب سے تجارتی بینکوں کا حصہ مقرر کرے گا، تو اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ غیر سودی نظام بینکاری میں زر کے بہاؤ پر کنٹرول کرنے کے لئے اسٹیٹ بینک کے پاس یہ مؤثر ترین ذریعہ ہوگا، لیکن اگر اس سے مراد یہ ہے کہ اسٹیٹ بینک سرمایہ کے

تناسب سے بینک کا کم سے کم یا زیادہ سے زیادہ نفع مقرر کرے گا یا یہ مراد ہو کہ منافع کے طے شدہ تناسب (Proportion) کی رو سے بینک کے حصہ میں جو نفع آئے گا، بینک ہمیشہ وہ سارا نفع حاصل نہیں کرے گا، بلکہ اسٹیٹ بینک اسے یہ ہدایت دے سکے گا کہ اگر بینک کے لگائے ہوئے سرمایہ کے دس فیصد سے زائد بینک کے حصہ میں آئے تو وہ وصول کرنے کے بجائے اپنے شریک کے پاس چھوڑ دے تو شرعاً یہ صورت جائز نہیں ہے، اور بظاہر اسٹیٹ بینک کے سر کلر میں شرح منافع کے لئے جو لفظ Rates of profit استعمال ہوا ہے اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید پیش نظر یہ دوسری ہی صورت ہے، اور مقصد یہ ہے کہ بینک سے مشارکہ وغیرہ کا معاملہ کرنے والے کاروباری افراد یا اداروں کو یہ اطمینان دلایا جائے کہ اگر کاروبار کا حقیقی منافع اسٹیٹ بینک کی مقرر کردہ حد سے زائد ہوا تو وہ بینک اپنے پاس رکھنے کے بجائے انہی کو واپس کر دے گا، لہٰذا ان کو یہ خوف نہیں کھانا چاہیے کہ اگر منافع زیادہ ہوا تو اس کا بہت بڑا حصہ بینکوں کے پاس چلا جائے گا۔

اگر اسٹیٹ بینک کے شرح منافع متعین کرنے کا مقصد واقعۃً یہی ہے تو ایک طرف شرعی اعتبار سے اس کا ہرگز کوئی جواز نہیں ہے اور دوسری طرف اس سے غیر سودی نظام کا کوئی فائدہ معیشت کو حاصل نہیں ہوگا۔

جہاں تک شرعی جواز کا تعلق ہے اگر بینک مشارکہ کا معاہدہ کرتے وقت اپنے شریک سے یہ شرط طے کرے کہ اگر بینک کا حصہ منافع بینک کے سرمایہ کے دس فیصد سے زائد ہوا تو وہ زائد سرمایہ بینک وصول نہیں کرے گا، تو اس شرط کی وجہ سے شرعی لحاظ سے یہ شرکت فاسد ہوگی، لیکن اگر معاہدے کے وقت اس قسم کی کوئی شرط نہ لگائی جائے البتہ منافع کی تقسیم کے وقت بینک اپنے نفع کا کچھ حصہ رضاکارانہ طور پر چھوڑ دے تو شرعاً یہ بھی جائز نہ ہوگا، کیونکہ بینک کا سرمایہ ہزاروں کھاتہ داروں کی ملکیت ہے، اور انکی مرضی کے خلاف کوئی ایسی رضاکارانہ کاروائی بینک کے لئے جائز نہیں ہوگی، جس سے ان کھاتہ داروں کا نفع متاثر ہو، ہاں اگر پی ٹی سی ہولڈر کوئی ایک فرد ہو تو یہ صورت ممکن ہے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ سود کے بجائے شرکت و مضاربت کے طریقے اختیار کرنے کا ایک فائدہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ کاروبار میں نفع زیادہ ہونے کی صورت میں صرف ایک فریق (یعنی بینک سے رقم لینے والا) اس سے مستفید نہ ہو، بلکہ بینک بھی اسمیں برابر کا حصہ دار بنے، تاکہ یہ منافع اس کے ذریعہ سے بینک کے لاکھوں کھاتہ داروں کی طرف منتقل ہو، اور سارا

سرمایہ سرمایہ داروں کی جیب میں نہ جائے بلکہ بینکوں کے توسط سے لاکھوں عوام تک پہونچے، جس کی وجہ سے تقسیم دولت کا توازن درست ہوگا، اور سرمائے کے ارتکاز کی روک تھام ہوگی، نچلے طبقہ کی آمدنی میں اضافہ ہوگا، اور منجمد رقوم گردش میں آئیں گی، جس کے خوشگوار اثرات پوری معیشت پر رونما ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ اگر اس اسکیم میں یہ پابندی عائد کردی جائے کہ ایک خاص حد سے زائد منافع ہونے کی صورت میں زائد منافع بینکوں کو نہیں ملے گا، بلکہ کاروباری فریق ہی کو واپس کردیا جائے گا، تو شرعاً ناجائز ہونے کے علاوہ اس پابندی کے ذریعہ شرکت اور مضاربت کی اصل روح ہی ختم ہوجائے گی، لہٰذا اس اسکیم کے تمام معاملات میں یہ شرط ختم کرنا ضروری ہوگا۔

دوسری ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے نفع کا جو تناسب بھی مقرر کیا جائے اس کا علم تمام سرٹیفکیٹ ہولڈرز کو شروع ہی میں ہوجانا چاہیے۔

مندرجہ بالا امور کی رعایت کے ساتھ اگر پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ کی اسکیم نافذ کردی جائے تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، بشرطیکہ اس کے طریقۂ کار میں انکے علاوہ اور کوئی خلاف شرع بات نہ پائی جائے۔

پاکستان میں پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ بہت سے مالیاتی اداروں نے جاری کئے جن میں انویسٹمنٹ کارپوریشن آف پاکستان (آئی سی پی)، ہاؤس بلڈنگ فائنانس کارپوریشن (H.B.F.C) اور نیشنل انویسٹمنٹ ٹرسٹ (این آئی ٹی) شامل ہیں، ان اداروں نے پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ کی اسکیم تقریباً اسی طرح نافذ کی جو گذشتہ صفحات میں حکومت پاکستان کے بجٹ اور اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی رپورٹوں میں ذکر کی گئی تھی، چنانچہ اس میں بھی وہی خرابیاں پائی جاتی تھیں، جو اوپر بیان کی جاچکی ہیں، خصوصاً نفع کی زائد مقدار کاروباری کمپنی کو واپس دینے کی شرط اسی حال میں برقرار تھی، اور اس کے علاوہ بھی بعض باتیں خلافِ شریعت پائی جارہی تھیں، جس کی بناء پر علماء کرام نے پی ٹی سی کی خریداری اور اس کے کاروبار کو ناجائز قرار دیدیا، ذیل میں علماء کرام کے اخیر ترین متفقہ فتوی کا متن ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:

> جہاں تک پی ٹی سی (پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ) کا تعلق ہے اصلاً یہ معاملہ شرکت اور مضاربت کی بنیاد پر ہونا چاہیے تھا، اور اس کا اصل تصور یہی تھا کہ اس

کے ذریعہ شرکت یا مضاربت کی بنیاد پر رقم فراہم کی جائے، لیکن اس کے لئے جو
معاہدات کئے جارہے ہیں ان میں بہت سی شرائط خلاف شریعت ہیں، جنکی وجہ
سے یہ معاملہ بھی شریعت کے مطابق نہیں رہا(۱)۔

موجودہ صورتحال یہ ہے کہ علماء کرام کے فتووں کی روشنی میں پی ٹی سی کی حیثیت بالکل ختم ہو چکی ہے، چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلامک بینکنگ کی جدید اشاعت میں ڈاکٹر حسن الزمان لکھتے ہیں کہ:

Besides mark up financing it started bridge financing and under writing on the basis of P T C and T F C, but disconinued it after the same was criticised by scholars[2].

مارک اپ فائنانسنگ (تمویل مرابحہ) کے علاوہ اس نے مختصر المیعاد قرضوں (Bridge financing) اور انڈر رائٹنگ ضمان الاکتتاب کے لئے پی ٹی سی اور ٹی ایف سی کے طریقہ کار پر عمل کیا، لیکن انہیں بعد میں علماء کرام کی تنقید اور مخالفت کے بعد ختم کر دیا گیا۔

آگے جاکر پی ٹی سی کے بارے میں رپورٹ دیتے ہوئے ڈاکٹر حسن الزمان لکھتے ہیں:

Actually the issuance of PTC has now been abandoned. They need to be revised with the following notifications.

1. There should not be any predetermined return on

(۱) دارالافتاء دارالعلوم کراچی، از تبویب فتاویٰ دارالعلوم کراچی، فتویٰ نمبر ۳۹۱۱۲۶۔

2. Encyclopaedia of Islamic Banking and Insurance, (IIBI).P. 233

them during or after the gestation period.

2) The clients should not be allowed to redeem the PTC,s before the due date. This is necessery to fore stall the tendency to have free financing during the gestation period.

3) The financial institution should not be expected to forgo or refund any part of the profit which flows to it according to terms of the PTCs. This will have the effect of increasing the income of the financial institutions.

4) The provesions of the PTC agreement ralating to treatment of losses will have to be deleted.

5) The PTCs should be made tradeable at the stock exchenge, so as to develop a secondry market for these instruments. This will obviate the need for discounting and rediscounging[1].

حقیقت یہ ہے کہ پی ٹی سی کا اجراء اب ختم کیا جاچکا ہے، اب اس بات کی ضرورت ہے کہ کچھ اصلاحات اور ترامیم کر کے انکو دوبارہ نافذ کیا جائے، اور وہ اصلاحات وترمیم درج ذیل ہو نگی:

1. Encyclopaedia of Islamic Banking and Insurance, (IIBI).P.241

۱۔ کمپنی کے کسی بھی زمانے میں خواہ وہ کمپنی کی ابتداء کا زمانہ ہو یا بعد کا، دونوں صورتوں میں نفع کی پیشگی تعیین نہیں ہونی چاہیے۔

۲۔ متعین مدت سے قبل کسی بھی سرٹیفکیٹ کے خریدار کو یہ اختیار نہ ہو کہ وہ اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ کرے۔

۳۔ کمپنی کو اپنے حصہ میں آیا ہوا نفع ہرگز چھوڑنا یا ری فنڈ کرنا نہیں چاہیے، تاکہ اس سرمایہ سے کمپنی کے مجموعی کاروبار میں ترقی دی جاسکے، اور اسکی آمدنی و نفع میں اضافہ ہو۔

۴۔ پی ٹی سی کے قانون میں نقصان کی صورت میں جو شرط لگائی گئی ہے اسے ختم کردیا جائے۔

۵۔ پی ٹی سی اسٹاک ایکسچینج میں قابل فروخت بنانے چاہئیں، تاکہ اس قسم کی سندات کا بھی ثانوی بازار وجود میں آجائے۔

پاکستان میں ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ

(Term Finance Certificate)

گذشتہ اوراق میں پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ کو مشارکہ کے عصری تجربات کے ذیل میں بیان کیا گیا ہے، پاکستان میں بہت سے مالیاتی اداروں اور بینکوں نے پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ کے بجائے ایک نئی اسکیم جاری کی، جس میں انہوں نے ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ(TFC) جاری کرنا شروع کئے، اور پی ٹی سی کو ختم کر دیا، لہذا اس بات کی ضرورت ہے کہ ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ کی شرعی حیثیت اور حکم بھی واضح کیا جائے، اس مقصد کے پیش نظر ذیل میں ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ یعنی ٹی ایف سی کا تعارف، طریق کار اور شرعی حکم بیان کیا جائے گا۔

ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ(TFC) کا تعارف یہ ہے کہ یہ ایسے سرمائے کے قابل واپسی دستاویزی ثبوت ہیں، جن میں کسی قسم کی شرکت کا عقد نہیں کیا جاتا، بلکہ درحقیقت یہ بائی بیک (Buy Back) اور مرابحہ مؤجلہ(Mark up) کا مجموعہ ہیں چونکہ یہ طریقہ کار سراسر سودی ہے، اس لئے اس پر بہت زیادہ تنقید کی گئی، چنانچہ بہت سے مالیاتی اداروں نے اسے بھی ترک کر دیا۔

ابتداء میں یہ سرٹیفکیٹ نہ تو اسٹیٹ بینک کی طرف سے جاری کئے گئے، اور نہ ہی انکی کوئی قانونی بنیاد تھی، بلکہ سب سے پہلے یہ ایک ڈیولپمنٹ فائنانس انسٹی ٹیوشن (DFI) کی طرف سے ۸۴-۱۹۸۵ء میں جاری کئے گئے، جسے بعد میں میعادی تمویل(Term Financing) کے ایک بڑے طریقہ کار کے طور پر بہت سے مالیاتی اداروں اور بینکوں میں پی ٹی سی کی جگہ پر استعمال کیا جانے لگا، اب ان کا طریقہ کار ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں میں ٹی ایف سی کے تحت تمویل کا عام طریقہ کار یہ ہے کہ اگر کسی کاروباری کمپنی

کو سرمایہ قرض لینے کی ضرورت ہو تو وہ بینک سے براہ راست قرضہ لینے کے بجائے یہ طریقہ اختیار کرتی ہے کہ بینک کو پہلے اپنا سامان اتنی قیمت پر فروخت کردے، جتنے سرمایہ کی اسے بطور قرض ضرورت تھی، اسے قیمت فروخت (Sale Price) کہا جاتا ہے، پھر کمپنی وہ سامان واپس بینک سے مرابحہ مؤجلہ (Mark up) پر یعنی مقررہ زائد قیمت پر خرید لیتی ہے، جسے قیمت خرید (Purchase price) کہا جاتا ہے، اس طرح کمپنی کے پاس مطلوبہ سرمایہ پہلی فروختگی کے نتیجہ میں قیمت کی شکل میں آگیا، اور پھر اسی سامان کی دوبارہ خریداری کی وجہ سے سامان بھی اس کے پاس آگیا، گویا کہ سامان اور اسکی قیمت دونوں اس کے پاس آگئے، البتہ کمپنی بینک کو اس سامان کی قیمت (زائد شکل میں) قسطوں میں ایک متعینہ مدت تک ادا کرے گی، چنانچہ کمپنی اقساط کی شکل میں متعین مدت تک قیمت کی ادائیگی کے مقابل کچھ سرٹیفکیٹ جاری کردیتی ہے، جسے ٹرم فائنانس سرٹیفکیٹ کہا جاتا ہے، یہ سرٹیفکیٹ اس واجب الأداء سرمایہ (دین) کے دستاویزی ثبوت ہوتے ہیں تاکہ متعینہ تاریخ تک کمپنی قیمت دا کر کے سرٹیفکیٹ واپس لے لے، لیکن اگر کمپنی نے متعینہ مدت تک رقم ادا کر کے سرٹیفکیٹ واپس نہ لئے تو کمپنی کے ذمہ لازم ہوگا کہ وہ حاملین سرٹیفکیٹ (Certificate holders) کو ان سرٹیفکیٹ کی قیمت اسمیہ (Face Value) کا بیس فیصد (20%) زائد ادا کرے۔

مذکورہ بالا طریقہ کار کا ایک پہلو یہ ہے کہ قرض لینے والی کمپنی سرمایہ فراہم کرنے والے بینک یا ادارے کو جو سامان فروخت کرتی ہے، اس میں یہ بات طے ہوتی ہے کہ قرض لینے والی کمپنی کی ملکیت میں وہ سامان نہیں ہوتا، بلکہ وہ سامان مہیا کرنے والے ادارے (Suppliers) سے صرف کاغذی کاروائی کے طور پر خرید کر قبضہ کئے بغیر آگے بینک کو فروخت کردے گی، (اور سامان اسی سرمایہ مہیا کرنے والے ادارے کے پاس ہی رہے گا) پھر بینک وہی سامان واپس کمپنی کو فروخت کردے گا، اور کمپنی وہ سامان مہیا کرنے والے ادارے (یعنی Supplier) سے جا کر وصول کرلے گی[1]، اب ذیل میں ٹی ایف سی کے تمام طریق کار کا شرعی حکم بیان کیا جاتا ہے۔

ٹی ایف سی کے مذکورہ طریقہ کار میں کئی باتیں خلاف شریعت ہیں جنہیں ذیل میں ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے۔

---

1. Institute of Islamic Banking and Insurance (IIBI), Encyclopaedia of Islamic Banking and Insurance, Institute of Islamic Banking and Insurance (IIBI). P. 242

اگر قرض خواہ کمپنی کوئی سامان بینک کو فروخت کرے، اور بینک سے یہ طے کرے کہ وہ کمپنی اس سامان کو واپس ایک مقررہ زائد قیمت پر خرید لے گی، یہ عقد بائی بیک (Buy Back) کہلاتا ہے، جو کہ بیع عینہ کی ایک شکل ہونے کی وجہ سے ناجائز ہے، کیونکہ ایک ہی شخص کو کم قیمت پر فروخت کر کے، فوراً ہی اس سے زیادہ قیمت پر ادھار خرید لینا در حقیقت سودی قرضے کی ایک شکل ہے، جبکہ پہلی خریداری میں یہ شرط ہو کہ اسے دوبارہ فروخت کیا جائے گا۔

عموماً بینکوں میں بائی بیک (Buy Back) کا یہ حیلہ بھی حقیقت میں نہیں ہوتا بلکہ عام طور پر محض فرضی کاروائی ہوتی ہے، ایسا کوئی سامان سرے سے موجود ہی نہیں ہوتا، جس پر بائی بیک کیا جارہا ہو، حتی کہ اداروں کے ایسے اخراجات جن سے کوئی چیز خریدی نہیں جاتی، مثلاً تنخواہیں، بلوں کی ادائیگی وغیرہ ان کے لئے بھی بینکوں سے مرابحہ کے طور پر قرضہ مل جاتا ہے۔

ایک اہم خرابی اس طریقہ کار میں یہ ہے کہ اسمیں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ اگر کمپنی نے متعین مدت تک بینک کو قیمت کی ادائیگی نہ کی تو وہ قیمت اسمیہ کے اضافی بیس فیصد کی ادائیگی کی بھی ذمہ دار ہوگی، یہ بیس فیصد کی ادائیگی بھی سود کی ایک شکل ہے، کیونکہ متعینہ مدت تک ادھار کی رقم ادا نہ کرنے پر اگر کوئی اضافی رقم عائد کی جائے تو وہ سود کہلاتی ہے، لہذا مذکورہ صورت میں بھی یہ اضافی بیس فیصد کی رقم سود ہوگی۔

تیسری اہم خرابی اس طریقہ کار میں یہ ہے کہ صورت مذکورہ میں قرض خواہ کمپنی نے سامان مہیا کرنے والے فرم (Supplier) سے سامان خرید کر اس سامان پر قبضہ کئے بغیر آگے سرمایہ فراہم کرنے والے ادارے کو فروخت کر دیا، جو کہ ناجائز ہے، کیونکہ سامان قبضہ کرنے سے پہلے کسی دوسرے کو فروخت کر دینا شرعاً ناجائز ہوتا ہے، اور حضور اکرم ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے[1]۔

(۱) بخاری: ابو عبد اللہ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح، عن ابن عباس یقول: أما الذی نهی عنه النبی ﷺ فهو الطعام أن یباع حتی یقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب کل شیء إلا مثله، (البیوع/رقم الحدیث ۱۹۹۱)، مسند أحمد، قال ابن عباس: احسب کل شیء مثله، (احمدبن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر(C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)۔رقم الحدیث:۱۷۵۰/ مسند بنی هاشم)۔

مذکورہ بالا وجوہات کی بناء پر ان سرٹیفکیٹ کے ذریعہ تمویل ناجائز ہے، اور اس کے جواز کی شکل صرف یہی ہے کہ مذکورہ بالا تمام خرابیاں ختم کر کے مرابحہ موجلہ کے جائز طریقے کے مطابق کاروبار کیا جائے یا اسلامی نظریاتی کونسل کی تجویز کردہ مشارکہ یا مضاربہ کی اسکیم یا پارٹی سپیشن ٹرم سرٹیفکیٹ کو صحیح طریقے سے تمام شرائط ملحوظ رکھتے ہوئے نافذ کیا جائے۔

پاکستان میں مضاربہ سرٹیفکیٹ اور مضاربہ کمپنیاں

موجودہ دور میں اسلامی طریقہائے تمویل کے جو تجربات کئے گئے ہیں ان میں سے ایک تجربہ پاکستان میں مضاربہ سرٹیفکیٹ اور مضاربہ کمپنیوں کا بھی ہے، سب سے پہلے یہ مضاربہ سرٹیفکیٹ ۱۹۸۰ء میں شروع کئے گئے، اس کے لئے ایک باقاعدہ قانون کا نفاذ عمل میں لایا گیا جس کا نام مضاربہ کمپنیز اینڈ مضاربہ آرڈی نینس ۱۹۸۰ء ہے، اس قانون میں مضاربہ کمپنیوں کی رجسٹریشن، طریقۂ تمویل، تنظیم اور مضاربہ سے متعلق دوسرے احکام بھی ذکر کئے گئے ہیں، اس کا ایک عمومی طریقۂ کار ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

اگر کچھ افراد مضاربہ سرٹیفکیٹ کے اجراء کے ذریعہ سرمایہ حاصل کر کے کاروبار کرنا چاہیں، تو اس مقصد کیلئے وہ پہلے ایک مضاربہ کمپنی قائم کرتے ہیں، جس کی باقاعدہ اجازت حکومت پاکستان کی طرف سے مقرر کردہ مضاربہ رجسٹرار سے لیتے ہیں، مضاربہ رجسٹرار اس کمپنی کے قیام کی اجازت دینے سے قبل اسے حکومت پاکستان کی طرف سے قائم کردہ مضاربہ ریلیجیس بورڈ سے اجازت حاصل کرتا ہے، مضاربہ ریلیجیس بورڈ اس کمپنی کے اغراض ومقاصد اور کاروبار کے طریقہ پر غور وخوض کر کے اگر اسے اسلامی اصولوں کے مطابق پاتا ہے تو اس کمپنی کو کاروبار کی اجازت دیدیتا ہے، جس کے بعد مضاربہ رجسٹرار اس کمپنی کو رجسٹر کرلیتی ہے، اور کمپنی مضاربہ کے تحت کاروبار شروع کردیتی ہے، دوران

کاروبار کمپنی اپنے حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے لئے مضاربہ رجسٹرار کی منظوری سے آڈیٹرز مقرر کرتی ہے تاکہ حساب کتاب میں کسی قسم کی بدعنوانی یا پیچیدگی کا امکان باقی نہ رہے، اور پھر مالیاتی سال کے آخر میں مضاربہ کمپنی اپنے حسابات اور بیلنس شیٹ وغیرہ مضاربہ رجسٹرار کو پیش کرتی ہے۔

مضاربہ کمپنیوں میں مضاربہ کے تحت کئے جانے والے کاروبار کا وہی طریقہ مقرر کیا گیا ہے، جو فقہ اسلامی میں مضاربہ کا طریقہ ہے، چنانچہ مضاربہ آرڈی ننس میں یہ مذکور ہے کہ:

> Mudarabah means a business in which a person participates with his money and another with his efforts or skill or both his efforts and skill.[1]
>
> مضاربہ ایک ایسا کاروبار ہے، جس میں ایک فرد اپنا سرمایہ اور دوسرا فرد اپنی محنت یا قابلیت یا دونوں لے کر شریک ہوتا ہے۔

عام مضاربہ کی طرح اس میں بھی دو قسم کے مضاربہ کا اختیار دیا گیا ہے، جس میں سے ایک قسم کثیر المقاصد مضاربہ (Multi purpose Modarabah) ہے، اس میں مضارب کو ایک سے زیادہ مخصوص مقاصد کے لئے کاروبار کی اجازت ہے، اور دوسری قسم مخصوص مضاربہ (Specific purpose Modarabah) ہے، اس میں مضارب کو صرف ایک مخصوص کاروبار کرنے کی اجازت ہے۔

مضاربہ کا کاروبار کسی متعین مدت یا غیر متعین مدت تک جاری رکھا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں مذکورہ بالا آرڈی ننس کے تحت قائم شدہ مضاربہ کمپنیوں کا کاروبار بہت تیزی سے پھیلا، جسکی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مضاربہ فنڈ کی آمدنی ٹیکس سے مستثنیٰ تھی، ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۳ء تک چالیس سے زائد مضاربہ کمپنیوں نے اپنے کاروبار شروع کر دئے تھے، کارپوریٹ لاء اتھارٹی (CLA) نے حال ہی میں عام مقصد کے مضاربہ کے

---

1. Profit and loss sharing, by Shahrukh Khan p.150. Published from Oxford University Press first Edition. 1987.

کاروبار کی اجازت سوائے بینکوں اور مالیاتی اداروں کے کسی کو دینا بند کردی ہے، تاکہ مضاربہ سرٹیفکیٹ ہولڈرز (حاملین سرٹیفکیٹ) کا سرمایہ اور نفع مزید محفوظ ہو جائے، کارپوریٹ لاء اتھارٹی نے ۱۹۹۲ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو اس بات کا اختیار بھی دیدیا ہے کہ وہ مضاربہ کمپنیز کے کاروبار کی نگرانی کر سکتا ہے[۱]۔

مضاربہ سرٹیفکیٹس کی کچھ اہم خصوصیات ذیل میں ذکر کی جاتی ہیں:

۱۔ مضاربہ سرٹیفکیٹس رجسٹرڈ ہوتے ہیں بیئرر نہیں ہوتے۔

۲۔ مضاربہ سرٹیفکیٹس کی پختگی (Maturity) کی کم از کم مدت تین ماہ ہے۔

۳۔ مضاربہ سرٹیفکیٹس کے ذریعہ حاصل کردہ رقم مضاربت کی تجارت میں استعمال ہونی چاہیے۔

۴۔ نوے فیصد نفع سرمایہ کاروں کے درمیان انکی سرمایہ کاری کے تناسب سے تقسیم ہوتا ہے، جبکہ بقیہ دس فیصد مضاربہ کمپنیوں کو بطور مضارب نفع (یا اجرت) دی جاتی ہے[۲]۔

۵۔ نقصان کا سو فیصد سرمایہ کاروں کے اوپر ان کے سرمایہ کے تناسب سے عائد ہوگا۔

٦۔ مضاربہ سرٹیفکیٹس اسٹاک ایکسچینج میں قابل فروخت ہیں۔

۷۔ حکومت کی طرف سے کسی قسم کی ضمانت یا کفالت نہیں لی گئی ہے[۳]۔

---

1. The Modarabah Companies and Modarabah (floatat and control) ordenance, 1980. Published in the Gazette of Pakistan on 26 June, 1980, P.2.

(۲) دیکھیے مضاربہ آرڈی ننس کی دفعہ ۱۸ صفحہ ٦ پر یہ بات مذکور اور مصرح ہے۔

3. The Musharakah Experience in Pakistan by Husain Lawai, former president of M.C.B. Pakistan. P.3. Chapter: 6, an article cuhich is read by the writer in the first internaticnal workshop in the subject of Musharakah Financing held in Malaysia in April 1996.

مضاربہ سرٹیفیکٹس اور مضاربہ کمپنیوں کا ایک اور پہلو بھی ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ اکثر مضاربہ کمپنیوں نے مضاربہ سرٹیفیکٹس کے ذریعہ حاصل کردہ سرمایے سے سادی تجارت کرنے کے بجائے تمویل (Financing) کے ذریعہ تجارت کی، جس میں انہوں نے مختلف کمپنیوں کو مرابحہ یا اجارہ کی بنیاد پر تمویل کو فراہم کیا، اور انکے شرعی تقاضوں کو ملحوظ نہ رکھا، جس کی وجہ سے ان کمپنیوں کی افادیت تقریبا ختم ہوگئی، اور صرف وہ مضارب اپنے اصل مقصد کے لحاظ سے کامیاب ہوے جنہوں نے فنڈ کی رقوم براہ راست تجارت یا صنعت میں لگائی۔

حکومت اردن کے جاری کردہ
,,سندات المقارضہ،، (مضاربہ سرٹیفیکیٹ)

اوپر ذکر کردہ عنوان کے تحت اگرچہ ہمیں حکومت اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ سے بحث کرنی ہے، لیکن قبل اس کے کہ ہم مذکورہ موضوع کا جائزہ لیں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سندات المقارضہ کی حقیقت، اسکی اہمیت، اور اسکی فقہی حیثیت کا بھی جائزہ لیا جائے، تاکہ انکی روشنی میں حکومت اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ کی شرعی حیثیت بھی واضح ہو جائے۔

سندات مقارضہ (یعنی مضاربہ سرٹیفیکیٹ) کا تصور در حقیقت ان سودی قرضوں کے سرٹیفیکیٹ کے شرعی بدل کے طور پر پیش کیا گیا جو عصر حاضر کے بینک اور تجارتی کمپنیاں جاری کرتی ہیں، سب سے پہلے ہم ان سودی قرضوں کے سرٹیفیکیٹ (دستاویزات) کا جائزہ لیتے ہیں۔

سودی قرضوں کی دستاویزات

سودی قرضوں کی سرٹیفکیٹ درحقیقت وہ دستاویزات ہیں، جو ان قرضوں کے ثبوت کے طور پر جاری کی جاتی ہیں جو مختلف کمپنیاں عام لوگوں سے متعین سودی نفع کی بنیاد پر قرض لیتی ہیں، اور یہ دستاویزات آگے فروخت کے قابل بھی ہوتی ہیں، البتہ انہیں منسوخ نہیں کیا جاسکتا۔

کمپنیوں کو اس قسم کی دستاویزات جاری کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہے کہ بعض اوقات کمپنیوں کو اپنے منصوبوں کی تکمیل یا توسیع کے لئے شیئرز کے اجراء کے بعد مزید سرمایہ کی ضرورت پیش آتی ہے، تو کمپنی نئے حصص جاری کرنے کے بجائے عوام سے (سرمایہ) قرض لیتی ہے، اور اس کے ثبوت کے لئے دستاویزات جاری کرتی ہے، جسے سندات یا بانڈز کہا جاتا ہے، اور کمپنی نئے حصص اس لئے جاری نہیں کرتی کہ مزید سرمایہ کے حصص جاری کرنے سے سابقہ حصہ داروں کی شرکت کی نسبت میں کمی آجاتی ہے، مثلاً پہلے کمپنی میں ایک لاکھ روپے کا سرمایہ لگا ہوا تھا، جس میں سے کسی نے دو ہزار روپے کے شیئرز لئے تھے، تو اسکی شرکت کی نسبت دو فیصد ہے، اب اگر کمپنی ایک لاکھ کے مزید حصص جاری کرے تو کمپنی کا سرمایہ دو لاکھ ہو گیا، اور دو ہزار کی نسبت دو لاکھ سے ایک فیصد رہ جائے گی، اس طرح نئے حصص جاری کرنے سے سابقہ حصہ داران کا نقصان ہوگا، جسکی حصہ داران اجازت نہیں دیں گے، لہٰذا کمپنی اس دوسرے طریقہ سے قرض حاصل کرنے کا بندوبست کرتی ہے، اس کے علاوہ دوسری طرف اس سہولت سے عوام الناس کو بھی فائدہ پہونچتا ہے، کیونکہ وہ اپنی روزمرہ کی بچتوں کو اپنے مستقبل کی متوقع حاجات کے لئے یا تو گھروں میں محفوظ رکھتے یا بینکوں میں جمع کراتے تھے، لیکن انکی خواہش یہ ہوتی تھی کہ اپنے سرمایہ کو اجتماعی نفع بخش کاموں مثلاً ملکی پیداوار یا بڑی بڑی تجارتوں میں لگائیں، اگر وہ اس خواہش کی تکمیل کی خاطر اپنا سرمایہ بڑے بڑے صنعتکار یا تاجروں کو بطور قرض دیتے تو یہ خدشہ بھی لگا رہتا کہ مستقبل میں اپنے سرمایہ کی واپسی میں کہیں مشکل اور دشواری نہ ہو، اس وجہ سے وہ اپنی خواہش کی باوجود ایسے قرضہ دینے سے ہچکچاتے تھے، اس مسئلہ کے حل کے لئے ماہرین اقتصادیات نے یہ بانڈز اور سرٹیفکیٹ کا طریق

وضع کیا، تاکہ سرمایہ داروں کو قرض دینے کی حوصلہ افزائی ہو، اور ان کے روپے ہر قسم کے اندیشوں سے محفوظ ہو جائیں، اس بانڈز کے طریقے میں انہوں نے ایک طرف تو سرمایہ داروں کو متعین سود کی کشش دلا کر قرض دینے پر آمادہ کیا اور دوسری طرف ان بانڈز کی ثانوی بازار (Secondry Market) میں خرید و فروخت کو ممکن بنادیا، تاکہ اس کے ذریعہ سرمایہ کار جب چاہیں اپنا سرمایہ واپس لے لیں، کہ اسے ثانوی بازار میں ایسے بازاری نرخ پر فروخت کر دیں، جو بعض اوقات اسکی قیمت اسمیہ (Face Value) سے زائد ہوتی ہے، اور جس سے سرمایہ داروں کو مزید نفع مل سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس طرح جدید معاشی نظام نے لوگوں کو پیداواری مقاصد کے لئے سرمایہ کاری کرنے کا ایک محفوظ طریقہ فراہم کردیا، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ در حقیقت یہ طریق سودی قرضہ پر مبنی ہے جسکی وجہ سے شریعت اسلامیہ اسکی اجازت کسی طور نہیں دے سکتی، اور اس کے علاوہ اس میں اور بہت سے شرعی اور اقتصادی مفاسد بھی ہیں، جنکی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، اسی وجہ سے بعض اسلامی ممالک کے علماء نے غور و فکر کر کے اس قسم کے بانڈز کا ایک شرعی بدل مقارضہ بانڈز (سندات المقارضہ) کی صورت میں نکالا، جس کی تفصیل ذیل میں ذکر کی جاتی ہے۔

مقارضہ یا قراض اسلامی فقہ میں مشہور عقد ہے جسے مضاربہ بھی کہا جاتا ہے، کہ اس میں سرمایہ کار (رب المال) اپنا سرمایہ کسی تاجر (جسے مضارب کہا جاتا ہے) کو دیتا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ وہ تجارت کرے، اور اس سے جو نفع حاصل ہو وہ باہمی طے کردہ شرح سے دونوں کے درمیان تقسیم کیا ہے، اس عقد مضاربہ کی دستاویزات (جسے سندات سے تعبیر کیا جاتا ہے) جاری کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان سندات کے حامل لوگوں اور سندات جاری کرنے والے کاروباری ادارے کے درمیان مضاربہ کا عقد ہو جائے، اور حاملِ سند کو متعین نفع کے بجائے یہ طے ہو کہ اگر کمپنی کو نفع ہوا تو اسے متعین شرح سے نفع ادا کیا جائے گا۔

بعض اسلامی ممالک نے ان سندات کے سلسلے میں کچھ خصوصی قوانین نافذ کئے ہیں، ان میں سے ایک قانون اردن کی ہاشمی حکومت نے ۱۹۸۱ء میں نافذ کیا جس کا نام سندات المقارضہ کا قانون نمبر ۱۰ ہے۔

اس حکومت اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ کی تفصیل محترم جناب ڈاکٹر عبد السلام عبادی صاحب نے اپنے ایک مقالہ میں بیان فرمائی، یہ مقالہ آنجناب نے مجمع الفقہ الاسلامی (اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ) کے تیسرے اجلاس میں

جو عمان میں منعقد کیا گیا تھا، پیش فرمایا، اس مقالہ کی تفصیلات کا خلاصہ مندرجہ ذیل نکات میں بیان کیا گیا ہے[1]:

۱۔ سندات المقارضہ ایسے محدود قیمت رکھنے والے دستاویزی ثبوت ہیں، جنہیں کمپنیاں، سرمایہ کاروں کے اموال کے دستاویزی ثبوت کے طور پر جاری کرتی ہیں، ان دستاویزات پر سرمایہ کاروں کا نام بھی درج ہوتا ہے، ان دستاویزات سے کمپنیاں لوگوں سے سرمایہ حاصل کرتی ہیں، جس کے ذریعہ اپنے بڑے بڑے کاروباری یا صنعتی منصوبوں کی تکمیل کرتی ہیں، پھر اس سے جو نفع حاصل ہوتا ہے، وہ باہم تقسیم کیا جاتا ہے۔

۲۔ ان سندات کے حاملین کو ایک متعین شرح سے اس کاروبار کی کمائی سے نفع بھی حاصل ہوتا ہے، اور منافع کی شرح ان سندات کو جاری کرتے وقت متعین کردی جاتی ہے، سندات المقارضہ کے حاملین کو نہ تو سود ادا کیا جاتا ہے، اور نہ ہی ان کو سود طلب کرنے کا حق حاصل ہے۔

۳۔ فقہ اسلامی میں جو مقارضہ (مضاربہ) معروف ہے اس کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ جب کاروبار کر کے نفع کمایا جائے تو ایک متعین مدت کے بعد سرمایہ کار اور کاروبار کرنے والی کمپنی ایک ایسی شرح سے نفع حاصل کرتے ہیں جو پہلے سے باہم طے کی ہوئی ہوتی ہے، لیکن اردنی سندات المقارضہ میں یہ بات مصرح ہے کہ جب ایک متعین مدت بعد سندات المقارضہ کے حاملین کو نفع دیا جائے گا، تو ان کے نفع کی شرح کاروبار کرنے والی کمپنی اپنی مرضی سے متعین کرے گی، اور نفع کی شرح کی تعیین میں صاحب سند کا کوئی اختیار نہ ہوگا، البتہ کمپنی کی طرف سے شرح کی تعیین کے بعد صاحب سند کو اس کا حصہ ادا کردیا جائے گا، اور کمپنی کا حصہ نفع اس کمپنی کے حصہ داروں میں تقسیم ہونے کے بجائے ایک جگہ الگ محفوظ کر کے رکھا جائے گا، تاکہ اس سرمایہ کے ذریعہ ان سندات کو

(۱) مجمع الفقه الاسلامی جده ، مجله مجمع الفقه الاسلامی، العدد الرابع، الجزء الثالث (ص:۱۹۶۳)۔

تدریجاً واپس خرید کر منسوخ کیا جاسکے۔

۴۔ ہر سند کے حامل کے اوپر یہ لازم ہے کہ وہ عقد میں ذکر کردہ میعاد پر اپنی سندات لے کر آئے، اور سندات جاری کرنے والی کمپنی سے یہ درخواست کرے کہ وہ ان سندات کو قیمت اسمیہ (Face Value) پر واپس لے کر منسوخ کردے تاکہ وہ ان سندات کا حامل کے عوض اپنا دیا ہوا مال واپس لے سکے، چنانچہ سندات جاری کرنے والی کمپنی وہ سرمایہ اپنے اس محفوظ کردہ منافع کے ذریعے واپس لوٹا دیتی ہے، جس کی تفصیل تیسرے نکتہ کے ذیل میں گذر چکی ہے۔

۵۔ اس طریقے سے حاملین سندات کمپنی کو اپنی دی ہوئی رقم تدریجی تنسیخ کے مذکورہ عمل سے ایک ایک کر کے واپس وصول کر لیتے ہیں، اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے، کہ تمام سندات کی تنسیخ کا عمل مکمل ہو جاتا ہے، اور اب کمپنی اس پروجیکٹ اور کاروبار کی بمعہ مکمل ساز وسامان مالک بن جاتی ہے، لہذا اب آئندہ اس پروجیکٹ کا مکمل نفع صرف کمپنی کے حصہ داران کو ملے گا، حاملین سندات کو کوئی حصہ ادا نہیں کیا جائے گا۔

۶۔ البتہ اگر اس کمپنی کو نفع کے بجائے نقصان ہو تو حکومتِ اردن ایک شخص ثالث کا کردار ادا کرتے ہوئے ان حاملین سندات کے لئے انکی قیمت اسمیہ (Face Value) کی ضامن ہوگی، اگرچہ نقصان کے سلسلہ میں مضاربہ کا اصل قاعدہ یہ ہے کہ نقصان صرف سرمایہ کار (Invester) کا ہوتا ہے، لہذا نقصان اس قاعدہ کی رو سے حاملین سندات کو برداشت کرنا چاہیے تھا، لیکن ان کے نقصان کی تلافی اور سرمایہ کاری کو ترغیب دلانے کی خاطر اردنی قانون نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ نقصان کی صورت میں حکومت سرمایہ کاروں کو ان سندات کی قیمت اسمیہ کی حد تک معاوضہ ادا کردے گی۔

۷۔ نقصان یا خسارہ کے وقت حکومت ان حاملین سندات کو جو سرمایہ فراہم کرے گی، وہ سندات جاری کرنے والی کمپنی کے ذمہ قرض ہو جائے گا، اور سندات کی

مکمل تنسیخ کے وقت مذکورہ قرضہ کی ادائیگی کمپنی پر واجب ہو جائے گی۔

اوپر حکومت اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ کے قانون کا مختصر تعارف اور خاکہ ذکر کیا گیا ہے، اگر اسکا بدقتِ نظر جائزہ لیا جائے تو شرعی لحاظ سے چند خامیاں نظر آئیں گی، جنہیں ذیل میں نمبروار ذکر کیا جاتا ہے۔

ا:۔ مضاربہ یا مقارضہ کی حقیقت یہ ہے کہ فریقین میں سے کوئی فریق دوسرے فریق کے لئے سرمایہ یا نفع کا ضامن نہیں بن سکتا، کیونکہ اس میں جو فائدہ ہوتا ہے وہ تجارتی نفع ہوتا ہے، سودی انٹرسٹ نہیں ہوتا، اور تجارتی نفع میں نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے، چنانچہ اگر رب المال کے سرمایہ کی مضارب ضمانت لے گا، تو یہ مضاربت کی حقیقت سے نکل جائے گا، چونکہ حکومتِ اردن کے جاری کردہ سندات المقارضہ میں بھی قیمت اسمیہ کی حد تک ضمانت لی گئی ہے، لہذا یہ شرط شریعت اسلامیہ کے مقرر کردہ مضاربت کے اصولوں کے موافق نہیں ہے۔

اس موقعہ پر اگر یہ سوال کیا جائے کہ جس نے اس قیمت اسمیہ کی ضمانت لی ہے وہ درحقیقت سندات جاری کرنے والے یا کاروباری کمپنی (مضارب) نہیں ہے، بلکہ حکومت نے ایک تیسرے فریق کی مانند ضمانت لی ہے، اور شریعت میں وہ صورت ممنوع ہے جب فریقین میں سے کوئی ایک فریق ضمانت لے، تیسرے فریق کی طرف سے نقصان کی ضمانت لینا عقد کے لئے شرعاً مانع نہیں ہے۔

لیکن یہ بات اس وجہ سے ناقابل قبول ہے کہ اس میں حکومت قیمت اسمیہ کی اسطرح ضامن نہیں ہے کہ وہ بلا معاوضہ رضاکارانہ طور پر خسارے کی اپنی طرف سے تلافی کردے، اور بعد میں کبھی اس رقم کا مطالبہ کمپنی سے نہ کرے بلکہ وہ نقصان کی ادائیگی کمپنی کے نائب اور ایجنٹ کے طور پر کرتی ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ وہ سرمایہ جو حکومت فراہم کرتی ہے وہ درحقیقت سندات جاری کرنے والی کمپنی کے ذمہ قرض ہو جاتا ہے، اسلئے کہ اس کے اوپر یہ لازم ہوتا ہے کہ جب تمام سندات کی تنسیخ عمل میں آجائے تو کمپنی ان سندات کی قیمت اسمیہ حکومت کو واپس لوٹائیگی، لہذا جب تک یہ صورت حال باقی ہے کہ کمپنی وہ سرمایہ حکومت کو ادا کرنے کا التزام کرے، اس وقت تک ضامن حکومت نہیں بلکہ وہی سندات

جاری کرنے والی کمپنی (مضارب) سمجھی جائے گی۔

۲:۔ اور اگر بالفرض اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردنی قانون صحیح ہے اور حکومت اس نقصان کی بلا معاضہ ادائیگی کر دے گی، اور حکومت کی جانب سے بطور تلافی اداشدہ مال کمپنی کے ذمہ قرض نہیں ہوگا، تو اس صورت میں حکومت اگرچہ تیسرے فریق کے طور پر ضامن تو بن جائے گی، لیکن فقہ اسلامی کے ایک دوسرے اصول سے متصادم ہوگی، اور وہ یہ ہے کہ اسلامی فقہ میں ایک یہ اصول ہے کہ کفیل کی کفالت یا ضامن کی ضمانت (گارنٹی) ایسی چیزوں میں صحیح ہوتی ہے جو اصیل (اصل شخص) کے ذمہ میں واجب الاداء ہو، مثلاً قرضہ خریدے ہوے سامان کی قیمت، یا اس کے علاوہ اور کوئی واجبات (Dues) وغیرہ ہوں، البتہ اگر کوئی چیز اصیل کے ذمہ واجب الاداء ہی نہ ہو، تو اسکی کفالت صحیح نہیں ہوتی، مثلاً امانت کا مال اگر امین کے ہاتھ میں بغیر جان بوجھکر تلف ہو جائے تو امین کے ذمہ اس مال کی ادائیگی واجب نہیں ہے، اسی طرح شرکت اور مضاربت کا سرمایہ کسی شریک یا مضارب کے ہاتھ سے تلف ہو جائے تو اسکا تاوان صرف شریک یا مضارب پر نہیں ہوتا، لہذا وہ سرمایہ واجب الاداء رقوم میں سے نہیں ہے، لہذا اس رقم کے سرمایہ کی ضمانت لینا صحیح نہیں ہے، اور یہ اصول تمام کتب فقہ میں معروف ہے، اور اس میں کسی کا کوئی اختلاف بھی نہیں ہے، علامہ مرغینانیؒ فرماتے ہیں۔

والکفالة بالأعیان المضمونة وإن کانت تصح عندنا خلافا للشافعی، لکن بالأعیان المضمونة بنفسها، کالمبیع بیعا فاسدا، والمقبوض علی سوم الشراء والمغصوب، لا بما کان مضمونا بغیره، کالمبیع والمرهون ولا بما کان أمانة کالودیعة والمستعار والمستأجر، مال المضاربة والشرکة[۱]۔

اشیاء مضمونہ (جنکی ضمانت لی جائے) کی کفالت اگرچہ ہمارے نزدیک صحیح ہے لیکن امام شافعی کے نزدیک صحیح نہیں ہے، اور ہمارے نزدیک بھی ہر شئے کی ضمانت نہیں لی جاسکتی بلکہ اس میں یہ قاعدہ ہے کہ وہ اشیاء جو بذات خود واجب

(۱) المرغینانی : شیخ الاسلام برهان الدین ابو الحسن علی بن عبد الجلیل أبو بکرالرشدانی الهدایة ، ایچ ایم سعید کمپنی (۱۲:۳)۔

الأداء ہوں، مثلاً بیع فاسد کی ذریعہ فروخت کردہ مال، خریداری میں بھاؤ تاؤ کے دوران کسی چیز پر قبضہ، یا مال مغصوب (چھینا ہوا مال) ان کا حکم یہ ہے کہ ان پر کفالت اور ضمانت لینا صحیح ہے، لیکن وہ مال جو بذات خود واجب الأداء نہ ہوں (بلکہ ان کی قیمت واجب ہو) مثلاً فروخت کیا ہوا مال، گروی رکھا ہوا مال، کہ اگر بالفرض رہن رکھا ہوا مال تلف ہو جائے تو بعینہ اس مال کا لوٹانا ضروری نہیں بلکہ اس کے ذمہ سے قرضہ ساقط ہو جائے گا، یا مقروض قرض ادا نہ کرے تو اس مال کو لوٹانا واجب نہیں ہے، اور نہ ہی وہ مال جو امانت ہو، مثلاً ودیعت، عاریت یا کرایہ پر لیا ہوا مال یا مضاربت اور شرکت کا سرمایہ، ان کا حکم یہ ہے کہ ان کی کفالت لینا صحیح نہیں ہے۔

علامہ شربینیؒ فرماتے ہیں:

يصح ضمان رد كل عين فمن هي في يده مضمونة عليه كمغصوبة ومستعارة ومستامنة ومبيع لم يقبض (إلى قوله) وأما إذا لم تكن العين مضمونة على من هي بيده كالوديعة والمال في يد الشريك، والوكيل والوصي فلايصح ضمانها لأن الواجب فيها التخلية دون الرد[1]۔

ہر ایسی چیز کے لوٹانے کی ضمانت لینا صحیح ہے جو اس کو رکھنے والے کے ہاتھ میں واجب الاداء ہو، مثلاً غصب کردہ عاریت یا امانت میں لیا ہوا مال، یا ایسی فروخت شدہ شئے جس پر ابھی تک قبضہ نہیں ہوا۔ البتہ اگر رکھنے والے کے ہاتھ میں وہ شئے مضمون (واجب الاداء) نہ ہو مثلاً مال امانت، شریک کا سرمایہ، یا وکیل اور وصی کے ہاتھ میں مال، تو انکی ضمانت (کفالت) لینا صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ اموال واجب الاداء نہیں ہیں، بلکہ ان اموال کو فارغ کرنا واجب ہے۔

(۱) الشربيني المطيب من أعيان علماء الشافعيين مغني المحتاج إلى معرفة معاني ألفاظ المنهاج للنووي من أبناء القرن العشر من الهجرة (۲:۲۰۲)۔

علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

ویصح ضمان الأعیان المضمونه کالمغصوب والعاریه وبه قال أبو حنیفة والشافعیؒ فی أحد القولین (إلی قوله) فأما الأمانات کالودیعة والعین المؤجرة والشرکة والمضاربة (إلی قوله) فهذه إن ضمنها من غیر تعد فیها لم یصح ضمانها[۱]۔

واجب الأداء اشیاء مثلاً مالِ مغصوب اور مال عاریت کی ضمانت لینا صحیح ہے، یہی مذہب امام ابو حنیفہ اور امام شافعیؒ کی ایک روایت کے مطابق ان کا بھی یہی مذہب ہے، البتہ امانتیں جیسے ودیعت کا مال، کرایہ پر دیا ہوا مال، سرمایہ شرکت و مضاربت، تو اگر تعدی (جان بوجھکر خراب کرنا) کے بغیر کوئی شخص ان اموال کی ضمانت لے تو اسکی ضمانت صحیح نہیں ہے۔

حنابلہ کی کتاب کشاف القناع عن متن الاقناع میں مذکور ہے کہ:

وتصح الکفالة بالأعیان المضمونة کالمغصوب والعواری، لأنه یصح ضمانهما، ولا تصح الکفالة بالأمانات، کالودیعة والشرکة والمضاربة إلا إن کفله بشرط التعدی إلخ[۲]۔

واجب الاداء اشیاء کی کفالت صحیح ہوتی ہے، مثلاً غصب کیا مال ہو، عاریت کا سامان، اس لئے کہ یہ اشیاء واجب الاداء ہیں، اور امانتوں کی کفالت صحیح نہیں ہے، جیسے ودیعت اور شرکت و مضاربت کا مال، إلا یہ کہ کوئی شخص جان بوجھکر

(۱) ابن قدامة (أبو محمد عبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی مکتبة الریاض السعودیة ۱٤۰۳ھ۔ (٤:٥٩٥)۔

(۲) البهوتی: منصور بن یونس ۱۰٥۱ھ کشاف القناع عن متن الاقناع، مکة المکرمة، مطبعة الحکومه بیروت (۳:۳٦٤)۔

کئے جانے والے نقصان کی صورت کی کفالت (ضمانت) لے۔

علامہ ابن ہمام فرماتے ہیں:

وضمان الخسران باطل لأن الضمان لا يكون إلا بمضمون والخسران غير مضمون على أحد، حتى لو قال بائع فى السوق على أن كل خسران يلحقك فعلّي، أو قال المشترى العبد إن أبق عبدك هذا فعلي، لا يصح[1]۔

خسارے کی ضمانت لینا باطل ہے، اس لئے کہ ضمانت ایسی چیزوں کی لی جاتی ہے، جو مضمون (واجب للأداء) ہوں، اور خسارہ غیر مضمون (غیر واجب الاداء) شئے ہے، چنانچہ اگر کوئی بیچنے والا بازار میں یہ کہدے کہ اگر تجھے کسی قسم کا نقصان ہوا تو میرے اوپر ہے، یا غلام کے خریدار سے کہدے کہ اگر تمہارا غلام بھاگ گیا تو میرے ذمہ ہے، یہ دونوں باتیں (ضمانتیں) صحیح نہیں ہیں۔

لیکن ان امور میں کفالت صحیح نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس سرمایہ کی کفالت لی گئی ہے، وہ سرمایہ کفیل کے ذمہ عدالت کی سطح پر لازم نہ ہوگا، لہذا جس شخص کو کفالت دی گئی ہے، (یعنی مکفول لہ) اس کو عدالت میں اس سرمایہ کے مطالبہ کا حق حاصل نہ ہوگا، چنانچہ تیسرے فریق کا اپنے اوپر اس سرمایہ کی ادائیگی کے التزام کو صرف ایک وعدہ کی مانند دیانتا تو معتبر مانا جاسکتا ہے، قضاء نہیں، اب اگر تیسرا فریق اپنے وعدہ کے ایفاء کی خاطر وہ رقم رضاکارانہ ادا کردے تو اس سند کے حامل کے لئے اسے لینا جائز ہوگا، البتہ قاضی اسے ادا کرنے پر کفالت کی طرح قضاء مجبور نہیں کر سکتا۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کیا مالکیہ کے مذہب پر عمل کرتے ہوئے اسے ان وعدوں میں شمار کر سکتے ہیں، جو قضاء (یعنی وعدۂ ملزم) لازم ہوتے ہیں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں اس میں یہ تامل ہے کہ اگر ہم اسے وعدہ ملزم قرار دیں تو یہ صورت ضمان لازم کی طرح بن جائے گی، تو پھر اس صورت میں مال شرکت و مضاربت کی ضمانت یا کفالت ناجائز ہونے کے کوئی معنی نہ رہ جائیں گے۔

---

(۱) ابن همام ،فتح القدير، ٧٦٧ه المكتبة الرشيدية ،كوئٹه (٦:٣٢٣)۔

سندات کی تنسیخ (Redemption) کا مسئلہ

تیسرا اہم اور قابل غور مسئلہ جو اردنی سندات سے متعلق ہے وہ یہ ہے کہ آیا ان سندات کو قیمت اسمیہ پر منسوخ کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ اور اس میں اشکال یہ ہے کہ اگر انہیں قیمت اسمیہ پر منسوخ کیا جائے تو یہ مضاربت کی حقیقت سے نکل کر قرض کی ایک شکل بن جائے گا۔

اس نکتہ کی وضاحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے سندات کی تنسیخ کے پہلو کا فقہی حیثیت سے جائزہ لیا جائے، اور واقعہ یہ ہے کہ سندات کی تنسیخ کا مطلب سرمایہ کار (رب المال) کی جانب سے مال مضاربت کی واپس وصولی ہے، اور یہ واپس لینا اس وقت تو آسان تھا جب مال مضاربت نقد شکل میں ہوتا، البتہ جب مال مضاربت اجناس کی شکل میں تبدیل ہو گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ کار (رب المال) جو اجناس کے حقیقی مالک ہیں یہ اجناس کو مضارب کو فروخت کر رہے ہیں، کیونکہ مضاربت کی حالت میں مضاربت کے سرمایہ پر مضارب کو صرف حق تصرف حاصل ہے، اسے ملکیت کا حق بالکل حاصل نہیں ہے، چنانچہ اگر اس کاروبار میں نفع ہوا تو اسے کام کرنے کی وجہ سے نفع میں سے حصہ تو ملے گا، لیکن نقصان کی صورت میں اس پر کوئی ذمہ داری نہیں آئیگی، لہذا مسئلہ کی رو سے جو شخص سندات لیکر کمپنی کے پاس تنسیخ سندات کیلئے آئے، اور سارا سرمایہ مضاربت کاروبار میں اجناس کی شکل میں لگا ہوا ہو تو اس کا مطلب یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کاروبار میں سے اپنا مشاع (غیر تقسیم شدہ) حصہ کمپنی کے ہاتھ فروخت کرنا چاہ رہا ہے، اب یہاں پر مندرجہ ذیل باتیں قابل غور ہیں:

۱۔ کیا رب المال اپنا مال مضاربت غیر نقد حالت میں واپس لے سکتا ہے؟

۲۔ سندات واپس لینے یا منسوخ کرنے کی مذکورہ شرط لگانا عقد مضاربت میں جائز ہے؟

۳۔ اگر منسوخ کرنا جائز ہے تو سرمایہ کار کو قیمت اسمیہ ملے گی یا بازاری قیمت؟

پہلا مسئلہ: مال مضاربت غیر نقد حالت میں واپس لینا:

سب سے پہلے ہم اس مسئلہ کا جائزہ لیتے ہیں کہ مال مضاربت ایسے وقت واپس طلب کرنا جبکہ وہ غیر نقد شکل میں ہو، فقہی تعبیر میں فسخ مضاربت یا مضارب کو عقد مضاربت سے معزول کرنا کہلاتا ہے، (اور یہی بات ان سندات کے حق میں بھی ہے) اور فقہائے کرام نے ذکر فرمایا ہے کہ مضاربت فسخ کرتے وقت مضارب کے ذمہ یہ لازم ہے کہ وہ مضاربت کے غیر نقد اثاثوں کو فروخت کر کے نقد شکل میں لے آئے۔

چنانچہ الدر المختار میں ہے:

> وینعزل (أی المضارب) بعزله (أی رب المال)، فإن علم بالعزل والمال عروض باعها[1]۔
>
> اور مضارب رب المال کے معزول کرنے سے معزول ہو جاتا ہے، اگر مضارب کو معزولی کی خبر پہونچے جبکہ سرمایہ اجناس کی شکل میں ہو تو مضارب اسے فروخت کرے گا۔

اوپر ذکر کردہ مذہب امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کا بھی ہے، چنانچہ علامہ ابن قدامہؒ فرماتے ہیں:

> والمضاربة من العقود الجائزة تنفسخ بفسخ أحدهما، وإن انفسخت والمال عرض فاتفقا علی بیعه أو قسمه جاز، لأن الحق لهما لا یعدو هما، وإن طلب رب المال البیع وأبی العامل ففیه وجهان، أحدهما یجبر العامل علی البیع، وهو قول الشافعیؒ، لأن علیه رد المال ناضا کما أخذه، والثانی لا یجبر إذا لم یکن فی المال ربح أو أسقط حقه من الربح[2]۔

---

(۱) الدر المختار (٥:٦٥٥)، قبیل المتفرقات، المضاربة۔

(۲) ابن قدامة (أبو محمدعبد الله بن أحمد بن محمد المقدسی)، المغنی مکتبة الریاض السعودیة ١٤٠٣ھ۔ (٥:٥٩٥)۔

اور مضاربت عقود جائزہ میں سے ہے، کسی ایک کے فسخ کرنے سے فسخ ہو جاتی ہے، اور جب فسخ ہو جائے اس حال میں کہ مال اجناس کی شکل میں ہو اور دونوں اسے فروخت یا تقسیم کرنے پر متفق ہو جائیں، تو ایسا کرنا جائز ہے، کیونکہ انہیں اس کام کا اختیار اور حق حاصل ہے، لیکن اگر رب المال (سرمایہ کار) فروخت کرنا چاہے اور کاروباری شخص (مضارب) اس کا انکار کر دے تو دو صورتیں جائز ہیں، ایک یہ کہ کاروباری شخص کو فروخت پر مجبور کیا جائے، (تاکہ وہ انہیں فروخت کر کے سرمایہ نقد شکل میں تبدیل کر لے) یہی مذہب امام شافعیؒ کا ہے، انکی دلیل یہ ہے کہ اس کے ذمہ یہ لازم ہے کہ جس شکل میں اس نے سرمایہ کار سے سرمایہ لیا تھا یعنی نقد حالت میں، اسی حالت میں اسے واپس بھی کرے، دوسرا اختیار یہ ہے کہ اگر اس مال میں کوئی نفع نہیں ہوا یا مضارب نے اس نفع سے دست برداری کا اعلان کر دیا تو کل سرمایہ اسی شکل میں (خواہ وہ غیر نقد ہو) واپس کر سکتا ہے۔

اوپر ذکر کردہ عبارت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مال مضاربت کو واپس لینے میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہے، اور اس صورت میں اگر مال غیر نقدی حالت میں ہو تو اسے فروخت کر کے نقد بنا لینا چاہیے، اور یہ بات بھی عیاں ہے کہ سرمایہ مضاربت کی فروختگی جس طرح تیسرے شخص کے ہاتھ جائز ہے اسی طرح مضارب کے ہاتھ بھی جائز ہے چنانچہ اگر مضارب اس سرمایہ کو خریدنا چاہے تو مطلوبہ قیمت دے کر خرید سکتا ہے، اس قیمت میں سے پہلے رب المال کو اسکا سرمایہ واپس کیا جائیگا، پھر اگر کچھ نفع ہوا ہو تو وہ فریقین طے کردہ تناسب سے تقسیم کر لیں گے۔

دوسرا مسئلہ: بیع کے راستہ سرمایہ کی واپسی کی شرط:

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بیع کے راستہ سرمایہ کی واپسی کی شرط لگانا عقد مضاربت میں کیسا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بظاہر اس میں کوئی مانع نہیں ہے، اس لئے کہ سرمایہ کار جب چاہے مضاربت فسخ کر سکتا ہے، اور اس وقت مضارب پر یہ لازم ہوتا ہے، کہ اگر سرمایہ نقد شکل میں نہ ہو تو اسے فروخت کر کے نقد صورت میں لے آئے، لہذا مضاربت میں اس

طرح کی اثاثوں کی فروختگی کی شرط عقد کے نا موافق نہیں ہے، کیونکہ بہت سے فقہائے کرامؒ کے نزدیک سرمایہ کار اور مضارب کے مابین سرمایہ مضاربت کی خرید و فروخت میں کوئی حرج نہیں ہے، چنانچہ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

ویجوز شراء رب المال من المضارب وشراء المضارب من رب المال وإن لم يكن في المضاربة ربح في قول أصحابنا الثلاثة، وقال زفر رحمه الله تعالى: لا يجوز الشراء بينهما في مال المضاربة۔ وجه قول زفر رحمه الله تعالى: هذا بيع ماله بماله، إذ المالان جميعا لرب المال، وهذا لا يجوز كالوكيل مع الموكل، ولنا أن لرب المال في مال المضاربة ملك رقبة لا ملك تصرف، وملكه في حق التصرف كملك الأجنبي، وللمضارب فيه ملك التصرف لا الرقبة، فكان في حق ملك الرقبة كملك الأجنبي، حتى لا يملك رب المال منعه من التصرف، فكان مال المضاربة في حق كل واحد منهما كمال الأجنبي، لذلك جاز الشراء بينهما[1]۔

اور رب المال (سرمایہ کار) کا مضارب سے مال خریدنا اور مضارب کا رب المال سے مال خریدنا جائز ہے، خواہ مضاربت میں کوئی نفع حاصل نہ ہو، یہ مذہب تینوں أئمہ کا ہے، اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اپنے مال کو اپنے مال کے عوض فروخت کرنے کی طرح ہے، کیونکہ دونوں مال سرمایہ کار کے ہیں، اور یہ ایسا ہے جیسے کوئی کوئی موکل اپنے وکیل کو اپنا مال اپنی طرف سے دئے ہوے مال کے عوض فروخت کردے۔ لیکن ہماری دلیل یہ ہے کہ سرمایہ کار کی اگرچہ سرمایہ مضاربت میں حقیقی ملکیت موجود ہے، لیکن اسے تصرف کا اختیار نہیں ہے جیسے اجنبی شخص کی مملوکہ اشیاء میں کسی کو تصرف کا اختیار نہیں ہوتا، اور دوسری طرف مضارب

(۱) الكاساني ،علاء الدين ابو بكر بن مسعود ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع في ترتيب الشرائع،بيروت ،موسسة التاريخ العربي ۱٤۱۷ھ،ايچ ايم سعيد كمپني،(٦:١٠١)۔

کو اس سرمایہ میں تصرف کی ملکیت تو ہے، لیکن حقیقی ملکیت نہیں ہے، لہذا حقیقی ملکیت حاصل نہ ہونے کی وجہ سے وہ مال ایک اجنبی کے مال کی مانند ہے، اور مضارب کو چونکہ تصرف کا اختیار حاصل ہے، لہذا اسے رب المال (سرمایہ کار) تصرف سے روک بھی نہیں سکتا، ان باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ سرمایہ مضاربت ہر ایک کے حق میں اجنبی کے مال کی طرح ہے، اسی لئے ان دونوں کے درمیان خرید و فروخت جائز ہے۔

مذکورہ بالا عبارت کا خلاصہ یہ کہ مضارب کے ہاتھ مال مضاربت کی فروختگی مقتضائے عقد کے خلاف نہیں ہے۔

تیسرا مسئلہ: سندات کی منسوخی قیمتِ اسمیہ پر یا بازاری قیمت پر؟

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ سندات کی منسوخی قیمت اسمیہ پر ہونی چاہیے یا بازاری قیمت پر؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اسے بازاری قیمت پر ہونا چاہیے، پھر اگر بازاری قیمت اسکی قیمت اسمیہ (Face Value) سے زائد ہو، تو دونوں قیمتوں کے درمیان جو فرق ہوگا، وہ مال مضاربت کا نفع ہوگا، لہذا اس نفع کو بھی رب المال اور مضارب کے درمیان اسی نسبت سے تقسیم کیا جائے گا، جو دونوں کے درمیان پہلے سے عقد میں طے کی گئی ہے۔

مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ ایک سند کی قیمت اسمیہ سو روپے ہے، اور تنسیخ کے وقت اسکی بازاری قیمت ایک سو بیس روپے ہے، تو مضارب اگر اس سند کو خریدنا چاہے تو ایک سو بیس روپے دیکر اسے خریدے گا، البتہ اس میں سے بیس روپے مضاربت کا نفع ہوں گے، لہذا اگر بالفرض مضاربت میں نفع آدھا آدھا طے کیا گیا تھا، تو دس روپے رب المال (سرمایہ کار) کو اور بقیہ دس روپے مضارب کو نفع میں سے اس کے حصہ کے طور پر اسے مل جائیں گے، نفع کے اس طریقہ پر تقسیم ہونے کے بعد گویا کہ رب المال کو اس سند کے عوض ایک سو دس روپے ملے۔

ان سندات کی تنسیخ بازاری قیمت پر ہونی چاہیے، اس بات کی دلیل یہ ہے کہ شرعی طور پر اصلاً رب المال (سرمایہ کار) مال مضاربت کا مالک ہے، مضارب کا حصہ صرف اس کے نفع میں ہے، اگر بازار میں اس مال کی قیمت بڑھ جائے تو اس

قیمت کا اضافہ در حقیقت اس مال کا نفع ہے، چنانچہ سوائے نفع کے اس حصہ کے جو مضارب کو دیا جائے گا، بقیہ سارا نفع اور اس کے ساتھ حقیقی سرمایہ رب المال کا ہوگا، تاہم اگر یہ شرط لگائی جائے کہ ان سندات کو بازاری قیمت کے بجائے قیمت اسمیہ پر فروخت کرنا ہوگا، تو یہ شرط مخالف عقد ہونے کی وجہ سے ناجائز ہوگی، چنانچہ فقہائے کرام نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے، علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

وإذا اشترى المضارب بمال المضاربة متاعا، وفيه فضل أو لا فضل فيه، فأراد رب المال بيع ذلك، فأبى المضارب وأراد إمساكه، حتى يجد ربحا، فإن المضارب يجبر على بيعه إلا أن يشاء أن يدافعه إلى رب المال، لأن منع المالك عن تنفيذ إرادته في ملكه لحق يحتمل الثبوت والعدم،وهو ربح لا سبيل إليه، ولكن يقال له: إن أردت الإمساك فرد عليه ماله، وإن كان فيه ربح يقال له: ادفع إليه رأس المال وحصته من الربح، ويسلم المتاع إليك[1]۔

اور جب مضارب مال مضاربت کے ذریعہ کوئی سامان خرید لے، اور اس میں اسکو فائدہ پہونچے، یا فائدہ نہ پہونچے، اور رب المال (سرمایہ کار) اس سامان کو فروخت کرنا چاہے، لیکن مضارب انکار کرے، یا اس سامان کو اس وقت تک روکے، جب تک نفع حاصل نہ ہو جائے، تو مضارب کو فروخت کرنے پر مجبور کیا جائے گا، اِلا یہ کہ مضارب وہ مال رب المال کو دینے کا ارادہ کرے، اس لئے کہ مالک کا مضارب کو تصرف سے روکنے کا مقصد نفع کے حصول کا غیر یقینی ہونا ہے، لہذا مضارب سے کہا جائے گا کہ اگر تم اس سامان کو رکھنا چاہتے ہو تو سرمایہ کار کا نقد مال واپس کردو، اور اگر اس مال پر کوئی نفع ہوا ہو تو مضارب سے کہا جائے گا کہ

---

(۱): الکاسانی ،علاء الدین ابو بکر بن مسعود ۵۸۷ھ ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع،بیروت ،موسسة التاریخ العربی ۱٤۱۷ھ،ایچ ایم سعید کمپنی،: (٦:۱۰۰)۔

سرمایے اور نفع میں سے اس کا حصہ اسے دیدو، اور اس کے عوض وہ تمام سامان تمہیں دیدے گا۔

مذکورہ بالا عبارت کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سندات کا مالک صرف قیمت اسمیہ (یعنی اپنے اصل سرمایے) کا مالک نہیں ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ نفع میں سے اپنے حصہ کا بھی مالک ہوگا، لہٰذا ان سندات کو قیمت اسمیہ پر تنسیخ کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اسکی فروختگی بازاری قیمت پر ہو، اور پھر دونوں کی درمیان نفع طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جائے۔

گزشتہ تفصیل کی روشنی میں سامان کی فروختگی کی تین شکلیں نکلتی ہیں:

۱۔ بازاری قیمت اور قیمت اسمیہ مساوی ہوں، تو اس میں کوئی مسئلہ پیش نہیں آئے گا، کیونکہ تنسیخ دونوں قیمتوں پر ہو سکتی ہے۔

۲۔ بازاری قیمت، قیمت اسمیہ سے کم ہو تو تنسیخ بازاری قیمت پر ہوگی، اور نقصان صاحب سند کا خسارہ سمجھا جائے گا۔

۳۔ بازاری قیمت، قیمت اسمیہ سے زائد ہو تو ضروری ہے کہ سندات کی تنسیخ بازاری قیمت سے اتنی رقم منہا کرنے کے بعد ہو جتنی رقم بطور حصہ نفع کمپنی کو حاصل ہوتی، مثلاً اگر کمپنی اور حامل سند کے مابین نفع نصف نصف طے ہوا اور سند کی قیمت اسمیہ سو روپے ہو اور بوقت تنسیخ اسکی بازاری قیمت ایک سو بیس ہوگئی، تو تنسیخ ایک سو دس میں ہوگی، اسلئے کہ بقیہ دس روپے کمپنی کے بطور نفع منہا کر لئے جائیں گے۔

سندات کی تنسیخ اکٹھے یا تدریجا؟

ایک سوال ان سندات کے بارے میں یہ پیش آسکتا ہے کہ کیا تمام سندات کی تنسیخ کا عمل ایک ساتھ ہوگا یا تدریجا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہر حصہ کے کسی ایک جزو کی تنسیخ کی جائے؟، اور مؤخر الذکر صورت میں ہر حصہ کا نفع قیمت کم

ہونے کی وجہ سے کم ہو جائے گا؟

بظاہر اس سوال کا جواب یہ ہے کہ تنسیخ کے دونوں طریقے اختیار کرنے میں شرعاً کوئی مانع نہیں ہے، اس لئے کہ یہ بات پہلے بھی بیان ہو چکی ہے کہ سندات کی تنسیخ کا مطلب مال مضاربت مضارب کے ہاتھ فروخت کرنا ہے، اور یہ فروختگی جس طرح تمام مال مضاربت میں صحیح ہوگی اس کے بعض حصوں میں بھی صحیح ہوگی، البتہ جب سرمایہ کار اپنا نصف مال مضاربت مضارب کو فروخت کر دے گا، تو بقیہ نصف حصہ میں مضاربت سابقہ حالت پر برقرار رہے گی، اور پھر یہ مال کا مجموعہ مشترک کاروبار میں آپس میں مخلوط ہو کر مشغول کاروبار ہو جائے گا، گویا کہ مضارب کے سرمایہ کار (رب المال) سے اس کا نصف حصہ خریدنے کے بعد کل سرمایے پر شرکتِ عنان وجود میں آجائے گی، اور مضارب اس کاروبار میں اپنے خریدے ہوئے حصہ کی وجہ سے بقیہ مال مضاربت کے ساتھ شریک بن جائے گا، پھر اس مال کے مجموعہ پر جو بھی نفع حاصل ہوگا، اسکے نصف کو مضارب شریک کی حیثیت سے وصول کرے گا، اور بقیہ نصف سرمایہ کار اور مضارب پر سابقہ مضاربت میں نفع کی طے شدہ شرح سے تقسیم ہوگا۔

اسکی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے زید نے ایک لاکھ روپے خالد کو مضاربت کے طور پر نصف نفع کی شرح کے ساتھ دیئے، خالد نے اس سرمایہ سے کاروبار کرنے کے لئے سامان خریدا، یہ سارا سامان زید کی ملکیت سمجھا جائے گا، پھر خالد نے اس سامان کا نصف مشاع حصہ خرید لیا، اور اسے سابقہ کاروبار سے الگ نہ کیا، بلکہ زید کی رضامندی سے کاروبار جاری رکھا، یہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں افراد اب نصف حصہ کی آپس میں خرید و فروخت کرنے کے بعد شریک بن گئے ہیں، اور نصف سامان کا مالک خالد اور بقیہ نصف کا زید مالک ہو گیا ہے، اور زید کے بقیہ نصف حصہ میں مضاربت سابقہ شرائط کے ساتھ جاری رہے گی، اور خالد اس مشترک سامان کے نصف حصہ کا تو مالک ہو جائے گا، اور بقیہ زید کے حصہ میں وہ زید کا مضارب رہے گا، پھر اگر مجموعہ سرمایہ پر بالفرض پچاس ہزار کا نفع ہوا تو اس پچاس ہزار میں سے پچیس ہزار خالد کو شریک ہونے کی حیثیت سے ملیں گے، اور بقیہ پچیس ہزار مضاربت کا نفع ہوگا، جسے زید اور خالد باہمی طے کردہ شرح کے مطابق نصف نصف لے لیں گے، چنانچہ ساڑھے بارہ ہزار زید کو سرمایہ کار (رب المال) ہونے کی حیثیت سے اور خالد کو ساڑھے بارہ ہزار مضارب (کاروباری) ہونے کی حیثیت سے مل جائیں گے، اور دونوں کے درمیان نفع کی تقسیم حسبِ ذیل تفصیل

سے ہوگی:

خالد کا حصہ بطور شرکت = ۲۵۰۰۰ (پچیس ہزار روپے)

خالد کا حصہ بطور مضاربت = ۱۲۵۰۰ (ساڑھے بارہ ہزار روپے)

خالد کے دونوں حصص کا مجموعہ = ۳۷۵۰۰ (سینتیس ہزار روپے)

زید کا حصہ بطور رب المال = ۱۲۵۰۰ (ساڑھے بارہ ہزار روپے)

صافی نفع = ۵۰۰۰۰ (پچاس ہزار روپے)

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب بھی سرمایہ کار (رب المال) مال مضاربت میں سے کوئی بھی حصہ مضارب کو فروخت کریگا، تو اگر اس حصہ میں نفع حاصل ہوا تو وہ مضارب کی طرف اس لئے منتقل ہوگا کہ وہ اپنے حصہ کی وجہ سے تجارت میں شریک بن چکا ہے، لہذا مجموعی نفع میں رب المال کا نفع کم ہو جائے گا، اور مضارب کا نفع بڑھ جائے گا، اور چونکہ ان سندات کی تنسیخ درحقیقت ان سامان کی فروختگی ہے جو ان کے مقابل ہیں لہذا اگر تنسیخ کے بعد اس جزو میں نفع ہوا تو نفع کا وہ جزو سندات جاری کرنے والی کمپنی (مضارب) کی طرف منتقل ہوئے گا، لہذا اس حصہ کی حد تک صاحب سند (رب المال) کا نفع فروخت کے فوراً بعد سے کم ہو جائے گے، اور اس نفع کی کمی کے سلسلے میں تمام سندات کی تنسیخ کا انتظار بھی نہیں کیا جائے گا۔

اور اسکی مثال یہ ہے کہ اگر سند کی قیمت اسمیہ سو روپے ہو اور صاحب سند اس کی نصف کی تنسیخ کے لئے حاضر ہو اور اس پر کمپنی بھی راضی ہو جائے تو صاحب سند کا حق نفع پچاس فیصد فوراً اسکی (صاحب سند کی) طرف منتقل ہوئے گا، اور یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس کا نفع سندات کی مکمل تنسیخ تک برقرار رہے۔

یہ تو شرعی لحاظ سے دونوں طریقوں کا ذکر تھا، البتہ اگر عملی حیثیت سے جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے طریقہ پر عمل کرنا زیادہ سہل اور اولی ہے، یعنی تمام سندات میں سے ایک متعین تعداد کی تنسیخ ہو، تاکہ عملاً نفع کا حساب آسان ہو، البتہ اسکی عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ہر سند میں ایک سے زائد کوپن شامل کر لئے جائیں، اور ہر کوپن سند کے

ایک متناسب حصے کی نمائندگی کرے، مثلاً ایک سند قیمت اسمیہ کے اعتبار سے ۱۰۰ روپے کی ہے تو اسے چار مختلف کوپنوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ان میں سے ہر کوپن پچیس روپے کی سرمایہ کاری کی نمائندگی کرے گا، اور اسکی قیمت پوری سند کی قیمت کا چوتھائی حصہ سمجھی جائیگی۔

ساتواں باب

مشارکہ اور سود کا فرق

ساتواں باب: مشارکہ اور سود کا فرق

تقسیم دولت پر مشارکہ اور سود کے اثرات کا تقابل

اگر تقسیم دولت پر مشارکہ اور سود کے اثرات کا تقابل کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مشارکہ کے نتیجہ میں تقسیم دولت کے نظام میں توازن اور ہمواری پیدا کرنے میں معاونت ہوتی ہے، اور دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں گردش کر کے معیشت کو مستحکم اور مضبوط بناتی ہے، جبکہ سودی نظام کی خرابی یہ ہے کہ اسکی وجہ سے تقسیم دولت کے نظام میں عدم توازن اور ناہمواری پیدا ہوتی ہے، اور دولت چند خاندانوں یا چند افراد کے ہاتھوں مرتکز ہو جاتی ہے، اسکی وجہ یہ ہے کہ سودی کاروبار میں ایک فریق یعنی سرمایہ مہیا کرنے والے کا منافع یعنی سود تو ہر حال میں متعین اور یقینی ہوتا ہے، لیکن دوسرے فریق یعنی سرمایہ حاصل کرنے والے کا منافع غیر یقینی اور غیر معین ہوتا ہے، کیونکہ کاروبار جتنے وسیع ہوتے ہیں، خطرات کے امکانات بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ سرمایہ دارانہ معیشتوں کو بارہا سنگین تجارتی بحرانوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، ایسے بحرانوں میں اگر کساد بازاری کا زور بڑھ جائے تو سود پر سرمایہ حاصل کرنے والوں کو زبردست نقصان کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جبکہ سرمایہ مہیا کرنے والوں کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، خلاصہ یہ کہ کاروبار میں خواہ نفع ہو یا نقصان سودی سرمایہ مہیا کرنے والوں کو بہر صورت اپنے سرمایہ پر سود ملتا ہے، جبکہ کاروبار کرنیوالے لوگوں کو نفع بھی ہو سکتا ہے، اور نقصان بھی، لہذا ایک فریق کا منافع متعین اور دوسرے کا غیر متعین اور مشکوک ہوتا ہے، جس کے نتیجہ میں کچھ افراد تو امیر سے امیر تر ہوتے جاتے ہیں جبکہ بقیہ افراد سود کے بوجھ تلے دب کر غریب سے غریب تر ہو جاتے ہیں، اس طرح دولت کی تقسیم میں توازن برقرار نہیں رہتا، جسکی وجہ سے معیشت کو مجموعی طور پر کئی صورتوں میں منفی اثرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، صرف گنتی کے چند افراد پوری دولت پر قابض ہو جاتے

ہیں، اور طلب و رسد کی فطری قوتیں انکی مرضی کے تابع ہو کر رہ جاتی ہیں، جس کے نتیجہ میں قیمتوں کی میکانیت (Mechanism) کا قدرتی نظام لازمی طور سے مصنوعی بن جاتا ہے، جسکی پوری قوم کو معاشی و سماجی اخلاقی اور سیاسی شعبوں میں بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

جبکہ سود کی ممانعت کی بدولت تقسیم دولت میں پیدا ہونے والی اس قسم کی عدم توازن کی خرابی کو روکا جاسکتا ہے، کیونکہ جب دونوں فریق مشارکہ کے طریقہ پر کاروبار کریں گے، تو اس میں نفع و نقصان کی شراکت کی بنیاد پر کاروبار ہوگا، تو لازماً خود غرضی اور لالچ کے بجائے باہمی مفادات کے تحفظ کا جذبہ پیدا ہوگا، اور نفع نقصان کی ذمہ داری جب مشترک ہوگی، تو تمام شرکاء کاروبار کے منافع میں اضافہ کے لئے اکٹھے کوشش کریں گے، اور اسمیں سودی کاروبار کی طرح خود غرضیاں جنم نہیں لیں گی، اور مسابقت اور مقابلے میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لئے اخلاقی اصولوں کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا، پورے معاشرے میں اتحاد اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہوگی، اور ملکی دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کے بجائے زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں گردش کر کے معیشت کو ایک خود کار نظام کی طرح ہر قسم کے شدید اور سنگین تجارتی بحرانوں سے بچانے میں مدد دے گی۔

سودی نظام کی خرابی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اگر قرض لینے والے کو بھاری شرح سے نفع ہو تو سود کا مستقل رجحان یہ ہے کہ وہ مالدار صنعتکاروں کے مفاد کے لئے کام کرے، کیونکہ یہ صنعتکار جو بینکوں سے کروڑوں اربوں روپے کے قرضے لیتے ہیں وہی اس دولت سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو غریب عوام بینکوں میں اپنی بچتوں کی صورت میں جمع کراتے ہیں، اور جب ان صنعتکاروں کو اس سرمایے کے ذریعے تجارت کرنے سے عظیم فائدہ ہوتا ہے، تو وہ عوام الناس کو اس میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح سے سود دیتے ہیں، اور پھر اس سود کو بھی وہ دوبارہ اپنی پیداوار کے اخراجات کی مد میں قیمتوں میں اضافہ کر کے واپس وصول کر لیتے ہیں، مجموعی سطح پر اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ مالدار لوگ کھاتہ داروں (Depositors) کو کچھ ادا نہیں کرتے، کیونکہ وہ سود جو وہ مالیاتی اداروں کو ادا کرتے ہیں وہ صارفین جیسے عوام الناس سے انکی پیداواری قیمت میں اضافہ کر کے واپس لے لیتے ہیں۔

پیدائش دولت پر مشارکہ اور سود کے اثرات کا تقابل

اگر پیدائش دولت پر سود اور مشارکہ کے اثرات کا تقابل کیا جائے تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سود کے مقابلہ میں مشارکہ کا نظام پیدائش دولت پر مثبت اثرات مرتب کرتا ہے، کیونکہ معاشیات میں بصیرت رکھنے والوں سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ تجارت، صنعت، زراعت، اور تمام نفع آور (Productive) کاموں کی معاشی بہتری یہ تقاضا کرتی ہے کہ جتنے لوگ کاروبار میں شریک ہوں وہ سب اس کاروبار کے فروغ سے دلچسپی رکھتے ہوں، اور ان سب کی یہ دلی خواہش ہو کہ ہمارا کاروبار بڑھتا اور چڑھتا رہے، کاروبار کے نقصان کو وہ اپنا ہی نقصان خیال کریں تاکہ ہر نقصان کے اندیشہ پر اجتماعی جدوجہد کریں، اور کاروبار کے نفع کو اپنا نفع سمجھ کر اسے پروان چڑھانے میں پوری پوری طاقت خرچ کریں، آج کل کی معاشیات میں اس جذبہ کو ذاتی منافع کا محرک (Motive of persnal profit) کہا جاتا ہے۔

اس نقطہ نظر سے اگر غور کیا جائے تو مشارکہ اور سود میں انتہائی واضح فرق نظر آتا ہے، کیونکہ مشارکہ میں ہر شریک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ منافع زیادہ سے زیادہ ہو اور نقصان بالکل نہ ہو، اس لئے کہ شرکت میں نفع اور نقصان دونوں میں تمام شرکاء حصہ دار ہوتے ہیں، اس میں یہ نہیں ہوتا کہ کاروبار میں خواہ نفع ہو یا نقصان قرض دینے والے کو ایک متعین رقم مل جائے، بلکہ اس میں ہر شریک کو نفع باہمی طے کردہ نفع کی شرح سے دیا جاتا ہے، اور نقصان ہر شریک کا سرمایہ کے تناسب سے ہوتا ہے، اس کے برخلاف سود میں یہ ہوتا ہے کہ سود خوار سرمایہ دار کو صرف اپنے نفع سے سروکار ہوتا ہے، اس بات کی اسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ کاروبار ترقی پر ہے یا تنزلی پر، اس میں نفع ہو رہا ہے یا نقصان؟ وہ مسلسل اپنے دئے ہوئے روپے پر منافع (سود) وصول کرتا رہتا ہے اور بسا اوقات اسکی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاروبار کو جتنا ہو سکے دیر میں نفع ہو تاکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا نفع بڑھتا رہے، اور جب مقروض اپنا قرضہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو وہ سود کی شرح میں اضافہ کردے، اسی بناء پر اگر کاروبار کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو تو تاجر اپنی پوری محنت اور کوشش اس کے دفعیہ پر صرف کرے گا، لیکن سرمایہ دار پر اس وقت تک کوئی اثر نہ ہوگا جب تک کاروبار کے بالکل دیوالیہ ہو جانے کا اندیشہ نہ ہو، اس غلط طریقۂ کار نے سرمایہ اور محنت کے درمیان ہمدردانہ رفاقت کے بجائے ایک سو فیصد خود

غرضی کا تعلق قائم کردیا ہے، جس کے نتیجہ میں بے شمار نقصانات جنم لیتے ہیں، ان میں سے چند ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں:

ا۔ سرمایہ کا ایک خطیر حصہ صرف اس وجہ سے کام میں نہیں لگتا کہ اس کا مالک شرح سود کے بڑھنے کا انتظار کرتا ہے، باوجودیکہ اس کے بہت سے مصارف موجود ہوتے ہیں، اور بے شمار افراد کسی کاروبار کی تلاش میں سرگرداں ہوتے ہیں، چنانچہ اسکی وجہ سے ملکی تجارت وصنعت کو بڑا نقصان پہونچتا ہے، اور عام قوم کی معاشی حالت بھی گر جاتی ہے۔

۲۔ چونکہ ساہوکار کو زیادہ شرح سود کا لالچ ہوتا ہے اس لئے وہ اپنے سرمایہ کو کاروبار کی واقعی ضرورت اور طبعی مانگ کے اعتبار سے نہیں لگاتا، بلکہ وہ محض اپنی اغراض کو سامنے رکھ کر سرمایہ کو روکنے یا لگانے کا فیصلہ کرتا ہے، چنانچہ اگر سرمایہ دار کے سامنے دو صورتیں ہوں کہ یا تو وہ اپنا سرمایہ کسی فلم کمپنی میں لگائے یا بے خانماں لوگوں کے لئے مکانات بنواکر انہیں کرایہ پر دے، اور اسے فلم کمپنی کی صورت میں نفع کی امید زیادہ ہو تو وہ یقیناً فلم کمپنی میں سرمایہ لگائے گا، بے خانماں افراد کی اسے کوئی پرواہ نہ ہوگی، ظاہر ہے کہ یہ ذہنیت عمومی واجتماعی مفاد کے لئے کس قدر خطرناک ہوگی۔

ان مذکورہ بالا خرابیوں کے علاوہ اور بہت سی برائیاں ہیں جو سودی نظام کے تحت پیدائش دولت سے پیدا ہوتی ہیں۔

ضمیمہ نمبرا۔ (Appendix)

مرابحہ (Mark up)

مرابحہ کاذکر بھی اس مقالے میں بار بار آرہا ہے، اس لئے اسکا مختصر تعارف اس ضمیمے میں کرایا جارہا ہے۔

مرابحہ کی تعریف: مرابحہ یہ ہے کہ آدمی کسی چیز کو فروخت کرتے وقت اس بات کی صراحت کردے کہ میں نے یہ چیز لاگت (Cost) پر اتنے نفع کے ساتھ فروخت کی، (البتہ اگر لاگت کے تناسب سے نفع کی صراحت نہ ہو تو یہ عقد فقہی اصطلاح کے مطابق "مساومہ" کہلاتا ہے)۔ خریدار کی جانب قیمت کی ادائیگی نقد، ادھار یا قسطوں میں کی جاسکتی ہے، لیکن اگر ادائیگی ادھار یا قسطوں میں کی جائے تو اسے مرابحۂ مؤجلہ کہا جائے گا۔

مرابحہ اصلاً کوئی طریقہ تمویل (Mode of Financing) نہیں ہے بلکہ یہ خرید و فروخت کی ایک شکل ہے، لہذا اسکے صحیح طریقہ سے منعقد ہونے کے لئے اکثر وہی شرائط ہیں جو عام خرید و فروخت (مساومہ) کی شرائط ہیں، البتہ شرائط ان سے مختلف اور مرابحہ کے ساتھ مخصوص ہیں، لہذا جب دونوں قسم کی شرائط پائی جائیں گی تو مرابحہ صحیح ہوگا، اب ذیل میں پہلے عام خرید و فروخت کی شرائط ذکر کی جائیں گی، اسکے بعد مرابحہ کے ساتھ مخصوص شرائط ذکر کی جائیں گی۔

خرید فروخت کی عمومی شرائط:

۱۔ ایجاب و قبول پایا جانا، خواہ وہ کلام، تحریر، عمل یا اشارہ کی شکل میں ہو۔

۲۔ عاقدین کا مکلف (یعنی عاقل بالغ یا سمجھ دار بچہ) ہونا۔

۳۔ مبیع (Sold goods) کا موجود، قابل فروخت (مال متقوم)، قابل ملکیت، قابل قبضہ اور متعین ہونا۔

۴۔ قیمت کا معلوم اور متعین ہونا۔

۵۔ بیع (خرید فروخت) کو مستقبل کی طرف منسوب نہ کیا جانا، یعنی مثال کے طور پر اگر بائع خریدار سے یکم رمضان کو یہ کہے کہ فلاں چیز میں نے تمہیں پندرہ رمضان کو فروخت کی، اور خریدار نے اسے قبول کرلیا تو یہ بیع فاسد ہوگی۔

۶۔ بائع کے ضمان (Risk) میں آنے کے بعد فروخت کرنا، ضمان میں آنے سے قبل کسی چیز کو فروخت کرنا صحیح نہیں ہے، اور ضمان میں آنے کے لئے اس چیز پر حقیقتاً یا حکماً قبضہ کرنا ضروری ہے۔

البتہ غیر منقولہ اشیاء کے ضمان میں آنے کے لئے قبضہ ضروری نہیں ہے بلکہ صرف سودا (عقد) مکمل ہونے کے بعد بھی اسے فروخت کیا جاسکتا ہے۔

مرابحہ کی شرائط:

۱۔ بیع مرابحہ میں خریدار کو سابقہ قیمت یا لاگت کا علم ہونا ضروری ہے۔

۲۔ بیع مرابحہ میں سابقہ قیمت یا لاگت کے بیان میں بطور خاص دیانت داری ضروری ہے یہاں تک کہ اگر بائع (Seller) نے خود مال ادھار خریدا تھا، تو اسکی صراحت بھی ضروری ہے۔

خریدار پر اگر یہ واضح ہوگیا کہ مرابحہ میں بائع نے سابقہ قیمت بیان کرنے میں کوئی خیانت کی ہے تو خریدار کو یہ سودا ختم کرنے کا اختیار ہوگا۔

بائع نے ایک چیز خریدنے کے بعد اس پر رقم خرچ کی جس سے اسکی قدر و قیمت میں اضافہ ہوگیا تو وہ اس چیز پر مزید خرچ ہونے والی رقم قیمت میں شامل کرسکتا ہے، اب بائع یوں کہے کہ یہ چیز مجھے اتنے میں پڑی، یہ نہ کہے کہ یہ میں نے اتنے میں خریدی۔

۳۔ مرابحہ کے نفع کا تعین عاقدین کی باہمی رضامندی سے ہوگا، نفع کی رقم اصل قیمت یا لاگت سے زائد تخمینہ کرکے (Lump sum) یا فیصد کے حساب سے دونوں طرح مقرر کی جاسکتی ہے، اسی طرح نفع کی رقم نقد ادائیگی کی

صورت میں کم اور ادھار کی صورت میں زیادہ بھی مقرر کی جاسکتی ہے، البتہ بوقت عقد کسی ایک کی تعیین ضروری ہے۔

۴۔ مرابحہ میں فروخت کی جانے والی چیز کے لئے یہ ضروری ہے کہ خریدار نے اسے اسی شرط کے ساتھ بائع کو فروخت نہ کیا ہو کہ وہ دوبارہ اسے فروخت کردیگا، ورنہ یہ بیع عینہ بن جائے گا جو ناجائز ہے۔

مرابحہ کے ذریعہ تمویل

مرابحہ اصل میں کوئی طریقہ تمویل یا سودی قرضہ نہیں ہے بلکہ یہ خرید و فروخت کی ایک شکل ہے لہذا بوقت عقد اسمیں خرید و فروخت کی عمومی اور مرابحہ کی خصوصی پیچھے بیان کردہ شرائط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مرابحہ کے ذریعے تمویل کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تمویلی ادارہ(Financier) اس چیز کو خود خرید کر قبضہ کرلے جس کی خریداری کے واسطے صارف(Client) رقم لینے آیا تھا، البتہ مالیاتی ادارہ خریداری کرنے کے لئے کسی تیسرے شخص کو اپنا وکیل بناسکتا ہے، اسی طرح اس بات کی بھی اجازت ہے کہ اگر وہ چاہے تو اس صارف کو خریداری کے واسطے اپنا وکیل بنادے جو قرضہ لینے آیا تھا تاکہ وہ اس تمویلی ادارہ کی طرف سے اس کا وکیل بن کر وہ سامان خرید کر اسپر قبضہ کرے، پھر وہ صارف اس تمویلی ادارہ سے وہی چیز ادھار قیمت(Deferreod price) پر خرید لے، لہذا پہلے وہ صارف اسکا وکیل ہوگا اور اسوقت اسکی حیثیت شریعت میں ایک امین کی طرح ہے، اور خریدی ہوئی چیز مالیاتی ادارہ کی ملکیت میں اور اسی کے ضمان(Risk) میں ہوگی، لہذا اس صورت میں اگر بالفرض وہ چیز کسی ناگہانی حادثہ میں تلف یا خراب ہوجائے تو صارف اسکا نقصان ادا کرنے کا ذمہ دار نہ ہوگا، البتہ جب صارف اس سے وہ چیز خریدے تب ملکیت اور ضمان صارف کا ہوجائے گا۔

خلاصہ یہ کہ مرابحہ کی تمویل میں درج ذیل ترتیب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے:

۱۔ صارف اور تمویلی ادارہ ایک عمومی معاہدہ کریں کہ جس میں ادارہ اس چیز کو صارف کو فروخت کرنے اور خریدار اسے قیمت یا لاگت سے زائد نفع پر خریدنے کا وعدہ کریں۔

۲۔ ادارہ صارف کو اس چیز یا سامان کی خرید اور قبضہ کرنے کا وکیل بنادے، اور وکالت کے معاہدہ پر دونوں دستخط

کر دیں۔

۳۔ صارف اس سامان کو ادارہ کی طرف سے خریدے، اور اس پر اسکے وکیل کی حیثیت سے قبضہ کرے۔

۴۔ خریداری اور قبضہ کے بعد صارف اس ادارہ کو اسکی اطلاع کر دے اور پھر اسے اس ادارہ سے خریدنے کی پیشکش (Offer) کرے۔

۵۔ ادارہ اس پیشکش کو قبول کر لے، کہ اب اس سامان کی ملکیت اور قبضہ صارف کی طرف منتقل ہو جائے۔

مندرجہ بالا پانچوں باتوں کی ترتیب (Sequince) ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

اسلام میں تمویل کا بہترین راستہ مشارکہ یا مضاربہ ہے، لہذا غیر سودی بینکاری میں انہیں استعمال کیا جائیگا لہذا مرابحہ کو مندرجہ بالا اصولوں کے مطابق تمویل کے لئے استعمال کرنے کی اجازت مخصوص حالات میں مجبوری کے تحت ہی ہوگی، البتہ مرابحہ کے ذریعہ تمویل سے متعلق چند اہم مسائل ذکر کئے جاتے ہیں۔

۱۔ ادارہ اس سامان کی قیمت کی ادھار کے عوض کسی رہن (گروی) رکھنے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

۲۔ رقم کی ادائیگی کے معاہدہ میں یہ بھی طے کیا جا سکتا ہے کہ اگر صارف نے فلاں تاریخ تک رقم ادا نہ کی تو وہ اس سے زائد اتنی رقم کسی خیراتی فنڈ میں دینے کا ذمہ دار ہوگا۔

۳۔ ادارہ کے سامان کو مرابحہ فروخت کرنے کا اور صارف کے اس سے خریدنے کا معاہدہ قضاء بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں مرابحہ کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے، ورنہ دلائل اور تفصیلات کے لئے فقہ کے ابواب یا اس موضوع پر لکھی جانے والی کتب کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ضمیمہ نمبر ۲۔ (Appendix)

اجارہ (Leasing)

اگرچہ ,,اجارہ،، اس مقالے کا موضوع نہیں ہے، البتہ مشارکہ کو ذریعہ تمویل کے طور پر تجویز کرتے ہوے متعدد مقامات پر تمویلی اجارہ (Financing Lease) کا ذکر آیا ہے، لہذا اس ضمیمہ میں اسکے طریق کار کا مختصر تعارف پیش کیا جارہا ہے۔

اجارہ (Leasing) جسے اردو زبان میں کرایہ داری بھی کہا جاتا ہے اسکی تعریف یہ ہے کہ کسی چیز کے منافع کو روپے یا منافع کے عوض دینا، جیسے مکان یا مشینری کے منافع ایک معینہ کرایہ پر دینا۔

کرایہ داری میں چند درج ذیل اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں:

۱۔ موجر (Lessor) جو شخص کوئی چیز کرایہ پر دے۔

۲۔ مستاجر (Lessee) جو شخص اس چیز کو کرایہ پر لے۔

۳۔ مستاجر (Leased) جو چیز کرایہ پر دی جائے۔

۴۔ معقود علیہ وہ منافع جس پر کرایہ کا عقد کیا جائے۔

۵۔ اجرت (Rent) وہ کرایہ جس پر کرایہ داری کا معاملہ کیا گیا ہے۔

۱:۔ اجارہ کا عقد بیع کی مانند ہے، لہذا عاقدین کی اہلیت، ایجاب و قبول اور مجلس عقد شرائط صحت اور تنفیذ میں وہی تفصیلات ہیں جو بیع میں ذکر کی جاتی ہیں، البتہ بعض باتوں میں بیع (خرید و فروخت) اور اجارہ میں فرق پایا جاتا ہے، جو درج

ذیل ہے:

ا۔ اجارہ میں چیز کے بجائے منفعت پر عقد کیا جاتا ہے، لہذا اس منفعت کا متعین اور مخصوص ہونا اور منفعت کا موجود ہونا ضروری ہے۔

۲۔ اجارہ عموماً محدود مدت کے لئے ہوتا ہے، لہذا اس میں وقت کی تعیین ضروری ہے۔

۳۔ اجارہ میں مستاجر (Lessee) اس چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ مالک موجر (Lessor) ہی رہتا ہے، لہذا ملکیت سے متعلق تمام ذمہ داریاں مالک یعنی موجر (Lessor) پر عائد ہوتی ہیں، البتہ اس کے منافع کے استعمال کی ذمہ داریاں مستاجر (Lessee) برداشت کرے گا، مثلاً اگر مکان کرایہ پر دیا جائے تو پراپرٹی ٹیکس موجر (Lessor) کے ذمہ ہوگا، البتہ بجلی اور پانی کا بل مستاجر (Lessee) کے ذمہ ہوگا۔

۴۔ اجارہ پر دی جانے والی چیز کا اصل مالک چونکہ موجر (Lessor) ہی رہتا ہے، مستاجر صرف اس کے مخصوص منافع کا مالک ہوتا ہے، لہذا ایسی کسی چیز کو کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا، جس کے منافع استعمال کرنے کے لئے اسے ختم، صَرف یا تبدیل کرنا پڑے، چنانچہ نقد رقم کھانے پینے کی چیزیں، پانی، تیل وغیرہ کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا، لہذا اگر ایسی چیز کرایہ پر دی جائے تو دی جانے والی چیز قرض اور حاصل ہونے والا کرایہ سود شمار ہوگا۔

۵۔ اجارہ کو مستقبل کی تاریخ کے ساتھ معلق کرنا صحیح ہے، مثلاً یہ کہنا کہ میں نے تمہیں آنے والے مہینے کی دس تاریخ سے اپنا مکان کرایہ پر دیا، اس طرح کہنے سے کرایہ کا عقد لازم ہو جائے گا، اور مذکورہ تاریخ سے پہلے اسے ختم کرنا صحیح نہیں ہے، البتہ اجرت یا کرایہ کا حساب اسی تاریخ سے شروع ہوگا۔

۶۔ یہ جائز ہے کہ مختلف مدتوں کے لئے کرایہ کی شرح مختلف مقرر کی جائے، مثلاً اگر زید نے عمر کو کوئی مکان پانچ سال کے لئے کرایہ پر دیا اور یہ کہا کہ پہلے سال کا کرایہ دو ہزار روپے ماہانہ ہوگا، اور آئندہ ہر سال دس فیصد (۱۰٪) کرایہ بڑھتا رہے گا، تو یہ صورت جائز ہے۔

۷۔ کرایہ پر دی جانے والی چیز کا مالک موجر ہی رہتا ہے، اور وہ چیز مستاجر (Lessee) کے ہاتھ میں مالِ امانت کی

طرح ہے لہذا اگر وہ غیر دانستہ طور پر یا بغیر کوتاہی کے ضائع ہو جائے، یا اس میں نقصان ہو جائے تو وہ موجر کا سمجھا جائے گا، لیکن اگر وہ مستاجر کے غلط استعمال کی وجہ سے تلف یا ضائع ہوا تو نقصان کی تلافی مستاجر (Lessee) کے ذمے ہو گی۔

اجارہ کا بطور تمویل (Financing) استعمال

یہ بات یاد رہے کہ اجارہ بذات خود کوئی تمویل کا طریقہ (Mode of Financing) نہیں ہے بلکہ یہ اور عقود کی طرح سادہ عقد ہے، جس میں کسی چیز کی منفعت مخصوص کرایہ پر دی جاتی ہے، لیکن موجودہ دور میں بہت سے مالیاتی ادارے (Financial Instutions) اسے سودی کاروبار کے متبادل کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، اور اس کو تمویلی اجارہ (Financial Lease) کہا جاتا ہے، یہ عام کرایہ داری (Operating Lease) کے عقد سے مختلف ہوتا ہے، اسکا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ جب کمپنی کو جامد اثاثوں (Fixed assets) مثلاً مشینری وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے تو کمپنی بینک سے قرض لے کر خود مشینری خریدنے کے بجائے بینک یا مالیاتی ادارے کو یہ کہتی ہے کہ یہ مشینری خرید کر ہمیں کرایہ پر دیدو، چنانچہ بینک یا مالیاتی ادارہ اسے خرید کر کرایہ پر دیدیتا ہے، اس دوران مشینری کا مالک بینک یا مالیاتی ادارہ ہی ہوتا ہے، اور کمپنی (مستاجر/Lessee) ہونے کی حیثیت سے اسے استعمال کرتی رہے گی، ایک مخصوص مدت کیلئے کرایہ طے کرتے وقت عموماً یہ ملحوظ رکھا جاتا ہے کہ اتنی مدت کے لئے اگر یہ رقم قرض دی جائے تو اس پر جتنا سود مل سکتا تھا وہ وصول ہو جائے، جب یہ مدت گذر جاتی ہے، اور کرایہ کی شکل میں مشینری کی قیمت بمعہ معینہ شرح سود ادا ہو جاتا ہے، تو اب یہ معینہ مشینری خود بخود کمپنی (مستاجر) کی ملکیت بن جاتی ہے، یہ بات کبھی معاہدہ میں لکھی ہوتی ہے اور کبھی لکھی تو نہیں ہوتی، البتہ معروف یہی ہے۔

عموماً قرض کے بجائے اجارہ کا طریقہ اختیار کرنے کے دو فائدے اضافی حاصل ہوتے ہیں:

۱۔ اسکی وجہ سے بعض اوقات ٹیکس سے بچت ہو جاتی ہے۔

۲۔ قرض کی وصول یابی کے لئے اجارہ کا طریقہ قرض دینے کے بہ نسبت زیادہ باعث اعتماد ہے، کیونکہ اجارہ میں

مشینری موجر (Lessor) کی ملکیت ہوتی ہے اور اس پر اسی کا لیبل لگا رہتا ہے، اگر بالفرض رقم نہ ملی تو موجر کو کوئی خطرہ نہیں اس لئے کہ مشینری اسکی ملکیت میں برقرار ہے۔

البتہ یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ آج کل عموماً اجارے (Conventional Financial Leasing) کے معاملات شرعی اجارہ سے مختلف ہیں، کیونکہ ان میں شرعی لحاظ سے اجارہ کی حقیقت موجود نہیں ہوتی اس لئے کہ یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ اجارہ میں جو بھی چیز کرایہ پر دی جاتی ہے وہ موجر کی ملکیت اور رسک میں رہتی ہے، مگر موجودہ دور میں تمویلی اجارہ (Financial Lease) میں عملاً ایسا نہیں ہوتا، اور موجر (Lessor) اس مشینری کی کسی قسم کی ذمہ دار نہیں لیتا، یہاں تک کہ اگر کسی ناگہانی آفت یا حادثہ میں وہ مشینری تباہ ہو جائے تب بھی مستاجر (Lessee) کرایہ دیتا رہتا ہے اور موجر کا تعلق صرف اتنا ہوتا ہے کہ مستاجر کی طرف سے عدم ادائیگی کی صورت میں موجر اسے فروخت کر کے اپنا قرضہ وصول کر سکتا ہے، لہٰذا آج کل عموماً حقیقی اجارہ نہیں ہوتا اصل مقصد تو سود پر قرض دینا ہی ہوتا ہے مگر ٹیکس سے بچت اور دوسرے عوامل کی وجہ سے یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقت میں موجر مشینری کا مالک اور ذمہ دار بن کر کرایہ داری کا معاملہ کرے تو جائزہ ہے، اور کرایہ مقرر کرتے وقت اس بات کو مد نظر رکھا جائے کہ مشینری کی قیمت بمعہ کچھ اضافی نفع کے وصول ہو جائے تو اس میں بھی شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، مگر معاہدے میں یہ شرط نہیں لگانی چاہیے، کہ مدت اجارہ ختم ہونے پر مشینری خود بخود مستاجر کی ملکیت بن جائے گی، کیونکہ ورنہ اس میں صفقۃٌ فی صفقۃٍ یعنی ایک سودے پر دوسرا سودا کرنا لازم آجائے گا، البتہ سابقہ شرط کے بغیر مدت ختم ہونے کے بعد اسکی طرف ملکیت منتقل کرنے کی گنجائش ہے، اور اس کے لئے بینک سے وعدہ بھی لیا جا سکتا ہے، اس وعدہ کی حیثیت کیا ہوگی؟ اسکی مکمل تفصیل ہم پیچھے تیسرے باب میں "شرکت متناقصہ" کے بیان میں ذکر کر چکے ہیں۔

اصطلاحات

(Glossary)

اباحت: جس بات کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہو۔

اجارہ و اقتناء: تمویلی اجارہ (This term refers to a mode of financing adopted by Islamic banks. It is a contract under which the Islmamic banks finaces equipment, a building or other facility for the client against an agreed rental together with an undrtaking from the client to purchase the equipment or the facility. The rental as well as the puchase price is fixed in such a manner that the bank gets back its principal sum alomg with some profit which is usually determined in advance.)۔

اجارہ(Leasing): کرایہ داری۔

اجتہاد: فقہی مسائل پر غور و خوض۔

اجیر(Employee): جو اجرت پر کام کرے، مزدور۔

استصناع(Manufacturing Contract): آرڈر دے کر کوئی چیز بنوانا۔

اشارۃ النص: جو حکم یا معنی کسی عبارت سے متکلم کا براہ راست مقصود نہ ہوں، لیکن عبارت ہی کے کسی حصے سے ضمنی طور پر سمجھ میں آرہے ہوں، مثلاً قرآن میں ہے کہ: ﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ﴾ الخ۔ یعنی جس کے لئے بچہ جنا ہے، (یعنی باپ) اسکو بچے کی والدہ کو نان و نفقہ احسن طریقہ پر دینا ہے، اس نص سے بطور اشارۃ کے یہ بات

سمجھ میں آگئی کہ بچہ کے نسب کی نسبت والد کی طرف ہو گئی، کیونکہ لفظ "مولود لہ" میں بچہ کی نسبت باپ کی طرف کی گئی ہے۔

المعروف کالمشروط: جو بات مشہور ہوتی ہے وہ مشروط کی طرح ہوتی ہے، یہ فقہ کا ایک اصول ہے۔

ایجاب(Offer): معاملہ کرتے وقت جو پیشکش کی جائے۔

ائمہ اربعہ: چار امام یعنی امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل (رحمہم اللہ)

ائمہ ثلاثہ: تین امام یعنی امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد (رحمہم اللہ)

اُجرت (Wages, Fare): کرایہ، تنخواہ، مزدوری۔

بائع(Vender/ Seller): فروخت کنندہ، فروخت کرنے والا۔

بیع باطل: بیع کے صحیح ہونے کی اگر شرائط نہ پائی جائیں تو وہ بیع باطل ہوتی ہے۔ اسکا حکم یہ ہے کہ خریدار چیز کا اور بائع قیمت کا مالک نہیں بنتا اور دونوں کیلئے چیز اور قیمت کا استعمال ناجائز ہے۔

بیع (Sale): کسی چیز کو کسی قیمت کے عوض فروخت کرنا۔

بیع فاسد: بیع فاسد یہ ہے کہ جو بیع اصل کے اعتبار سے جائز ہو لیکن وصف کے اعتبار سے جائز نہ ہو۔ مثلاً بیع کی تمام شرائط پائی جا رہی تھیں، لیکن کسی شرط فاسد سے اسمیں خرابی پیدا ہو گئی۔

تجارتی سود(Commercial Intrest): تجارتی مقاصد کیلئے حاصل کردہ سودی قرضہ پر سود کا لین دین۔

تصفیہ: حساب کتاب صاف کرنا۔

تعدی: جان بوجھ کر نقصان پہونچانا، تلف کرنا یا دست درازی کرنا۔

تعلیق: کسی معاملے کو کسی شرط پر موقوف کر دینا کہ شرط پائی جائیگی تو معاملہ ہوگا ورنہ نہیں۔

ثمن(Price): مبیع کے عوض خریدار جو چیز یا قیمت ادا کرنے کا معاہدہ کرے۔

جہالت(Uncertainty): نا معلوم ہونا۔

حدِّ قذف: جھوٹی تہمت لگانے پر جو حد جاری کی جائے۔

حرام(Prohibited): ناجائز۔

حلال(Permissible): جائز۔

حنبلی: امام احمد بن حنبل کے مقلد (پیروکار)۔

حنفی: امام ابو حنیفہ نعمان کے مقلد (پیروکار)۔

حوالہ: مقروض کا اپنے ذمہ سے قرض کا مطالبہ ساقط کر کے دوسرے کے ذمہ مطالبہ لازم کرنا، یا ایک شخص اپنی ذمہ داری دوسرے کی طرف منتقل کر دے، جیسے ہنڈی(Bill or exchange)، چیک ڈرافٹ، یا مثال کے طور پر زید بکر کا مقروض ہے، زید نے بکر سے کہا کہ میرا قرض عمر ادا کرے گا، اس لئے آپ عمر سے وصول کر لیں اور عمر نے اسے قبول کر لیا۔

خلطۃ الشیوع: چند افراد کے اموال مشترک ہوں، اور انمیں سے ہر ایک کا حصہ نصاب زکاۃ تک نہ پہونچتا ہو، البتہ مجموعی لحاظ سے نصاب تک پہونچ جاتا ہو۔

خلیط، ج: خلطاء: شریک۔

خیار الشرط: کسی چیز کو خریدتے وقت کسی فریق کا یہ شرط لگانا کہ اتنے دن تک اسے یکطرفہ طور پر بیع کے باقی رکھنے یا نہ رکھنے کا اختیار ہو گا۔

خیار عیب: خرید کردہ چیز کو کسی عیب کے نکلنے کی وجہ سے واپس کرنے کا اختیار۔

درہم: پرانے زمانہ کا چاندی کا سکہ، متحدہ عرب امارات کا سکہ۔

دینار: پرانے زمانہ کا سونے کا سکہ، کویت اور بحرین کا سکہ۔

دَین(Dues, payables): واجب الاداء رقم یا چیز۔ جمع: دیون۔

راس المال(Capital): سرمایہ۔

رب المال(Invester): سرمایہ کار۔

ربا الفضل(Usury of trade): ہم جنس وزنی اشیاء کے باہم تبادلے میں کم بیشی۔

ربا النسیہ(Usuary of debt): ادھار کے معاملے پر سود۔

رہن (Mortgage): گروی رکھنا۔

سوائم: چرنے والے جانور۔

سیفِ محلّی بالذہب: سونے سے آراستہ تلوار۔ فقہ کی اصطلاح میں منطقہ مفضضہ ایک مسئلہ کا عنوان ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی چیز مال ربوی اور مال غیر ربوی سے مرکب ہو، اور اسے خالص مال ربوی سے فروخت کیا جائے مثلاً سونے کے ایک ہار میں موتی بھی لگے ہوئے ہیں تو اس میں موتی غیر ربوی اور سونا ربوی چیز ہے۔

شافعی: امام محمد بن ادریس شافعی کے مقلد (پیروکار)۔

شرکتِ عقد(Partnership on contract): دو یا کئی افراد ایجاب و قبول کے ذریعہ اپنے اپنے حقوق و اموال متحد کر دیں۔

شرکتِ تقبل: دونوں شریک اکٹھے مزدوری کریں اس سے جو اجرت حاصل ہو اس کو برابر تقسیم کر لیں۔

شرکتِ عقد: دو یا زیادہ اشخاص کا باہمی معاہدہ کے ذریعہ کسی مال یا اس کے منافع میں شریک ہونا، اسے شرکت عقود اور شرکت معاملہ بھی کہتے ہیں۔

شرکتِ عنان: ہر شریک دوسرے کا وکیل ہو کفیل نہ ہو، نیز مال اور منافع میں بھی برابر نہ ہو۔

شرکتِ مفاوضہ: ہر شریک دوسرے کا وکیل اور کفیل ہو، نیز دونوں مال، نفع، تصرف اور مذہب میں بھی برابر ہوں۔

شرکتِ ملک: وراثت یا خریداری کے ذریعہ چند افراد کا ایک چیز میں شریک ہونا، نیز اسے شرکت املاک بھی کہتے ہیں۔

شرکتِ وجوہ: دونوں شریک بغیر پیسے روپے کے اپنے اثر ور سوخ پر خرید و فروخت کریں، اور نفع نقصان اسی حساب سے تقسیم کرلیں جس حساب سے شرکت کی ہو۔

شیخین: امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف، (رحمہا اللہ)۔

شُفعہ (Right of Pre-emption): پڑوسی یا شریک کا زمین یا مکان کے کسی حصہ کے خریداری کے حق کا دعویٰ کرنا۔

صاحبین: امام ابو یوسف اور امام محمد (رحمہا اللہ)۔

صدقہ (Charitable giving): خیرات۔

صرف (Money Exchange): زر کو زر کے عوض فروخت کرنا۔

صَرفی سود (Consumer Intrest): استعمال اور ضرورت کیلئے حاصل کردہ سودی قرضہ۔

ضامن (Guarontor/ boilor): ضمانت (Guarantee) دینے والا۔

طرفین: امام ابو حنیفہ اور امام محمد (رحمہا اللہ)۔

عاقد یا عاقدین (Contractor): معاملہ کرنے والے ایک فرد کو عاقد اور دونوں کو عاقدین کہا جاتا ہے۔

عامل(Active):کام کرنے والا۔

عبارۃ النص: جو بات کسی عبارت سے متکلم کا مقصود ہو، مثلاً ﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ﴾ یہ آیت بطور عبارت النص تعداد ازواج اور اباحت نکاح بتلا رہی ہے۔

عروض (Goods):اجناس، سامان ۔

عقد بیع (Contract of Sale): خرید و فروخت کا معاہدہ۔

عقد (Transaction / Contract):جب دو انسان آپس میں کوئی معاملہ کرتے (Transaction) کرتے ہیں، تو وہ عقد کہلاتا ہے۔

عینہ(Buy back):سودی مقاصد حاصل کرنے کے لئے مصنوعی بیع کرنا جس کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔

عین: ج:اعیان، نقد، سامان۔

غبن فاحش: یہ فقہ کی ایک اصطلاح ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز اسکی عام بازاری قیمت سے اتنی کم قیمت میں بیچی جائے یا اتنی زیادہ قیمت میں خریدی جائے کہ اس تجارت کے لوگ عام طور سے اتنی کمی بیشی کو اصول تجارت کے خلاف سمجھتے ہوں۔

غرر(Uncertainty, hazard):دھوکہ، ابہام۔

فاسد(innalid, irregular):خراب۔

فتویٰ(Religious decree):شرعی حکم۔

فسخ(Dissoloution):ختم کرنا۔

فقہ(Islamic Jurisprudence):اسلامی قانون کا علم۔

قبول(Acceptance): پیشکش کے بعد دوسرے شخص کی رضامندی۔

قرضِ حَسَنہ(Intrest free loan): غیر سودی قرضہ۔

قرض(Loan, debt): قرضہ۔

قیمت(Rate): کسی چیز کا بازار میں رائج نرخ۔

قِراض /مقارضہ: مضاربت کا دوسرا نام۔

کفالت رکفالہ(Guarantee): ایک شخص پر کسی چیز کی ذمہ داری ہو اور کوئی دوسرا شخص یہ ذمہ داری لے لے کہ اگر اصل شخص نے ذمہ داری ادا نہ کی تو میں کروں گا یا کسی شخص قرض یا شئے کے مطالبہ میں ایک کی ذمہ داری کے ساتھ دوسرے کو بھی ذمہ دار بنانا۔

کفیل(Guarantier): جو شخص ذمہ داری لے۔

مال متقوم: وہ مال جسکی عرف یا شریعت میں کوئی قیمت ہو۔

مالکی: امام مالک بن انس کے مقلد (پیروکار)۔

مبیع(Sold goods): فروخت شدہ، فروخت کی گئی چیز۔

متعارف: مشہور و معروف۔

متعاقدین (Contractor): معاملہ کرنے والے ایک فرد کو متعاقد اور دو کو متعاقدین کہا جاتا ہے۔

مجلس عقد(Place of Contact): جس جگہ پر عقد کیا جاتا ہے اسے مجلس عقد کہتے ہیں۔

مجہول(Unknown, Indistinct): مبہم، غیر واضح۔

محاقلہ: کھیت میں لگی ہوئی گندم کو کٹی ہوئی صاف گندم کے بدلہ اندازے سے فروخت کرنا۔ یہ ناجائز ہے۔

مرابحۂ مؤجلہ : کسی چیز کی قیمت خرید یا لاگت بیان کر کے نفع کے ساتھ ادھار میں فروخت کرنا یعنی قیمت کی ادائیگی کسی مقررہ تاریخ پر کی جائے۔

مرابحہ (Sale on cost plus / mark up): چیز کی قیمت خرید یا لاگت بیان کرنے کے بعد مزید کچھ نفع کے اضافہ کے ساتھ اسے فروخت کرنا۔

مرجر (Merger): دو یا زیادہ تجارتی فرمیں مل کر ایک مشترک تجارتی ادارہ بنائیں، اور پھر کاروبار کریں، اسکو مرجر کہتے ہیں۔

مزارعۃ / مزارعت: وہ عقد جسمیں زمین کی پیداوار میں کچھ حصہ کاشتکار کیلئے مقرر کر کے زمین کاشت کرائی جائے۔

مساقاۃ / مساقات: جسمیں ایک شخص باغ کی تمام قسم کی نگرانی دوسرے شخص سے کرائے، اور پھل دونوں میں ایک مقررہ مقدار میں تقسیم ہو۔

مساومہ: (Bargaining Sale) چیز کو کسی بھی متفقہ قیمت کے عوض فروخت کرنا۔

مستاجر (Lessor): جو شخص کرایہ پر چیز لے۔

مستاجر (Lessee, Hired): جو چیز کرایہ پر لی جائے۔

مشاع: ایک ایسی مشترک شئے جس میں شریک کا حصہ متعین اور ممتاز نہ ہو۔

مشتری (Buyer): خریدار۔

مضاربت / مضاربۃ: ایک شخص سرمایہ لگائے، دوسرا اس سرمایہ سے تجارت کرے۔

معقود علیہ: وہ منافع جسپر عقد کیا جائے۔

معلق: (Contingent, Conditional) مشروط۔

مقارضہ / قراض: مضاربت کا دوسرا نام۔

مقایضہ (Barter): جنس کو جنس کے عوض فروخت کرنا۔

مقروض کو محیل، قرض خواہ کو محال، محال لہ، یا محتال لہ کہتے ہیں، اور جس نے اپنے ذمہ قرض لیا ہے اسے محال علیہ یا محتال علیہ کہتے ہیں، اور قرض کو محال بہ کہتے ہیں۔

مکفول عنہ (Guaranteed): جسکی طرف سے کفالت کی جائے۔

منطقۂ مفضضہ: چاندی کا پٹکا۔ فقہ کی اصطلاح میں منطقہ مفضضہ ایک مسئلہ کا عنوان ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی چیز مال ربوی اور مال غیر ربوی سے مرکب ہو، اور اسے خالص مال ربوی سے فروخت کیا جائے مثلاً سونے کے ایک ہار میں موتی بھی لگے ہوے ہیں تو اس میں موتی غیر ربوی اور سونا ربوی چیز ہے۔

منقولہ، منقول (Move able , Transferable): قابل انتقال۔

موجر (Employer): جو شخص اجرت پر کسی سے کام لے۔

موکل: جو شخص کام سپرد کرے۔

موہوب لہ: جسے ہدیہ دیا گیا۔

مہایاۃ: دونوں شریک اپنی اپنی مشترک ملکیت بر قرار رکھتے ہوئے آپس میں فائدہ اٹھانے کا کوئی طریقہ باہمی رضامندی سے طے کرلیں۔

مُدّ عجوہ: ایک مد عجوہ کھجور۔ فقہ کی اصطلاح میں مد عجوہ ایک مسئلہ کا عنوان ہے، وہ یہ ہے کہ کوئی چیز مال ربوی اور مال غیر ربوی سے مرکب ہو، اور اسے خالص مال ربوی سے فروخت کیا جائے مثلاً سونے کے ایک ہار میں موتی بھی لگے ہوے ہیں تو اس میں موتی غیر ربوی اور سونا ربوی چیز ہے۔

مؤجل: ادھار۔

نصاب: نصاب زکوۃ، جسمیں زکوۃ فرض ہو۔

نفع(Profit): فائدہ۔

نقد(Cash): سونا چاندی، روپیہ۔

واہب: ہدیہ دینے والا۔

ودیعت/ ودیعہ(Safe keeping): امانت۔

وقف(Trust): اصل چیز کو اپنی ملکیت میں رکھتے ہوئے اسکے منافع خیرات کرنا۔

وکالت(Agency): کوئی کام دوسرے کے سپرد کرنا، قائم مقام بنانا۔

وکیل(Agent, attorney): نائب

ہبہ(Gift): ہدیہ

آجر(Entreprenuer): جو شخص اجرت پر کام کرے۔

کتابیات

(BIBLIOGRAPHY)

ا

ابراہیم الفاضل، شرکۃ العنان، مکتبۃ الاقصی عمان، ۱۴۰۳ھ۔

ابن البزاز (الامام حافظ الدین) محمد بن محمد، البزازیۃ علی ہامش الفتاوی الہندیۃ ۹۰۲-۹۵۴، مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ

ابن العربی، محمد بن عبداللہ، ۵۴۳ھ، احکام القرآن، مکتبۃ السعادہ مصر ۱۳۱۹ھ۔

ابن القیم، محمد بن ابی بکر الجوزیہ ۷۵۱ھ، إعلام الموقعین، مصر، اداۃ الطباعۃ المنیریہ۔

ابن المفلح، الفروع للمقنع، شرح المبدع، ۱۳۸۹ھ۔

ابن المنذر، محمد بن ابراہیم النیسابوری ۳۱۹ھ، الاجماع، دار طیبہ، الریاض ۱۴۰۲ھ۔

ابن الہمام، (الامام) کمال الدین محمد بن عبدالواحد السیواسی ، فتح القدیر شرح الہدایہ، ۷۰۰-۷۷۴ مکتبہ الحلوانی، ۱۴۰۳ھ، المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ

ابن تیمیہ: احمد بن عبدالحلیم ۷۲۸ھ، مجموع الفتاوی، مطابع الریاض ۱۳۸۳ھ۔

ابن تیمیہ، احمد بن عبدالحلیم ۷۲۸ھ، الاختیارات القطعیہ من فتاوی ابن تیمیہ۔

ابن تیمیہ، (أبو العباس) تقی الدین أحمد بن عبدالحلیم، مجموعۃ الفتاوی لابن تیمیۃ ۶۶۱: ۷۲۸ دار الکتب الحدیثیۃ مکۃ المکرمۃ۔

ابن تیمیہ، (أبو العباس) تقی الدین أحمد بن عبد الحلیم، الفتاوی الکبری،

ابن جریر، عبد الرحمٰن بن ابی بکر ۹۱۱ھ، الدر المنثور۔

ابن جریر، محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ، جامع البیان، مصر، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۵ھ۔

ابن حجر، احمد بن علی الشافعی المکی ۸۵۲ھ، تحفۃ المحتاج۔

ابن حجر، احمد بن علی الشافعی المکی ۸۵۲ھ، فتح الباری، بیروت دار المعرفہ۔

ابن حزم، علی بن احمد ۴۵۶ھ، المحلی، ادارۃ الطباعۃ المفیرہ، مصر ۱۳۴۷ھ۔

ابن حزم، علی بن احمد المحلی ۴۵۶ھ، مراتب الاجماع، توزیع دار الباز مکۃ المکرمہ، دار الکتب العلمیہ۔

ابن رجب، ابو الفرج عبد الرحمٰن ۷۹۵ھ، القواعد فی الفقہ الاسلامی، دار المعرفہ، بیروت۔

ابن سعد، محمد بن سعد ۲۳۰ھ، طبقات، دار بیروت، بیروت ۱۳۷۷ھ۔

ابن قاضی، بدر الدین، جامع الفصولین، اسلامی کتب خانہ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔

ابن قدامہ، عبد الرحمٰن بن محمد شمس الدین بن قدامہ المقدسی ۶۸۲ھ، الشرح الکبیر علی المغنی، بیروت، دار الکتاب العربی۔

ابن قدامہ، عبد اللہ بن احمد ۶۲۰ھ، الکافی بیروت، المکتب الاسلامی ۱۴۰۲ھ۔

ابن قدامہ، موفق الدین ۳۳۴ھ، المنتقی علی مختصر الخرقی۔

ابن قدامہ، موفق الدین ۳۳۴ھ، و شمس الدین بن قدامہ المقدسی ۶۸۲ھ، المغنی مع الشرح الکبیر، دار الکتب العلمیہ بیروت۔

ابن قدامۃ، (أبو محمد) عبد اللہ بن أحمد بن محمد المقدسی، المغنی، مکتبۃ الریاض السعودیۃ ۱۴۰۳ھ

ابن کثیر، عماد الدین ابن کثیر، التفسیر لابن کثیر ۵۹۳ھ، لاہور۔

ابن مردویہ۔

ابن مفلح، المبدع، المکتب الاسلامی۔

ابن نجیم، زین الدین، البحر الرائق شرح کنز الدقائق ۷۹۲ ایچ ایم سعید کمپنی ۱۳۸۹ھ۔

ابن نجیم، زین الدین، الاشباہ والنظائر، ادارۃ القرآن، کراچی۔

ابوداود سجستانی، سلیمان بن الأشعث بن اسحاق، سنن أبی داود مع تعلیق محمد بن عبد الحمید، مطبوعات اسلامیہ۔

ابو غدہ، الدکتور عبد الستار، المضاربۃ و القراض و التطبیقات المعاصرۃ، ابحاث موتمر المصرف الاسلامی الثانی، موسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۷ھ۔

ابو غدہ، ڈاکٹر عبد الستار: الاجوبۃ الشرعیۃ فی التطبیقات المصرفیۃ، دلۃ البرکۃ۔

ابو غدہ، ڈاکٹر عبد الستار، خوجہ، پروفیسر عز الدین: فتاوی ندوات البرکۃ (۱۹۸۱۔ ۱۹۸۷)، مجموعۃ دلۃ البرکۃ، قطاع الاموال، شرکۃ البرکۃ للاستثمار والتنمیۃ۔

ابو غدہ، ڈاکٹر عبد الستار، وخوجہ، پروفیسر عز الدین: فتاوی الہیئۃ الشرعیۃ للبرکۃ و فتاوی ہیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ، شرکۃ التوفیق و شرکۃ الامین۔ ناشر: مجموعۃ دلۃ البرکۃ، قطاع الاموال، شرکۃ البرکۃ للاستثمار والتنمیۃ۔

ابو غدہ، دکتور عبد الستار، الاجوبہ الشرعیہ فی الطبقات المصرفیہ۔

ابو غدہ، دکتور عبد الستار، المضاربۃ والقراض والتطبیقات المعاصرۃ، مؤسسۃ الرسالۃ۔

ابو غدہ، دکتور عبد الستار، فتاوی الہیہ الشرعیہ للبرکۃ، الطبعۃ الأولی۔

ابو یوسف، امام ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم ۱۸۲ھ، کتاب الخراج، القاہرۃ، المطبعۃ السلفیۃ ۱۳۵۲ھ۔

اتاسی، محمد خالد الاتاسی، شرح مجلۃ الأحکام، مکتبہ اسلامیہ، کوئٹہ ۱۴۰۳ھ۔

احمد غنیم، احمد بن غنیم النفراوی المالکی، الفواکہ الدوانی علی رسالۃ أبی محمد عبداللہ القیروانی، دمشق، دارالفکر۔

احمد محي الدین احمد حسن، عمل شرکات الاستثمار الاسلامیہ فی السوق العالمیہ، بنک البرکۃ الاسلامی للاستثمار، البحرین۔

احمد بن حنبل، مسند، قرص الحاسوب صخر، مصر (C.D. of Encyolopaedia of Hadith by Sakhr Software)۔

ادارۃ تحقیقات اسلامی اسلام آباد، ربااور مضاربت، ادارۃ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد۔

اردو دائرۃ معارف الاسلامیہ پنجاب

اردو دائرۃ معارف الاسلامیہ حیدر آباد دکن

افغانی، (حضرت مولانا) شمس الحق، سرمایہ دارانہ واشتراکی نظام کا اسلامی معاشی نظام سے موازنہ، من علماء القرن الخامس عشر، مکتبہ حکمت اسلامیہ

اقبال سہیل، حقیقۃ الربا۔

الاستاذ سعید العالم، اللمحات فی احکام الشرکات، مخطوطہ ۱۹۹۴ء۔

البخاری، (أبو عبداللہ) محمد بن اسماعیل ۱۳۲-۱۸۹ھ، الجامع الصحیح، دارالکتاب بیروت، دارالکتب العلمیہ،

البزدوی (فخر الاسلام) علی بن محمد، أصول البزدوی مع أصول الکرخی، نور محمد کتب خانہ کراچی

الترمذي، (أبو عیسیٰ) محمد بن عیسی بن سورۃ، جامع الترمذی ۱۹۸-۲۵۲ھ، دارالفکر بیروت

التعلیق المیسر علی ملتقی الأبحر۔

التھانوی (حکیم الامت، مولانا) أشرف علی، بیان القرآن ۱۲۸۰=۱۳۶۲ دارالاشاعت کراچی

التھانوی (حکیم الامت ، مولانا) اشرف علی، امداد الفتاوی (ج: ۳) مکتبۃ دار العلوم کراچی

الجرجانی، (السید) شریف علی بن محمد، التعریفات، تہران ۱۳۰۶

الخوارزمی، (مولانا) جلال الدین السکرلانی، الکفایۃ شرح الہدایۃ مع فتح القدیر ۷۶۷ھ، المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ

الخیاط، عبد العزیز عزت، الشرکات فی الشریعۃ الإسلامیۃ والقانون الوضعی، دار النہضۃ العربیۃ بیروت ۱۴۰۷ھ۔

الدبو، ابراہیم فاضل یوسف، عقد المضاربۃ، مطبعۃ الارشاد، بغداد، ۱۹۷۳ء۔

الدکتور السید علی السید، الحصۃ بالعمل بین الفقہ الاسلامی والقانون الوضعی، ۱۹۷۳ء۔

الزبیدی، (محب الدین أبو الفیض) السید محمد مرتضیٰ، ۱۲۰۵ھ، تاج العروس من جواہر القاموس، الخیریہ مصر

الزرقاء، (الشیخ) أحمد بن محمد بن ابرہیم، شرح القواعد الفقہیۃ ، ایچ ایم سعید کمپنی ۱۴۰۲ھ

الزیلعی، (فخر الدین) عثمان بن علی، تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ، ۷۴۳ھ، مکتبۃ امدادیہ ملتان

السالوس، دکتور علی احمد، معاملاتنا المعاصرہ فی البنوک والنقود، محاضرات وندوات، (۸:۱)، دار الحرمین الدوحۃ قطر ۱۹۸۳ء۔

السعدی، (أبو) جیب، القاموس الفقہی لغۃ واصطلاحا (عربی)، من علماء القرن الخامس عشر، مطبعۃ المدنی القاہرہ

الشرکۃ، قرص فقہ المعاملات، شرکۃ صخر لبرامج الحاسب، (Fiqhul Muamlaat, C.D. Sakhr Software Co 1996).

الشیبانی، (الإمام) محمد بن الحسن، المبسوط ۱۰۹۸، ادارۃ القرآن کراچی

الفتاوی الشرعیہ فی المسائل الاقتصادیہ، بیت التمویل الکویتی ۱۹۸۵ء۔

القرضاوی، دکتور یوسف، الحلال والحرام فی الاسلام۔

القرطبی: أبوالولید محمد بن أحمد بن رشد القرطبی، بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد، مکتبۃ الکلیۃ، الأزہریۃ، ۱۳۸۶ھ۔

القشیری، (أبوالحسین) مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم مع الترقیم والتحقیق لفواد عبدالباقی ۱۴۰۷ھ دارالکتاب بیروت

المرزوقی، الدکتور صالح بن زابن، "شرکۃ المساہمۃ فی النظام السعودی"، جامعہ ام القری، ۱۴۰۶ھ۔

المرغینانی: (شیخ الاسلام برہان الدین ابوالحسن) علی بن عبدالجلیل أبو بکر الرشدانی، الہدایۃ، مکتبہ امدادیہ، ملتان۔

المواق (أبو عبداللہ) محمد بن یوسف بن أبی القاسم العبدری، التاج والإکلیل لمختصر خلیل مع مواہب الجلیل ، دار صادر بیروت

النبہانی، الشیخ تقی الدین ، الشرکات فی الفقہ الاسلامی۔

النووی، (الحافظ أبوزکریا) محی الدین بن شرف النووی، شرح المہذب المسمی بالمجموع، دارالفکر، بیروت۔

النووی، (الحافظ أبوزکریا) محی الدین بن شرف النووی، المنہاج مع مغنی المحتاج، مطبعۃ العاصمۃ القاہرۃ ۱۹۷۶ء دار إحیاء التراث بیروت۔

النووی، (الحافظ أبوزکریا) محی الدین بن شرف النووی، روضۃ الطالبین وعمدۃ المفتین ۹۰۲-۱۹۵۴ المکتب الاسلامی بیروت

النبہانی، الشیخ تقی الدین، الشرکات فی الفقہ الإسلامی۔

الوجیز فی القانون التجاری۔

الوسی، محمد بن عبداللہ ۱۲۷۰ھ، تفسیر روح المعانی (۳: ۴۳)، لاہور، المکتبہ الرشیدیہ ۱۴۵۱ھ۔

الہیثمی، (حافظ) نورالدین علی بن أبی بکر الہیثمی، کشف الاستار عن زوائد البزار، موسسۃ الرسالۃ بیروت۔

الہیثمی، (حافظ) نورالدین علی بن أبی بکر الہیثمی، مجمع الزوائد و منبع الفوائد دارالکتاب بیروت

امینی (محمد) تقی، اسلام اور جدید دور کے مسائل، قدیمی کتب خانہ کراچی۔

اندلسی، ابو حیان محمد بن یوسف ۷۵۴ھ، البحر المحیط۔

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (ج:۴)۔

انصاری، الشیخ زکریا، اسنی المطالب عن روض الطالب۔

ب

بابرتی، اکمل الدین محمد بن محمود ۷۸۶ھ، شرح العنایہ علی الهدایہ، کلکتہ، بابو منشی رام ۱۲۴۷ھ۔

بابرتی، أکمل الدین محمد بن محمود، العقد المنظم للحکام فی ما یجری بین أیدیھم من العقود ۷۸۶ھ، کوئٹہ۔

بجیرمی، حاشیۃ البجیرمی علی شرح منہج الطلاب، المکتبہ الاسلامیہ ترکی۔

برہان پوری، علاء الدین علی المتقی بن حسام الدین الہندی البرہانفوری، کنز العمال فی سنن الأقوال والافعال، مؤسسۃ الرسالۃ۔

بغوی، امام ابن ابی الدنیا ابو محمد حسین بن مسعود البغوی، بیروت، المکتب الاسلامی، دار الفکر۔

بک، أحمد ابراہیم، المعاملات الشرعیۃ المالیۃ، من علماء القرن الخامس عشر

بلاذری، احمد بن یحیی ۲۷۹ھ، فتوح البلدان، بیروت، دار الکتب العلمیہ۔

بن منظور، جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور، لسان العرب ۶۳۰=۷۱۱، المعرف العلمیہ، لاہور۔

بنوری، محمد یوسف، معارف السنن، مکتبہ العربیۃ الاسلامیہ، کراچی۔

بیہقی، احمد بن حسین البیہقی ۴۵۸ھ، السنن الکبری، دار الخلفا الکتۃ الاسلامی، ملتان، نشر السنۃ، کویت۔

بیہقی، الجوہر النقی حاشیۃ البیہقی۔

بہوتی، منصور بن یونس البہوتی ۱۰۴۶ھ، منتہی الارادات، دار الفکر، بیروت۔

بہوتی، منصور بن یونس ۱۰۵۱ھ، الروض المربعہ، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۴۰۸ھ۔

بہوتی، منصور بن یونس ۱۰۵۱ھ، کشاف القناع عن متن الاقناع، عالم الکتب، دار الفکر، بیروت۔

ت

تاج ودکتور عبد الرحمٰن، شرکات التامین من وجہ نظر الشریعہ الاسلامیہ ۱۳۱۰-۱۳۹۴ھ، مجمع البحوث الاسلامیہ الازہر ۱۴۰۵ھ مکتبہ السلام لاہور۔

تفتازانی، سعد الدین التفتازانی الشافعی، التلویح (۲۰۲-۷۷۵)

تقی الدین ابوالحسن علی بن عبد الکافی، فتاوی السبکی ۷۵۶ھ، دار احیاء التراث بیروت

ج

جزائری، عبد الرحمٰن الجزائری، کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، لاہور، محکمہ اوقاف ۱۹۷۱ء۔

جصاص، احمد بن علی ۳۷۰ھ، احکام القرآن، مصر ۱۳۴۷ھ، مطبع لاہور، سہیل اکیڈمی۔

جمال، دکتور غریب، المصارف والأعمال المصرفیہ، المکتبۃ الرشیدیۃ کوئٹہ۔

جمال، دکتور غریب، المصارف وبیوت التمویل۔

ح

حافظ مزی، موسوعۃ اطراف الحدیث

حاکم، محمد بن عبد اللہ الحاکم ۴۰۵ھ، مستدرک، بیروت، دار الکتب العلمیہ ۱۴۱۱ھ۔

حسن النجفی، معجم المصطلحات التجاریۃ الفنی، مطبعۃ الرشادیہ بغداد۔

حصکفی، محمد علاء الدین بن الشیخ علی الإمام بجامع بنی اُمیہ، الدر المنتقی فی شرح الملتقی ۷۴۳ مطبع عامرہ

حصکفی، محمد علاء الدین الحصکفی بن الشیخ علی الإمام بجامع بنی اُمیہ، الدر المختار شرح تنویر الابصار مع رد المحتار۔

حطاب، ابو عبد اللہ محمد بن محمد، ۹۵۴ھ، تحریر الکلام فی مسائل الالتزام، دار الغرب الاسلامی، بیروت

حماد، اَحمد بن حماد بن عبد العزیز الحماد، الربا وخطرہ و سبیل الخلاص منہ، دار الفکر دمشق ۱۳۳۱ھ۔

حموی، احمد بن محمد ۱۰۹۸ھ، الأشباہ والنظائر غمز عیون البصائر، لبنان، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۴۰۵ھ۔

خ

خرشی، محمد المالکی، شرح الخرشی علی مختصر سیدی خلیل۔

خفیف، (پروفیسر) علی، الشرکات۔

خوجہ، الاستاذ عز الدین، قطاع الاموال، مجموعۃ دلۃ البرکہ۔

د

دار قطنی، علی بن عمر ۳۸۵ھ، سنن الدار قطنی، دہلی، مطبع الفاروقی۔

دارمی، عبد اللہ بن عبد الرحمٰن ۲۵۵ھ، سنن الدارمی، المدینۃ المنورۃ۔

داماد آفندی، شیخ زادہ عبد اللہ الرحمٰن بن الشیخ محمد بن سلیمان المعروف بداماد آفندی، مجمع الأنہر شرح ملتقی الأبحر، دار الطباعۃ، ۱۹۷۶ء۔

دبو، ابراہیم الدبو، عقد المضاربۃ، جامعۃ أم القری مکۃ المکرمۃ، ۱۳۹۳ھ

دردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الکبیر۔

دردیر، احمد بن محمد الدردیری ۱۲۰۱ھ، الشرح الصغیر علی اقرب المسالک (۳:۴۵۵) مصر، شرکۃ مکتبۃ، ومطبعۃ

مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۴۷ھ۔

دسوقی: حاشیہ۔

دکتور حسن یونس، الشرکات، مؤسسۃ الرسالۃ۔

دکتور عبدالعظیم، عقد المضاربۃ بین الشریعۃ والقانون، مکتبۃ الکلیات الأزہریۃ الأزہر ۱۴۰۳ھ۔

دکتور عبداللہ عبدالرحیم، موقف الشریعہ من المصارف الاسلامیہ المعاصرہ۔

دکتور فضل الحی، التدابیر الواقیہ من الربوا فی الاسلام ۱۴۸۲ھ، ادارۃ ترجمان اسلام ۱۳۹۴ھ۔

ڈ

ڈاکٹر عبدالعظیم، عقد المضاربۃ بین الشریعۃ والقانون، مکتبۃ الکلیات الازہریۃ، الازہر، ۱۴۰۳ھ۔

ڈپٹی نذیر احمد، الحقوق والفرائض۔

ر

رازی، امام محمد بن عمر الرازی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر، ایران۔

رستم باز، سلیم بن رستم باز اللبنانی، شرح المجلۃ، بیروت، دار التراث العربی۔

رشاد (شیخ) أحمد، بلاسود بینکاری، مکتبۃ تحریک مساوات

رشید رضا، محمد رشید رضا، تفسیر المنار (۱۱۶:۳)، مصر، مطبعہ المنار ۱۳۴۶ھ۔

رملی، محمد بن احمد الرملی ۱۰۰۴ھ، نہایۃ المحتاج، بیروت، احیاء التراث العربی۔

رملی، مغنی المحتاج۔

رہونی، حاشیۃ الرہونی علی شرح الزرقانی علی متن خلیل، المطبعۃ الأمیریۃ مصر، طبعۃ أولی ۱۳۰۶ھ۔

ز

زحیلی، وہبہ بن مصطفیٰ الزحیلی، نظریۃ الضرورۃ الشرعیۃ، بیروت، مؤسسہ الرسالہ ۱۴۰۲ھ۔

زحیلی، دکتور وھبہ، الفقہ الاسلامی وادلتہ، بیروت، دارالقلم۔

زیلعی، عثمان بن علی ۷۴۳ھ، تبیین الحقائق، مکتبہ امدادیہ، ملتان، ۷۴۳ھ۔

س

سرسید احمد خان، سید احمد بن میر تقی ۱۸۹۸ء، تفسیر القرآن، سلسلہ تصانیف احمد (۲۹۸:۳)، لاہور فضل الدین ککے زئی۔

سرخسی، محمد بن أحمد بن أبی سہل شمس الأئمہ الإمام الکبیر أبو بکر، المبسوط للسرخسی ۱۹۴ھ-۲۵۶ھ، إدارۃ القرآن کراچی،

سعدی أبی جیب، مؤسسۃ الاجماع فی الفقہ الاسلامی، طبع فی دار العربیہ، بیروت۔

سعدی، أبو جیب، القاموس الفقہی (عربی) لغۃ واصطلاحاً، مطبعۃ المدنی القاہرہ۔

سنہوری، عبدالرزاق بن احمد، الوسیط فی شرح القانون المدنی، بیروت، احیاء التراث العربی ۱۹۶۹ء۔

سیوطی، الإمام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر ۹۱۱ھ، الجامع الصغیر مصر، مکتبۃ مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۵۸ھ۔

سیوطی، الإمام جلال الدین عبدالرحمٰن بن ابی بکر ۹۱۱ھ، الأشباہ والنظائر، بقواعد وفروع فقہ الشافعیہ، تحقیق حامد الفقہی حلب مصر۔

سیوہاروی، (مولانا) حفظ الرحمٰن، اسلام کا اقتصادی نظام، مکتبہ امدادیہ ملتان

ش

شاشی، سیف الدین أبو بکر محمد بن أحمد القفال الشاشی، حلیۃ العلماء فی معرفۃ مذاہب الفقہاء، مؤسسۃ الرسالہ بیروت ۱۳۹۵ھ۔

شامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین الشامی تنقیح الفتاوی الحامدیہ، دار المعرفہ بیروت۔

شامی، محمد امین الشہیر بابن عابدین الشامی، ردالمحتار علی الدر المختار ۱۸۲۷ ایچ ایم سعید کمپنی، کراچی۔

شربینی، الخطیب مغنی المحتاج إلی معرفۃ معانی ألفاظ المنہاج للنووی۔

شرکۃ البرکۃ للاستثمار والتنمیہ السعودیہ۔

شوکانی، محمد بن علی الشوکانی ۱۲۵۵ھ، نیل الأوطار، مصر، مصطفیٰ البابی الحلبی ۱۳۴۷ھ۔

شیخ محمود أحمد، سود کی متبادل اساس، ادارہ ثقافت اسلامیہ

ص

صحیح، مناقب عبداللہ بن سلام۔

صدر الشریعۃ عبیداللہ بن مسعود المحبوبی، التوضیح شرح التنقیح ۶۲۰-۱۴۰۳ھ

صدیقی، ڈاکٹر نجات اللہ، شرکت ومضاربت کے شرعی اصول، اسلامک پبلیکیشنز لاہور۔

صدیقی، محمد نجات اللہ، غیر سودی بینکاری، اسلامک پبلیکشنز لاہور۔

صنعانی، محمد بن اسماعیل ۱۱۸۲ھ، سبل السلام شرح بلوغ المرام، دار إحیاء التراث العربی بیروت ۱۳۷۹ھ۔

ط

طبرانی، سلیمان بن احمد ۳۶۰ھ، الجامع الکبیر، ریاض، دار الصمیعی ۱۴۱۵ھ۔

طبری، محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ، تاریخ، القاہر مطبعۃ الاستقامۃ ۱۳۵۸ھ۔

طبری، محمد بن جریر الطبری ۳۱۰ھ، تفسیر، بیروت، دار الفکر ۱۴۰۵ھ۔

طحاوی، سید احمد بن محمد بن اسماعیل، حاشیۃ الطحاوی علی الدر المختار، ایچ ایم سعید کمپنی۔

ع

عبادی، رسالۃ دکتوراۃ فی الفقہ المقارن، کلیہ الشریعہ بجامعۃ الازہر۔

عبدالرحمٰن بن ابی بکر ۹۱۱ھ، لباب النقول، مصر، مصطفی البابی الحلبی۔

عبدالرحمٰن گیلانی، اسلام میں ضابطہ تجارت، من أبحاث مؤتمر المصرف الاسلامی الثانی۔

عبدہ، دکتور عیسی، العقود الشرعیہ۔

عثمانی: مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ، أحکام الأوراق النقدیۃ، مکتبہ دار العلوم کراچی، دار القلم، دمشق

عثمانی: مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ، تکملۃ فتح الملہم شرح صحیح المسلم، مکتبہ دار العلوم کراچی

عثمانی، مولانا محمد تقی، اسلام اور جدید معیشت و تجارت، ادارۃ المعارف، کراچی۔

عثمانی، العلامۃ ظفر احمدؒ، إعلاء السنن، ادارۃ القرآن، کراچی۔

عثمانی، مولانا محمد تقی عثمانی، فقہی مقالات، میمن اسلامک پبلیکشنز، کراچی۔

عثمانی، محمد تقی، بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ، مکتبہ دار العلوم کراچی، دار القلم دمشق،

عزیز الرحمٰن الدیوبندی، (مفتی اعظم)، عزیز الفتاوی، دار الاشاعت کراچی

عسقلانی، احمد بن علی ۸۵۲ھ، فتح الباری مصر، المطبعۃ البہیہ المصریہ ۱۳۴۸ھ۔

عطیہ، دکتور محمد کمال، محاسبۃ الشرکات والمصارف فی النظام الاسلام۔

علامہ ظفر أحمد عثمانی، (شیخ الاسلام)، أحکام القرآن إعلاء السنن أیضا إدارۃ القرآن

علی بن سلطان محمد القاری، مرقاۃ المصابیح، مکتبہ امدادیہ ملتان ۱۴۰۷ھ۔

علی حیدر، درر الحکام شرح مجلۃ الأحکام، بیروت، دار الکتب العلمیہ۔

علی، (شیخ) مبارک، تعارف معاشیات جدید برائے ایم اے، من شخصیات القرن الخامس عشر، کفایت اکیڈمی، کراچی

علیش مالکی، (الشیخ) محمد ۱۲۹۹ھ، منح الجلیل علی مختصر العلامۃ خلیل، دار الفکر بیروت

عمیم الاحسان، مجموعۃ قواعد الفقہ۔

غ

غانم بن محمد ۱۰۳۰ھ، مجمع الضمانات، مصر، المطبعۃ الخیریہ۔

غزالی، امام محمد بن محمد الغزالی، الوجیز، بیروت، دار المعرفہ ۱۳۹۹ھ۔

ف

فتاوی ہیئۃ الرقابۃ الشرعیۃ لبنک فیصل الاسلامی السودانی، بنک فیصل الاسلامی السودانی۔

فضل الرحمٰن، تجارتی سود، علیگڑھ یونیورسٹی۔

فیروز آبادی، امام علی بن یوسف فیروز آبادی، شیرازی، المہذب فی فقہ الامام الشافعی، مطبعہ عیسیٰ البابی الحلبی مصر۔

فیروز آبادی، تقی الدین ابو بکر الحصنی، کفایۃ الأخیار فی حل غایۃ الاختصار، منشورات العصریہ، بیروت۔

فہمی ہیکل، (الدکتور) عبدالعزیز، موسوعۃ المصطلحات الاقتصادیہ الاحصائیہ

ق

قاضی خان، (الإمام فخر الدین) الحسن بن منصور بقاضی خان ۵۹۲ھ، نول کشور ہند

قدوری، احمد بن محمد القدوری ۴۲۸ھ، متن الہدایہ، مکتبہ امدادیہ ملتان۔

قرارات مجمع الفقہ الاسلامی، اردو ایڈیشن، اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ ۱۹۹۲ء، میمن اسلامک پبلیشرز کراچی۔

قرارات مجمع الفقہ الاسلامی، مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی جدہ۔

قرضاوی، یوسف القرضاوی، فقہ الزکاۃ، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ۔

قزوینی، عبداللہ محمد بن یزید القزوینی ابن ماجہ، سنن ابن ماجہ مع التحقیق الترقیم لمحمد فواد عبدالباقی، مکتبہ اسلامیہ کوئٹہ۔

ک

کاسانی، علاء الدین ابو بکر بن مسعود ۵۸۷ھ، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، بیروت، موسسۃ التاریخ العربی ۱۴۱۷ھ، ایچ ایم سعید کمپنی۔

کلبی، محمد بن احمد جزری ۷۴۱ھ، القوانین الفقہیہ، بیروت، دار القلم ۱۹۷۷ء۔

ل

لامنس کا مقالہ، (Lommince) مکہ۔

لکھنوی، مولانا فتح محمد لکھنوی، عطر ہدایہ، دیوبند، مکتبہ نشر القرآن۔

م

مالک، امام مالک بن انس ۱۷۹ھ، الموطأ، جدہ، دار الشروق ۱۴۰۵ھ۔

مالک، مالک بن انس الأصبحی، روایۃ الامام سحنون التنوخی، المدونۃ الکبری، دار الکتب العلمیہ، بیروت۔

مجاہد لاہوری، وفاقی شرعی عدالت کا سود کے بارے میں فیصلہ، وفاقی شرعی عدالت پاکستان ۱۹۸۳۔

مجلات مجمع الفقہ الاسلامی، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ۔

مجلۃ الاحکام العدلیۃ، جماعۃ من العلماء، نور محمد کارخانہ تجارتِ کتب کراچی۔

مجلۃ لواء الاسلام۔

مجلۃ مجمع الفقہ الاسلامی، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ۔

مجموعۃ الفتاوی الشرعیۃ فی الاقتصاد، الصادرہ عن ندوات البرکۃ للاقتصاد الاسلامی (۱۹۸۱۔۱۹۹۰) دار الحرمین للطباعۃ، القاہرہ ۱۹۹۲۔

محامی، جلیل قسطو معجم المصطلحات التجاریہ الفنی، مؤسسہ الرسالہ بیروت۔

محلی، جلال الدین محمد بن احمد المحلی ۸۶۴ھ، شرح المنہاج، مصر، دار احیاء الکتب العربیہ۔

محمد اشرف، اسلامی تجارت کے بنیادی مسائل، مرکز الاقتصاد الاسلامی کراچی۔

محمد الحسینی، ابی بکر بن محمد الحسینی الحصی، کفایہ الاخبار، بیروت، منشورات المکتبۃ العصریہ۔

محمد بن ابراہیم موسیٰ، شرکات الاشخاص بین الشریعۃ والقانون، جامعۃ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ ریاض، ۱۴۰۱ھ۔

محمد بن ابراہیم، ملتقی الابحر، بیروت، مؤسسہ الرسالہ۔

محمد بن مکرم، لسان العرب، بیروت، داراحیاء التراث الاسلامی ۱۴۰۸ھ۔

محمد شفیع ۱۳۹۶ھ (مفتی اعظم پاکستان)، احکام القرآن، ادارۃ القرآن، کراچی۔

محمد کفایۃ اللہ (مفتی اعظم ہند)، کفایۃ المفتی ۲۰۲-۲۷۵،

مرداوی، علی بن سلیمان المرداوی ۸۸۵ھ، الانصاف، بیروت، داراحیاء التراث العربی ۱۴۰۰ھ۔

مرزوقی، صالح بن زابن، شرکۃ المساہمۃ فی النظام السعودی، جامعہ ام القری مکۃ المکرمۃ۔

مفتی محمد شفیع ۱۳۹۶ھ (مفتی اعظم پاکستان)، امداد المفتیین، مکتبہ دارالعلوم کراچی

مفتی محمد شفیع (مفتی اعظم پاکستان) ۱۳۹۶ھ مسئلہ سود، ادارۃ المعارف

مفتی محمد شفیع (مفتی اعظم پاکستان) ۱۳۹۶ھ، معارف القرآن ۹۰۲-۹۵۴ ، ادارۃ المعارف

منگلوری، مضامین سود مند ۸۹۔

منگلوری، مسئلہ سود اور مسلمانوں کا مستقبل۔

مودودی، ابوالاعلیٰ بن سید احمد حسن مودودی ۱۳۹۹ھ، سود، لاہور، مکتبہ جماعت اسلامی۔

مودودی، ابوالاعلیٰ بن سید احمد حسن المودودی ۱۳۹۹ھ، فتاوی الزکاۃ، جدہ، جامع الملک عبدالعزیز۔

ن

نجیب، محمد نجیب المطیع، تکملہ المجموع شرح المہذب، مطبعۃ الإمام، مصر۔

نظام الدین، الشیخ، رئیس جماعۃ، الفتاوی الہندیہ المعروف بالفتاوی العالمگیریہ، مکتبہ ماجدیہ کوئٹہ

ہ

ہمدانی۔

ھامش الشرح الصغیر علی اقرب المسالک۔
استاذ علی الخفیف، الشرکات۔

ENGLISH BOOKS AND PAPERS

A Practical Introduction to business, by Knooz and Fulmer, Revised Edition, 1978, Published by: Richard D, Irunin. I.N.C. Ontario.

A compendium of Legal Opinions On The Operations Of Islamic Banks - Muhabaha, Mudarabah, and Musharakah. Edited and translated by Yousuf Talal Delorenzo, Published by Institue of Islamic Banking and Insurance (IIBI), 1997, London, Uk.

Accounting Issues in Islamic Banking by IIBI.

An Introduction To Islamic Finance, Mufti Muhammad Taqi Usmani, Published by Idaratul Maarif, Karachi.

Circular of State Bank of Pakistan No.34/1984- P167.

Company law,by A.M. Chouhdry

Dictionary of Banking by F E Perry and G Klein, Pitman.

Economic Doctrines of Islsm,by Islamic publications Lahore.

Economics A Complete Course, by Don moynihan Brian Titley, Oxford,1989.

Economics business Decisions ,by F. Livessey, published by Mac donald and Evans, 1983.

Encyclopaedia of Islamic Banking and Insurance , Institute of Islamic Banking and Insurance (IIBI).

Fundamentals of Financial Management , by Ramesh K. S. Rao. Published at Macmillan Publishing Company,NY.and Collier Macmillan Publishers,

London.

Islam and the econimic challenge, M. Umer Chapra. the Islamic Foundation and the International Institute of Islamic Thought.

Islamic Banking an overview, edited by Daphne Buckmaster, IIBI.

Islamic Finance by Philip Moore, published by Al Barakah Investment and development co, Dallah Al Barakah Group.

Islamic Law of Business organization Partnerships, by Imran Ahsan Khan Niyazee, The International Institue of Islamic Thought and Islamic Research Institute. 1997.

Journey Towards Islamic Banking Edited by Shahzad Sheikh, IIBI.

Modelling Interest - Free Economy by Muhammad Anwar, the International Institute of Islamic Thought.

Modern Economic Theory By Kewal Krishan Dewett, Sham Lal Charitable Trust, Delhi.

Popular Oxford Dictionary of Business.

Popular Oxford Dictionary of Business, p. 393.

Profit and Loss Sharing, by Shah Rukh Rafi Khan,1997, Oxford University Press.

Profit and loss sharing, by Shahrukh Khan p.150. Published from Oxford University Press first Edition. 1987.

Profit and loss sharing, by Shahrukh Khan p.150. Published from Oxford University Press first adition. 1987.P.137.

Report of the council of Islamic Ideology on the Elimination of Intrest from the Economy, by Government of Pakistan. 1980 P.36, 37.

Shorter Ency clopaedia of islam.

The Modarabah Companies and Modarabah (floatat and control) ordenance, 1980. Published in the Gazette of Pakistan on 26 June, 1980, P.2.

The Musharakah Experience in Pakistan by Husain Lawai, former president of M.C.B. Pakistan. P.3. Chapter: 6, an article which is read by the writer in the first interxaticnal workshop in the subject of Musharakah Financing held in Malaysia in April 1996.

The New Encyclo paedia Britanica Edition by The University of chicago.

Theoratical Studies in Islamic Banking and Finance, Edited by Mohsin S Khan and Abbas Mirakhor,the institute for research and Islamic studies USA.

COMPUTER SOFTWARES AND CDs:

Encyclopaedia of BRITANICA CD 97.

CD of Encyclopaedia of Ahadith, by Sakhr Software Co, Egypt.

CD of Encyclopaedia of the verses of the Holy Quran. by Sakhr Software Co, Egypt.

CD of Encyclopaedia of Islamic Jurisprudence (Fiqhul Muamalat) by Sakhr Software Co, Egypt.

CD of Encyclopaedia of Americana 98.

CD of Data Bank, by Harvard Islamic Finance Information Program(HIFIP), HARVARD UNIVERSITY, USA.

CD of Encyclopaedia of Encarta.

Franklin Dictionary and thesaurus, Merriam - Webster.

اشاریہ ۔ ۱ (INDEX-1)
فہرستِ آیاتِ قرآنیہ

۱۔ سورۂ نساء آیت ۵:

﴿وَلاَ تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا﴾ ۔

۲۔ سورۂ نساء آیت ۶:

﴿وَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ﴾

۳۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۲۹:

﴿وَلاَ تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلٰى عُنُقِكَ وَلاَ تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَحْسُورًا﴾

۴۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۲۶:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهُ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلاَ تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا﴾

۵۔ سورۂ جمعۃ آیت ۶۲:

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾

۶۔ سورۂ نساء آیت ۲۹:

﴿لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ﴾

۷۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۶۷:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ﴾

۸۔ سورہ نساء آیت ۱۶۱:

﴿وَأَخْذِهِمُ الرِّبَا وَقَدْ نُهُوا عَنْهُ﴾

۹۔ سورۂ روم آیت ۳۹:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلاَ يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ﴾

۱۰۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۸۔۲۷۹:

﴿وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (......وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ﴾

۱۱۔ سورۂ روم آیت ۳۹:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِبًا لِيَرْبُوَا فِي أَمْوَالِ النَّاسِ فَلاَ يَرْبُوا عِنْدَ اللَّهِ﴾

۱۲۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۵:

﴿ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا﴾

۱۳۔ سورۂ نساء آیت ۲۹:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ﴾

۱۴۔ سورۂ زخرف آیت ۳۱:

﴿لَوْ لاَ نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾

۱۵۔ سورۂ ابراہیم آیت ۳۷:

﴿وَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ﴾

۱۶۔ سورۂ قریش آیت ۴:

﴿وَآمَنَهُمْ مِنْ خَوْفٍ﴾

۱۷۔ سورۂ عنکبوت آیت ۶۷:

﴿وَيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾

۱۸۔ سورۂ بقرۃ آیت ۱۲۵:

﴿وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِلنَّاسِ وَأَمْنًا﴾

۱۹۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۵:

﴿قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا﴾

۲۰۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۰:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوْا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾۔

۲۱۔ سورۂ بقرۃ آیت ۴۱:

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِآيَاتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾

۲۲۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۸:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ﴾

۲۳۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۹:

﴿وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾

۲۴۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۵:

﴿ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ إِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوْا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِنْ رَبِّهِ فَانْتَهٰى فَلَهُ مَا سَلَفَ وَ أَمْرُهُ إِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَأُولٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ﴾

۲۵۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۶:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيْمٍ﴾

۲۶۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۸۔۲۷۹:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِيْنَ فَإِنْ لَمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَإِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُؤُسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ﴾

۲۷۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۸۰:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلٰى مَيْسَرَةٍ وَأَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

۲۸۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۸۱:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾

۲۹۔ سورۂ آل عمران آیت ۱۳۰:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

۳۰۔ سورۂ روم آیت ۳۹:

﴿وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ رِّبًا لِيَرْبُوَا فِيْ أَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا آتَيْتُمْ مِنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾

۳۱۔ سورۂ نساء آیت ۱۶۰۔۱۶۱:

﴿فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبَاتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَأَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَأَكْلِهِمْ أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا﴾

۳۲۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۱۹:

﴿يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَا إِثْمٌ كَبِيْرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾

۳۳۔ سورۂ اسراء آیت ۸۵:

﴿وَمَا أُوْتِيْتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيْلًا﴾

۳۴۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۶:

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقَاتِ﴾

۳۵۔ سورۂ بقرۃ آیت ۱۷۳:

﴿إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللَّهِ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

۳۶۔ سورۂ مائدۃ آیت ۳:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ﴾

۳۷۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۷۵:

﴿أَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبَا﴾

۳۸۔ سورۂ کہف آیت ۱۹:

﴿فَابْعَثُوا أَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هَذِهِ إِلَى الْمَدِينَةِ فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَى طَعَامًا فَلْيَأْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ أَحَدًا﴾

۳۹۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۲۰:

﴿وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ﴾

۴۰۔ سورۂ زمر آیت ۲۹:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا رَجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا الْحَمْدُ لِلَّهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾

۴۱۔ سورۂ ص آیت ۲۴:

﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِنَ الْخُلَطَاءِ لَيَبْغِي بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَقَلِيلٌ مَا هُمْ﴾

۴۲۔ سورۃ نساء آیت ۱۲:

﴿فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ﴾

۴۳۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۳۱۔۳۲:

﴿اشْدُدْ بِهِ أَزْرِي وَأَشْرِكْهُ فِي أَمْرِي﴾

۴۴۔ سورۂ انفال آیت ۴۱:

﴿وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾

۴۵۔ سورۂ قریش آیت ۱۔۲:

﴿لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّیْفِ﴾

۴۶۔ سورۂ کہف آیت ۱۹:

﴿فَابْعَثُوْا اَحَدَکُمْ بِوَرِقِکُمْ﴾

۴۷۔ سورۂ طٰہٰ آیت ۳۲:

﴿وَاَشْرِکْهُ فِیْ اَمْرِیْ﴾

۴۸۔ سورۂ حج آیت ۷۸:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾

۴۹۔ سورۂ بقرۃ آیت ۱۸۵:

﴿یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾

۵۰۔ سورۂ جمعۃ آیت ۱۰:

﴿وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾

۵۱۔ سورۂ جاثیۃ آیت ۱۲:

﴿لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾

۵۲۔ سورۂ مائدہ آیت ۲:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾

۵۳۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۹:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَکُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾

۵۴۔ سورۂ جاثیہ آیت ۱۳:

﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِنْهُ﴾

۵۵۔ سورۂ مائدہ آیت ۹۶:

﴿أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهُ مَتَاعًا لَكُمْ وَلِلسَّيَّارَةِ﴾

۵۶۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۸۰:

﴿وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ﴾

۵۷۔ سورۂ نحل آیت ۸۰:

﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ بُيُوتِكُمْ سَكَنًا﴾

۵۸۔ سورۂ بقرۃ آیت ۲۳۳:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ﴾

۵۹۔ سورۂ نساء آیت ۳:

﴿فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ مَثْنَى وَثُلَاثَ وَرُبَاعَ﴾

اشاریہ۔ ۲ (INDEX 2)

فہرستِ احادیث مبارکہ

۱۔ ,,طلب كسب الحلال فريضةٌ بعد الفرائض،،

۲۔ إنك أن تذر ورثتك أغنياء خير من أن تذر هم عالة يتكففون الناس

۳۔ ,,نعم المال الصالح للرجل الصالح،،

۴۔ ,,اللهم أكثر ماله وولده وبارك له فيه،،

۵۔ ,,أمسك عليك بعض مالك فهو خير لك،،

۶۔ ,,امسكوا عليكم أموالكم ولا تفسدوها،،

۷۔ ,,امسكوا عليك أموالكم ولا تقسموها،،

۸۔ ,,الأكثرون هم الأقلون إلا من قال هكذا وهكذا وهكذا،،

۹۔ ,,عليكم بالتجارة فإن فيها تسعة أعشار الرزق،،

۱۰۔ ,,التاجر الصدوق الأمين مع النبيين والصديقين والشهداء،،

۱۱۔ ,,من قتل دون ماله فهو شهيد،،

۱۲۔ ,,التجار يحشرون يوم القيامة فجارا إلا من اتقى وبر وصدق،،

۱۳۔ ألا من ولي يتيما له مال فليتجر فيه ولا يترك حتى تأكله الصدقه

۱۴۔ ,,إن أربى الربا استطالة الرجل في عرض أخيه،،

۱۵۔ ,,کل قرض جرّ منفعةً فهو ربوا"

۱۶۔ ,,الذهب بالذهب مثلاً بمثلٍ، والفضة بالفضة مثلاً بمثلٍ، والتمر بالتمر مثلاً بمثلٍ، والبر بالبر مثلاً بمثلٍ، والملح بالملح مثلاً بمثلٍ، والشعير بالشعير مثلاً بمثلٍ فمن زاد أو أزداد فقد أربى، بيعوا الذهب بالفضة كيف شئتم يدًا بيدٍ، وبيعو الشعير بالتمر كيف شئتم يدًا بيدٍ"

۱۷۔ ,,لا تبيعوا الدرهم بدرهمين فإنى أخاف عليكم الرما" (والرما هو الربا:

۱۸۔ ,,الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعيروالتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ يدا بيد فمن زاد واستزاد فقد أربى،الآخذ والمعطى فيه سواء"

۱۹۔ ,,الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعيروالتمر بالتمر والملح بالملح مثلاً بمثلٍ سواءً بسواءٍ يدًا بيدٍ، فإذا اختلفت هذه الأجناس فبيعوا كيف شئتم إذا كان يدا بيد"

۲۰۔ ,,ولابأس ببيع الذهب بالفضة اكثرهما يدا بيدٍ،وأما نسيئة فلا، ولا بأس ببيع البر بالشعير والشعير اكثرهما يدا بيد وأما النسيئه فلا"

۲۱۔ ,,عن ابى سعيدؓ قال، جاء بلال الى النبى ﷺ بتمر برنى، فقال له النبى ﷺ: من أين هذا؟ قال: كان عندنا تمر ردیٔ فبعت منه صاعين بصاع، فقال: اوّه، عين الربا، عين الربا لا تفعل ولكن إذا أردت أن تشترى فبع التمر ببيع آخر ثم اشتر به"

۲۲۔ ,,عن أبى سعيد وأبى هريرة أن رسول الله ﷺ استعمل رجلا على خيبر فجاء ه بتمر جنيب فقال: أ كلُّ تمر خيبر هكذا؟ قال: لا والله يارسول الله، إنا لنأخذ الصاع من هذا بالصاعين، والصاعين بالثلاثة، فقال: لا تفعل، بع الجمع بالدراهم ثم ابتع بالدراهم جنيبًا۔ وقال فى الميزان مثل ذلك،،

۲۳۔ ,,من لم يترك المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله"

۲۴۔ ,,ألا أن كل ربا كان فى الجاهلية موضوع عنكم كله، لكم رؤس أموالكم لا تظلمون ولا تُظلمون، وأول ربا موضوع ربا العباس بن عبد المطلب كله"

۲۵۔ ,,عن ابن مسعودؓ قال: لعن رسول الله ﷺ آكل الربا وموكله"

۲۶۔ وفى روايه لمسلم وغيره: لعن ,,رسول الله ' آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: هم سواء"

۲۷۔ عن عبد الله بن مسعودؓ عن النبى ﷺ قال: ,,الربا بضع وسبعون بابًاوالشرك مثل ذلك"

۲۸۔ عن عبد الله بن مسعودؓ عن النبى ﷺ قال: ,,الربا ثلاث وسبعون بابًا ايسرها مثل آن ينكح الرجل أمه" رواه الحاكم

۲۹۔ عن عبد الله بن سلامؓ عن رسول الله ﷺ قال: ,,الدرهم يصيبه الرجل من الربا أعظم عند الله من ثلاثةٍ وثلاثين زنيةٍ يزنيها فى الإسلام" رواه الطبرانى

۳۰۔ عن عبد الله بن مسعودؓ عن النبى ﷺ قال: ,,ما أحد أكثر من الربا إلا كان عاقبة أمره إلى قلة"

۳۱۔ عن سمرة بن جندبؓ قال قال النبى ﷺ: ,,رأيت الليلة رجلين أتيانى فأخرجانى إلى أرض مقدسة فانطلقنا حتى أتينا على نهر من دم فيه رجل قائم، وعلى وسط النهر رجل بين يديه حجارة فأقبل الرجل الذى فى النهر فإذا أراد أن يخرج رمى الرجل بحجر فى فيه فرده حيث كان، فجعل كلما جاء ليخرج رمى فى فيه بحجر فيرجع كما كان فقلت: ما هذا الذى رأيته فى النهر قال: آكل الربا" رواه البخارى

۳۲۔ عن أبى هريرة عن النبى ﷺ قال: ,,اجتنبوا السبع الموبقات، قالوا يا رسول الله! وما هن؟ قال: الشرك بالله والسحر وقتل النفس التى حرم الله إلا بالحق وأكل الربا، وأكل مال اليتيم والتولى يوم الزحف وقذف المحصنات الغافلات المؤمنات" رواه البخارى ومسلم وأبوداؤد والنسائى

۳۳۔ عن ابن عباسؓ قال: "نهى رسول الله ﷺ أن تشترى الثمرة حتى تطعم وقال: إذا ظهر الزنا والربا

فی قریة فقد أحلوا بأنفسهم عذاب الله"، رواه الحاكم وقال صحيح الأسناد

۳۴۔ عن عمرو بن العاصؓ قال: سمعت رسول الله ﷺ يقول: "ما من قوم يظهر فيهم الربا إلا أخذوا بالسنة وما من قوم يظهر فيه الرشا إلا أخذوا بالرعب"، رواه أحمد

۳۵۔ عن أبی هريرةؓ قال رسول الله ﷺ: "رأيت ليلةً أسرى بی لما انتهينا إلى السماء السابعة فنظرت فوقی فإذا أنا برعدٍ وبرق وصواعق قال: فأتيت على قومٍ بطونهم كالبيوت فيها الحيات من خارج بطونهم، قلت: يا جبريل! من هؤلاء؟ قال: هؤلاء أكلة الربا"، رواه أحمد فی حديث طويل

۳۶۔ عن ابن مسعودؓ عن النبی ﷺ قال: "بين يدی الساعة يظهر الربا والزنا والخمر"، رواه الطبرانی

۳۷۔ عن القاسم بن عبد الواحد الوراق قال: رأيت عبد الله بن أبی أوفیؓ فی السوق فی الصيارفة فقال: يامعشر الصيارفة أ بشروا، قالوا: بشرك الله بالجنة بم تبشرنا يا محمد؟ قال: قال رسول الله ﷺ: "ابشروا بالنار"، رواه الطبرانی

۳۸۔ عن أبی هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ "ليأتين على الناس زمان لا يبقى منهم أحد إلا أكل الربا فمن لم يأكله أصابه من غباره"، رواه أبوداؤد وابن ماجه

۳۹۔ عن أبی أمامةؓ عن النبی ﷺ قال: "يبيت قوم من هذه الأمة على طعم وشرب، ولهو ولعب فيصبحوا قد مسخوا قردة وخنازير وليصيبنهم خسف وقذف حتى يصبح الناس، فيقولون: خسف الليلة ببنی فلان وخسف الليلة بدار فلان ولترسلن عليهم حجارة من السماء كما أرسلت على قوم لوط على قبائل فيها، وعلى دور لترسلن عليهم الريح العقيم التی أهلكت عادا على قبائل فيها وعلى دور بشربهم الخمر ولبسهم الحرير واتخاذهم القينات وأكلهم الربا وقطيعة الرحم نسيها جعفر"، رواه أحمد

۴۰۔ عن عمر بن الخطابؓ "أن آخر ما نزلت آية الربا وأن رسول الله ﷺ قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربا والريبة"، رواه ابن ماجه

۴۱۔ ”الربا وإن كثر فإن عاقبته إلى قل،،

۴۲۔ روى الشوكانى عن أبى عبيدة عن عبد الله قال: اشتركت أنا وعمار وسعد فيما نصب يوم بدر، قال: فجاء سعد بأسيرين، ولم أجيء أنا وعمار بشيء، قال الشوكانى: وهو (أى الحديث: حجة فى شركة الأبدان وتملك المباحات وهو دليل على صحة الشركة۔

۴۳۔ روى أحمد وأبوداود عن رويفع بن ثابت قال: إن كان أحدنا فى زمن رسول الله ﷺ ليأخذ نضو أخيه على أن له النصف مما يغنم ولنا النصف، وإن كان أحدنا ليطير له النصل والريش و للآخر القدح۔

۴۴۔ عن أبى هريرةؓ قال: قال رسول الله ﷺ: يقول الله تعالى: أنا ثالث الشريكين ما لم يخن أحدهما۔

۴۵۔ فإذا خان أحدهما صاحبه رفعها عنهما۔

۴۶۔ أخرج ابو يعلى والبيهقى عن النعمان بن بشيرؓ قال: قال رسول الله ﷺ: من خان شريكا فيما أئتمنه عليه واسترعاه له فإنه برئ منه۔

۴۷۔ عن النبى ﷺ : يد الله مع الشريكين ما لم يتخاونا، فإذا تخاونا محقت تجارتهما فرفعت البركة منها۔

۴۸۔ عن علىؓ: أن رجلين كانا شريكين على عهد رسول الله ﷺ، فكان أحدهما مواظبا على السوق والتجارة، وكان الآخر مواظبا على المسجد والصلاة خلف رسول الله ﷺ، فلما كان عند قسمة الربح قال المواظب على السوق فضلنى، فإنى كنت مواظبا على التجارة، وأنت كنت مواظبا على المسجد، فجاء إلى رسول الله ﷺ فذكر ذلك، فقال النبى ﷺ: للذى كان يواظب على السوق إنما كنت ترزق بمواظبة صاحبك على المسجد۔

۴۹۔ إن زيد بن أرقم والبراء بن عازب رضى الله عنهما كانا شريكين فاشتريا فضّة بنقد ونسيئة، فبلغ النبى ﷺ فأمرهما أن ما كان بنقد فأجيزوه، وما كان بنسيئة فردوه۔

۵۰۔ قال عليه الصلاة والسلام: ,,تفاوضوافإنه أعظم للبركة،،۔ وفى رواية أخرى: ,,فأوضوا فإنه أعظم للبركة،،۔

۵۱۔ قال النبى ﷺ: الربح على ما شرطا والوضيعة على قدر المالين۔

۵۲۔ إن السائب بن أبى السائبؓ قال للنبى ﷺ: كنت شريكا فى الجاهلية، فكنت خير شريك لا تدارينى ولا تمارينى، وفى رواية: انه كان شريك النبى ﷺ فى اول الاسلام فى التجارة فلما كان يوم الفتح قال: مرحبا باخى وشريكى لا تدارى ولا تمارى۔ وقال ابن عبد البر: كان شريك النبىﷺ فى اول الاسلام فى التجارة فلما كان يوم الفتح قال: مرحبا باخى وشريكى كان لا يمارى ولا يدارى۔

۵۳۔ عن حكيم بن حزام صاحب رسول الله ﷺ أنه كان يشترط على الرجل إذا أعطاه مالا مقارضة، يضرب له به أن لا تجعل مالى فى كبد رطبة ولا تحمله فى بحر ولا تنزل به بطن مسيل فإن فعلت شيئا من ذلك فقد ضمنت مالى۔

۵۴۔ حديث السفينة وهو قوله ﷺ: مثل للقائم على حدود الله والمداهن فيها كمثل قوم استهموا سفينة فى البحر، فأصاب بعضهم أعلاها، وبعضهم أسفلها، فكان الذين فى أسفلها يصعدون فيستقون الماء، فيضيقون على الذين فى أعلاها فقال الذين فى أعلاها: لا ندعكم تصعدون فتؤذوننا، فقال الذين فى أسفلها فإننا نبقها من أسفلها، فنستقى، فإن أخذوا على أيديهم فمنعوهم نجوا جميعا، وإن تركوا هم غرقوا جميعا۔ قال الترمذى حديث حسن صحيح۔

۵۵۔ يسروا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا۔

۵۶۔ يد الله على الجماعة

۵۷۔ ,,المومن للمومن كالبنيان يشد بعضه بعضا،،

۵۸۔ ,,الناس شركاء في ثلاثة: الماء والكلأ والنار،،۔

۵۹۔ ,,عن قيس بن أبي حازمؓ قال: أتى رجل رسول الله ﷺ بكبة شعر من الغنيمة، فقال: يا رسول الله هبهالي، فإنا أهل بيت نعالج الشعر، فقال عليه الصلاة والسلام: نصيبي منها لك،،

۶۰۔ ,,عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: سمعت النبي ﷺ وقد جاء ه رجل ومعه كبة من شعر فقال: أخذت هذه من المغنم لأصلح بردعة لي، فقال النبي ﷺ: ما كان لي ولبني عبد المطلب فهو لك،،۔

۶۱۔ ,,عن عمرو بن سلمة الضمريؓ قال: خرجنا مع رسول الله ﷺ حتى أتينا الروحاء، فرأينا حمار وحش معقورا، فأردنا أخذه، فقال رسول الله ﷺ دعوه فإنه يوشك أن يجيء صاحبه، فجاء رجل من بهز، وهوالذي عقره، فقال: يا رسول الله شأنكم والحمار، فأمر رسول الله ﷺ أبا بكر أن يقسمه بين الناس،،

۶۲۔ ,,كان رسول الله ﷺ إذا أصاب غنيمة أمر بلالا فنادى في الناس فيجيئون بغنائمهم، فيخمسه ويقسمه، فجاء رجل بعد ذلك بزمام من شعر، فقال رسول الله ﷺ: هذا فيما كنا أصبناه من الغنيمة، فقال: أسمعت بلالا ينادي ثلاثا؟ قال نعم، قال: وما منعك أن تجيء به؟ فاعتذر إليه، فقال: كن أنت تجيء به يوم القيامة فلن أقبله عنك،،

۶۳۔ كتب يزيد بن معاوية إلى أهل البصرة: سلام عليكم، أما بعد فإن رجلا سأل رسول الله ﷺ زماما من شعر من مغنم فقال رسول الله ﷺ: سألتني زماما من نار لم يكن لك أن تسألني ولم يكن لي أن أعطيه۔

۶۴۔ عن عمرو بن شعيب عن أبيه عن جده قال: سمعت النبي ﷺ وقد جائه رجل ومعه كبة من شعر، فقال: أخذت هذه من المغنم لأصلح بردعة لي، فقال النبي ﷺ: ما كان لي ولبني عبد المطلب

فهو لك، فقال أما إذا بلغت ما أرى فلا إرب لی فیها، وتبذها۔

۶۵۔ ,,عن عمرو بن سلمة الضمریؓ قال: خرجنا مع رسول اللّٰه ﷺ حتی أتینا الروحاء، فرأینا حمار وحش معقورا، فأردنا أخذه، فقال رسول اللّٰه ﷺ دعوه فإنه یوشك أن یجیء صاحبه، فجاء رجل من بهز، وهوالذی عقره، فقال: یا رسول اللّٰه شأنكم والحمار، فأمر رسول اللّٰه ﷺ أبا بكر أن یقسمه بین الناس،،

۶۶۔ الربح علی ما شرطا والوضیعة علی قدر المالین،

۶۷۔,,المسلمون علی شروطهم إلا شرطا حرّم حلالاً أو أحلّ حراماً ،،

۶۸۔ ,,المسلمون علی شروطهم إلا شرطا حرّم حلالاً أو أحل حراماً،،

۶۹۔ فقال ﷺ: مثل المؤمن كمثل التاجر لا تخلص له نوافله ما لم تخلص له فرائضه، فالتاجر لا یسلم له الربح حتی یسلم له رأس ماله،،۔

۷۰۔ ,,خذو ما وجدتم لیس لكم إلا ذلك،،

۷۱۔ عن أبی سعید الخدریؓ قال: أصیب رجل فی عهد رسول اللّٰه ﷺ فی ثمارابتاعها، فكثر دینه، فقال رسول اللّٰه ﷺ: تصدقوا علیه، فتصدق الناس علیه، فلم یبلغ ذلك وفاء دینه، فقال رسول اللّٰه ﷺ: خذوا ما وجدتم لیس لكم إلا ذلك، رواه ابو داؤد فی البیوع باب وضع الحاجة رقم: ۳٤٦۹،

۷۲۔ لأن النبی ﷺ قال: لا یحل بیع وسلف، ولا شرطان فی بیع۔ قال الترمذی: هذا حدیث صحیح، ولأن النبی ﷺ نهی عن بیعتین فی بیعة، حدیث صحیح،

۷۳۔ ,,المسلمون علی شروطهم إلا شرطا حرّم حلالا أو أحل حراما،،

۷۴۔ ,,ثلاث من السعادة، المرأة الصالحة، والمسكن الواسع، والمركب الهنیئ،،

۷۵۔ ,,ثلاث من السعادة، المرأة الصالحة، والمسكن الواسع، والمركب الهنيئ،،

۷۶۔ أتى النبى ﷺ بقلادة فيها ذهب وخرز ابتاعها رجل بتسعة دنانير أو سبعة دنانير، فقال النبى ﷺ: لا حتى تميز بينهما، قال: فرده حتى ميز بينهما، رواه ابو داؤد، ولمسلم أنه ﷺ أمر بالذهب الذى فى القلادة فنزع وحده، لأنه قد يتخذ حيلة على الربا الصريح۔

۷۷۔ عن ابن عباس يقول: أما الذى نهى عنه النبى ﷺ فهو الطعام أن يباع حتى يقبض، قال ابن عباس: ولا أحسب كل شيء إلا مثله، ۔

اشاریہ۔ ۳ (INDEX-3)

فہرستِ اعلام و موضوعات

ب

ت

ٹ

ج

چ

ح

خ

د

ز

س

ش

ص

ض

ط

ع

غ

ف

ق

ک

ل

م

ن

ی

ENGLISH INDEX